

پیر عشق میں



طالعہ راز غفری

وال کلاک کی تک تک اس پن ڈراپ سائنس میں کسی کو ہے کے ہتھوڑے کی مانند اس کے دماغ پر پڑ رہی تھی۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ پورا عالم رات کے اس پہر سنانے اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کوریڈور کی طرف دیکھا۔ سرنگ جیسا کوریڈور ویران پڑا ہوا تھا۔ اُس نے اکا دکا جلتی ہوئی ٹیوب لائٹس کی طرف دیکھا۔ شاید دو بج کر اٹھم تھا۔ ٹیوب لائٹس بار بار جل بجھ رہی تھیں۔ اس نے کاؤنٹر پر نگاہ دوڑائی۔ ڈیوٹی ٹرس کرسی پر لوگھ رہی تھی۔ اس نے پھر ٹیوب لائٹس کو دیکھا۔

”تہہاری زندگی کا چراغ بھی موت کے طوفان میں اسی طرح ٹھنسا رہا ہے..... تہہاری حیات کی لو بھی بے رحم ہواؤں کی زد میں ہے۔“

اس نے آزر دگی سے سوچا۔ دل سے ایک ٹیس سی ٹلی۔ برسوں پہلے اُس نے اپنے کسی ٹاول یا افسانے میں ایک جملہ لکھا تھا۔

”محبت ایک اندھا کتا ہے۔ اور اس میں گر جانے والا کبھی بھی باہر نہیں آ سکتا۔“

اس اندھے کتوں میں تو وہ خود گر چکی تھی۔ اب لاکھ ہاتھ پیر مارنے کے باوجود باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔

اُس نے گہری سانس اپنے لبوں سے خارج کی اور پھر آئی۔ سی۔ یو کے اسی وحشت زدہ کمرے میں آگئی جس کی خاموشی اور نیم اندھیرے سے گھبرا کے وہ باہر نکلی تھی

اندھ آئی تو سفید سفید ٹیوں میں جکڑا جسم بے حس و حرکت اس کے سامنے تھا۔ وہ ست روی سے چلتی ہوئی واپس بیڈ کے سرہانے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہولے سے وہ مضبوط ہاتھ اٹھا کر احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اُس کے ہاتھ کی رگوں میں اتنی سونیاں چھپی تھیں کہ جگہ جگہ سے وہ نیلا پن گیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی زخم آلود تھیں۔

ٹپ..... ٹپ..... ٹپ..... آنکھوں سے ہیرے گرے اور ہاتھ کے سیپ میں قید ہو گئے۔ تو تہہاری محبت نے مجھے بھی اس اندھے کتوں میں دھکیل ہی دیا ہے.....

اُس نے اُس کی بند آنکھوں کو دیکھا۔ مگر میرے عشق نے تم کو کہاں پہنچا دیا؟..... ایک سسکی اُس کے منہ سے نکلی۔ ”کب کھلو گے“

یہ آنکھیں؟..... اس نے بے خودی کے عالم میں بند پہلوں کو اپنی نرم آنکھوں سے چھوا۔ کمر ٹوٹنے کی تہادری سے سینہ؟

اس نے اپنے رخساروں پر پہنچے پانی کو بے دردی سے دوپٹے سے صاف کیا۔

”جیسے رات کا سیاہ رنگ بہت پرندہ ہے..... جب سیاہ، بالکل سیاہ آنکھوں کے آنچل پر شفاف موتی جیسے تارے جھلکاتے ہیں، جب تجھے لگتا تھا کہ تم اپنی ان دو ہیرے جیسی چمکی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہو..... تمہارے چہرے پر سب سے زیادہ حسین چیز تمہاری یہ آنکھیں ہی تھیں..... ان شفاف آنکھوں میں میرا چہرہ کس قدر واضح نظر آتا ہے..... ہے یا تھا؟“ وہ کانپ گئی۔

”نہیں..... تم مجھے اتنی بڑی سرائیں دے سکتے..... وہ اُسے خود دینے کے تصور سے ہی کانپ اٹھی تھی۔

”بھئی ایسا وقت بھی آئے گا جب تم میرا نام لے کر پکارو گی..... کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب تمہاری آنکھیں میرا چہرہ دیکھنے کو ترس سکی..... مگر کمر میں تمہارے قریب نہیں ہوں گا..... ہاں..... جب تم مجھے پانے کو ایسے ہی بے چین ہو گی..... جب تم میرے لئے ٹوٹ کر پڑو گی جیسے میں تمہارے لئے ترپا ہوں..... جب احساس ہو گا تم کو کشف عارفین عادل اکبر الٰہی کی گئی کیا ہوتی ہے؟..... جب تم میری دیوانگی کا مطلب جان پاؤ گی..... جب مجھے پہچان جاؤ گی۔“

ایک بھاری آواز اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی..... وہی آواز جس کے سحرے کشف عارفین عادل نا ہی اس چنان کوٹھی کی گھبرائی دیوار بنا تھا۔

گزشت چھ مہینے سے چار سال تو اس نے اسی دھوکے میں گزار دیئے تھے کہ وہ جیور ملی خان سے محبت نہیں کرتی، صرف اس کے وعدے کی پاسداری کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر اب جب وہ سامنے آیا تھا تو سارے گمان مٹتی بن گئے۔ کچھ سامنے تھا تو صرف یقین..... یقین اس بات کا کہ وہ بھی جیور ملی خان سے محبت کرتی ہے۔ مگر اظہار کرتی تو کیسے؟ وہ تو ہسپتال کے اسی سردار کے میں سارے عالم سے بے خبر بدوش پڑا تھا۔

کشف نے جیور ملی خان کو دیکھا اور مجھے سمجھے انداز میں کمری کی پشت سے ٹپک لگی۔ باہر تیز بارش شروع ہو چکی تھی اور اندر وہ دھنسی کے طوفان میں بہہ رہی تھی۔ کمری کے ساتھ وہ اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ اتنی تیزی سے کہ خود اسے بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ آج وہ اپنے دھنسی کو دوبارہ جانتی تھی..... وہ ہرگز نہ بات یاد کرنا چاہ رہی تھی جو جیور سے جڑی ہوئی تھی..... جس سے جیور کی مہک آتی تھی۔

رات کا تھکا ہوا تنگی سے سوزل جھٹکود کی جانب رواں تھا اور اس کی نظریں جیور کے زرد چہرے پر پئی تھیں۔



رات کی تاریکی کا سیاہ چال ہر ٹوٹ پھٹا ہوا تھا۔

سڑکوں پر فریک نہ ہونے کے برابر تھا۔ روڈ لائٹس بجلی رہی تھیں۔ ان کی دھم دھم بجائی رہائش سڑکوں پر بجائی سا آجالا پھیلتا ہوئے تھیں۔ رات کے اڑھائی بج رہے تھے مگر کراچی شہر میں زندگی کی جولا نیاں ختم نہیں ہوئی تھیں البتہ دھم دھم سرور بگنی تھیں۔

سیاہ اسپورٹس کار ناگن جیسی بل کھاتی، سیاہ چمک دار سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بے انتہا حسین اور سڈول جسم والا نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے بدن پر بے حد نشی لباس تھا جس میں سے بہترین اور فنیٹ خوشبو میں آغہ اٹھ کر پوری کار کو سطر کر رہی تھیں۔ اس کی دامن چوڑی کلائی پر پیش کرتی گھڑی بندھی تھی جس کے ڈائل میں ننھے ننھے ہیرے لگے تھے اور نیم اندھیرے ماحول میں لمبوں کی طرح دک رہے تھے۔ اس کے سفید سفید مردانہ خوب صورتی سے سڑکیں ہاتھ انشیزنگ پر لا پڑاوی سے رکھتے تھے۔ اس کی کشادہ چمکی پیشانی کے نیچے سیاہ ومان دار ہڈوں تلے دو ہیرے دک رہے تھے۔ سیاہ چمکی آنکھوں میں جب سا کھال تھا۔ اس کی نیم وا آنکھوں کو یہ کھال اور حسین بنار تھا۔ جس قدر وہ آنکھیں کھینچ کر دیکھتا تھا تو ان میں بے چین سی دشت سائی تھی۔ کار کے کیسٹ پیڈل پر انگریزی وچمن بج رہی تھی اور کار کے اندر کی خوب صورتی اور دریا مان پور ماحول میں اضافہ کر رہی تھی۔

نوجوان بہت لا پڑاوی سے کار چلا رہا تھا۔ وہ بے مقصدی سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اڑھائی بجے..... پونے تین بجے..... پھر سو اٹھن..... اور جب پورے چار بجے تھے، جب وہ نوجوان ایک گلی جیسی کوئی کے سامنے کار روکے، دران بنار تھا۔ گیٹ کھٹے میں صرف ایک منٹ لگا تھا مگر نوجوان نے ہان پر سے ہاتھ جب تک نہیں ہٹایا جب تک کہ بدحواسی کے عالم میں باوردی چوکیدار اس کے سامنے ہاتھ جڑ کر کھڑا نہیں ہو گیا تھا۔

”کہاں سرگئے تھے؟..... گیٹ کھٹے میں اتنا وقت کیوں لگا؟“ نوجوان غریبا۔

”مم..... میں..... جی..... وہ ڈرا آٹھ گلی جی سرکار“ چوکیدار متنبایا۔

”تھو آدم آٹھ گلی نے کی ہی تو لیتے ہو..... اس نے نظر کیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں جی“ وہ نظریں جھکا کر یوں کھڑا تھا جیسے اسے چٹائی کی سزا سنا دی گئی ہو۔ بدحواس..... ڈرا سا..... سہا ہوا۔

نوجوان بنا کچھ بولے اس پر سے نظریں ہٹا کر گیٹ کو دیکھنے لگا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔ کار کے اندر جاتے ہی چوکیدار نے کھلی کی سی تیزی سے گیٹ بند کر دیا۔ نوجوان نے کار پورچ میں روکی جہاں پہلے ہی سے تین چار مختلف ماڈل، سائز اور رنگ کی گاڑیاں موجود تھیں۔

اس نے اپنے جھٹکے مانے جسم کو گاڑی سے باہر نکالا اور دوڑتے ہوئے قدموں سے اندر بڑھ گیا۔ اس کے دوڑنے، دو گام سے قدم اس بات کی دلیل تھے کہ وہ ”لی“ کر آیا ہے۔ اس وقت وہ بال

کمرے سے گزر کر سڑکیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی وقت کچھ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہاں سے سفید دوپٹے کے پہلے میں سونو چہرہ لے کر ایسا نمودار ہوئی۔

”تجور!..... تم میرا آج پوری رات باہر گزار کر آئے ہو؟“ لی اماں روزانہ کا کہا ہوا جملہ دہرا لے لگیں۔

”سوری لی اماں!..... آج دیر ہو گئی۔ کل سے وقت پر آؤں گا۔“ اُس نے بھی روزانہ کا رونا ہوا جواب بول دیا۔

”کھانا کھایا؟“ دوسرا سوال بھی کچھ نہ تھا۔

”جی.....“

”چاؤ سوچاؤ چاکر۔ ساری رات ناچ گانے، ہلکا گھاس گزارتے ہو۔ کبھی ایک وقت اللہ کو بھی یاد کر لو تو ساری آوارگی کے آگے بندہ جائیں۔ ساری بے سکونی جین و راحت میں تبدیل ہو جائے۔“

(افو..... پھر وہی لہجہ) وہ جھنجھلا سا گیا۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے لی اماں باقی لہجہ کل..... اوکے، مکہ نائٹ۔“ وہ بے مشکل جواب دیا، روزگزار ہوا، ہوا میں میاں چڑھتا اپنے کمرے میں چلا گیا اور لی اماں افسردہ سی اسے تب تک نہ دیکھتی رہیں جب تک کہ وہ غمخوار سے اوجھل نہ ہو گیا۔ پھر تازہ سے سر ہلاتی وہ بھی اپنے کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔

تجور نے اپنے کمرے میں کچھ کرکٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور جوتوں سمیت بستر پر گر گیا۔ تھکا ہوا، شے میں دھت جسم گداز فوم پر گرا تو غفلت کی آنکھوں میں خورانی پھیل گیا۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ اُس نے کرکٹ لیٹے ہوئے اپنے اوپر کھینکھینکا اور سستی و کاغذ سے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

لی اماں جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بستر پر ہی پڑا تھا۔

”تجور!..... اٹھ جاؤ جیٹا!“ انہوں نے اس کے نزدیک آ کر اس کے گھٹیرے سیاہ رات جیسے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ یہ ان کا مخصوص اسٹائل تھا جسے بچکانہ۔

”اوپر، ہوں۔“ سونے بھی دہلی لی اماں! ابھی تو صبح ہے۔“ وہ کاغذ سے بولا۔

”صبح کب کی آگے کرکٹ مچائی۔ اب تو دن چڑھ آیا ہے۔ دوپہر ہو رہی ہے۔ دو بج رہے ہیں۔ اٹھ کر کھانا دانا کھاؤ۔ لیکن پہلے نہالو۔“ انہوں نے کہا۔

”اچھا..... ابھی اٹھتا ہوں۔“ اس نے نالے والے انداز میں کہا۔

”پوری پوری رات چاک کر کرکڑو سے تو صبح آٹھ کہاں سے کھلے گی بھلا؟..... اور یہ دیکھو جو تے چمکاے سو رہا ہے۔“ ان کی نگاہ کے بیٹوں پر پڑی جو کھل کے پیچھے سے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ کسمسایا۔

”جوتے چمکا کے سونے سے کیا بڑی ابھی نیند آتی ہے؟“ انہوں نے اس سے پوچھا۔

”ہوں..... بہت ابھی۔“ وہ ان کے طعنے کے جواب میں سکڑا گیا۔

”میں کھانا لگاوا رہی ہوں۔ آدھے گھنٹے میں فریض ہو کر پیچھے نظر آؤ گے۔“ انہوں نے غم نہاد دیا۔

”پہلے بیٹی لی اماں!“ اس نے ہانک لگائی۔

”بھگوانی ہوں۔“ وہ پولیس اور کمرے سے باہر نکلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد تجور نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔ پانچ منٹ کے بعد ملازم اس کے لئے بیٹی لے آیا تھا۔ اس نے چائے کی دھواں اڑاتی پیالی کو اٹھا کر کلوں سے لگا لیا۔

”سرکار! چوہا نیم صاحب کا فون آیا تھا۔ تین بار فون کر چکی ہیں مگر اب تک۔ آپ سو رہے تھے لہذا میں نے پیچھا نہیں کیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ جب آپ جاگ جائیں تو آپ سے کہوں کہ انہیں آپ فون کر لیں۔“ ملازم نے اسے پیغام دیا۔

”ٹھیک ہے..... میں کرلوں گا فون۔“ تم میرے کپڑے نکالو۔“ اُس نے لاہ دہا سی آ رڈر دیا۔ ملازم اس کی وارڈرو ب کی طرف بڑھ گیا۔

اُس نے اپنی پیالی ختم کی اور ایک پھر پور نکلتی لیٹے ہوئے بستر سے نیچے اتار اور اپنے بوٹ اتار کر ایک طرف پیچھے۔ پھر موزے اتارے اور جوتوں کی انگلیوں کو ہلکا کر آرام دینے کی کوشش کی۔ جوتوں کو جب بھولوں اور جوتوں کی قید سے آزاد کی تو وہ تازہ ہوا کھانے پر سکون ہو گئے تھے۔ ملازم اُس کے کپڑے اور جوتے وغیرہ نکال کے چاکا تھا۔ اُس نے اپنی قمیض کے بٹن کھولے اور وہیں کپڑے کپڑے کھینچ کر انہیں اتار دیے اور بڑے اطمینان سے گولہ لگا کر ایک طرف پھینکی۔ پھر کمرے کے انچھٹہ ہاتھ روک دیکر طرف بڑھ گیا۔

نیم گرم پانی سے اچھی طرح غسل کرنے کے بعد اس نے لباس بدلا، بال سنوارے، پر فہم بگون اور پاؤں اسی کمرے کا پتہ تھا شور سے روٹی استعمال کیا، پھر گمری اپنی سٹنڈل کھائی پر باغی اور جوتے پہن کر باہر نکل آیا۔

نیچے پہنچا تو کھانے کی کچی میز اس کی خنجر قسی۔ کھانوں سے اخصی اشتہا انگیز مہک اس کے نھنوں کے ذریعے سیدی معدے میں اتر گئی اور اس کی گلی گلی بھوک یک دم پک اٹھی۔

”لی اماں کو ملاؤ۔“ اُس نے میز کے پاس کپڑے ملازم سے کہا۔

”وہ نماز ادا کر رہی ہیں۔“ ملازم نے بتایا۔

”کھانا کھایا انہوں نے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں!..... دو سو ساڑھے بارہ پیچھے کھاتی ہیں۔“ ملازم نے بتایا۔

”اووہ..... ہاں، یہ ہمیشہ میں بھول جاتا ہوں کہ لی اماں تو ساڑھے بارہ پیچھے دوپہر کا کھانا کھا لیتی ہیں۔“ ظاہر ہے، پرعدوں سے پہلے جاگ جاتی ہیں اور منہ اچھر سے ناشہ کر لیتی ہیں تو بھوک بھی تو جلدی کھتی جائز ہے۔ اب شام کا کھانا بھی سات پیچھے کھائیں گی۔“ وہ خود خاد کی سے اعزاز میں بولا۔

ملازم گولہ بھرا ہوا کھانا اتارے اور سخت دھڑاٹھا اٹھا کر دیتا جا رہا تھا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا اور دیکھیں سے اچھا پوچھے ہوئے کرسی تکمیت کرکڑا ہوا گیا۔ اسی وقت اس کے موبائل

کا بہت شوق تھا اور شاید یہ اس کے چند گئے چنے شوق میں سے ایک تھا جو کہ قسم نہیں ہوا تھا۔ اور اس میں بھی زیادہ تر ہاتھ ہی اماں کا تھا۔ بہت سی چھوٹی عمر سے انہوں نے اس کو مطالعے کی ات ذرا دل دی تھی۔ جب وہ خود کتابیاں پڑھنے کے قابل بن گیا تھا، جب اسے کتابوں میں سے کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ پھر جب وہ خود پڑھنے کے لائق ہوا تو انہوں نے اس کا ایک حقیقت مختلف قسم کی کہانوں کی کتابوں سے بھرنا شروع کر دیا۔ وقت رفتہ ہی اماں کا اس کے اندر پیدا کیا ہوا شوق بڑھتا ہی چلا گیا۔ اسے جب بھی اور جہاں بھی اچھی کتب نظر آتی تھی وہ اسے ضرور خرید لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ادب میں کسی کتب کو دیکھ رہا تھا۔ کافی ساری کتابوں کی نئی تکمیل دیکھیں دیکھیں میں تھی۔ پھر ایک کتاب کے پتل پر اس کی نگاہ پڑی تو اس نے دلچسپی سے اسے نکال کر دیکھا۔ کتاب اردو میں رقم طراز تھی۔ اس نے کتاب کے داخل کو ایک بار پھر دیکھا۔

”تیرے عشق نیا“

یہ پہلے اسے کافی دلچسپ لگا تھا۔ اس نے کتاب کو لی اور ابتدائی صفحات کو سرسری سادہ کیے لگے۔ ”عشق روح ہوتی ہے..... عجمت جیہ“

بس اس ایک فقرے نے اسے بہت متاثر کیا تھا اور اس نے فوراً ہی وہ کتاب خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے مصنف کا نام پڑھا۔ ”کا کا کا“۔ ”خاص نام تھا۔ اس کے لئے ایسی تھا۔ مگر عجیب

نقش کشی اس نام میں..... ایک خاص قسم کی کہانی تھی۔

”شاید کوئی نئی راتلے ہے۔ وہ سوچتا ہوا ایک دم سے پلٹا۔ محروم اپنا ایک پتہ اس کے لئے کافی

تھانہ وہ ثابت ہوا تھا۔ وہ بالکل اپنا کسی سے گمراہ تھا۔ گمراہ بہت زوردار ثابت ہوا تھا۔

اس کے ہاتھوں سے ساری کتب نکل کر زمین پر پھیل چکی تھیں۔ گمراہ نے اسے اس کے کشادہ

پتے پر زور سے لگا تھا۔ اسے پہلی تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے گفت بھر سے اعجاز میں اسے دیکھا جو

اس کی گھر سے زمین پر گر چکا تھا۔ وہ چونک گیا۔ وہ ایک لڑکی تھی..... سیاہ لباس میں بیٹھی تھی۔ سر پر

کالے رنگ کا اکارف لپیٹ رکھا تھا۔ کان کا ڈھانچا لڑکا کا وہ اپنے اس کے شانوں پر پہنچنے سے موجود تھا

اور اس کے پتے کو بھی چھپا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام رکھا تھا اور فرش پر دوڑا تو بھیجی ہوئی تھی۔ چور کے سینے سے اس کا سر بہت زور سے لگا تھا۔ وہ دھواں پانی تھی۔ اس اچانک اٹھا۔ پڑھنے کی اور

امین پر گر گئی تھی۔

پور ہو گیا تھا۔ اس کا مزاج ایسا ہی تھا۔ جس طرح لوگ روزانہ کپڑے بدلے ہیں، اس طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ فاسٹ چور لڑکیاں بدلنا تھا۔ اس کی دوستی کسی بھی لڑکی سے چند ہفتوں سے زیادہ نہ رہتی تھی۔ وہ چند ہفتوں تک لڑکیوں کے ساتھ جلتا، دڑ، بچ، دھیر کرنا، گھومتا پھرتا، بیٹھ کرنا، پلا گھلا کرنا اور پھر پور ہو کر جان چھڑا لیتا۔ اس نے لڑکیوں سے دوستی کی کوئی خاص حد مقرر نہ کر رکھی تھی۔ اس حد سے تجاوز کرنے والی عادت پر اسے کوئی شرمندگی بھی نہ ہوتی تھی۔ جس ماحول میں وہ رہتا تھا

سب اس کا خاصا تھا۔

”عشق“ کی پارکنگ میں اس نے اپنی گاڑی پارک کی اور گاڑی لاک کر کے باہر نکل آیا۔ اسے یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اس جگہ اسے ہر وہ مطلوبہ کتاب مل جاتی تھی جو دوسری دکانوں میں مشکل سے

دستیاب ہوتی تھی۔ ”گلشن“ کا مالک ایک نوجوان مرد تھا اور اس کا اچھا دوست بھی تھا۔ مراد اس کا نام

تھا۔ اس نے اپنی دکان میں بہترین تکمیل دیکھیں دیکھیں کی اس کی دکان پر خاصا رش لگتا رہتا

تھا۔ اس وقت بھی دکان کتابوں کے سیاہ اور ضرورت مندوں سے بھری پڑی تھی۔ گلاس ڈور کو کھیل کر وہ

اندرا داخل ہوا تو اسے کسی کی خوشی کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی خوشبو نے اس کے چہرے پر اور سانسوں کو سحر کر

دیا۔ ایک خوشگوار احساس اس کو چھو گیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ خوشبوؤں کا دیوانہ۔ اپنے ارد گرد شہن دیکھنے

عادی۔

وہ سیدھا کاؤنٹر پر گیا۔ مراد وہاں موجود تھا اور کسی کا کپ کو نشانہ بنا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے ہونٹوں

پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگر یہ مسکراہٹ ”کاروباری“ نہ تھی بلکہ وہ تھی جو کسی جان بچان والے کسی اپنے

کو دیکھ کر کیوں پر دوڑ جاتی ہے۔

”ہیلو چور!..... کہاں ہو بھئی؟ بڑے دن بعد پھر لگایا ہے۔“ مراد بے تکلفی سے بولا اور ساتھ

اپنی اچھا مصالحتی کے لئے آگے بڑھا۔

”بس پیارا میں نے سوچا کہ روز روز کا آتا قدر کھودتا ہے۔ اور میں اپنی قدر کھوتا نہیں چاہتا۔

چور مسکرایا۔

”تجربہ سے یہاں روز روز آنے سے تجھاری قدر کم نہیں ہوگی، پڑ جائے گی۔ اس لئے کہ

قدر کرنے والوں میں سے ہیں پیارے؟“ مراد ہنستا چور بھیجی میں پڑا۔ اس کی آواز بھیجی میں آج

اس سے کہیں زیادہ خوب صورت اس کی ہوتی تھی۔ جب وہ ہنستا تھا تو اس کا چہرہ چہرہ روشنیوں

بکیرے لگتا تھا۔ گھر اس کی آنکھیں آداس رہتی تھیں..... بہت خاموش!

”کوئی نئی تکمیل آئی ہے؟“ چور نے پوچھا۔

”بالکل آئی ہے..... تم دیکھو تم کو کھنڈ آئے گی۔ اس طرف۔“ مراد نے دائیں جانب اشارہ کر

”اوکے..... میں دیکھ لوں، پھر لگاتے ہیں کپ شپ۔“ چور مطلوبہ کتب کی تلاش میں ا

طرف مگھو گیا جس طرف مراد نے اشارہ کیا تھا۔ دکان بہت بڑی تھی اور ہر قسم کی کتابوں سے بھ

پڑی تھی۔ چور حقیقت میں دیکھیں دیکھیں میں سے مطلوبہ کتب ملے کر رہا تھا۔ اسے کتابیں پڑ۔

”پوری نہیں..... فتنی فتنی تھی۔ سونا سے محبت کر کے تم اپنی اصل تو کھو بیٹھے ہو۔ اب شادی کر کے آزادی بھی کھودو گے۔ مجھے تو تم پر ترس آتا ہے۔“ وہ اسے چمکرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”اچھا..... ٹھیک ہے بیٹا! وقت کا خنجر ہوں۔ دیکھ لوں گا تم کو بھی۔ ابھی تو بڑے بڑے بول بولے جا رہے ہو۔ ذرا اپنی حداریں سے گزرتو پھر پوچھوں گا تم سے۔“ حیدر نے منہ پر ہاتھ جھیر کر دمکی آئینہ لکچے میں کہا۔

”دیکھ لینا..... میں بدلنے والا نہیں ہوں۔“ حیدر پُر یقین لکچے میں بولا۔
 ”دیکھ لیں گے..... دیکھ لیں گے۔ جانا کہاں ہے تم نے اور ہم نے۔ خیر، ابھی تو تم یہ پورنگ بچا بناؤ۔ اسپورٹس کا جیتل لگاؤ۔“ حیدر کو بچک وغیرہ میں دلچسپی نہیں تھی۔ سو حیدر نے جیتل بدل دیا اور ساتھ ہی موضوع بھی۔



”اے اے اے.....“ حیدر زور سے نفس دیا۔ ”اتنا زور سے؟“
 ”ہر شریف آدمی اپنی منگیتر سے ڈرتا ہے۔“ حیدر نے اطمینان سے جواب دیا۔
 ”بڑے بڑا دل ہو یا راز۔ مرد و عورت۔ تم کچھ بھی کرو، وہ تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟“ حیدر نے نکتہ سے کہا۔

”میں بڑا دل نہیں ہوں۔ اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ مجھ سے جذبات کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ خیال رکھتے ہیں کہ کتنی اس کے باز کھڑوں کو کوئی جگہ بھی نہیں ملے گی۔“ حیدر نے منہ بنایا۔ ”میری ماں تو ایک آدمی کا دلکش کر دی ڈالو۔ مشق کی محبت تمہارے بچہ کو کم ہونے لگی تو تم خود بخود شادی کے لئے بھی راضی ہو جاؤ گے۔“ حیدر نے تمہارا کہے بغیر ہی قصہ چھیڑ دیا۔
 ”کر لیں گے محبت بھی۔ مگر کوئی اس کا قائل نہ بھی تو۔“ حیدر لا رہا وہی سے بولا۔

”یہ جو ہر روزنی کار کی طرح لڑکیاں بدلے ہو، ابھی میں سے کبھی کو پسند کر کے محبت کر ڈالو۔ وہ جو تمہاری ایک دوست تھی، کیا نام تھا اس کا؟“ حیدر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہاں..... یاد آ گیا..... سیما..... سیما صدیقی نام تھا اس کا۔ اس میں کس چیز کی کمی ہے؟ کر ڈالو اس سے محبت۔ شادی کی راہ خود بخود ہی ہموار ہو جائے گی۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”تمہارے ان جتنی مشوروں کی مجھ کو کوئی ضرورت نہیں ہے مسٹر!..... حیدر علی خان جس سے محبت کرے گا تو وہ ایسی دیکھ کوئی لڑکی ہرگز نہیں ہوگی، بہت خاص اگلاں لڑکی ہوگی۔“ حیدر نے کہا۔
 ”اچھا جانتا ہوں! تو یہ لڑکیاں جن کو تم بھل میں دہائے پھرتے ہو وہ کیا جہت قرار نام پاس ہیں؟“ حیدر نے کہا۔

”اور کیا تھی..... میں ان لڑکیوں سے شادی کرنے کی نیت سے تھوڑی دیر ہوئی کرتا ہوں۔ بلکہ میں کیا دوستی کرتا ہوں، تم تو جانتے ہی ہو کہ آج تک لڑکیاں خود میرے ساتھ دوستی کرنے کی خواہش لے کر میری طرف بھیجی ہیں۔ میں نے ان تک خود سے آگے بڑھ کر کسی دوستی سے یہ نہیں کہا کہ میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“ حیدر کے اعزاز سے اس کا مخصوص غرور و تکبر چمک رہا تھا۔
 ”تو کیا یہ سب ایسی ہیں۔“ حیدر نے بائیں سے پوچھا تو جواب میں حیدر نے کندھے اچکا کر بے نیازی سے اس کے ہاتھ سے ریہوت لے لیا۔

”میرے بھائی! انی الحال تو مجھے اپنی یہ آزادی بہت چاہی ہے۔ اور ابھی تک میری اصل شریف بھی میری کھوپڑی میں محفوظ ہے۔ اور مجھے یہ دونوں چیزیں بہت عزیز ہیں اور میں انہیں کسمانہ نہیں چاہتا..... تمہاری طرح۔“ حیدر نے ”تمہاری طرح“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”محبت اور شادی کے بعد انسان یہ دونوں چیزیں کھو بیٹھتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں نے اپنی اصل اور اپنی آزادی دونوں کھو دیے ہیں؟“ حیدر نے اسے گھورا۔

انہوں کی کھٹ پٹ اور کٹ پٹہ پنہنجی۔ پھر صحن میں جگہ جگہ بیٹ کرتی پھرتی تھیں۔ وہ پودے
اور صف نے بڑی محبت اور محنت سے سکوں میں لگا رکھے تھے، نیر کی "پھینچوں" نے چٹخیں مار مار کر
ان پر سے بھرے پھول پودوں کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا تھا۔

"ام! یہ کیا مصیبتیں پال لی ہیں آپ نے؟" بھی بھی وہ سخت چڑ جاتی تھی۔

"کو..... تم کو کیا کہتی ہیں معصوم؟ ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئے ہیں سب ان بے چاروں کے۔"
نیر، ہر اماں کے کہیں۔ کوئی ان کی "معصوم" مرغیوں کے متعلق ایک بھی برا لفظ نہ سے نکال بیٹھے۔ یہ
اہلی کہاں کو مارا تھا۔

"آپ کی ان "معصوم" مرغیوں نے میرے گلاب کے پھولوں کا کیا حال کر دیا ہے۔ دیکھیں۔"
اس نے اپنے انتہائی شوق سے لگائے گلاب کے سفید پھولوں کی بھری بھری سی تہوں کی طرف اشارہ
کیا تھا چرمیوں کی شہر سالمانی کی صورت صحن میں بھری ہوئی تھیں۔ بھی تو وہ مرغیاں اس کمرے
میں کھس کر اس کی رائیگ شیل پر حصر سے براہمان پائی جا تیں۔ بھی جب وہ اپنے سفید برقع
"پنے پائی کپڑے" صحن میں گلف لگا کر کھانے کے لئے پھیلائی تو وہ حصر سے اپنے پڑ پڑ پڑائی ہوئی
ان پر چاٹتی تھیں اور ان کی اس "بے تکلفی" پر کشف خون کے ٹھونٹ لپی جاتی۔ ماں سے شکایتیں کر کر
کے وہ تنگ مٹی تھی۔ لہذا اس نے ان شیطان صفت مرغیوں سے نہایت کا ایک صل سوچا۔ اُس نے اپنا
کمرہ اور والی منزل میں شفٹ کر دیا۔ حالانکہ پہلے پورن کی نسبت لوری منزل گرمیوں کے موسم میں
غاسی گرم رات تھی اور سردیوں میں رات بھی گرمیوں کی سردی سے بھرتی تھیں۔ مگر وہ اس پر مطمئن تھی کہ کم از کم
ان مرغیوں کے شور شرابے سے تو سکون مل گیا تھا۔

"ام! اچھے کھانا دے دیں۔ پھر میں نے چائے بھی ہے۔" کشف نے صحن میں بھی چار پائی پر
بیٹھے ہوئے کہا۔

"ابھی تو تم تھکی ہوئی آئی ہو۔ ابھی پھر چیلے کی بات کر رہی ہو۔ دو گھنٹی آرام بھی تو کیا کرو
لاؤ گی؟" نیر نے مرغیوں کو دانہ ڈالنے کے بعد ہاتھ دھوئے اور کچن کی طرف چلے گئے تھے
ہو گئیں۔

"آرام کرنے لگتی تو خواہوں کہ حقیقت کیسے بھانڈ گئی؟ اُس نے دل میں سوچا مگر بولی کچھ نہیں۔
معدیہ کمرے میں جا چکا تھا۔ اُس نے اپنی سینڈل سے حصر آزاد کئے اور اٹھیں کو گنگے فرش پر رکھ دیا۔
تھکے ہوئے حصر کو گنگے فرش پر رکھنے سے اسے قدرے خشک اور سکون کا احساس ہوا تھا۔ نیر
ردانہ فرش کو صحن میں چائے سے دھوتی تھیں اس لئے فرش ٹھنڈا اور صاف تھرا رہتا تھا۔ اُس نے
حصر کو ڈرا سا پتہ سکون کیا اور پھر اتر گھنٹہ صحن میں ہی ایک کونے پر گئے تنگ کی طرف بڑھ گئی۔ اُس
نے ہاتھ اور چہرہ صابن سے دھو کر اسٹینڈ پر لگے ایلے ایلے سفید تھوٹے سے صاف کئے اور پھر اندر
کمرے میں چل آئی۔ معدیہ دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں کھری کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کچھ
سنگین بھی رہا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو نیر ساجی پائو اور لاڈلی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔
"آ..... آ..... آ..... شاباش..... آ..... کھا....." کی گردان کرنے کے دوران نیر
انہیں دانہ کھانے میں مگن تھیں۔

وہ اندر داخل ہوئی تو ماں کو مرغیوں میں گھرے دیکھ کر بیزار سی شکل بنائی۔
"کیا ہے ام! آپ کی پھینچوں کا کچھ نام ابھی نہیں ختم ہوا؟" اُس نے اپنا اسکارف اتارے
ہوئے پاس سے کہا۔

"ام کی لاڈلیوں کو کچھ نہ کہیں! ایسا! ابھی مانڈ کر جائیں گی ام۔" تو لیے سے اپنا گلاب چرو
پو پیٹھے ہوئے معدیہ نے نیر کی بجائے جواب میں کہا۔ "ویسے ام! ان مرغیوں کو دیکھ کر بھی کبھی
مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ اور بھی کوئی تو ان سے حسد محسوس ہوتا ہے۔" معدیہ خاصی تنیدہ و صورت
بنائے ہوئے تھا۔

"وہ کیوں بھی؟" ان معصوموں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" ام نے دانہ ڈالنے کے دوران
بیٹے کو گھبرا جوتو لے اسٹینڈ پر پھیلا رہا تھا۔

"وہ اس نے میری پیاری ام! کہ آپ جتنے پیار سے ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں اس پر میرا بھی چاہتا
ہے کہ میں بھی ایک عدد مرغیاں بن جاؤں اور آپ کی پھینچوں کی محبت کا شریک دار بھی۔" معدیہ نے
جس طرح شکل بنا کر سفید کالی اور سرخ مرغیوں کو دیکھا تھا، اُس کے ہونٹوں پر سکڑا ہوا تیر گئی تھی۔
نیر نے اس کو گھورا۔ "اچھا..... تو ان مرغیوں کے گوشت کے پنے حصر سے دور چکنا پر ہاتھ
بھی تو صاف کرتے ہو پھر۔ اس وقت حسد یا رشک کا جذبہ کیا کیا حریہ اور چکنا کے ساتھ معدیہ میں
اتار لیتے ہو؟" نیر نے غرے لپچے میں کہا۔

"تو میں انکی ٹھوڑی ہی کھانا ہوں ان مرغیوں کو؟" معدیہ نے جلدی سے کہا۔
"اچھا..... مگر کھنٹھیں تو تمہاری زیادہ کھنٹھیں ہیں یہ۔" نیر نے فوراً کہا۔

"ام! آپ بھی کسی کی باتوں کا اثر لے نہیں....." اُس نے جلدی سے کہا۔ چاقو تھی کہ معدیہ
کے لیس دار ہیلے ماں کے اعصاب سے چٹ جائیں گے۔ بحث طویل اختیار کر چلے گئی۔ ماں کو اپنی
پائو مرغیوں سے بہت محبت تھی۔ ان کے ایک سو بیس گزے رنگ پر حقیر شدہ ام چھوٹے سے صحن
کے اندر بنے اس چھوٹے سے صحن میں نیر کی پائو مرغیاں سارا دانہ ڈالتی پھرتی تھیں۔ کشف کو

"معید! تم مجھے آج سبز چھوڑ آئے۔ آج بیدل جانے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ بہت تھک ہوں۔" اس نے چھوٹے بھائی سے کہا اور خود چٹک پڑ بیٹھ گئی۔

"اچھا..... کب تک بیٹیں گی آپ؟" معید نے بہن سے پوچھا۔
"بس، کھانا کھا لوں۔ وہ پتے کو کھر کی تیاری میں ہو؟" اس نے معید کو دیکھا۔ نیلی بیچر دور اور نیلی دھاریوں والی شرت میں اچھا اچھا سامعہ اسی بڑا بڑا رنگ رہا تھا۔ وہ اس سے پورے برس چھوٹا تھا مگر اپنے اونچے پتے کے ساتھ کہ سب اس سے بڑی لگتا تھا۔

"آج ہم دوستوں کی ٹرینٹ نوکیر رہے اسلان کے یہاں۔ وہیں جانا ہے۔" معید نے بتایا۔
"ایگزاسٹر کی تیاریوں کی کیا پوزیشن ہے؟..... تیاری کہاں تک پہنچی ہے تمہاری؟" اس پوچھا۔ معید بیٹائی میں اعتراف کرتا تھا۔ اسے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا۔
"تیاری تو پوری ہے میری..... آپ دیکھ لیں گے گا، اس سرجنری پوزیشن آئے گی انشاء اللہ۔" بڑے یقین سے کہہ رہا تھا۔

"انشاء اللہ" کشف کے دل سے اس کے لئے دعا تھی۔ "آمین۔"
اس نے تیرے کھانے کی ڈسک سے اٹھائے وہیں چل آئیں۔ "دوستوں کی محفل چھوڑ دو گے بھی پوزیشن لے سکو گے۔ روز روز کسی فلاں کے گھر جانا ہے، کبھی ڈسکا کے یہاں جانا ہے۔" تیرے لئے ٹر کشف کے سامنے رکھتے ہوئے اسے تہماڑا۔

"ام! ہم دوستوں کے گھر سے کرنے کے لئے تھوڑی جاتا ہوں۔ ہم وہاں کہاں اسلان کرتے ہیں۔" معید نے منہ بٹا کر کہا۔

"رہنے دو کہاں اسلان کی تمہارے ساتھ تھوڑی ہوتے ہیں ہم جو تمہاری باتوں کا یقین کریں۔ تیرے لئے کہا تو معید کو ماں کی اپنے لئے ہے بڑا تمہاری خامی ناگوار کر دے۔"
"دیکھیں اب! ام! بڑے جگ کر رہی ہیں۔ میں بھلا کیوں جھوٹ بولوں گا ان سے؟" اس جگہ کے بہن سے شکایت کی۔

"ام! ہمارا معید دوسرے لڑکوں جیسا نہیں ہے۔ یہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ اس سے ایسی بات نہ کیا کریں۔" کشف نے بھائی کی طرف داری کرتے ہوئے ماں کو کھنچا۔ ساتھ ساتھ وہ کھانا ہم کھاتی چاری تھیں۔

"بڑا دل اس کی نصیحت پر خراج ہو رہے ہیں۔ ہم اپنی بساط سے بڑھ کر اس کے لئے کر رہے ہیں کہ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق ہے اور اس کے اسی شوق کی تحمیل کے لئے کیا کیا جھینا پڑتا ہے ہمیں۔ تیرے بھرپور شروع ہو گئیں۔

"ام! پلینر..... بس کریں..... اچھا، چلو معید! ام! ایک نکالو۔ میں آ رہی ہوں۔" کشف نے ماں کو درمیان ہی میں ٹوک دیا اور بھائی سے مخاطب ہوئی جو ماں کی ستوالی پر بکڑے بکڑے منہ بٹا تھا۔ بہن نے کہا تو خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"ام! آپ کیا ہر وقت اس غریب کے پیچھے پڑی رہتی ہیں؟" معید کے کمرے سے نکل جانے کے بعد کشف نے ماں سے ہارٹس لیجے میں کہا۔

"ارنی ہوں کہ کہیں کسی بڑی محبت میں نہ پڑ جائے۔ یہ کہاں اسلان کی جھ سے ہضم نہیں ہوتی۔ ہلو کھر میں رہ کر پڑھا کرے۔ دیکھو، وہاں کبھی کتنا تیار ہو کر جا رہا ہے۔" تیرے نے کہا۔

"وہ اس وقت اسلان کے گھر جا رہا ہے۔ گیت نوکیر ہے وہاں دوستوں کی۔ اور پھر بے چارہ ان ماہر سنگھار کر کے جا رہا ہے؟ کئی مہر کے چنے ہوئے پکڑے بہن کے جا رہا ہے۔ آپ اسے ہر ان مت سنایا کریں۔ کبھی وہاں نہ جائے۔ ام! یہ عرصہ خطرناک ہوتی ہے۔ قدم اونٹنے چنے اس پر پڑتے ہیں۔ کبھی ڈول جاتے ہیں، کبھی ٹوکرا جاتے ہیں۔ اگر وہیں میں بے احاد کی کے ٹر چھہ جائیں، اگر راستے میں ٹک کے کاٹنے بچہ جائیں تو قدم ٹوکرا جاتے ہیں اور کرنے کا خدشہ رہا ہے۔" ام! کیا یہ بھر نہیں ہے کہ تم معید کو اپنے احاد کا مواراست دکھائیں جس پر وہ بڑے ہار اور قار سے چلا ہوا اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ بس ہمیں ایک خاص وقت تک اس کا ہاتھ پکڑ لے کر نہا ہوگا تا کہ اس کے قدم ٹوکرا نہ پڑیں۔ گھر اس کے لئے کبھی ضروری بات احاد ہے جو ہم کوں کے روویں سے اس کے لئے ظاہر ہونا چاہئے۔ کیوں، میں غلط کر رہی ہوں کیا؟" وہ زری سے اس کو کھنچتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ تیرے اس کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھیں۔

"زمانہ اعتبار کے قابل نہیں ہے جی! اس زمانے پر کیسے مجبور کروں؟" تیرے نے کھری سانس لینے ہوئے کہا۔

"زمانے پر مجبور بھی کسی حد تک کہ ضروری ہے ام! آخر چلنا ہمیں اسی زمانے کے ساتھ ہے اور رہنا بھی اسی زمانے کے ساتھ ہے۔ پانی اینڈ پر مجبور کرنا کیسیں۔ معید دوسروں سے، یعنی اس کے ہم عصر لڑکوں سے زیادہ سمجھ اور فوراً چھاپے۔ مگر آپ جو اس پر اپنی بے اعتباری ظاہر کر رہی ہیں تو یہی وجہ میں اعتبار اور احاد کی اس ڈگر سے پھل کر گر نہ پڑے اس لئے کہتی ہوں کہ اسے ہر وقت لڑکی رہا کر کریں۔ لڑکیاں ہر وقت کی روک ٹوک سے غارت کھاتے ہیں جی! وہ تو پھر لڑکا ہے۔" کشف نے ماں کو کھنچا۔

"ایچ! آجائیں۔" باہر سے معید کی آواز پر اس نے جلدی سے پانی کا گلاس چڑھایا اور کھری ہو گئی۔

"کھانا تو پورا کھاؤ۔" تیرے نے اسے چہنٹتے سلق سے لے کر کہا۔
"دوسرے ہو رہی ہے ام!..... آج میرے اسٹوڈنٹس کا ٹیسٹ بھی ہے۔" اس نے گلت گلت کھا اور اس اٹھایا۔ "ام! یہ میری کتابیں منہال کر رکھ دیجئے گا۔ کبھی آپ کی "پیشیاں" ان کا مشورہ کر لیں۔" اس نے کتابوں کا لٹاؤ ماں کی سمت بڑھایا۔

"مرادو! کان پر کئی تھیں؟" تیرے نے شاہ پر "کشتن" کا سوٹوگرام پڑھ لیا تھا۔
"جی!..... اچھا! ام! اللہ حافظ۔" اس نے گلت سے کہا اور سر پر اس کا راف باغی ہوئی باہر نکل گئی۔

معید موہر بایک لے کر آں کا شکر تھا۔ اُس کا موہر اس کی باتوں کی وجہ سے ابھی شرب ا سکتے تھے آؤ گے پارٹی ہے۔“ نیر نے معید سے پوچھا۔
”نہیں جا رہا ہوں میں کسی پارٹی دارائی میں۔ ایسا کو چھوڑ کر سیدھا گھر آؤں گا۔“ وہ بھولے منہ کے ساتھ بولا۔

”اوسے..... میرا بیٹا برا مان گیا؟..... دیکھ بیٹے اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ اپنی اولاد کو جب ذوق ہیں تو اس میں بھی اس کی مانتا اور محبت ہی چھپی ہوتی ہے۔“ نیر۔
”اے کرمیت سے اس کا سر چلا۔

”تو نامیں برا وقت ٹھک بھی نہ کیا کریں۔“ اُس کا غصہ آرا سا کم ہوا تھا۔
”ٹھک تھ کر نہیں کرتے بچے اگر ٹھک کرتی تو تجھے دوسروں کے گھر چھوڑتی؟ چل شہاؤ صبح کر۔“ انہوں نے بچوں کی طرح اسے چکارا۔

”اگر ایسا ہی رہیں برا وقت تو کتنا اچھا ہو۔ مگر آپ کی تو ساری محبت ان جیتی مریضوں پر ختم معید نے معمولی تنگی سے کہا۔

”اوسے بچے! میری محبت صرف مریضوں کے لئے نہیں ہے۔ تو بھی اس محبت کا شرا کر ہے۔“ نیر نے شوشی سے کہا تو معید نے پڑا۔ جبکہ کھٹ مکرنا لگی۔

”شام تک آ جاؤں گا..... خدا حافظ۔“ معید نے بایک کولنگ لگائی اور ایک جھٹکے سے بڑھا دی۔ جبکہ نیر دل ہی دل میں سوچ رہا کہ وہ دونوں پر پھونک رہی تھیں۔



عارفین عادل ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ نیر ان کی ماموں زاد تھیں۔ بعد میں یہ ازدواجی بندھن میں بندھ گیا تھا۔ عارفین بہت عجیب و غریب اور پراخ طبیعت کے مالک تھے۔ نیر بچپن ہی جملہ بازاروں کی حد تک فضولی طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کی چار اولاد تھیں۔ تین لڑاؤ اور ایک لڑکا۔ سو اور ما بڑاؤں تھیں۔ ان سے چھوٹی کشت بھی اور معید کشت سے چھوٹا تھا۔ لڑکیوں کے بعد پیدا ہوئے اولاد معید بڑا درد مندوں اور مردوں کا حاصل تھا۔ نیر نے بیٹے کی ذمہ داریوں کو کون کون سے دیکھنا تھا۔ کون کون سی باتیں نہیں مانی تھیں۔ کیا کیا ٹوٹے نہیں آئے تھے۔ پھر آخر جب ایک بڑا بچہ پڑا تو انہیں ان کی نندہ سے ملا تو وہ وہاں اپنی بھولی پھیلا۔
مٹی تھیں۔

”بادشاہ جی! میری تین لڑکیاں ہیں۔ مگر بیٹے کی نعمت سے بھولی خالی ہے نہ کھٹکا سکتے وہ پر بھاری بن گئی ہوں۔ چار سالوں سے بیٹے کی آرزووں میں لئے بیٹھی ہوں۔ یہ اپنی نعمت سے نہیں نوازتا۔ آپ اس کے در پر آئی ہوں۔“ نیر نے ان کے آگے دوپٹہ پھیلا دیا۔
”آؤ پچھ ڈال لی جا۔“ اُس کا در کھٹکانے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہ

۔ وہ تو خود دلوں میں ڈبو جھانے ہوئے رہتا ہے۔ جا..... تیری مراد پوری ہوگی۔“ وہ کسی کو اچھاپنے دو بار سے نہیں جانے دیتا..... بس ضرورت صرف اس کو صدقہ دل سے یاد کرنے کی ہے۔ جا..... تیری مرادوں کا کھل اسی برس بہار میں مل کر تیرا آئینہ مچکا لے گا۔“

ایک صبح..... ایک اعجاز تھا۔ وہ اونچے لیے سے جواں سال بزرگ تھے۔ سید مصطفیٰ کی نسل سے لڑکے۔ اگلے خالص سید..... دیکھنے میں عادت بادشاہ ایک عجیب جیمیں سالہ نوجوان دیکھنے میں ناہل چنگ دار گندمی رنگت۔ کھڑے اور وقار نقوش، بلند قد و قامت، سیاہ چنگ دار لہر دار دل سے نیچے نک۔ لیے جا، سیاہ چنگ دار عریش ان کے چہرے کی شان بڑھاتی تھی۔ بے مام سے لباس میں اپنے آستانہ میں بڑی بے نیازی سے براجمان رہتے تھے۔ ان کی سیاہ آنکھوں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اب..... جلالی کیفیت تھی۔ ان کے مقابل بیٹھے والا ایک لٹو بھی ان کی سون میں جھٹکے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ان کے انداز میں شہاؤ پن بھی تھا اور بے پرواہی بھی۔ لی شفقت کے سامنے سے بیٹھے والے اپنی ذرا تھیں کہ ایک عجیب سا کون محسوس کرتے تھے۔ یہی نیر نے اس وقت اپنے ہاں محسوس کیا تھا۔ نیر نے انہیں نذرانہ پیش کرنا چاہا تو انہوں نے لڑپا۔

”میں ہمارے مالک نے“۔“ بولا۔“ ہاتھ بنا کر پید کیا ہے۔“
ان کے ایک جھٹکے میں نیر نے اپنی ہر بات کا جواب مل گیا تھا۔ وہ بہت بڑا امید ہو کر ان کے سامنے آ گئی تھیں۔ اور پھر وہ ہو گیا جس نے انہیں عادت بادشاہ جی کی سرحدی بننا دیا۔ معید کی شہاؤ پن کے درمیان لی ڈالنے میں ہو گئی تھی۔ نیر کی سرخوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔



گرمی کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ آج تو آٹھن جیسے آگ پر بنا رہا تھا۔ گاؤں ناصر پور کی کچی راہوں پر سٹوگر کی سوک سبک بخاری کے ساتھ چلنے لگتی آگے بڑھتی ہوئی خولی مقصود کی بہ کا حزن تھی۔ راستوں کی گراؤ مٹی سے اپنی وہ کھسی سی تھنے مال کی کار با ادھر ادھر گھس کرے۔ سٹوگر سے سیدھی ایک دیہاتی طرز کے بڑے پتھر دار اینٹوں سے تعمیر شدہ قدرے بڑے اور بے بارہ سے مکان کے کونے کے بڑے سے گھٹ کے سامنے جا کے رکھی۔ کار کا دروازہ کھلا اور میں سے اٹل دیانت مگر کی سادہ مگر سے اپنا قیمتی سازشی میں لپٹا ایک سانچے میں ڈھلا سون جیسا ڈال رکھا۔ یہ کوئی تیس چوبیس سال کی لڑکی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ اگر مگر دیکھنے چلتے آتے۔
لوگ اس کو دیکھ کر کچھ کھوں کے لئے ٹھک سے جھٹے تھے۔ قدرے دروازہ قدر سازشی میں لپٹا تھا پر کشش لگ رہا تھا مگر سے بھی نہ ڈالے، کسی بھی آیتاری طرح لہراتے ہوئے سہری رہتی۔ دار پال جو اس سے کھٹے ہوئے تھے۔ اس کے بالوں میں کوئی کپ وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا۔ یہی پرواہ سے کھٹے کھٹے سے تھے اور اُس کے کٹائی چہرے کے گرد احاطہ کے ہوئے تھے۔ اُس کی دودھ جیسی دودھ صاف اور ہلکا ہلکا لی پن جھلک رہا تھا۔ اُس کی کمان دار بھونٹوں کے نیچے چمکتی

ہوئی گہری نیند آنکھیں اور ان پر سایہ گھن سیاہ لاجمی ٹپکیں اس قدر حسین تھیں کہ ان میں ایک جمک جائے لینے والا جس اس نیند جھیل کا قدی بن جاتا تھا۔ اس کی تسخیر سی ٹپکی، جھک واپس بے حد ناک میں سیر کے کیل دیکر رہی تھی اور کیل کے سیرے سے نکلنے والی روشنی اس کے پار سے چر پر اپنا نورانی عکس بکھیر رہی تھی۔ اس کے یا تو فی لہو کے کنارے گہرا سیاہ جل اس قدر ہلکا کر گویا اسے نظر لگ جانے کے ڈر سے قدرت نے یہ سیاہ جل اس کے لہو کے کنارے لگا دیا۔ صراحتی دہر گروں میں ہیروں کا ہڈک سا بیکس دیک کر گروں کی شان پر حار ہوا تھا اس نے بہت سائیک اپ کر رکھا تھا۔ وہ حقیقت میں کسی حور شمس سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ کالج سٹاڈک اور سٹافٹکس جس جو کھا میٹاں اپا تھا۔

”میڈم! آپ اندر تشریف لے جائیں۔ میں یہ کار اضر سائے میں کھڑی کر دیتا ہوں۔“ آواز شہر پر سے اترام سے قاطبہ ہوا۔

”ٹھیک ہے۔“ لڑکی نے سر ہلایا مگر اس کی نگاہیں اس سبز رنگ کے آگنی گیت پر ہی مرکوز تھیں اس نے ساڑھی کا پلے سر پر رکھا اور آہستہ روی سے چلتی ہوئی گیت کی طرف بڑھی۔ اس کے قدم چبے گیت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے اس کی حرکتوں کی رفتار میں اس طرح اضافہ ہوتا رہا تھا۔ کار سے گیت تک کا فاصلہ طے کرنے میں ہی اس کے گلاب جیسے شفاف چہرے پر بڑے بڑے شہم کے تھکروں کی طرح چٹکتے کی تھیں۔ گیت ختم ہوا تھا۔ اس نے ذرا سادہ پاؤ ڈال کر گیت کھول دیا کہ جس میں سے وہ ہوا آسانی اندر جا سکتے۔ لڑکی اندر آئی۔ اس نے دیکھا کہ یہاں صرا اور عورتوں کی قطاریں لگی تھیں۔ وہ اس حمایت بادشاہ سرکار کے آستانے پر موجود تھی۔ بادشاہی عقیدت مندوں سے ان کا آستانہ بھرا ہوا تھا۔ اس کے اندر آنے پر سب کی نظریں اس پر جم گئی تھیں اس میں سے اکثر لوگ اس ہوشیار باچرے کو پچھانتے تھے۔ اور جو نہیں پچھانتے تھے وہ بے چارے لگوں کے لئے اپنی سادہ بدمعاشی بیٹھے تھے۔

لڑکی کو اس وقت کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ وہ جیسے کسی حیرت مگر ہی ہوئی تھی۔ جیسے چٹا تار ہو گئی تھی اس کی نظریں بادشاہی کے اس چھوٹے سے کمرے کی جانب مرکوز تھیں جہاں بادشاہی اس و موجود تھے۔ لڑکی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے کے دروازے کے پاس جا کر دی۔ کمرے دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر چرچاؤ کا دیر لگا ہوا تھا۔ لڑکی نے بھی اپنی سینڈل اتاری اور ایک طرف کر خود کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرہ بے حد سادہ تھا۔ کمرے میں ایک صوفہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے کے فرش کو ڈھک رکھا تھا۔ کمرے میں ایک صوفہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے دیواروں پر چند قرآنی آیات اور احادیث نبوی بھی فرسوں میں آویزاں تھیں۔ چھت پر ایک چنگ ہوا تھا جس کی ہوا گرمی کی شدت کو کسی حد تک کم کر رہی تھی۔ کمرے میں اس وقت عورتوں کا ایک تھا۔ اس وقت وہاں ہر عمر کی اور ہر طبقے کی عورتیں موجود تھیں۔ نین اسیر، درمیانی عمر، عمر رسیدہ اور طبقے کی عورت، امیر، نچلے طبقے کی عورت۔ ان کے لباس اور طیلوں سے ان کے طبقے کا اندازہ

ہوئی گہری نیند آنکھیں اور ان پر سایہ گھن سیاہ لاجمی ٹپکیں اس قدر حسین تھیں کہ ان میں ایک جمک جائے لینے والا جس اس نیند جھیل کا قدی بن جاتا تھا۔ اس کی تسخیر سی ٹپکی، جھک واپس بے حد ناک میں سیر کے کیل دیکر رہی تھی اور کیل کے سیرے سے نکلنے والی روشنی اس کے پار سے چر پر اپنا نورانی عکس بکھیر رہی تھی۔ اس کے یا تو فی لہو کے کنارے گہرا سیاہ جل اس قدر ہلکا کر گویا اسے نظر لگ جانے کے ڈر سے قدرت نے یہ سیاہ جل اس کے لہو کے کنارے لگا دیا۔ صراحتی دہر گروں میں ہیروں کا ہڈک سا بیکس دیک کر گروں کی شان پر حار ہوا تھا اس نے بہت سائیک اپ کر رکھا تھا۔ وہ حقیقت میں کسی حور شمس سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ کالج سٹاڈک اور سٹافٹکس جس جو کھا میٹاں اپا تھا۔

”میڈم! آپ اندر تشریف لے جائیں۔ میں یہ کار اضر سائے میں کھڑی کر دیتا ہوں۔“ آواز شہر پر سے اترام سے قاطبہ ہوا۔

[illegible]

ان کے آستانے میں مردوں اور عورتوں کے لئے مخصوص تھے۔ یہاں، منظر، بجہ کے دولہ
صرف خواہنیں سے ملنے تھے۔ ان کے مسائل سننے تھے۔ بڑے شہزادہ اسباب آیت قرآنی و احادیث
کی روشنی میں ان کے مسائل کے حل بتاتے تھے۔ اس کے بعد وہ آدھے گھنٹے کا ٹیگور دیتے تھے۔
دوسری میں وہ کسی بھی موضوع کو منتخب کر لیتے تھے۔ فیض مرتبہ لکھ کر ایک ہی موضوع پر تینوں
دوس دیتے تھے اور صرف دوس ہی نہیں دیتے تھے بلکہ لوگوں کے سوالوں کے جوابات بھی دے کر
کے زبانوں سے ٹک کر یہی کھولتے تھے۔ ہجرت، ہفتہ اور اتوار مردوں کے لئے مخصوص کردہ
تھے۔ ان دنوں وہ صرف مردوں سے ملاقات کرتے۔ ان کے مسائل کا حل نکالتے۔ دوس دے
جو کہ وہ کسی سے نہیں لیتے تھے۔ اس ایک دن کاتبوں نے صرف اور صرف عبادت کے لئے مخصوص
دیا تھا۔ اس روز صرف عصر اور مغرب کے درمیان ہی لوگ انہیں دیکھ پاتے تھے۔ وہ بھی اس لئے
عصر اور مغرب کے درمیان درود پاک کا بہت بڑا ختم شریف کروایا جاتا تھا۔ ان کے آستانے پر ہر
سبادہ میں بے شمار مرد حضرات اور خواہنیں شرکت کرتی تھیں۔ ختم سبادہ کے مراد اور زمانہ الگ
حصوں میں منعقد کروایا جاتا تھا۔ زمانہ جسے میں عبادت بادشاہ کی گھر کی خواہنیں اس ختم سبادہ
سرہستی کا کرتی تھیں۔ جبکہ مراد جسے میں مردوں کی سرہستی عبادت بادشاہ خود کرتے تھے۔ ان
درود پاک کی اس محفل کو کھانے پر بلاتے اور پھر قشاک لوگ وہاں آتے تھے۔ وہاں شانہ پہ شانہ
افراد میں اس وقت نہ کوئی بڑا ہوتا تھا نہ کوئی چھوٹا۔ نہ کوئی امیر ہوتا تھا اور نہ ہی غریب۔ سید
حضور انور رحمہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نورانی محفل میں سب برابر ہو جاتے تھے۔ عبادت بادشاہ کے
میں کسی کے لئے کوئی تخصیص نہ تھی۔ وہ سب لوگ ایک ہی نکل سے دیکھتے تھے۔

آج کا موضوع "لباس" تھا۔ وہ "لباس" پر درس دے رہے تھے۔ مختلف قرآنی آیات

”ہمارا دین، دین اسلام ہے حد پیارا دین ہے۔ ایک جامع ترین دین۔ ہمارے مذہب ہمارے رب نے پروہشے کچھ چھوڑ دی ہے جو اسے مثلاً، عملی اور روحانی طور پر مکمل ترین بنا دیتی۔ لباس کے بارے میں بھی ہمارے مذہب میں ہدایات دی گئی ہیں۔ ہمارا دین حیا کا دیار، پاکیزہ دین ہے۔..... شرم و حیا کی تعلیم دینے کا دین ہے۔ لہذا ہمارے دین میں لباس کو بھی بہت اہم دیتے ہوئے اس کے بارے میں کچھ احکامات دے دیئے گئے ہیں۔ یہ مسلمان ہیں اور کچھ مسلمان ہمیں اپنے لباس کے اور اسے پہننے سے بھی یہ ضرور ظاہر کرنا چاہئے۔ لباس ایسا پینجر

ان کو دیکھتے۔ جس میں ستر پوشی ہو۔ جسم میاں نہ ہو بلکہ ڈھکا چھپا رہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی لباس کی پاکیزگی اور ستر پوشی پر زور دیا ہے۔ آپؐ کو بھی اچھا لباس تنہا مبارک پر کھاتے تھے۔ اچھے لباس سے مراد بہت قیمتی، بہت مہنگا لباس ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اچھے لباس سے مراد صاف، تمیزا

اس کے بعد انہوں نے چند احادیث مبارکہ لباس سے متعلق سنائیں۔

”اچھے لباس سے کیا مراد لی جائے سرکار؟..... اور عورتوں کے لباس کے حلقے میں کیا احکامات ہیں؟“ خواتین کے مجمع میں سے ایک نے سوال کیا۔

”خواتین کا لباس ایسا ہونا چاہئے کہ کسی نامحرم یا کسی مرد کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں بھی تو اس لباس کی وجہ سے وہ اس خاتون کے جسمانی خدو خال کا اعزاز نہ لگ سکے۔ عورتوں کو تو ویسے بھی اپنی زخموں کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

لوہی کی نگاہیں بے اختیار اپنے لباس کی سمت اٹھیں۔ اس کی ساڑھی میں اس کا سانچے میں ڈھلا بسم بہت نمایاں ہو رہا تھا۔

”لباس ہماری تہذیب و تمدن کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ ہمیں اس چیز سے ہمارے میں بہت زیادہ ماس ہونے کی ضرورت ہے۔“ حمایت بادشاہ کہہ رہے تھے۔ ”لباس جس قدر سادہ ہوگا، آپ لوگ دینی مشکلات سے بچیں گی۔ وہ اس طرح کہ سادہ لباس، دیکھ کر چھپی ہوئی پاک سے مردوں کی نگاہ آپ پر نہیں پڑے گی۔ ہر مرد کی نگاہ پاک صاف نہیں ہوتی۔ بلکہ نگاہ جانے کے آپ خواتین کی مردکی نگاہوں میں ”شیطانیت“ سونے کی کندھار ہیں۔ جن میں کھنکھاتی ہیں، بے پردہ، فیشن میں ڈوبی۔ پھر کب تک اور کہاں تک کوئی اپنے فیشن پر قابو رکھ سکے گا؟ سوچنے کی بات ہے۔“ وہ خنجر چلا رہے تھے۔ جی جی کسی فنر سے کم تو نہیں ہوتا۔ ساری خواتین جو کچھ پر قبل اس سماجی والی لڑکی کی نصیحت کر رہی تھیں، اس کے لباس کو خنجر و دھڑ سے دیکھ رہی تھیں، اس وقت حمایت بادشاہ کی باتیں اس کو اتنیے نکھاری تھیں۔ ان میں سے اکثر عورتوں نے جدید فیشن کے مطابق طے لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ بہت فٹ۔ جن میں اس عورتوں کی جسم، ان کے گلہ بہت نمایاں تھے۔ کسی نے ڈھکی آستین پہن رکھی تھی تو کسی کی آستین ہی عاقبت صاف تھی۔ کسی کے گھڑاؤڑھاتے تھک تھے کہ ان کی رانیں اور پنڈلیاں بالکل اسی طرح تو کسی کی نظارہ کے بانچے لگاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ عورتوں کی آشوری طور پر ادا ہونے دوئے پھیلا کر دیکھ کر یہ تھک تھک حمایت بادشاہ کی نظر اس میں سے کسی کی طرف بھی نہیں اٹھی تھیں۔ وہ تو اسے ہی حال میں مت تھے۔ ابی با جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”عورتیں اگر خود جا ہیں تو اپنے لباس کے ذریعے خود کا ہوا دور اور محترم بنا سکتی ہیں۔ اگر کیا ہیں تو اسی لباس کو وہ اپنے لئے ڈھال بنا سکتی ہیں۔ ایسی ڈھال کہ جو شیطان غفلتوں سے ان کی حفاظت کر سکے۔ ہمارے مسلمان آج مغرب اور غیر مسلموں کی امنی حقیقت میں اپنی ”اصل“ کو کبھی بہت دور پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ مغرب نے فیشن کے نام پر بے حیائی کو رواج دیا اور اسے ہر مسلمانوں نے

بڑے آرام سے اپنا لہکے یہ "فیض" ہے۔ "فیض" جو کہ دور حاضر کے "اہم تقاضوں" میں شمار ہو ہے۔ وہ بھر کے۔

"تو سرکار! کیا فیض کرنا جائز نہیں ہے؟ حالانکہ فیض تو مرد حضرات بھی کرتے ہیں اور کچھ عورتوں سے بھی زیادہ ہی کرتے ہیں۔ ایک جوان لڑکی نے جیسے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اس انداز اور سوال پر بھی عورتوں نے اسے گھورا۔ ان کے نزدیک اس لڑکی کا لہجہ گستاخانہ تھا مگر مہاراجہ بادشاہ نے اس کے لہجے کا بالکل بھی پرانا نہ مانا تھا۔

"بی بی! تم غلط نہیں کہتی۔ یہ فیض کی بیماری تو ہمارے مردوں کو بھی لافن ہو گئی ہے۔ اور شک وہ بھی اس طرح کے لباس کو اپنا لینے ہیں جن میں ستر پوشی سرے سے نظر ہی نہیں آتی۔ وہ جہاں جہاں کہہ کر مرد ہیں اور اگر ہم بغیر کپڑوں کے بھی گھومیں پھریں گے تو ہمیں آزادی ہے۔ ہمیں کوئی کام نہیں۔ کیونکہ ہم مرد ہیں۔ مگر مردوں کو بھی اپنے لباس میں احتیاط کرنی چاہئے۔ یہ جو آدمی آؤ پڑ لیاں لنگی لے کر گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کا اشارہ شائش اور ہاف پیش کش کی طرف تھا۔ "ہو یا؟" جائز نہیں ہے۔ ہمارے پیارے جینرل جیمز صعلقی مسلمی اٹلہ علیہ وسلم جو لباس زیب تن فرماتے تھے وہاں ہوتا تھا کہ ان کی گردن تک دھکی ہوئی تھیں۔ صرف ہاتھ، بیک اور نچلے نظر آتے تھے۔ باقی رہا سوا کہ کیا فیض کرنا جائز نہیں ہے؟ تو فیض اگر پیوہ اور نیم مریاں پہناوے کی شکل اختیار کر لے تو وہ یہ جائز نہیں۔ ہمارا دین ہمیں شرم و حیا کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ اس میں نہایت ہے۔ آسانی ہے۔ بچا، حفظ ہے۔ شرم و حیا چاہے پہناوے میں ہو، انگوٹھوں میں یا سونچ میں، اس کا اثر بہت دیر پا، بہت کم ہوتا ہے۔ میری آپ سب بیبیوں سے درخواست ہے کہ خدا ارادہ اپنے لباس پر تو چکریں۔ سادگی کو! شعار بنائیں۔ ایسے لباس پہنیں کہ جن سے دیکھنے والوں کی نظریں بے اختیار احترام سے جھک جائیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر جب من میں رب العزت اور اس کے پیارے حبیب پاک مسلمی اٹلہ علیہ وسلم کا عشق ہوتا ہو تو پھر سب مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ پہلا قدم اٹھ جائے تو باقی کا راستہ مشکل نہیں رہتا۔"

اس کے بعد انہوں نے چند احادیث و قرآنی آیات سنائیں اور محفل سمیٹی۔ ان کا گھاٹلک ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے پاس کھڑے اس قبائلی خدمت گار کو پانی لانے کا کہا۔ وہ جو ابھی تک خاموش نظر میں بھٹکا کھڑا تھا فوراً پانی لانے چلا گیا۔ کچھ خواتین اب اس سے اجازت مانگ رہی تھیں اور سلام کر کے چلت رہی تھیں۔ وہ ان کے سلام کا جواب نہ دیتے رہے۔ اتنے میں خدمت گار ایک مٹی کے کنوڑے میں پانی لے آیا۔ تاحیات بادشاہ نے پانی کا کنوڑا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور لوگوں سے لگا لیا۔ انہوں نے پانی پینے کے بعد کنوڑا خدمت گار کے حوالے کر دیا۔ خدمت گار نے کنوڑا لے لیا اور بنجا ہوا پانی گرانے کے واسطے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ لڑکی جو دروازے کے پاس ہی کونے میں بیٹھی تھی، حکم اس نے بے چین ہو کر خدمت گار کی طرف دیکھا اور پھر پانی کے کنوڑے کو دیکھ کر ایک دم سے بول پڑی۔

"سنئے..... ذرا رکئے۔" لڑکی نے خدمت گار کو پکارا تھا۔ اس کی آواز اتنی سچی تھی، اتنی مٹھی جیسے کہ کسی کی ڈھیروں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ خدمت گار نے چمک کر اسے دیکھا۔

"کی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔

"یہ..... اس پانی کا کیا کریں گے آپ؟" اس کا اشارہ کنوڑے کے پینے ہوئے پانی کی طرف تھا۔

"پینیک دوں گا۔" خدمت گار قہر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ شاید اس کا سوال عجیب لگا تھا۔

"یہ مقدس پانی پینیک دیں گے؟" لڑکی زرب بڑ بولی۔ "مجھے دے دیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر کنوڑا مانگا۔ خدمت گار پھر حیران ہوا مگر اس نے پانی اسے دے دیا۔ لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے کنوڑا تمام لیا اور ایک ہی سانس میں پانی چڑھا مگر اور خالی کنوڑا اسے دے دیا۔

"یہ پانی پیچھے کے لئے نہیں تھا۔" وہ عجیب سے انداز میں بولی۔ خدمت گار حیران حیران سا، چپ چاپ کنوڑا لے کر آگے بڑھ گیا۔

رنگ آہستہ آہستہ گھٹنا چلا جا رہا تھا۔ عورتیں اپنی اپنی باری آنے کے بعد کیے بعد دیگرے آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ مگر وہ لڑکی یوں بیٹھی رہی۔ وہ پھر سے مصر ہو گئی تھی۔ لوگوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے دو تین رہ گئی تھی۔ اور پھر جب آخری عورت بھی چلی گئی تب تاحیات بادشاہ سرکار نے اس لڑکی کو دیکھا وہ اب ان سے چند بائٹ کے فاصلے پر ہی بیٹھی تھی۔ وہ کی گھنٹوں سے مسلسل وہاں بیٹھی تھی مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر مسکن کے معمولی سے آثار بھی نہ تھے۔ وہ بڑی شائش بٹاش نظر آ رہی تھی۔

"یہ بی بی وہ پھر سے یہاں بیٹھی ہیں۔" ان کے خدمت گار نے انہیں بتایا۔ "کیا حاجت ہے چہری؟..... کیوں گھنٹوں سے یہاں ہے؟" ان کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ آواز میں نرمی کا عنصر دیکھ دینا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی خاص کشش تھی کہ وہ ایک لمبی لمبی ان کی طرف دیکھ نہ پائی۔ یوں تو وہ گھنٹوں سے ان کے چہرے کو کتنی چلی آئی تھی مگر ان کے دروہان کے چہرے کو نہ دیکھ پاری تھی۔ اس کی آنکھیں خود بخود جھکی چلی گئیں۔

"کچھ کام نہیں۔ کچھ حاجت نہیں ہے۔ میرے پاس پکارا۔" بوجھ ایسا سا انداز تھا کہ بے حد مہر آواز۔ "تو پھر کیوں آجاتی ہے روز یہاں؟" وہ اپنے مخصوص رنگ انداز میں پوچھنے لگے۔

"نہیں۔ صرف آپ کو دیکھنے آئی ہوں میرے سرکار! صرف آپ کا دیدار کرنے آئی ہوں۔ آپ سامنے ہوتے ہیں۔ آپ کو کتنے کتنے آنکھیں سیر نہیں ہوتیں۔" عجیب سی بے بسی تھی لہجے میں مگر آنکھیں ابھی بھی ہوئی تھیں۔

"جانی لیا جا..... یہاں تیرا کیا کام؟..... یہ فقیروں کا در ہے۔ تو گھلوں کی باسی ہے۔ ہم ناک کا اوڑھنا چھوڑ کر دے والوں کو گھلوں کے ٹکڑے سے کیا کام؟" وہ بے نیازی سے بولے۔

"صرف..... صرف ایک بار مجھ پر نظر کیجئے۔" اس نے بے ساختہ ان کے قدموں کو چھوا لیا۔
 "ہٹ..... جیساں سے....." انہوں نے ہٹنے کی کئی سہرت کے ساتھ اپنے قدم پیچھے ہٹے۔
 "یوں مت کیجئے..... میں تو بس آپ کے فضلے سے سامنے میں رہتا چاہتی ہوں۔" وہ نرم سے بولی۔
 "گھر جا..... کیوں فقیر کی جمپوزی میں مٹی آتی ہے؟..... کتنا سکھایا ہے تجھے۔"
 کھڑے ہو گئے۔
 "آگ دید کی تڑپ کھینچ لاتی ہے۔" وہ اس بار مت کر کے ان کی جانب دیکھ پائی تھی۔ وہ سروقہ کھڑے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو بہت چھوڑا محسوس کیا۔
 "شوہر والی ہے۔ ایسی باتیں تجھے زیب نہیں دیتیں۔" انہوں نے سکھایا۔
 "وہ کیوں دلیل نہیں سنتا۔ کوئی رشتہ نہیں مانتا۔ میری آنکھوں کے سامنے سدا آپ رہ جے ہیں۔
 میں کیا کروں؟..... میرا شوہر مجھے نظری نہیں آتا تو میں کیا کروں؟..... میرے ساتھ ساتھ اٹھ بیٹھے، چلتے پھرتے، سو سوتے، کھاتے پیتے اگر کوئی رہتا ہے تو وہ میں آپ ہیں..... میں کہہ کروں؟..... اس کی ٹیلی جھیلوں میں پانی بھر لے گا تھا۔
 "ہماری نماز کا وقت ہوا چاہا ہے۔" اس کی بات کے جواب میں یہ جملہ سن کر اس نے کمری سانس لی۔

وہ آہستہ آہستہ آگے چلے گئے تھے اور وہ بس یونہی بیٹھی ان کو گردن موڑے جاتا دیکھ رہی تھی۔ نیلی جھیلیں پانیوں سے گہرے تھیں اور لب خاموش..... مگر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ اٹھی تھی اور بولے بولے پلٹتی ہوئی گھٹ سے گھر پلنگ گئی تھی۔ اس کا ذرا تیرا اس کا خنجر تھا۔ اس کو دیکھ کر فوراً پھیلا اور اڑھ کھولا۔ وہ اندر بیٹھ گئی اور کار کی پشت سے سر نکال دیا۔ مگر آنکھیں ملکی گئیں۔ نیلی جھیلیں ابھی تک پانی سے بھری ہوئی تھیں۔



اگلے روز وہ بہت مصروف تھا۔ رؤف علی خان نے لندن سے اس فون کر کے دایات دی تھیں کہ وہ آج آفس ضرور جائے۔ ان کے کچھ خاص مہمان جاپان سے آنے والے تھے جنہیں تیور نے ہی ریسو کرنا تھا۔ باپ کی سخت دایات پر ادا دل خواستہ اسے جانا تھا۔
 صبح اس بجے وہ آفس چلا گیا تھا جہاں رؤف علی خان کے شیجر مرزا ایک اس کے خنجر تھے۔ تیور باتا تھکی سے آفس نہیں جاتا تھا۔ باپ کی فیرو موجودگی میں تو کبھی کبھی چلا جاتا تھا مگر جب رؤف علی خان شہم میں موجود ہوتے جب تو وہ ان کے بار بار کے اصرار کے باوجود دفتر میں ہما ٹکا بھی نہ تھا۔ اس کا دل آفس میں لٹکا ہی نہ تھا۔ اس لئے باپ کے بار بار بلانے پر بھی آفس نہ جاتا تھا۔
 اب رؤف علی خان جھیلے دو ماہ سے لندن گئے تھے تو کبھی اکا دکا مگر تیور بھی آفس میں جھانک آتا تھا۔ آج کی میننگ بڑھس کے حوالے سے بہت اہم تھی سو اس لئے رؤف علی خان نے تیور کو

اس جانے کی تاکید کی تھی۔ وہاں سے وہ اپنے فیکل کائٹس سے میننگ کرنے کے بعد ڈھانکی بچے مارا ہوا تھا اس کے بعد وہ انہیں لے کر ایک ایٹھ ہوئی چلا گیا تھا جہاں انہوں نے بڑے مختلف قسم کا کچا کیا تھا۔ پھر اپنے مہمانوں کو ان کے اس ہوٹل تک اس نے چھوڑا تھا جہاں وہ میٹم تھے اور اس کے بعد وہ مل اور جیکری کے سروے کے لئے چلا گیا تھا۔ پورے دن کی مصروفیت نے اسے تھکا دیا تھا۔
 شام گہری ہوئی تو اس نے گھر میں قدم رکھا اور پھر کھانے کے بعد تازہ دم ہو کر وہ کلب کی طرف اٹھ گیا تھا۔ جس وقت وہ کلب پہنچا تھا اس وقت کلب میں زندگی اپنے عروج پر تھی۔ مردوں اور عورتوں کا ایک جگمگ تھا۔ بے باک قہقیرے فضا میں گونج رہے تھے۔ مختلف قسم کی خوشبوؤں نے مائل کو مائل بنا کر رکھا تھا۔ کلب کے بے حد آزاد اور بے باک فضا میں کوئی نیا جن نہ تھا۔ تیور "ہاں" سائیڈ کی طرف مڑا تھا۔ وہ درجہ اولک اسٹول پر بیٹھا کرسی کے گھاس میں سے گھومت گھومت کرو سیال ماہ اپنے بعد سے میں انمار ہوا تھا کہ "بیوٹی" کی آواز پر گردن موڑ کر بائیں جانب دیکھنے لگا۔
 "پرس تیور مل خان! آپ تو میرے کا چاند ہو گئے۔ کھر ہیں، بھئی؟" درمیانے قد کا ایک قدرے فربہ سرواٹا ایک خوش فہم آدمی اس سے بے تکلفی سے مخاطب تھا۔ آدمی کی عمر چالیس بیٹھاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ تیور کے برابر والے خالی اسٹول پر بیٹھ گیا اور ویٹر کو ڈرک بنانے کا اشارہ کیا۔
 "اوہ، زیدی کی صاحب! کیسے ہیں بھئی؟" تیور نے خوش دلی سے ان سے مصافحہ کیا۔
 "ہماری چھوڑے جناب! آپ اپنی سٹایجے پورے دو ماہ بعد صورت دیکھی ہے آپ کی۔"
 زیدی کی صاحب نے گھرو کیا۔

"ہم تو روز ہی کلب آتے ہیں زیدی کی صاحب! آپ بھی آ جایا کریں تو ملاقات میں ناخدا ہی نہ ہو۔" وہ مسکرایا۔ "آپ کو تو معلوم ہے ہماری مصروفیات کے بارے میں۔ کام ہی ہمارا کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کہوں کلب کی فحش دیکھنے بغیر گزار جاتے ہیں۔" انہوں نے غور پیش کیا۔

"....." ویٹر نے گھاس زیدی کی صاحب کی طرف بڑھایا۔
 "جھینکس۔" انہوں نے مسکرا کر گھاس لے لیا۔ پھر تیور کو کھانسی کر کے کہنے لگے۔ "تمہاری پہلی ہانگ نے تو فیشن اور میڈیا کی دنیا میں تھک چا دیا تھا۔ جب سے "وی فیشن" کے روز بھیجے تمہاری تصویر بھیجی ہے میرے دفتر، مگر کے فون اور موہاٹوں پر قیمتی ٹوٹ پڑی ہے۔ بڑی ڈیماٹ بڑھ گئی ہے تیور مل خان کی۔ میرے پیچھے پڑے ہیں سب کمرش تم سے ان کو ملوان۔" پھر کیا ارادہ ہے یس؟"
 زیدی کی صاحب نے گھاس لیوں سے لگاتے لگاتے پوچھا۔
 تیور ہلکے سے ہنس پڑا۔ "زیدی کی صاحب! وہ تو آپ نے زیدی ہی مجھ سے ایک ماہ ڈالک کروالی تھی۔ بس کافی ہے۔ اب اور نہیں۔" اس نے زیدی سے منع کر دیا۔
 زیدی کی صاحب اس کے اچھے جاننے والوں میں سے تھے اور انہیں صاف انکار کرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔
 "مگر کیوں؟ اس میں مضائقہ تو کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

”ہی!..... مجھے اندازہ نہیں ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”اپنے سوچے بار بار نہیں آتے اور نہ ہر کسی کو ملنے ہیں۔ پھر تمہارے پاس قدرت کی عطا کردہ خوبصورتی ہے..... جسم ہے..... آواز ہے..... دولت مند تو پہلے سے ہی ہو، اس طرح تم شہرت یافتہ بھی ہو جاؤ گے۔ تم میں ٹینٹ ہے، گر جے منتر ہے۔ تم تو اپنے ایک پروگرام کی بدولت اسے مشہور ہو گئے ہو۔ خود سوچو کہ جب باقاعدہ جرائن کرو گے تب تمہاری شہرت کا کراف کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا؟“ وہ برابر اسے قائل کرنے کی سعی کر رہے تھے۔

تجربہ دار نے اس بار قدرے سگرا کر ان کو دیکھا۔ ”زیڈی صاحب! اچھے سے یہ سب نہیں ہوا پائے گا۔“ اس نے کیسے نہیں ہوا پائے گا جیک میں اتنا ٹینٹ ہے کہ تم کو زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔“ وہ بھلا کہاں اس کی جان آسانی سے چھوڑنے والے تھے۔ ”ایشیا کا بہت بڑا ٹارگٹ شو ہونے والا ہے آئندہ ماہ کے بعد۔ اپنے ڈریس ڈیزائنر ”ریزی“ ہیں نا..... وہی اس شو کے کرتا دھرتا ہوں گے۔ انہوں نے تو میرا اٹھنا بیٹھنا سونا چاندی حرام کر رکھا ہے۔ بس ایک ہی شخص ہے کہ تجور کی خان سے کالینکٹ کرادیں۔ میں اپنے شو میں تجور کو ڈال بنا چاہتا ہوں۔ یقین چاہو اس آدی نے حقیقتاً میری زندگی ابھر کر رکھی ہے تم سے ملنے کو کجکت آدھی آدھی رات کو فون کرتا بھاتا ہے اور نیکوٹ کرتا ہے۔“ وہ چپٹے لگے۔ ”تمہاری تو آتی ڈیماڑ ہے کہ ابھی ابتدا میں یہ حال ہے تو خود سوچو آگے کیا ہو گا؟ اور کل تو وہ بندھ جے ایک فاسٹ ٹیکل سے لے کر ڈرنک میرے سر پر سوار رہا اور بالآخر مجھ سے یہ وعدہ لے کر ہی دم لیا کہ میں تم سے بات کروں اور تم کو ڈال ٹارگٹ کے لئے راضی بھی کروں۔ اسی لئے تو اپنی ساری مصروفیات ایک پٹارے میں بند کر کے مجھے تمہارے پاس آنا پڑا۔“ وہ بھندے تھے۔ مگر ان کے اصرار میں اس قدر شفقت آمیز عجزت تھی کہ تجور لاکھ چاہنے کے باوجود بھی ان کو کٹھن اس مرتبہ نہیں کر پایا تھا۔

”زیڈی صاحب! آپ اسے اسٹے طمس والے بندے ہیں کہ اب آپ کو پار پار اٹار کرنا مجھے خود برا لگ رہا ہے۔“ بالآخر اسے پار ہانی پڑی۔

”اتنی ہم تو خود آپ کے عشق میں ڈوب چکے ہیں تجور کی خان صاحب! لیے چڑھے بینک بینٹس والے تو ہم نے بھی بہت دیکھے ہیں مگر آپ جیسا اتفاق کم کم ہی نظر آتا ہے امیر زادوں میں۔“ وہ بنا کسی گلی گلی کے کہہ رہے تھے۔

”تو پھر کتنا ہے ریز صاحب؟“ اس نے مضامندی دے دی۔

”آپ کل میرے گھر کھڑے آئے گا، شام چار بجے۔ پھر ہم پبلکس کے ریز کے پوینک۔ وہ اس وقت ادھر ہی ہو گا۔“ زیڈی صاحب نے پروگرام ڈن کر لیا۔

”ٹیک ہے..... مگر میری چھوٹا اٹھ ہوں گی۔“ تجور ہوا۔

”وہ کیا؟“ ”زیڈی صاحب! فکے۔“

”سب سے پہلی شرط یہ کہ میں ریز سے مل کر یہ فیصلہ کر گا کہ وہ اس قابل ہے یا نہیں۔ اگر

سے مزاح کے خلاف بندہ ہوا تو میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔“ تجور نے کہا۔

”ٹیک ہے..... دیکھو میں تمہاری عادت جانتا ہوں۔ اور ریز چھوٹا لڑکا ہے، جسکی تو میں نے تم بات کی ہے وہ نہیں اسے صاف اٹار کر دیتا۔“ زیڈی صاحب اطمینان سے بولے۔

”آپ سناٹے کیسی گز رہی ہے؟“ تجور نے مومنوں بول دیا۔

”ہم اللہ زیڈی کا تعلق شوہر کی دنیا سے تھا۔ وہ شوہر کی دنیا کے مشہور ستارے تھے۔ بہت سارے فن کاروں کا پیچھے تھے۔ خود ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ نے شوہر کے آسمان پر بے شمار ستارے سجائے تھے۔ اور یہ غلط نہ تھا۔ بے شمار ستارے اور ٹینٹوں لوگوں کو انہوں نے حصارف کر لیا تھا۔ ان کا نام شوہر میں بہت احترام سے لیا جاتا تھا۔ اللہ زیڈی کی ملاقات تجور سے ایک قانع افسار ہوئی جس نے اس روز تجور پر ایک بات کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے ”پرل کافی ٹیکل“ کے پول امپریا میں موجود تھا۔ اللہ زیڈی بھی وہاں موجود تھے اور تجور کے دوست کے والد کے دوست کی حیثیت سے شادی میں شریک تھے۔ تجور اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ ایشی ڈانٹ ڈزٹوش میں ملیں کپ شپ لگا تھا جب تجور کے اس دوست نے جس کی شادی تھی، بہت اصرار کر کے اس سے غزل سنانے کی بات کی تھی۔ تجور بھی راضی نہ ہوا۔ مگر کبھی اصرار دہن کی طرف سے بھی تھا۔ اس سے نئی دہن کا کہا۔“ لیا کیا اور وہ کچھ پہچان کر قائم کرنے آگیا۔ اس نے مایک ہاتھ میں لے لیا اور چند لمبے سوچنے کے بعد یہ غزل اس کے کپوں پہنچائی۔

”کبھی سے کنار سے رنجھے، کبھی زنگار سے غلاب دے
جیرا کا اصول ہے زندگی، مجھے کون اس کا جواب دے
جو پچھا سکوں تیرے واسطے، جو سچا سکوں تیرے راستے
میری دھڑکن میں ستارے دکھ، میری مٹھلیں میں نگاہ دے
یہ جو خواہشوں کا پتہ ہے، اسے مومنوں سے غرض نہیں
یہ آڑے گا اپنی ہی مون میں، اسے آپ دے کہ سراب دے
مجھی یوں بھی ہو تیرے رویہ، میں نظر ملا کے یہ کتھ سکوں
میری حسیوں کو شمار کر، میری خواہشوں کا حساب دے“

بے حد خوبصورت، انتہائی دلکش اور عرصہ انگیز آواز، شہد کی طرح زیڈی صاحب کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ وہ مقابلے کا تھیں کہ بھول گئے تھے اور بے ساختہ ان کی نظریں اس کی طرف نہ گئیں۔ ایشی ڈانٹ کمرے میں قیامت ڈزٹوش میں ملیں، ایک سبک سے تیار تجور کی خان پر ان کی طرفیں پڑیں تو گویا وہ بت سے بن گئے۔ مردانہ وہابت اور خوبصورتی کا بہترین شہکار ان کی طرفوں کے سامنے کھڑا تھا۔ اس پر اس کی چادو بھری آواز۔ وہ تو چند گھنٹوں تک تجور کی خان پر سے طرفیں ہی نہ ہٹا سکے تھے۔

پھر غزل ختم ہونے کے بعد جب تالیوں کے شور نے انہیں چونکایا تو وہ جیسے "غائب" سے "حاضر" میں آ گئے۔ انہوں نے اپنی یہ خودی پر بھیجب سے کن انکھیں سے ارگرد دیکھا۔ مگر جب گرد و پاؤں کھڑی ہوئی تو خاموشی اور لڑکیوں کو بھی اس وجہ ان کے حشر میں گرفتار دیکھا تو ان کی بھیجب کچھ کم ہو گئی۔ وہ فوراً دوست سے معذرت کر کے تیسرے طرف تیزی سے بڑھے جو کہ اپنے دوستوں کے ہنسنے میں پھر سے کھڑکا تھا۔ سب اس کی خوب صورت آواز اور غزل کی داد دے رہے تھے اور مغرور سے انداز میں اپنی خصوصیات کے ساتھ ان کے درمیان موجود تھا۔

"ایک کیڑی اکیا میں آپ سے کچھ دیر باتیں کر سکتا ہوں؟" زیدی صاحب نے ان سے پوچھ تو وہ چونک گیا تھا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجئے گا..... میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟" تیمور نے زدی سے کہا اور ساتھ ہی انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہ چہرہ اس کو ہرگز شاسائیں نگ رہا تھا۔

"مجھے فیم اللہ زیدی کی کہتی ہیں۔ میری ایک بہت بڑی ایلو اور رنگ کہتی ہے۔ آپ نے شاید نام سن رکھا ہو۔" انہوں نے کہتی کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں..... کافی مشہور کہتی ہے۔ فرمائیے۔" اسے یاد آ گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس سے کیوں اور کیا بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ جبکہ وہ ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔

"اگر مائنڈ نہ کریں تو بیٹھ کر بات کریں۔" انہوں نے پول کے قریب رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ تیمور نے دوستوں کی طرف دیکھا۔ ان لوگوں نے انکھوں ہی انکھوں میں "ہاں" کہہ دی۔ تیمور نے سر ہلایا۔

"چلے۔" وہ ان کے ساتھ چلا ہوا پول کے نزدیک رکھی کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ میرا تعلق شوہر سے ہے۔" زیدی صاحب نے بات کا آغاز کیا۔ "مجھے اس فیلڈ میں 48 برس ہو چکے ہیں۔ مگر کیا آپ یقین کریں گے کہ میں نے اسے 48 سالہ کی بیز میں آپ سے زیادہ جمنین اور عمل مردان سے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس پر آپ کی آواز۔ خدا کی قسم! میں تو آپ کا دیوانہ ہو گیا ہوں۔ بلکہ میں کہنے صاحب! کہ میں تو آپ کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں۔"

زیدی صاحب کی باتوں پر اسے ہنسی آ گئی۔ "بڑھ چاہے ہیں آپ تو زیدی صاحب!" وہ مسکرایا۔ "قسم لے لیجئے جب....." وہ کہتے کہتے رکے جیسے کچھ یاد آ گیا ہوا تھا۔ "لیجئے، اسے کہتے ہیں غائب و نامی۔ آپ کے جلوں نے تو ہماری یادداشت تک پراثر چھوڑ دیا ہے جی۔ نام تو ہم نے بوجھ ہی نہیں آپ کا۔" وہ بھیجب کر پوچھ گئے۔

"تیمور..... تیمور علی خان۔"

"واہ..... عام کسی کیافت بیٹہ رہا ہے۔" وہ بے اختیار بولے۔ "ہاں تو تیمور صاحب! میں یہ کہہ

ایسا کہ آپ کے خشن اور وجاہت کے ساتھ ساتھ ہم تو آپ کی آواز کے بھی دیوانے ہو گئے ہیں۔ آپ ہماری انہی نظم میں مائل نگ کریں گے؟" انہوں نے حکم آفریدی۔ وہ اس آخر کے لئے وقتی ہو چکا تھا۔ چونکہ کران کی شکل دیکھنے لگا۔

"معذرت کے ساتھ زیدی صاحب! میں دوسری فیلڈ کا بندہ ہوں۔ یہ مائلنگ وائلنگ میرے ان کارڈنگ نہیں۔" وہ انکار کرتے ہوئے بولا۔

"میرا جیو فلیس بتاتے ہیں وہ کوئی ایسی ویسی نہیں ہو جس تیمور علی خان صاحب! آپ میرا کارڈ مس۔" وہ کوٹ کی اندرونی جیب سے اپنا دائرہ لٹال کر کارڈ نکالتے ہوئے بولے۔ "لیجئے۔" انہوں نے کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ تیمور نے جانے کیوں نہ چاہے ہوئے بھی ان کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا۔

"آپ میرے آفس آئیں۔ ہم اطمینان سے کافی بیٹھیں گے اور باتیں کریں گے۔ میں آپ کو اپنا ارا سینٹ اپ دکھاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مایس نہیں ہوں گے۔ ہمارے شوڈ انٹرچینل لیول نہ ہیں تیمور صاحب! سستا اور کھلیا میپار نہیں ہے ہمارا۔ ہم کام کو کتنی کی میں پر کرتے ہیں۔ مجھے آپ جیسے نئے اور فریش چہرے کی ضرورت تھی۔ آج آپ کو دیکھ کر لگا کہ مجھے وہ چہرہ مل گیا ہے۔" وہ اپنی کہیے جا رہے تھے۔ تیمور کو اب بھی سمجھ نہ آ رہی تھی۔ ان کا اصرار اس کے حزانہ پر کراں کر رہا تھا۔

فرخ پوچھ کر ایسی بات تھی ان میں کہ وہ انہیں دو ٹوک "ناں" کہہ کر اٹھ نہیں گیا تھا۔

"فیک ہے..... میں سوچوں گا۔" اس نے ہلا۔

"جیاب! اسرف سوچنا نہیں ہے، ہاں بھی مہربانی ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اٹو..... یہ تو کچھ دھوکا پیچھے ہی پڑ گئے۔" وہ کچھ بھلا سا لگایا۔

"آجماؤ پھر آپ کھل جائیجئے۔" مجھے آپ کے کون کا کشت سے انتظار رہے گا۔ ہائے وا

اے اگر آپ بھی مجھے اپنا کالیکٹ فہرہ دے دیں تو آجماؤ ہو گا۔" انہوں نے بادل خواستہ ان کو اپنا تیلی فونر

دیا پڑا۔ زیدی صاحب شہر سے کسی سے اٹھ کر کمرے ہو گئے۔

"تیمور صاحب! زمانہ دیکھ رکھا ہے ان انکھوں نے۔ آپ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔" وہ ہاتھ جاتے جاتے بھی اس کی تعریف سے باز نہ آئے ان کی تعہد ہو گئی پر تیمور کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے اس حد تک خود پر فریفتہ صرف لڑکیوں کو ہوتا دیکھا تھا۔ آج پہلی بار کسی مرد کو اپنے حشر میں گرفتار ہوتے

دیکھ کر اسے ہنسی آ رہی تھی۔

"کیا کہہ رہے تھے مصوف؟ کون تھے؟" زیدی صاحب کے جانے کے بعد تیمور کے دوستوں

نے اسے گھیر لیا تھا۔ تیمور نے انہیں ساری باتیں غلامی میں بتا دیں جو اس کے اور زیدی صاحب

کے مابین ہوئی تھیں۔

"مگولڈن چائس ہے بیٹا۔" ان کیوں ہاتھ سے جانے دے رہے ہو؟ ایسے مواقع بار بار جنہیں

لئے۔" اس کے ایک دوست نے رنگ بھرے لہجے میں کہا۔

”تم ان کو“ ہاں“ کہہ دو۔“ سو سرے نے بھی مشورہ دیا۔

”دیکھو! گاؤں کا یار! موڑ بن گیا تو حامی بھرنوں گا۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔ پھر موضوع بدل دیا۔

لے تھے۔ انہوں نے ایک دن گزارنے کے بعد اسے فون کر دیا تھا۔ وہ انہیں یوں ان نہ سکا تھا۔ مگر

انہوں نے اپنا تعارف کروایا تو پھر تیمور کو وہ یاد آ گئے اور ان کے ساتھ وہ آفر بھی۔

”وہ صاحب! پھر کب شریف لا رہے ہیں ہمارے آفس؟“ انہوں نے رسمی ٹیکہ ٹیک سے فارغ ہو کر پوچھا۔

تکمل آ

صاحب کی آفر کو رد نہیں کرے گا۔ کم از کم ایک بار کا تجربہ تو ضرور کر کے دیکھے گا۔ اس کی

تھوڑے پر زیدی صاحب کل اچھے تھے۔ انہوں نے تھوڑے وقت بنا دیا۔

مکھا؟ اور جو اس کے باپ کو اور ماں کو یہ پتہ چل گیا کہ وہ ماڈلنگ کر رہا ہے تو ان کا رد عمل کیا ہو

لڑوہ بے چین نہیں تھا۔ خوف زدہ بھی نہیں تھا۔ بس مارل سے انداز میں پیٹ پر گرتے ہوئے سوچتا تھا۔

نفلک کا تجربہ اس کے لئے بہت اچھا رہا تھا۔ شہر کی دکانوں کی دیکھ بھال دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

مردم ہی اس کے لئے شہرت کے پیغام لے آیا تھا۔ تیمور علی خان کی ظاہری شخصیت ایسی تھی کہ وہ

یو، مسن و ٹیلنٹ کی اس دنیا میں ایک ہی پروگرام کے ذریعے خاصی بلندی پر جا پہنچا تھا اور اب

تیئور علی خان! کیا سوچا آپ نے؟“ زیدی صاحب فون پر اس سے رمز والی آفر کر معلقہ۔

 $\frac{d}{dt} \left(\frac{1}{2} m v^2 \right) = -\vec{F} \cdot \vec{v}$

اس بارے میں تو ایسی کچھ سوچائیں ہے۔ "وہ لا پرواہی سے ہوا۔

مال کر رکھا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اے حسن اور اے ٹیلنٹ کو پوری دنیا دیکھے۔ قدرت

لوگوں کو ایسے انعامات سے نوازتی ہے اور قدرت بہت کم لوگوں کو ایسے گولڈن چانس دیتی

اب آپ یہ پاس کی نہ لیں۔ یہ تو صاف صاف ناسکری ہوئی۔ پھر ہمارا دل بھی تو چاہتا

نا ہی چاہئے۔ ”وہ بھرتیور کی قصیدہ گوئی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔

بی بی صاحب! کیا آپ مجھے بڑنگ (Buttring) کر رہے ہیں؟ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

نے جیسے ہوئے جملہ اوصو را حبیب ز دیا۔ اس بار تیر کھٹکھا کر فہر زدا۔

[Faint handwritten notes at the bottom of the page]

”نیک ہے زیدی صاحب! آپ جیتے، ہم ہارے۔“ اس نے مجھے ہار مان لی۔ ”کب ملواریے

”سأفعلها“ آ۔ کہیں کہیں کہیں آ۔ کہیں کہیں کہیں آ۔ کہیں کہیں کہیں آ۔

مٹے ہیں۔ نیک کام میں دہری اچھی نہیں ہوتی۔ میں رمیز کو فون کر دوں گا، اسے انفارم کر دوں گا کہ

نام دونوں اس کی طرف آرہے ہیں۔ کل شام ساڑھے چار بجے۔ ٹھیک ہے نا؟“ زیدی صاحب

“... ”

”تو پھر آپ تیار رہئے گا۔ میں آپ کو یہیں سے پک کر لوں گا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے گھر

.. "وہ دگر نام ڈن کر چکے تھے۔"

”میرا یہی صاحب! میری سرائفہ والی بات یاد ہے؟“ اس نے ان کو یہ دوہائی کرائی۔

اس نہ ہوگا۔" انہوں نے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے۔ پھر کل ملاقات ہوگی۔“ تیمور نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر سوچ میں گم

لہا تھا۔ کبھی کبھار کسی فکشن میں کوئی گیت مانگ لیا بھی گا لیتا تھا۔ اس کی اداکاری اور آواز کا جادو

تھا کہ دیکھنے اور سننے والے اس کے اثر سے بچ نہ سکتے تھے۔ اس نے فی الحال حیدر سے اس آفر کا

لوہیں کیا تھا لیکن وہ رمیز سے ملاقات کرنے کے بعد اسے سب کچھ بتائے گا ارادہ ضرور رکھتا تھا۔



ای سی لڑکی مڑی تھی۔ بیوہ جیٹ اور ریٹ قسم کی بغیر آجیوں کی فی شرٹ پہنے وہ لڑکی بہت سی سال تک رہی تھی۔ اس کے بال باب کٹ تھے اور رنگنی رنگ میں ڈالنی کئے گئے تھے۔ اس نے ہار کز بن رکھے تھے۔ گلے میں موٹی سی سونے کی زنجیر کے علاوہ اس نے اور کوئی چیز نہیں پہنی تھی۔ اس کا چہرہ بچوں جیسی معصومیت اور جاذبی لئے ہوئے تھا۔ اس کی عمر افسانہ سال سے زیادہ تھی۔ وہ نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں تیرور کے لئے شناسائی کی چمک تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ لی طرف آ رہی تھی۔

"دینا! تم کیسی ہو؟" تیرور نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ لڑکی اب قریب آ پہنچی تھی جسے تیرور نے دیکھا تھا۔

"کیسے ہو؟..... یہاں ابھی کیا کر رہے ہو؟" دینا نے پوچھا۔
 "موت تک کرنے آیا تھا۔" تیرور نے اس کے سوال کا جواب بڑی سنجیدگی سے دیا۔
 "اوہ..... تمہاری حس مزاج بھی نا..... دیکھ لکھا کر بیٹھے ہوئے انگریزی میں بولی۔
 "بے گئے سوال کرنے سے باز نہیں آؤ گی۔" تیرور بھی انگریزی میں ہی کہہ رہا تھا۔ "ظاہر ہے، اب تک مال ہے تو شاہک ی کی کروں گا۔ دینے تو یہاں کس کے ساتھ آئی ہو؟" اس نے پوچھا۔
 "فریڈز کے ساتھ آئی ہوں۔ لیکن تم بے تاد کو کہاں قاصد ہو؟..... کتنے دن ہو گئے تم نے مارے مگر قدم بھی نہیں رکھا۔" وہ لکھو کرنے لگی۔
 "اگر میں نہیں آتا تو تمہارے کون سے پاؤں کھس گئے ہیں ہمارے مگر آ آ کر۔" اس نے ترکی

کی کہا۔
 "تیرے مسئلہ ہو رہے تھے۔" دینا نے غور سے دیکھا۔
 "اچھا، ہو گئے قسم؟" تیرور نے پوچھا۔
 "کب کے۔" جمی تو آج یہاں موجود ہوں۔ ورنہ تم تو پتہ ہے کہ ماما بیچر کے دوران کہاں کسی تم کی میاشتی کرنے دیتی ہیں۔ دو دو آٹھانوں کے دوران اتنی سخت ہو جاتی ہیں کہ بس، بالکل پاپا بیسی نہ ہاتی ہیں۔" دینا نے بتا کر بولی۔
 "تو اچھا ہے۔ پورے سال کون سا تم پر چلتی ہو۔ انہیں مجبوراً بیچر کے دوران سختی کرنی پڑتی ہے۔" تیرور نے اسے سمجھایا۔

"میں نہیں..... کسی نے کہہ دیا تم سے کہ پورا سال میں پرستی نہیں ہوں؟ اتنی اچھی تیاری کرتی ہوں میں۔ جمی تو اتنے اچھے کر گئے آتے ہیں۔" اس نے احتجاج کیا۔
 "اچھا، چلو مان لیتے ہیں۔ ویسے امتحان کیسے ہوئے؟" تیرور نے پوچھا۔
 "اے سون دیکھ لیو، میرا رزلٹ کتنا اچھا آئے گا۔ دینا نے ڈوٹی کے ساتھ کہا۔
 "اچھا..... اگر تمہارا تو میری طرف سے خوش کا بھجوا۔" تیرور نے وعدہ کیا۔
 "تمہیک ہے..... تمہیک لکھ کر بھجوانا نہیں تم۔" دینا نے سر ہلادیا۔ "اچھا تم مگر آؤ نا۔ بلکہ کل ہی

شام کچھ گہری ہو رہی تھی۔ آسمان کی نیلا ہٹ پر سیاہی کا غلبہ ہو رہا تھا۔
 وہ سرنگی جیٹ پر سیاہ شرٹ پہنے خوشبو میں مٹا ڈوبا شاہک مال کی پارکنگ میں کار پارک کر رہا تھا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا اور مشہور شاہک مال تھا۔ یہاں زیادہ تر غیر ملکی سامان کی دکانوں میں بیجا ہوا نظر آتا تھا۔ یا پھر وہ مال موجود تھا جو ملک سے باہر بھی بیجا جاتا تھا۔ اس شاہک مال سے خریداری کرنا عام انسان کے لئے صرف ایک خواب تھا۔ کیونکہ اس شاہک مال میں کتنے دالا ایک دو مال بھی سو روپے سے کم کا ہرگز نہ ہوتا تھا۔ اسے کچھ خریداری کرنی تھی اس لئے وہ یہاں آیا تھا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر غور کا رنگ بکھرا ہوا تھا۔ آنکھوں پر "تیرو" کا ٹیٹ قیمت اور بے حد اسٹائلش چہرہ تھا۔

اس نے کار سے نکلنے کے بعد دروازہ بند کیا اور پھر کار لاک کر کے کی چین کو ہانگی پر جھٹکا ہوا کوڑا انگریزی کی گانا بگھٹاتا ہوا آئے۔ یہاں شاہک مال میں داخل ہونے کے بعد اس کا رخ مطلوب دکان کی طرف تھا۔ پورا مال اسے کی شکل میں سرور ہوا تھا۔ یہاں وہاں اس جیسے ہی لڑکے، لڑکیاں نظر آ رہے تھے۔ جیٹ، شرٹ پہنے۔ کچھ لڑکے لڑکیاں عجیب عجیب ٹیلیوں میں تھے۔ گلے میں بکتر ڈالے، رکھائی میں کڑے یا بے سلسٹ پہنے، ہاتھوں کے عجیب عجیب اسٹائل بنائے، بے فکر چائیس، آزادانہ قہقیر، بس اپنی ہی دھن میں مٹھوئے ہوئے۔ یہ ماحول اس کے لئے آتشیں تھا۔

وہ اپنی مطلوبہ خریداری میں مگن تھا کہ اس مال میں اس کی نگاہ کتابوں کی ایک دکان پر پڑی اور اسے وہی کتاب یاد آئی جو پچھلے ہفتے اس نے "عشق" سے خریدی تھی اور ساتھ ہی اس کو خیال آیا کہ وہ اپنی کتاب حیدر کوڑے چکا تھا اور وہی کتاب وہاں خریدنی تھی۔ مگر اسے یاد نہ رہا تھا۔ اب اسے یاد آیا تو اسے حیدر کوڑے کی کتابوں کی دکان میں گھس گیا۔ اس قسم کے شاہک مال میں اردو ٹیکسٹ بک کی نظر آئی ہے۔ مگر بیکریسی وہ انگریزی کی کتابوں میں اس کتاب کو ڈھونڈ رہا۔ پتا نا خواہ اسے چند ہزاروں کے درمیان وہ کتاب بھی نظر آ گئی۔ اس نے فوراً وہ کتاب اٹھالی۔ پھر چند انگریزی ناؤز پر اس نے خرید لئے۔ بل ادا کرنے کے بعد وہ اپنی خریداری کے شاہر ڈھانڈے باہر نکل رہا تھا کہ کسی اسے لکھا۔

"تیرور....."

وہ چونکا۔ اس نے پلٹنے کی بجائے صرف ڈرامی گردن موڑ کر دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر آکا

گھرا آؤ۔ میں سب سے کہہ دوں گی کہ تم آ رہے ہو۔“ دیا نے قرار کیا۔

”میں..... کبلی نہیں، کبلی میں بڑی ہوں۔ اچھا ایسا کرتا ہوں کہ اس فرانیٹے آ جاؤں گا۔“

نے وعدہ کر لیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم بھولنا مت۔ حالانکہ تم سے یہ کہتا ہے کار ہے۔“ دیا اس کی ”دھوہ غلافی“ بخولی پکپاتی تھی۔ ”میں فرانیٹے سے کونوں کر کے یاد دہانی کرادوں گی۔“ اس نے خودی کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں۔“ دیا نے اس نے جان چڑائی آگے بڑھ گیا۔

”دانا..... کون ہے یہ مسٹر یونس؟..... ہوائے فریڈ؟ محرم سے بڑا لگتا ہے۔“ دیا سہیلیاں اس کے چاتے ہی دیا کے گرد اکٹھی ہوئی تھیں۔

”پاکا ہو۔ ہر کسی کو ایک ہی نظر سے دیکھنا پس۔“ دیا نے انہیں گھورا۔

”بھائی تو ہوشیں سکتا۔ کیونکہ سہارے بھائیوں کو کم جاتی ہیں اور پکپاتی ہیں۔“ اس کی آواز ذرا سی سبکی لے کر تھا۔

”بھائی اور ہوائے فریڈ کے علاوہ اور رشتے کیا نہیں ہوتے؟“ دیا نے قدم آگے بڑھا کر سہیلیوں سے بھی اس کی تحقیر کی۔

”بتاؤ دانا، کون ہے یہ آفت حم کا بندہ؟“ وہ بے قرار تھیں اور دیا کو ان کی بے قراری اور جستجو حیرت نہیں ہو رہی تھی بلکہ دھڑلے سے دیکھ رہی تھی اس کی چیز کا۔

”مجھے لگتا ہے کہ اس کو میں نے نہیں دیکھا ہے۔“ دیا کی ایک کھلی نے ذہن پر زور دیا۔

”اچھا..... کہاں؟“ دیا کے سوا کبھی تجسس ہوئی۔ جبکہ دیا اطمینان سے اپنے پر سر میں۔

”جگہ کمال کرکھا نہ لگی۔“ وہ کھلی بے چارگی سے بولی اور باقی ساری لڑکیاں اس کی یادداشت اسے کونے لگیں۔

”تو بتاؤ، کون ہے یہ؟..... کیا لگتا ہے تمہارا؟“ لڑکیاں پھر دیا کے پیچھے پڑ گئیں۔

”اچھا بھئی، بتاتی ہوں۔“ دیا نے آفران کی مشکل آسان کر دی تھی۔

”ارے یہ یاد آگیا۔ اس کی تصویر تو قریب آدھ دو ماہ قبل میں نے ایک فیشن میگ میں دیکھی تھی۔“

ماڈل سے ”اس لڑکی کو یکدم یاد آگیا۔“

”لگتا؟“ سب چوہیں۔ سوائے دیا کے۔ ”لگتا بھی ہے۔ کیا ہائٹ ہے ظالم کی۔“

اشفاق ہے۔ ایسا زبردست بندہ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا۔“ لڑکیاں اس کی شان میں تھپتھپا رہی تھیں۔

”ارے..... وہ دیکھو بار! کیا زبردست اشفاق ہے۔ کیا لکھری بیشن ہے۔ پلو ذرا اس سا والے ہو بیگ میں۔“ دیا نے اچانک دائیں جانب مڑتے ہوئے تقریباً چلا کر کہا۔ سامنے وہ

اب یہ بے حد اشفاق اور خوب صورت ریڈی میڈ لباس ڈھپلے میں اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ ساری اس کی نظریں ایک وقت ادھر گھوم گئیں۔

”واؤ..... واؤ..... چلو دیکھتے ہیں۔“ یوں تھور کا ذکر لباس کی خوب صورتی میں مدغم ہو گیا۔



شام کے گھیرے رات کی تاریکیوں میں مدغم ہو گئے تھے۔

کھنسی سے کونجی تھوڑور بن چکی تھی گھر کے ملازمین نے پوری کوشش کی تھاں روشن کر دی تھیں۔

”بہن کے اس ترتیب وار سلسلے میں یہ کونجی تو رن کر دیک رہی تھی۔ عشاء کا وقت نزدیک تھا جب نورنگ کی سوک گئی تھی۔“

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

پھر دیا نے گیت سے اندر سے باہر نکلی ہوئی اس میں موجود ڈانچور نے پاران بنایا۔

عش و شریعت کا حصول، اس کی تسکیر نہ..... سب کیا ہے؟
کسی کی آواز کی نرئی میں جی کا پلکا سا ہر بھی مثال تھا۔

”سب ہلکے پیچھے بھاگ رہے ہیں..... سب بھاگ رہے ہیں۔“
لوکی نے انھیں بند کر لیں۔ آواز آئی جب بند نہیں ہوئی۔
”دنیا کی آواز نہ گئی کہ اصل“ کی محبت دلوں سے نکل گئی۔“

لوکی نے انھیں کھول دیں۔ وہم آنگھوں سے اس کمرے پر نظر کی دوزخ نے مٹی۔ اس قدر
اور ساجیا کمرہ تھا کمرے، دشت کی ہونے لگی تھی۔ اس کمرے میں ایک ایک چیز کی قیمت ہزار
ڈالرز اور پانچ ڈالر سے شروع ہوتی تھی۔ کمرے کے فرش پر بیٹھے ہیں قیمت خوب صورت قالین
لے کر قد آور کھڑکیوں پر لہلہاتے پر دھول تک، ساڑھ نیچلو پر کچھ نیلے لپ سے لے کر چھوٹوں
دو ادھوں پر آج وہ ان کی لاشیں، ٹیڈنک، ڈریسنگ ٹیبل پر مٹی مٹی سے لے کر جوتوں کے
تک ہر چیز باہر کی تھی۔ ہر چیز کی قیمت تھی۔ ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ مگر اس سے اُسے
سب کچھ کئے کئے کا لگ رہا تھا۔

اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر مٹی سونے کے فریم میں جڑی تصویر کو دیکھا۔ اس تصویر پر نظر پڑے
اس کی بے قراری میں شدت آگئی۔ یہ اس کی شادی والے روز کی تصویر تھی۔ سرخ، بے انتہا
صورت، استغناش اور بیش قیمت لباس میں دلہن بنی اپنے شوہر کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ
انتہائیں لگ رہی تھی۔ اتنی کڑھک نہیں رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی بہت خوب صورت تھا مگر
کے سامنے ہانپ پڑ رہا تھا۔

وہ اٹھی اور اپنے اپنے چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آگئی۔ اس کی نظریں فریم میں جا
تصویر پر پڑ گئی تھیں۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس نے وہ فریم اپنے ہاتھ
میں اٹھا لیا اور اپنے چہرے کے سامنے لے آئی۔ وہ تصویر کو گور سے دیکھنے لگی۔ تصویر میں اس
چہرے پر بے مثال رنگ اطمینان چھایا تھا۔ یا تو قی لہوں پر بے حد مسرور مسکراہٹ تھی۔ آنگھوں
بیروں میں جیسی چمک تھی۔ اسے ایک غمزدہ دیکھنے والا بھی جان جاتا کہ وہ اس تصویر میں کس قدر خوش
آسودہ لگ رہی تھی۔ اس کے جیون ساگی کے لہوں پر بھی کدھی سی مسکراہٹ تھی۔ سب لوگ ان
قریب کر رہے تھے۔

اُسے ابھی طرح یاد تھا کہ اس کی سہیلیوں اور اس کی نزدیک و دور کی کزنز نے اس کی قسمت
کتنے رنگ کا اظہار کیا تھا۔

”تم سے ماہور اتھری قسمت پر تو رنگ آتا ہے۔ بلکہ تم تو ایسے خاصے بننے کا پرگرام بنا
جینی ہو۔“ اس کی بہت قریبی دوست کا بڑا تھا۔

”مجھی بہت خوش قسمت ہے، ماہور! ولید بھائی جیسا لائف پارٹنر جو مل گیا ہے۔ جان دیا
تیار رہے ہیں ہر وقت وہ تو ہماری نور ہے۔“ دوسری کنبلی نے ٹھہرا دیا۔

”کم تو ہماری نور بھی نہیں ہے۔ اس کے خنسن کا مقابلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اور آج تو وہ بے
فانیس کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ تو ذکر بیسی ہیں۔“ اس کی ایک اور کنبلی ہوئی۔
”دو ہے۔“ سب شوق ہو گئی تھیں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ان کی باتوں پر دل میں خود بخود غرور پیدا
رہا تھا۔

”جی جی تو ہے۔ اگر ولید خوب صورت ہیں، دولت مند ہیں، مجھ سے محبت کرتے ہیں تو اس میں
غلط کیا ہے؟ میں بھی تو کم نہیں ہوں۔ خنسن میں میرا مقابلہ کون کی نہیں۔ دولت میرے قدموں کی باندی
ہے۔ میں ہوں ہی چاہے جانے کے قابل۔ پھر ولید مجھ سے محبت کرتے ہیں تو مجب کیا؟ اس نے
سچا تھا۔

”مگر اب؟ اب کیا ہوا؟“ ماہور نے فریم کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے سوچا۔ ”سب دیکھا
ہا ہے۔ ولید آج بھی، شادی کے دو سال بعد بھی مجھے اسی شدت سے چاہتے ہیں۔ دولت آج بھی
میرے قدموں کی باندی ہے۔ میں آج بھی اسی طرح حسین ہوں۔ پھر..... پھر کیا بات ہو
گئی؟“ میں..... میرا دل..... دیکھا کیوں نہیں رہا؟“

اس نے فریم کو دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔
”میرا دل..... ڈو چمک سی گئی..... ٹھک سی گئی۔“
”ہاں، دل..... ساری بات دل ہی کی تو ہے۔ وہ افسردہ ہو گئی۔ دل سے تو بڑا ہوا ہے ہر
رشتہ..... ہر احساس..... وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

آئینہ چلا گیا کہ کمرہ بھاگتا، گواہی دے رہا تھا کہ وہ آج بھی بے انتہا، بے اندازہ حسین ہے۔ اتنی
کہ وہ کہہ مقابلہ خنسن میں حصہ لے تو بغیر کسی سخت و تک دو کے جیت جائے۔ وہ کم کم اپنا عکس
دیکھنے لگی۔ مگر..... یہ کیا.....؟ یہ آئینے میں کس کا عکس تھا؟ وہ گھبرا گئی۔

سیاہ بالوں سے چھائی روشن کشادہ چہرہ، سیاہ مٹی بنوڑوں کے نیچے کنبلی غیر معمولی سیاہ مٹی
آنکھیں ستواں ہاک کے نیچے پھرے پھرے سرخ بوٹ جن پر شیش کی مسکراہٹ تھی۔ سرخی ہاتھ چہرے
پر سیاہ مٹی..... وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اتنی کہ بدحواسی اسے اسٹول سے اٹھ کر چند قدم پیچھے چلی گئی۔

”یہ..... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟“ وہ اپنے چہرے کے اپنے ہاتھ ہٹاتے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آئینے کی
پھر ایک لمحے بعد اس نے اپنے چہرے پر اپنے ہاتھ ہٹاتے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آئینے کی
ست دیکھا۔ وہاں اس کا اپنا عکس تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر بڑی سیست بڑھ گئی۔



ذی صاحب دھوے کے خانے سے پانچ تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر تیمور کے گھر میں اس کے ڈرائنگ
روم میں موجود تھے۔ ملازم نے انہیں وہاں بٹھا کر چائے پانی کا پوچھا۔

”کچھ نہیں، شہر ہے..... بس تیمور صاحب کو جلدی بھجوا دیں۔ ان سے کہیں میں ان کا انتظار کر رہا
ہوں۔“ انہوں نے اپنا کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔ ملازم ڈریسنگ کارڈ لے کر چلا گیا۔

تجور تیار ہو رہا تھا جب ملازم نے اس کے کمرے میں آکر اسے وہ کارڈ دیا اور زیدی صاحب کا بیٹا بھی۔
"انہیں ڈنک وغیرہ پاؤ۔" میں دس منٹ میں آرہا ہوں۔" اس نے حکم دیا۔

ملازم "جی اچھا" کہہ کر باہر نکل گیا۔
دس چندہ منٹ بعد جب تجور تیار ہو کر پہنچا تو زیدی صاحب اس کے مختصر تھے۔ ان کے سائیز ٹیبل پر کولڈ ڈنک کا خالی گلاس رکھا تھا اور وہ کسی سے موہاں پر بات کر رہے تھے۔ اسے آتے دیکھ کر انہوں نے موہاں آف کر دیا اور بڑی گرم جوشی سے اس سے ملے۔

"آپ کو انتظار کرانے کے لئے معذرت۔" مگر میں وقت کا پابند نہیں ہوں۔ آپ جیسا تو فعلی نہیں۔" تجور مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں..... یہ سارے "بڑے اسٹار" والے جراثیم ہیں۔" زیدی صاحب نے مذاق میں کہا۔

"ابھی کہاں ہے بنے ہیں اسٹار؟" وہ مسکرایا۔
"وہ نہیں ہے تجور صاحب اب اس جگہ کی پھڑکی گھمانے کی دیر ہے۔" وہ جرت ہوئے اور وہ نہیں پڑا۔

"کھلیں؟" اس نے پوچھا۔
"پانگل....." زیدی صاحب نے کہا۔ پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پورچ تک آئے۔

"میری گاڑی میں پٹیس کیا آپ کی کار میں؟" اس نے پوچھا۔
"جیسی آپ کی مرضی۔" زیدی صاحب نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا۔

"تو ایسا کرتے ہیں کہ یہاں سے آپ میری کار میں چلیں۔" واپسی پر سیمین سے اپنی کار لے جائے گا۔ اور ہمارے ساتھ ڈرنجی کر لیجئے گا۔" اس نے پوکرام بتایا۔

"ڈرنک واء وہ نہیں کرتا۔" پھر کبھی کسی آج تو ذرا کام ہے۔" انہوں نے معذرت کر لی تو اس نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ اس نے سواری کے لئے مسٹرڈر کا انتخاب کیا تھا۔ کار وہ خود ڈرائیج کر رہا تھا۔

اس نے گیٹ سے کار باہر نکالنے کے بعد زیدی صاحب کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق کار کا رخ اور ضرور لایا۔ راستے میں وہ دونوں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ زیدی صاحب خامے خوش گفتار اور خوش اخلاص انسان تھے۔ تجور کو ان میں جو بات سب سے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ ان کی سادہ طبیعت تھی۔

اسے بڑے آدمی ہونے کے باوجود وہ سادہ مزاج رکھتے تھے اور فصیح و بلیغ سے پاک تھے اور شوہر کی فیڈل کے لحاظ سے تجور کو ان کے مزاج کی یہ خاصیت خاصی حیران کن لگتی تھی جس کا اظہار اس نے کرکھی دیا تھا اور جس کے جواب میں زیدی صاحب صرف ہنس کر چپ ہو گئے تھے۔

آرے سمجھئے کہ بعد تجور کی کار اس بلڈنگ کی پارکنگ میں تھی جس کی ساتویں منزل پر "ڈنک ریجز" ہوٹیک آ رہی تھی۔

"زیدی ریجز کی مین برانچ یہاں ہے۔ باقی دونوں برانچوں میں سے ایک طارق روڈ پر ہے اور

امری کھشن میں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں بھی ریجز کا ایک ہوٹیک ہے۔ لاہور میں بھی ایک ہے اب وہ پشاور میں بھی ایک ہوٹیک بنانے کا سوچ رہا ہے۔ ٹیل، فی میل دونوں کے لئے ڈنک لنگ رہا ہے۔ اس کے اسٹنٹ اس کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ کام کرتی ہے۔" زیدی صاحب ریجز کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات اسے فراہم کر رہے تھے۔

"میرا نامک میں بھی اس کے ڈیزائن بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ بہت آرڈر آتے ہیں باہر۔ اس کے لئے کام ہی اس کی اولین ترجیح ہے۔" زیدی صاحب ذرا سا زکے پھر کہنے لگے۔

"ال! اہم شیئر کر اس کے ساتھ کام کرنا تم کو پسند آئے گا۔" وہ منجھوا دنا بہت اچھا ہے۔"

تجور خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ شاید زیدی صاحب کو دوسروں کی قصیدہ گوئی کا شوق ہے۔ پہلے میری تعریف میں دشمن و آسمان کے مقابلے ملا رہے تھے اور اب ریجز کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ پھر بڑا سا ہوشیار گیا۔

اسی وقت اس کے سیل کی حیرت انگیز بجی۔ اس نے سیل پر دیکھا۔ اسکرین پر "حیدر" کا نام تھا۔ اس نے فون اٹھ کر کے موہاں کان سے لگا لیا۔

"کہاں ہو؟" حیدر نے چھوٹے ہی پوچھا۔
"ڈرا باہر ہوں۔ کوئی کام تھا؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی بے ساتھ آیا کھینچو؟" حیدر نے پھر پوچھا۔
"ہاں..... ایک دوست ہے۔" اس نے جان بوجھ کر فی الحال زیدی صاحب کا تذکرہ نہ کیا تھا۔

"اچھا..... ایک کام کرو، رات کو یہاں آ جاؤ۔ ذرا کھینچ کر لیں گے۔" حیدر نے کہا۔
"یارا پھر کبھی کسی آج....." اس نے بہانہ بنانا چاہا۔

"پھر کبھی" بھی ضرور۔ منوٹ دیگر مگر آج ضرور۔ میں انتظار کروں گا۔" حیدر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور پھر اس کا جواب سننے بغیر فون بند کر دیا۔

تجور نے سیل آف کر کے دست و پاچ پر وقت دیکھا۔ پونے پانچ بج رہے تھے۔ زیدی صاحب نے اس سے کال کے حلقہ پچھو جس پر چھٹا تھا۔ اس نے ابھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔



موسم نے ہنگوا کی تھی۔ گرمی کی شدت نے کم ہونا شروع کر دیا تھا۔ آگ برساتے سورج کی گرمی پر اب بدلے موسم کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا پٹاپٹی، جینوں کو کھسکا، ہیکر کا ڈرائیج دھوپ سے تو چھٹکارا مل گیا۔

وہ بے نیوٹری سے تقریباً ساڑھے تین بجے کچھ آگئی تھی۔ مگر آتے ہی اس کا استقبال کرنے والی خاتون، اس کی ماں کی لالائی مرچیاں تھیں جو اسے دیکھتے ہی کٹ کٹ کرتی ہوئی اس کی جانب چلی

تھیں۔ مگر اس نے ان کو دیکھ کر غصے سے ناک سیکڑی اور ان کو مکمل طور پر "فولٹ" کہہ کر خود ماں کو سلام کرنے لگیں میں چلی گئی۔

”اُم! میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ آج شام نے اپنی تھوڑے کی خوشی میں سب دوستوں کوڑ دی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”میں کپڑے تبدیل کر لوں۔“ وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے بیڑم کی طرف بڑھی۔

”اوسے بھی وہ تھمارے خطوط آئے ہیں۔“ فیروز کو اچانک یاد آیا۔

”خطوط..... اچھا۔“ وہ ٹھنک گئی۔ ”ادیب صاحب نے پیچھے ہوں گے۔“ اس نے استدعا کیا ”ہاں..... ان کے دفتر سے لڑاکا کے دے گیا تھا اور کہا تھا کہ تم ادیب صاحب سے رابا لو۔“ انہوں نے بیچان دیا۔

”اچھا.....“ وہ ہنسی۔ ”خط کہاں ہیں؟ اس نے پوچھا نہیں تھا۔ جانتی تھی کہ اُم نے اس کی رائے نہیں لی تھی۔“

اس نے بیڑم صاف چڑھتے ہوئے اپنا اسٹارف اتارنا شروع کر دیا۔ آج کو چنگ سینٹر کی چمڑی لہڑا ہے وہاں گھائے کی جلدی بھی نہ تھی۔ وہ اہمیتان کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی۔ صوب آکر زنجی مگر مگر کی کاڑ کچھ دھک دیا۔ اس نے کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں اور دروازہ کھلی دیا۔ ساتھ ہی پگھلا بھی لگا دیا۔ دن کے اس حصے میں خوب لائٹ آن کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی وہ اہمیتان سے رائٹنگ ٹیبل کی جانب بڑھی۔ صاف شفاف رائٹنگ ٹیبل پر چند کتابیں ایک طرف بچے کر کے رکھی گئی تھیں۔ چٹن ہولڈر میں قلم کا ہوا تھا۔ بائیں جانب اس کے رائٹنگ پیپر ڈویفر سے رکھے تھے۔ اس کی نظر پیپر وٹ کے پیچھے دسے خطوط کے ڈویفر پر پڑی۔ اس نے اپنا دوش پاشا کر کے پر پھیلا دیا اور جوتوں سے پیچہ آزاد کر کے خطوط کا پلندہ اٹھا کر بیڈ پر آگئی۔ وہ بیڈ پر سکون بیٹھ گئی اور بندھن قانون پر نظر دوڑانے لگی۔ سارے کے سارے خطوط ”کائنات“ کے نام تھے۔ اس ایک لحاظ سے پاک کیا اور سطر اور فقرہ میں دوڑانے لگی۔

”ڈویزر کائنات! اسلام علیکم۔“

خداوند تعالیٰ سے آپ کی کمی عمر اور صحت کی دعا کرتی ہوں کیسی ہیں آپ؟ اور کہاں غائب ہیں؟ پچھلتے دو ماہ سے آپ کا کوئی ہال، کوئی افسانہ، کوئی ناول، کوئی تحریر بھی نظروں سے نہیں گزر رہی۔ ”حیرے عشق چنپا“ کی زبردست کامیابی کے بعد تو آپ سات برسوں میں چھپ گئی ہیں۔ ابھی آپ نو رمانوں کوئی زبردست سا افسانہ یا ناول لکھ ڈالیں۔ ہمیں بہت سے باتیں ہیں۔ آپ کی تحریر واقعی لاجواب ہے۔ خاص طور سے ”حیرے عشق چنپا“ نے تو آپ کے گزشتہ سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ بس اپنے ”فیخیر“ کو زیادہ انتظامت کروائیں۔ اب۔ خدا سے آپ کے لئے دعا کرتی ہوں کہ جو نئی لکھتی رہیں۔ ہمارے لئے۔ ہم سب کے لئے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

نصرت اقبال۔“

اس نے خط ایک طرف رکھ دیا اور دوسرا لٹاف کھولا۔ اس میں بھی اس کے سنے ہال ”حیرے عشق چنپا“ کی تحریف تھی۔ اس کی دوسری تحریروں کی طرح اس کی اس تحریر کو بھی بہت زیادہ سراہا گیا تھا۔ وہ ارادہ خلوٹ کھول کر پڑھتی تھی۔ تقریباً سبھی خطوط میں اس کی تحریروں کی تحریف تھی۔ کچھ میں تحریف نے ساتھ تنقید بھی تھی۔

اس نے تمام خطوط کو پڑھنے کے بعد ترتیب سے سینٹ کیا اور پھر اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل کے پاس آ گئی۔ اس نے جھک کر ٹیبل کی دروازہ کھولی اور اس میں سے لیڈر کی سیاہ خاک نکالی۔ اس نے وہ تمام الخطوط اس خاک میں لگانے کے بعد خاکل بند کر کے دوبارہ میز کی دروازہ پر رکھ دی۔

لکھنا اس کا شوق تھا..... خدا اور ملاحت۔ جب وہ پانچویں جماعت کی طالبہ تھی تب اس نے اپنے سکول میگزین کے لئے ایک کہانی لکھی تھی جس کا عنوان تھا ”بچے جاہلیت کیوں پسند کرتے ہیں؟“ اس کہانی میں اس نے جاہلیت کی پوری ہسٹری بیان کی تھی۔ جاہلیت کب، کیسے اور کس طرح مفر عام ہو گئی؟ اس کی ابتدا کی شکل و صورت اور ذائقہ کیا تھا؟ اس کو شروع میں کس طرح استعمال کیا جاتا تھا؟ بعد ازاں اس کے تغیر اور اشکال کو کون کون سے سانچوں میں ڈھالا گیا؟ اور یہ کس کس چیز کے استعمال میں آتی ہے اور اس کے کیا کیا فائدے اور کیا کیا نقصانات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کی کاس میجر اس کہانی کو پڑھا کہ یہ حد حیران ہوئی تھی۔ پانچویں جماعت کی بچی کی کہانی تو گف ہی نہ رہی تھی۔ انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

”تم نے یہ کہانی کس سے لکھوائی ہے؟“ تو جواب میں اس نے یہ کہہ کر انہیں حیرے حیرت میں ڈال دیا۔

”میں! یہ میں نے خود لکھی ہے۔ کسی سے لکھوائی نہیں ہے۔“ اس کی کس کو اعزاز ہو گیا تھا کہ بچی میں یہ صلاحیت قدرت کی عطا کر دہ ہے۔ انہوں نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔ لٹاف کا انتخاب، جملوں کی روانی وغیرہ سب بہت پر فیکٹ تھے ان کو۔ انہوں نے اسے مزے لکھائے لکھنے کے لئے تاکہ کی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا۔ اس کی لکھی کہانیاں اب سکول میگزین کے علاوہ بچوں کے رمانوں، اخبارات، وغیرہ میں بھی شائع ہونے لگی تھیں۔ نویں جماعت میں پہلی کلاس نے ”کائنات“ کے نام سے باقاعدہ آرٹیکل وغیرہ لکھنے شروع کر دیے تھے۔ وہ آرٹیکل لکھتی اور اخبارات میں بھیجواتی رہتی۔ اسی جماعت میں اس نے باقاعدہ افسانے اور ناول لکھنے شروع کر دیے تھے۔ وہ افسانے اور ناول لکھتی اور مختلف ڈائجسٹوں میں بھیجواتی رہتی۔ اس کی تحریریں یہ حد پسند کی جانے لگیں۔ ادیب کی دنیا میں اس کا نام چائیں تھا۔ اس کی تحریروں میں نئے نئے جتن بھی وسعت میں آتی تھیں، چاندنی جیسی فطرت بھی، سورج کی طرح دلوں کو جھلسا دینے والی گرمی بھی اور تیز سے کی ادنیٰ کی طرح سینے میں کھپ جانے والی چین بھی۔ عشق کی سچائیاں، اس کا کرب، اس کی کہانی بھی اور بے وفائی کے عذاب بھی۔ وہ ہر طرح کے موضوع پر بہت بے باکی اور سفاکی سے لکھتی تھی۔ اس کی تحریریں ”حق“ ہوتی تھیں اور جج

جب بے باک اور سفاک ہو تو ریحون کی جبین بن جاتا ہے۔ اس لئے وہ قریبوں کے ساتھ ساتھ تنہی کا نشانہ بھی بنتی تھی۔

”بھئی بھئی تم حد سے زیادہ سفاک ہو جاتی ہو..... بھئی بچ کے ساتھ کچھ مبالغہ بھی شامل کرو۔ ورنہ مشکل ہو جائے گی۔“ کچھ دوست اسے کہتے۔ مگر وہ ایک کان سے کن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتی۔

”میں صرف اپنے لئے لکھتی ہوں۔ میری تحریریں میرے اندر اُٹھتے جوار ہمارا گو باہر نکالے گا ذریعہ ہیں۔ اگر میں اپنے قلم پر بند باندھ دوں گی تو میرے اندر کی آگ مجھے جلا کر رکھ کر دے گی۔ اگر میری تحریریں پڑنے والوں کو بے لگام کھولے جیسی لگتی ہیں تو ان کی ڈونٹ کیز۔ میں اپنے قلم کو لکھ نہیں ڈال سکتی۔ لکھ جوت تو بڑے آرام سے لیتے ہیں، پھر بچ کیوں نہیں؟..... بچ نہتے ہی ان کے کانوں میں لا داپتے لگتا ہے۔ انھیں جوت کو پڑھنے اور دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں۔ مجھے ان کے سامنے بچ لا کر ان کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولنے میں حذر آتا ہے۔“ اس کے پاس یہی جواب ہوتا تھا۔

نیرہ اس کی اس ”بنیادی“ سے بڑا خدا کھاتی تھیں۔

”ہماری سات ہفتوں میں کوئی ادیب، ادیبہ نہیں گذرے۔ پھر جانے اسے یہ بنیادی کہاں سے لاقب ہو گئی ہے؟..... راتوں کو جاگ جاگ کر بس آنکھیں پھوڑتی رہتی ہے۔ اتنی خوب صورت آنکھیں دی ہیں خدا نے۔ مٹیاں اس کرنے کی ان کا۔“ ام پر ایک کے سامنے دکھڑا رہی۔ وہ پرواہ نہ کرتی۔ البتہ باپ کی بہت سپرد تنگی تھی۔ وہ اس کی تحریروں کو پڑھنے اور سراہتے، داد دیتے۔ اور وہ کہتی۔

”ہا! مجھے صرف تعریف نہیں کا ہے۔ تعریف سے انسان اپنی غامیوں کو نہیں دور کر سکتا۔ مجھے بتائیں کہ ان میں میری کیا کیا لگائیاں ہیں؟ کہاں کہاں میں نے غلطی کی ہے؟ اور مجھے حید کیا چیز امپر دو کرنی کا ہے؟“ وہ بجاے خوش ہونے کے کشتی تو فیر کر جاتیں۔

”عجب لڑکی ہے..... قریبوں سے خوش نہیں ہوتی۔ تنہی کا ہوتی ہے۔ دوسرے جن چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں یہ لڑکی ان چیزوں سے بھاگتی ہے۔“ وہ ایک ایک نقطہ چنچا کر کہتیں۔

”ام! آپ انھیں نہیں سمجھیں گی۔“ وہ بس اتنا ہی کہتی۔

”ہاں..... میری انھیں میری شکل میں نہیں آتیں۔“ وہ کہیں تو وہ بے جا چارگی سے باپ کی طرف دیکھنے لگی جو آنکھوں میں آنسوؤں میں اسے خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے سگڑا دیتے۔

کھینچ لکھنے کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ کالج لیل پڑھنے کے باقاعدہ ناول لکھنے شروع کر دیے تھے مگر فی الحال کتابی شکل میں اس کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس نے خودی ایلیہ کو ایسا کرنے سے منع کر رکھا تھا۔

”کتاب ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں ابھی خود کو اس قابل نہیں سمجھتی۔ کچھ عرصہ میں

بی تحریریں اگر اس قابل ہو جائیں جب آپ ضرور شائع کیجئے گا۔“ وہ نرمی سے ایلیہ طر صاحب کی اگلاست رو کر دیتی۔

پھر ”تیرے عشق نمایا“ کے عنوان سے اس نے رسالے میں ایک ناول بھینچا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ کوئی ادیب اس ناول کو کتابی شکل دینے سے روک نہیں سکے۔ کشف عادل کی اجازت کے بغیر اس نے وہ ناول کتابی شکل میں شائع کر کے اس کی ایک کاپی اور ایک چیک اسے پیش کیا تو وہ عجز ان کی اس کو نہ سمجھی رہ گئی۔

”بھئی پہلے تو مذمت کر میں کہ تمہاری اجازت کے بغیر یہ ناول کتابی شکل میں بھجوا دیا۔“ اسے فہر پر ڈھیروں مبارکباد وصول کرو جو اس ناول کی شہاد کا مہمانی کے لئے تم کو وصول ہوئی ہیں۔ یہ تمہارے لئے کا مہمانی کا پہلا قدم ہے۔ بس اب کوئی سختی ہو اور اپنے قارئین کو خوش کرتی رہو۔“

”مگر یہ چیک؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یہ تو معمولی زائد ہے۔ تمہاری کتاب ہاتھوں ہاتھ بیچے۔ یہ تمہارا حق ہے۔“ انہوں نے ایلیہ کی سگڑاہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اس چیک سے اس کی کافی ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔ مارتھن عادل کی غلبہ خواہ سے گزارہ ہے۔ حد مشکل تھا اور انھیں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مارتھن عادل حق عادل کی کتابی کے چند ہزار برصیہ کی پہلی تاریخ کو لاکھ لکھنے کی تھیلی پر بھر دیتے تھے۔

”اس سے“ جنہوں میں میرے جیسے بھر کا خرچ مجھ سے نہیں چلا۔ سال کے سال صرف پانچ سو روپے پڑھتے ہیں کہ ہر ہفتگی ہر روز پڑھتی ہے۔“ کیسے کروں پورا؟“ وہ ہر بار ایک ہی بات دہرائی تھیں۔

”اللہ خیر کرے گا۔“ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ یہی جملہ ہوتا تھا۔

”ہوں..... اللہ خیر کرے گا۔“ نیرہ بیل کر خوشی پر نقل اتار تھیں۔

مارتھن عادل جانتے تھے ہنگامی کے پڑھنے ہوئے اڈو سے آہستہ آہستہ نیرہ کے صبر کو کھل رہے ہیں۔ ٹھیک ہی تنخواہ میں نیرہ کو ہر طرح کے خرچے پورے کرنے ہوتے تھے۔ گھر کے اخراجات، بجلی، قیس، مانی کے بل، ٹیلی فون کے بل، بچوں کی شینیں، کپڑے، لئے، خوراک، ڈاکٹر، دوائیاں، مہمان داریاں، مین دین ہر چیز انھیں پوری کرنی پڑتی تھی۔ مارتھن عادل کی ایماء عاری میں انھیں اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پھر بھی نیرہ نے چھوٹی چھوٹی کیشیاں ڈال رکھی تھیں جن سے وہ اپنی دونوں لڑکیوں کی شادیوں بھی کر پاتی تھیں اور دوسری ضروریات زندگی بھی فٹا رہی تھیں۔ سولہ ماہ کے عذاب و کشف کی گھر میں رہتی تھیں۔ اس کے لئے رشتے آ رہے تھے۔ مگر مارتھن عادل اتنی جلدی اس کی شادی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ تمام بیع ہو چکی تو ان قرضوں کی ادائیگی کی ضرورت ہو چکی تھی جو دونوں بڑی بیٹیوں کی شادیوں میں انہوں نے اٹھائے تھے۔ دوسرا کشف نے بھی ساف ساف ماں اور باپ سے کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ اس کی شادی کے خواب نہ دیکھیں۔ اس کی زندگی کا مقدمہ شادی رچا کر ایک چار دیواری سے دوسری چار دیواری میں جا کر بہت ناگھنا اور بچے پالنا نہیں

ہے۔ بلکہ وہ پڑھ لکھ کر کچھ جانتا ہی ہے۔ پھر سعید کو بھی ڈانڈتا تھا۔ وہ اس کے لئے بھی کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی اپنی مصروفیات تھیں اپنی پر حالی اور دوسرے اخراجات کا بوجھ تو اس نے میٹرکل لیول سے ہی اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مختلف کلاس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر وہ ان روپوں سے اپنے اخراجات پرے کرتی تھی۔ کانٹا میں آنے کے بعد بھی اس نے یہی روٹیں دیکھیں تھیں۔ یہ بخیر علی کچھ اس کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایم اے سائنس کر رہی تھی۔ اپنی پر حالی کے ساتھ اس کی غیر نصابی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ کھتے کھاتے کے کام میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک کوچنگ سینٹر بھی جوائن کر لیا تھا۔ وہاں وہ کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے اس ٹیوشن کو مختلف مضامین پڑھانی تھیں۔ پڑھانی میں وہ بے حد تبحر تھی۔ ہر سال وہ ٹاپ کرتی تھی۔ اسکول میں کئی بار وہ پرموٹ کی گئی تھی۔ کانٹا میں بھی اس نے فرسٹ اینڈ اور سیکنڈ اینڈ کے ہجے ذیل امتحان دے کر بہترین نمبروں سے کلیئر کئے تھے۔ وہ جلد از جلد اسٹوڈنٹ لائف کلاس کے پرنسپل لائف میں آنا چاہتی تھی۔ وہ جو کمال تھی اس کا ایک بڑا حصہ اپنی ماں کو دے دیا کرتی تھی۔ اپنے پاس صرف اتنی رقم رکھتی جس کی اسے ضرورت ہوتی تھی۔ اس طرح لیسر کو پہلے کے مقابلے میں اب اس قدر مشکل نہیں ہوتی تھی۔

فعلی طور پر کشف کافی پرنسپل لڑکی تھی۔ وہ خوابوں خیالوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اس کی یہ عیادت فی زمانہ کوئی خوب خیر چیز تھی۔

”آج کے دور میں انسان کو کئی ہو کر زندگی گزارنی چاہئے۔ تصورات کی دنیا میں ہم انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔“ اس نے ایک مرتبہ اپنی سہیلی سے کہا تھا۔

”مگر تمہاری تحریریں کو پڑھ کر تو کوئی بھی تمہارے بارے میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تم اس قدر پرنسپل لڑکی ہو۔“ اس کی سہیلی نے جواب دیا۔

”غلط۔ میری تحریریں کو پڑھنے والے ہی سمجھ بھیجے طور سے جان سکتا ہے۔ میری تحریر میں محبت کی باتیں ہیں، عشق کی باتیں ہیں۔ مگر میں نے زندگی کی کڑوی حقیقتوں سے کبھی اپنے ہار نہیں لے کر نہیں دیکھا۔ اگر میں دوج کی بات کرتی ہوں تو جس کی بات بھی لازمی کرتی ہوں۔ اگر میں خوابوں کا ذکر کرتی ہوں تو عمل کی تائید بھی کرتی ہوں۔ زندگی میں خواب ضرور دیکھنے چاہئیں مگر عمل سے ان کو حقیقت بھی بنانا چاہئے نہ کہ بس خواب ہی دیکھنے رہیں اور ہجرے کے منتظر رہیں کہ کب خواب کسی ہجرے کے باعث سچ ہو جائے۔ یہ ہجڑوں کا دور نہیں ہے، یہ حقیقتوں کا دور ہے۔“ وہ مختلف دلائل کے ذریعے اپنی سہیلیوں کو سمجھاتی تھی۔

بیٹہ پر لکھی ہوئی وہ سوچ رہی تھی کہ اس صاحب سے جا کر لے گی۔ واقعی ان سے ملنے خاصا وقت گزار چکا تھا۔ ادیب صاحب بہت اچھے اور بڑے ایڈیٹر تھے۔ وہ انہیں تب سے جانتی تھی جب سے وہ اپنے انسانے وغیرہ شائع کرتی آ رہی تھی۔ ادیب صاحب اس کے لئے تحریک استاد کا درجہ بھی رکھتے تھے۔ وہ خود بھی بہت بڑے ادیب و شاعر اور تنقید کار تھے۔ کشف کی زیادہ تر تحریریں انہوں نے

اپنی کی تھیں۔ کشف کو ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ جہاں کچھ چیزیں مشکل پڑتی تھیں، اسے ادیب صاحب کی یاد آتی تھی۔ اور اب وہ کل ان سے ملنے کا ارادہ کئے بیٹھ گئی۔



میں وقت وہ حیدر کے گھر میں داخل ہوا تھا عصر کی اذان میں ہو رہی تھیں۔ گھر کے ملازمین نے دیکھا تھا۔ وہ اسے بخوبی پہچانتے تھے۔

”السلام علیک صاحب! کیسے حراج ہیں؟“ حیدر کے پرانے ملازم نے کہا۔

”برکت دیں! کیسے ہوں؟“ اس نے سلام کا جواب دینے کی زحمت نہ کی۔

”آپ کی دعا ہے۔“ برکت دیں نے مسکرا کر عاجزی سے جواب دیا۔

”حیدر کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہوئے صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔ ان کی تاکید تھی کہ آپ جیسے ہی آئیں، ان کے کمرے پہلے جائیں۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اور باقی سب بھی نظر نہیں آ رہے؟“ اس نے ابھر اھر نظر لیں دوڑائیں۔

”بڑی نیچم صاحبہ تو تھی، اپنے کمرے میں ہیں۔ چھوٹی لڑکی اپنے کمرے میں ہیں۔ بڑے بچے آپس سے ابھی آئے نہیں ہیں۔“ اس نے مختصر بتایا۔

”ہوں..... ٹھیک ہے۔“ حیدر نے بے نیازی سے سر ہلادیا اور حیدر کے کمرے کی طرف قدم مارتے۔ اس کا کمرہ کبلی منزل پر تھا۔ حیدر کے کمرے کے قریب کچھ کر بند دروازے کو صاف اور صاف دیکھ کر زحمت کے بغیر دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ حیدر کپیٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ کچھ کر سکتا تھا۔

”مجھے نہیں نہیں تھا کہ تم پہلے آؤ گے۔“ حیدر نے اس سے گرم جوشی سے معافی کیا۔

”میرے بارے میں بڑی بدگمانیاں ہیں تم کو۔“ حیدر نے بے لطفانہ انداز میں بیٹھ گیا۔

”وعدہ بھانے کی عادت تو جنوں ہے تمہیں۔“ حیدر دوبارہ کے کپیٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ مگر اس کا کام کرنے کی بجائے ہی آف کر دیا تھا۔ وہ پوری طرح حیدر کی طرف توجہ تھا۔

”اب میرے قصیدے نہ پڑھو، جلدی سے کافی پلو آؤ۔ تمہاری وجہ سے آج آپ کی اماں کے ہاتھ کی دلی چوڑ کر آیا ہوں۔“ اس نے فرمائش کی۔

”ابھی پلو آتا ہوں۔“ حیدر نے اٹھ کر دیوار پر لگے عکس کی بنیوں کو دیکھا۔ چند لمحوں بعد برکت وہاں آیا۔

”دو کافی لے آؤ برکت! احمرے دارسی۔“ حیدر نے برکت کو آڈر دیا اور پھر حیدر کی طرف توجہ دیا۔

”ساتھ کچھ لو گے؟“

”نہیں.....“ اس نے منع کر دیا۔

”ٹھیک ہے..... ابھی کافی لے آؤ۔ بعد میں کھانا ہی کھا لیں گے۔“ حیدر نے سر ہلایا۔ ملازم

واپس پلٹ گیا۔

”اور بھئی..... کہاں ہو آج کل؟“ حیدر اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”میں مازگ کر رہا ہوں۔“ تیمور نے با تسبیہ اطمینان سے کہہ دیا۔
 ”کیا..... مازگ؟“ حیدر چونک گیا۔ ”انکل کو معلوم ہے؟“ اس کا اشارہ تیمور کے و
 طرف تھا۔

”نہیں۔“ تیمور نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تم نے انہیں بتانے کی رحمت نہیں کی؟“ حیدر نے اسے ہار انگلی سے گھورا۔

”تم آن پارا یہ میری زندگی ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق ہی اسے گزارنا ہے مجھ کو۔ اب پا اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے بھی اجازت لوں گا کیا؟“ وہ قدرے جھنجھلا گیا۔

”پھولی بات؟.....“ پھولی بات ہے؟“ حیدر نے طنز یہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”جی“ میگزین والی بات بھول گئے ہو؟ کیا بگڑا چکا تھا۔ کیا مسلمان تین سو تیس جنس کرنے اکل ہے۔“ حیدر نے یاد دہانی کرائی۔ ”وہی بھی تم کو ایسی ہی اسے کرنے کے لئے امریکا پہلے جانا ہے۔ پڑھو گے خرافات کے لئے وقت نکالو گے؟“

”وہ میرا بیٹک ہے۔ ویسے بھی ابھی میرے جانے میں تمہیں مینے پڑے ہیں۔“ وہ بے سے بولا۔

”انکل کو کیسے راضی کرو گے؟“ حیدر نے پوچھا۔

”پہلے کب ترویج کی تھی؟ خدای سیٹ ہو گئے تھے۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ اسے اچھی طرح
کہ ”دی فیشن“ پر اس کی تصویر دیکھ کر وہ کتنا مجبور تھے۔

”اب بھی کرو ہو مٹی ہے کہ تم ان گلے گلے کے رسالوں کے لئے اپنے ماڈل ہوئے کام
دیکھو تورا آج یہ ہوا ہے کراسہ میں برواٹ نہیں کروں گا۔ مٹی میں ملاؤ گے میرا ما؟.....
بڑے بڑے کیس ان گینوں کا انگوٹھا بیٹا ملاؤ گے کر رہا ہے..... مائی گٹھنوں۔“ رؤف کی خان اس کے
لے رہے تھے اور وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ کچر ہے سے صاف ظاہر ہوا تھا کہ ”اھڑ“ پرواہ
ہے؟ اب کی ڈانٹ کو وہ کب بھینگی سے لیتا تھا۔

”پلیز پاپا!..... میں کون سا اسے پرورش لے رہا ہوں۔ بس ایک موقع تھا، جسے اچھو کر بے مہرے خیال میں اس میں حرج بھی کسے؟“ وہ بولا۔

”دنکو چور اور تہارے لئے یہ بڑی معمولی کامیابیات ہو سکتی ہے مگر میرے لئے نہیں۔ میں یہ دولت اور عزت دوسروں کی طرح ”راٹوں رات“ نہیں کماؤں۔“ ”یہ عجیبہ تھے۔“ یہ عزت، یہ شہرت کمانے میں یہ بھولیں کی محنت اور ان کا لہو پیٹہ شامل ہے۔ ہمارے خاندان میں بہت آج سکی مگر یہ ڈانگ، وغیرہ کو، ہم لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔ جہاد کی ایک، ناگجھی سے میں نہیں جانتا کہ، ہم بھولیں کی محنت داؤ پر لگاتے تھے۔ آج کے ایسی کوئی حرکت نہیں کر رہے۔ اڈو ہٹ کیس؟“ ”انہوں

سوچ کر مطمئن ہو گئی تھیں۔

ان کی ملاقاتیں بڑھتی رہیں اور تیسری ملاقات میں رؤف علی خان نے انہیں پرہیز کر دیا تھا۔
عالم کے لئے یہ پرہیز غیر متوقع نہ تھا۔ وہ پہلے ہی سوچ اور سمجھ کر بھی تھا انہوں نے
مہ آرام سے اس پرہیز کو قبول کر لیا۔ مگر رؤف علی خان جب باقاعدہ رشتہ لے کر دینا کے مگر
ان کے والدین نے صاف صاف انکار کر دیا۔ ان کی بیوی بتا دلائی تھی۔ اپنی لاڈلی، حسین،
ایکسی کنواری بیٹی کے لئے رؤف علی خان کا رشتہ ان کو یہ قبول ہوسکتا تھا؟..... رؤف علی خان
مہاجر کی، خوب صورت کسی مگر رطوبے اور ایک بچے کے باپ تھے۔ مہاجر میں بھی دو بیویاں
تھیں۔ انہوں نے اپنے بچے کے لئے ان کی قابل رشک بہن سے رشتہ اور دولت کی چمک کے لئے ان کی مگر کتنا خاصا
پالنا تھا مگر حقیقت تو بہر حال یہی تھی کہ وہ بیویاں سے ملے ہوئے تھے۔

رؤف علی خان کو دینا کے والدین کے اس انکار سے بہت سکی محسوس ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بھی
ان سے دور تھے۔ رؤف علی خان ناراض ہو کر وہاں سے چلے آئے تھے اور دینا کے بہت روکنے کے
بہر بھی دور کے نہیں تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ اپنے باپ سے اٹھ کر چلی گئی۔

”تم جہاں جاتی ہو رہی ہو دینا!..... مگر دیکھی ہے اس کی اور اپنی؟..... پھر وہ رطوبہ ہے۔ ایک بچہ
اس کا تم اس کی صورت اور دولت دیکھ کر دل پارٹھی ہو۔“ دینا کی ماں نے انہیں سمجھایا۔
”سو دینا؟..... میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ میرے نزدیک یہ بائیس کچھ معنی نہیں رکھتیں۔
آپ مجھے زیادہ پریشان کریں گے تو میں سول میرج کر لوں گی۔ میں مانع ہوں۔ مجھے اس چیز کی
ہات قانون دیتا ہے۔“ وہ قلمی انداز میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے تھیں۔

ان کے والدین جانتے تھے کہ وہ بہت ضدی اور خوسر ہیں۔ وہ فیصلہ کر چکی ہیں اور اب کوئی بھی
ان کو اس فیصلے پر غور نہ کرنے سے نہیں روک سکے گی۔ اور پھر دینا کی ضد کے سامنے ان کے
دھمپ کر گھٹنے ٹیٹنے پڑے۔ اور اس طرح وہ دینا عالم سے دینا رؤف علی خان بن کر ان کی زندگی
میں جلی آ گئیں۔ مگر ان کی ماں نے دیکھی ہے قلمی انہیں بہت سی باتیں سمجھا کر بھیجنا تھا۔

”رؤف علی خان کے بیٹے کو تو پہلی فرست میں پورڈنگ بھیج دینا۔ کوشش کرنا کہ باپ جتنا زیادہ
ڈراما سٹینڈنگ نہ پیدا کر سکیں۔ اور اب تم بھی پہلے ہی سال ایک جتن ضرور ملے آئے۔ بچہ نکاح کے
”میں مضبوطی پیدا کرنا ہے۔“ بیٹی میں اس کے ساتھ برابر کی پانڈر شپ بنانا۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ
”اب کچھ بیٹے کے نام پر کر دے۔“

دینا کی ماں ”چندہ چیدہ پائنتس“ انہیں ذہن نشین کر رہی تھیں۔ ”تفصیل“ تو وہ پہلے ہی ان کے
امام میں ڈال چکی تھیں۔ دینا کے ذہن میں ماں کی بائیس صفحہ تھیں۔ انہوں نے رؤف علی خان کے
مگر آنے کے بعد مکمل رات سے ان باتوں کو پلائی کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کم عمر تھیں، حسین تھیں
فرار دار تھیں، بات منوانے کا فن جانتی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر ”نئی ٹولٹی دکن“ تھیں۔ عورت
میں کچھ جادو ہو، مگر ایک جادو جو سر چڑھ کر دینا کے وہ کم سن شیاپ کا جادو ہوتا ہے جو مرد کے سر

رؤف علی خان کا شہر لک کے باپ کلاس کاروباری لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ لوگ ہدی
ریکس اور کاروباری لوگ تھے۔ تیسرے اپنے والدین کی انگوٹی لٹا دیتے تھے باپ دادا کا نام، ذمہ
دولت، ہر شے، ہر عیش سونے کی قالی میں بچے جاتے ملے تھے۔ وہ ان خوش نصیب لوگوں میں
ایک تھا جن کو سب چیزوں کے لئے کوئی تک و دو نہ کرنی پڑی تھی۔ تیسرے رؤف علی خان کی
بیوی سے تھا جو کران کی فرسٹ کزن بھی تھیں۔ تیسرے کو ختم دینے کے ایک ہفتے بعد ان کا انتقال
تھا۔ وجہ حد سے زیادہ جسمانی کمزوری تھی جو کہ ڈیوری کے دوران بہت زیادہ خون بہہ جانے کی
سے ہوئی تھی۔

بی بی رؤف علی خان کی والدہ کے زمانے کی ملازم تھیں۔ بہت ہی وقاردار، بہت ہی پر
اور صوم و صلہ کی پابند تھیں۔ تیسرے ہی چھوڑا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔
رؤف علی خان بہت پریشان ہوئے تھے۔ ایک ہفتے کے بچے کو وہ دھانا، اس کی دیکھ بھال کرنا
کے دیگر کام وغیرہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی جس کے لئے رؤف صاحب خاصے پریشان
تھے۔ ان کی اس پریشانی کو بی بی رؤف نے اپنا دوسرا بیٹا لیا تھا۔ ہفتے بھر کے ختمے سے تیسرے کو انہوں
اپنے بیٹے سے لگا کر اپنی ساری ماحول سے دور کر دی تھی۔ بی بی رؤف بھی اسے اور بچہ لٹا دیا۔
کی شکل میں جیسے انہیں اپنا بچہ لیا تھا جس نے ان کی سوتلی، باجھہ گو گو کو برا بھلا کر دیا تھا۔ پھر وہ
کی ماں بن گئیں۔ ملازم سے ماں بننے میں ان کو کچھ نہ تھا جس۔

رؤف صاحب کے لئے بیوی کا تم بڑا تھا۔ انہیں اپنی بیوی سے بہت پیار تھا۔ وہ تھیں بھی
محبت کرنے والی، بہت خیال کرنے والی، شانہ بہ شانہ شوہر کے ہر بوجھ کو پاٹنے والی۔ ان کے
جانے سے رؤف علی خان کی زندگی میں جو غلاظت آئی تھا وہ دینا عالم نے پُر کیا تھا۔ چھ ماہ بعد دینا
کی ملاقات ایسٹ پورٹ پر اتفاقاً رؤف علی خان سے ہوئی تھی۔ دونوں لندن جا رہے تھے۔ غلاظت
ایک ہی تھی اور بیٹھیں بھی ساتھ ساتھ۔ اپنی اپنی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے خاصے قریب آ
دینا جیسے خاصی امیر کیر مشلی سے تھیں۔ دیکھی تھیں۔ وہ خاصی آزاد خیال بھی تھیں۔ انہیں رؤف
خان کی پہلی شادی اور بچے کا طہر ہار ہی کی علم تھا کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد اب وہ بالکل
ہیں۔ مگر دینا کے لئے یہ بات سرسری تھی۔ انہوں نے اس چیز کو اپنی گہرائی سے نہیں لیا تھا۔
’نیک ہے، پہلے بیوی کی گہرائی سے نہ دیکھیں۔ وہ کیا بچہ تو اس کے ہونے سے کیا فرق

چڑھ کر یوں ہے۔ ہوشیار عورت اسی "چادو" کو اختیار بنا کر مرد پر استعمال کر سکتی ہے اور اسے اپنا دام غلام بنا سکتی ہے۔

دینا عالم تو یہی ہے ہر کس کا سننے سے ایسے جس۔ رؤف علی خان شب عروسی کے چند گھنٹوں ہی ان کے بے دام غلام بن کر مونا کی تین سالہ رقابت کو یوں بھول گئے جیسے وہ ان کی زندگی میں آئی ہی نہ ہوں۔ نیچے سے، گول منول سے تھوڑو کچھ کر دینا کے دل میں کوئی مانتا نہ ابھری تھی انہیں اس سے نفرت بھی محسوس نہ ہوئی تھی شاید اس لئے کہ تھوڑے ہی عرصے پہلے انہیں بچہ تھا اور دینا کی کمزوری تھا۔ یا پھر شاید اس لئے کہ فطری طور پر وہ کوئی ماحسوس عورت نہیں جس جو سنیٹ سے حسد کرے گتلیں۔ یا پھر شاید اس لئے کہ تھوڑے ہی وقت بہت ہی چھوٹا تھا اور اسے چھوٹے سے حسد کا جذبہ خاصی مضبوطی سے چڑھ چکی تھی۔ مگر یہی نہیں تھا کہ ان کے دل میں اس کے لئے بے مانتا جذبات اٹھ پڑے تھے۔ جب رؤف علی خان نے تھوڑا سا ان سے تعارف کر لیا تب انہوں نے مہ

اس کے رشتہ پر ابھی سے پکا سا یادگار کیا تھا۔

"بہت کیوت ہے۔"

لی اماں سے بھی ان کا تعارف کر دیا گیا مگر وہ ان کے نزدیک مگر کی ایک پرانی ملازمہ سے کچھ نہیں تھیں۔ انہوں نے لی اماں کو دوسرے ملازموں کی طرح ہی ٹریٹ کیا تھا۔ ان کے روپے لی اماں کو نقد سے دل برداشتہ کیا تھا کیونکہ سونا نے ہمیشہ ان کو خزت دی تھی اور مگر کی ملازمہ کا درجہ نہیں دیا تھا۔ رؤف علی خان بھی لی اماں کو خزت دیتے تھے۔ مگر دینا کے اعزاز میں وہ کچھ تھا خاموش ہی ہو گئی تھیں۔

تھوڑے دینا، تھوڑی سونیا ماں جس عروہ ایک لبرل عورت تھیں۔ تھوڑو کچھ کہ ان کے دل میں حتیٰ چند پر نہیں اٹھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ رؤف علی خان نے ان سے یہ شادی تھوڑے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی اور دینی امور کے لیے تھوڑی اور دینی امور کرنے کے لئے کی تھی۔ تھوڑے کے لئے اماں جس اور دینی اس کے لئے کافی تھیں۔ وہ مکمل طور پر انہی کی ذمہ داری بن چکا تھا۔ یوں وہ سر پر "مسلمہ" نہیں کیا گیا تھا۔ دوسری بات جہاں کے وہ بنیں تھی وہ یہ کہ چند سالوں بعد تو وہ بھی تھوڑو پورے بچھڑا ہے۔ پھر یوں بھی رؤف علی خان مگر نہیں کم ہی تھکتے تھے۔ ان کے تھکاہٹ پہلے ہونے پر ان کی وجہ سے ان کا ایک بڑا بھائی تو دوسرا وہاں ہوتا تھا۔ بھئی وہ لندن ہوتے، بھئی جی برس میں، بھئی جاپان میں تو بھئی امریکہ میں۔ بھئی اگر کلک میں موجود ہوتے بھی تو تھوڑے کے نور تھکتے تھے۔ اور جو بھی کراچی میں رہ جاتے تھے بھی روز ہی ان کو کسی نہ کسی بیٹا پر کسی ڈنر، پانی وغیرہ کے لئے مگر سے باہر رہنا پڑتا تھا اور دینا پر کلک ان کے ساتھ شانہ بہ رشتہ تھیں۔ دینا کی ذہانت اور حسن و اعزاز نے رؤف کی راہوں کو آسان کر دیا تھا۔ دینا روز بروز کی "ضرورت" بنتی جا رہی تھیں۔ رؤف صاحب ان کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یوں آہستہ آہستہ وقت کی گاڑی آگے کو سرک رہی اور دوسرا سال گزر گئے۔ تھوڑا بڑا ڈھائی سال

اٹھا۔ اس نے اب یوں بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی تو قری زبان میں ابھری تھیں کہ ان کے گاہکوں کو اپنی ماں کو بھیجے گا تھا۔ اپنی تو قری زبان میں سے پہلا لفظ بھی اس نے "لی اماں" ہی کہا تھا۔ اس کے لئے کسی ہمسایہ کی طرح تھا جو بھی کھانا کھا کر آتا تھا۔ اس سے وہ گڑھی پیار کے بھر مگر نہ جانے کے بعد کبھی اپنی ضرورت دکھاتا تھا۔ دینا اس کے لئے کسی انہی کی طرح تھیں جو نہ سے بہت کرتی تھیں نہ نفرت۔ بس اس کے دوسری حق ان کے اعزاز میں۔ بے حد قابل ساعدا تھا۔ لی اماں کے کھانے پر وہ چاہا تھا کہ یہ اس کے ماں اور باپ ہیں۔

مگر جب تھوڑو کو سکول داخل کرنا تھا تب رؤف علی خان نے اس کے لئے وقت نکالا تھا اور وہ خود اس کے لئے کوششیں کر رہے تھے۔ تھوڑا سا کوئی کیو لیول بے حد شارب تھا۔ بنا لڑ بنگ کے، بنا کسی کھانے پر چاہنے کے اس نے بہت تیزی کے ساتھ تھوڑو کی کچھ پیار لیوٹر اس کی سالوں میں بیکٹر کر لیا تھا۔ حالانکہ اس کی پیچھے رہنے کی بار رؤف علی خان سے کہا تھا کہ آپ اپنے کو تھوڑو کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ اگر اسے گریو ون میں بھی بٹھا دیں۔ مگر وہ بہت اہلی سے اسے پاس کر لے گا مگر رؤف علی خان چاہتے تھے کہ وہ اپنی عمر کے ساتھ رنجہ ہی آگے بڑھے۔

تھوڑو ہر سال ٹاپ کرتا تھا۔ اس کا کوئی کیو لیول بہت ہی تھا۔ جس سبق کو دوسرے بچے گھنٹوں لگا لیتے تھے وہ اسے چند منٹوں میں سمجھ جاتا تھا۔ اس نے گریو فائیس اس عمر میں بیکٹر کیا تھا جس عمر میں اسے بچے گریو فقی پاس کرتے ہیں۔ اس کی ذہانت کی وجہ سے اسے پڑھتو کیا جاتا تھا اور اس کا زور دہ ہر سال ٹاپ کر کے اپنے ریکارڈ میں اضافہ ہی کرتا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی کھیلوں میں بھی تھیں۔ وہ ہر گیم میں حصہ لیتا تھا اور ہمیشہ شاندار کامیابی حاصل کرتا۔ اُس کی مٹی ہوئی کامیابیوں نے جہاں رؤف علی خان کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا وہیں دینا عالم کے احساسات نامہ بٹیاں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

تھوڑی بے چارہ ذہانت اور رؤف علی خان کا اس کی سمت بڑھتا رہتا تھا جہاں ان کے لئے باعث ذہنی تھا وہیں بے بات بھی انہیں بھل رہی تھی کہ شادی کے پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی اور بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب ان کو خاموشی تو شعل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ اپنا ہر قسم کا ٹیٹ اور علاج ڈال رہی تھیں۔ سارے ٹیٹ کھیتے تھے۔ مگر خدا نے ابھی تک ان کو اولاد کی دولت سے محروم رکھا ہوا۔ وہ بھی کسی اپنی خوشی کا اعتبار تو ہر سے کر تھیں تو وہ کہتے۔

"تھوڑو بھی تو تھوڑا چاہتا ہے۔ پھر اگر دوسری کوئی اولاد نہیں ہوتی تو تم کو لڑکی کیا ضرورت ہے؟" ان کے بے نیاز اور سرسری اعزاز پر دینا کی جان تو بل جانی کھر بٹا پورہ مسکرا دیتی۔ "ہاں، بالکل۔ تھوڑو بھی تو میرا ہی بیٹا ہے۔ مگر ڈارنگ اور بھی تو ہے ہونے چاہئیں۔ تمہارا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ مگر ازم کو تو بچے تو اور ہونے چاہئیں۔" وہ جلدی سے کہتی۔

"جو چاہیں گے..... مگر کی کیا بات ہے؟" کوکوں کے یہاں دس دس سال بعد بھی اولاد ہوتی

ہے۔" ان کی بے نیازی پر دینا کا لہجہ بڑھتا رہتا۔ مگر تیرور کے خلاف کچھ بول کر وہ شور کے دل: گمانی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ مگر تیرور کے خلاف ان کے دل میں دعوتِ جنم لے چکی تھی۔ وہ کی آگ کو دھواں تو تھانے کی ماں ہوا دیتی رہتی تھیں۔

تیرور جب بہت چھوٹا تھا تب تو اسے اپنے اور دینا کے رشتے کا طلم نہ تھا۔ بی اماں کچھ بھی سمجھنے سے ذہن میں نہ لگتا تھا۔ کاج نہیں بولتا چاہتی تھیں۔ مگر دینا کا دل پر دینا ہوتا انداز تیرور کو بڑھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت چھوٹا تھا تب بی اماں نے اسے سمجھایا تھا کہ اس کی ماں دینا ہیں۔ بی اماں سمجھانے پر ہی دینا کو "نام" کہنا تھا۔ مگر اسے ہمیشہ اپنی "نام" دوسرے بچوں کی ماں سے ملتا تھا۔ دینا دوسرے دوسری ماؤں کی طرح پیار کرتی تھیں۔ نام دینے کے لئے کبھی نہ اسے گود میں اٹھاتیں۔ میں اٹھانے کے تو سخت خلاف تھیں۔ ان کے کہڑوں کی کر بڑ جو خراب ہو جاتی تھی۔ حالانکہ ان کی بار دوسرے بچوں کو دیکھا تھا جو اس کے ہم عمر تھے۔ مگر ان کی مائیں انہیں گودوں میں اٹھا کر پنشن پنشن پیار کرتی تھیں۔ اس کے اندر یہ محرومی جنم لے چکی تھی۔ بی اماں کا پیار بھی اس محرومی کو دیکھا تھا۔

ایک دن دل کے ہاتھوں بھور ہو کر وہ دینا کے بیڑہ میں چلا آیا تھا۔ وہ اس وقت بیڑہ پر بیٹا پائلس ریموور سے ٹپل پائلس صاف کر رہی تھی۔ تیرور جھٹکا وہاں کے کمرے میں آ گیا۔ "نام! میں اندر آ جاؤں؟" اس نے پوچھتے ہوئے پوچھا۔ دینا نے جیسی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس وقت رفت صاحب گھر نہ تھے ورنہ ان کا ردِ ماں اور ہوتا۔

"کیا کام ہے؟" بڑے نگہ کر انہوں نے پوچھا تھا۔ "میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔" اس نے وہیں رک کر کہنے کی بجائے اندر آ کے کہا۔ اندر آ کے کے بعد سیدھا اس کے قریب آ گیا تھا۔ "کیوں؟" دینا کے لہجے کا لکھا پتا نہ بڑھ گیا۔

"آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ آپ میری مام ہیں۔ مائی سوئے اینڈ ڈارنگ مام۔" بے حد انداز تھا۔ بیحد محبت۔ لیجے میں بولتا ہوا وہ اس کے بیڑہ پر چڑھ گیا۔ دینا کی بجائے اگر اس کی لپٹی ہوتی تو وہ اس کے اس انداز پر جان ٹار کرتی۔ داری صدمے ہوتی۔ مگر بیڑہ پر بیٹھی یہ عورت ان "ماں" نہیں تھی، اس کے باپ کی "بیوی" تھی۔ تیرور آگے بڑھ کر اس کے رخسار کو چوم کر اپنی ہر اکتھا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایسا کرنے کے لئے ذرا سی حرکت کی تو ریموور کی مکئی شیشی جو بیڑہ میں تھی وہ یکدم تیرور کے انگوٹھے کی ٹھوک سے گر گئی اور بیڑہ پر ریموور گر گیا۔

"کوہ..... مائی گاڈ! یہ کیا کام ہے؟" جان سنسا..... اسٹوپ! ہوائے! سارا بیڑہ خراب دیا۔ دینا یکدم چلی آئیں۔ تیرور سمجھ کر اپنی جگہ پر جم سا گیا۔ "گھٹ آؤت فرام ہینر۔ دو بارہ اس کمرے میں قدم نہ رکھنا۔" دینا یہی طرح چلا رہی تھیں۔

پھر پھر ہی تو تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کو یوں خود پر چلاتے ہوئے اور خود کو ڈانٹ لے کر دیکھا تھا۔ وہ خوف زدہ سا ہو گیا۔

"کس..... سواری مام....." اس نے صفائی مانگی تھی۔ "میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور بیٹا..... تمہاری ماں مر چکی ہے..... خود تو مر گئی اور اس دہشت کو میرے لئے چھوڑ گئی..... بچ..... دینا جیسے جسے میں پاگل ہو رہی تھیں۔ تیرور ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس وقت دینا کا سین چہرہ اسے انہی اور خوف زدہ کر دینے لگا۔ رہا تھا۔ دینا کا شور سن کر ملازمہ بھاگتی ہوئی اندر آ گئی۔

"کیا ہو بیگم صاحبہ؟" ملازمہ نے پوچھا۔ "لے جاؤ اس بچہ تیز لڑکے کو یہاں سے..... سارا بیڑہ خراب کر دیا ہے۔" دینا نے تیرور کی طرف اشارہ کیا۔

ملازمہ نے پہلے خاموشی، خوف زدہ سے کھڑے تیرور کو دیکھا، پھر بیڑہ کی طرف دیکھا۔ بیڑہ بیٹ پر بیٹا بڑی ریموور کی شیشی دیکھ کر وہ کچھ کچھ معاملہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے ترم بھری نظروں سے تیرور کو گھبراہٹ سے دیکھا۔ "جی جی جی....."

"پہلے یہ بیڑہ بیٹ بولو..... ریموور کی سیلی سارے کمرے میں پھیل گئی ہے۔" دینا نے حکم دیا۔ "جی....." ملازمہ نے حکم کی قیامت کی اور بیڑہ بیٹ لینے کے لئے کمرے سے باہر جانے لگی۔ "ترم بھی جاؤ..... اور پھر میرے کمرے میں قدم مت رکھنا۔" اندر بیٹھنا؟ دینا نے تیرور کو ہزاروں تیرور نے شامی نظروں سے دیکھا اور دیکھا، پھر ملازمہ کو جو دروازے کے پاس کھڑی اسے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

تیرور کو دینا کا یہ انداز بہت افسانہ نگار دے میں لگا تھا۔ وہ بہت چھوٹا مگر ذہین اور حساس تھا۔ ماں کو محسوس کر سکتا تھا۔ کدھشت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ دینا نے آج سے قبل اگر اسے کبھی بیان نہ لیا تھا تو کبھی مارا یا ڈانٹا بھی نہیں تھا۔ مگر آج کی ڈانٹ کھانے کے بعد اس کے دل میں دینا کے لئے گہر بن گئی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

رات کو جب بی اماں اسے دودھ کا گلاس دینے اس کے کمرے میں آئی تھیں تب وہ اُداس اُداس قائلین پر اوجھ حالتیں تھا۔ بی اماں نے اس کو ایک نظر دیکھا اور گلاس سائینڈ پیمبل پر رکھ دیا۔ "تیرور..... بچے! دودھ پی لو۔" انہوں نے اسے پکارا۔ مگر وہ اس سے کس نہ ہوا۔ "تیرور! دودھ پی لو۔" بی اماں نے دوبارہ اسے پکارا۔ مگر اس کے کان پر جوں نہ رہی۔

جب وہ اس کے پاس پہلی آئیں۔ "اس طرح قائلین پر کیوں لیجے ہو بیٹے؟..... اجھر بیڑہ پر آ جاؤ۔" انہوں نے اس کے ریشم کے لمبوں جیسے بالوں میں اٹھکایاں بکیرے ہوئے ملائم لیجے میں کہا۔ تیرور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یہ سوئچی مائی کیا ہوتا ہے بی اماں؟" اس نے اچانک سوال کر کے ان کو

ششدر کرویا۔

”یہ لفظ کہاں سے سیکھتا م نے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آئی ایم ناٹ اے کڈ۔ مجھے معلوم ہے سو قتل ماں اسٹیپ ہو کر کہتے ہیں۔ اور اسٹیپ ہوا نہیں ہوتی گندی ہوتی ہے۔ بالکل مام کی طرح۔“ دور لیں انداز میں کہہ رہا تھا۔
لی اماں خاموش سی ہو گئیں۔

”تم کو کس نے کہاں کہ امام تمہاری اسٹیپ مار ہیں.....؟“ انہوں نے چند لمحوں کے

”میرے فریڈ روئی نے بتایا ہے۔ اور اس کو اس کی ماں نے۔ اور پھر بھائی (نورانی) نے جو
 تھا کہ ماں میری اسٹپ مد ہیں اسی لئے مجھے یاد نہیں کرتیں۔ میرا خیال نہیں رہتیں۔ مجھے اے
 ہیں۔ پتہ ہے بلال! آج انہوں نے مجھے کتنا برا لگا۔“ یہ کہہ کر اس نے ریوڑور گرجانے والی
 نہیں بتادی۔

”کلید کہہ رہی تھی کہ اگر میری اپنی مام ہوتی تو مجھے کبھی نہ ڈانٹیں اور یہ کہ یہ مگر تو میرا ہے“

بی اماں جو ہمیں۔۔۔ یہ سب گھیلے نے کہا تم سے؟“ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”مور کہا؟“

’اس قلیل کا بندوبست کرنا ہوگا۔ کجنت جو زمین آئے جب دیتی ہے۔ بھلا بیچے یہ سہ لوگوں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ دل ہی دل میں جیجی و تاب کھائے گئیں۔

”جئے! ایسا کیسے کہتے۔ بھری بات ہے۔ وہ آپ کی اسٹیج درجیں تو کیا ہونا؟ درتو ہیں۔
 رہیں تو اس ہوتی ہے بس۔ سوئی گئی باقی نہیں ہوتی۔ پھر آپ نے شہلی کی کمی۔ اگر انہوں نے ذرا
 فکرت دلایا تو ہو گیا؟ آپ ان کے بچے ہوں۔ وہ خزی ہے اسے کھانے نکلیں اس کے دل میں
 کھانے کی روکھوتا پائی۔ پانی جس کو اس کی عمر میں دل آئیے گی مانند شفاف ہوتا ہے۔ بجلی بھی
 اس آئیے کو کوئلہ کر سکتی ہے۔“

”تو مجھے ٹھیکہ کے سامنے کیوں ڈانٹا؟..... کیوں پولیس کو گیت آؤٹ فراہم نہ کر؟ ٹھیکہ کیا سوچ کر کی میں کتابت پر لڑا کہ ہوں جو اپنی مام سے اس طرح ڈانٹ کھا رہا ہوں۔“ وہ منہ ہٹا کر بولا۔

”اچھا چلو چھوڑو، تم پہلے دودھ پی لو۔ پھر سو جاؤ..... صبح تم کو سکول بھی جانا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

وہ ان کے کہنے پر اٹھا اور دودھ کا گلاس اٹھالیا۔ ”میں دودھ پی لیتا ہوں۔ مگر آپ نے اسٹورک
نے کا وعدہ کیا تھا آج۔“ وہ انہیں یاد دلاتی کرانے لگی۔

”ٹھیک ہے..... میں سنا دوں گی۔ تم پہلے دودھ ختم کرو۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

[illegible]

۱. لاہاتے ہوئے پوچھا۔

”لاؤں گی۔ پہلے وہ بیکس تو ختم کرو جو پہلے لا کر دی تھیں۔“ انہوں نے کہا۔

”وہ کس؟..... دو تو میں نے کب کی پڑھ بھی لیں۔“ وہ بولا۔

”اچھا..... میں اور لا دوں گی۔ لیکن ساری کی ساری انصافی مت چڑھا کرو۔“ انہوں نے کہا۔

”ٹھیک ہے..... میں پاپا سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی مجھے اور بکس لا دیں۔“ اس نے سر ہلایا اور لٹ گیا۔ لیکن اس کے سر ہانے بیٹھ گئیں۔

”بی اماں!“ اس نے سرگھما کر انہیں دیکھا۔

”اب کیا ہے میرے فخر اور.....“ انہوں نے اس کے سرخ سرخ، پھولے سے رخسار کو

”میری ماما کیسی تھیں؟..... ان کی کوئی اسٹیپ (تصویر) کیوں نہیں ہے؟..... ماما کی اپنی تصویر تو ہے مگر میں لگی ہوں۔“ اس نے پوچھا۔

[illegible]

”مونا کی تصاویر سامنے رکھیں گی تو آپ کو اسے بھلانے میں مشکل ہو گی اور میرا اور جوجول کرے گا۔
 اس سے بھی زیادہ مشکل۔ مونا میری ہے۔ آپ سرخ رو کو گوئی گی یا دونوں کو زخمہ کر کے گی یا مجھے زخمہ کرے گا۔ جذبات کا خیال کریں۔“ دینا نے سر دھچکے میں کہا تھا اور اس کے بعد رؤف علی خان نے
 ارادہ بھی کر دینا سے لے کر اس کی بات نہیں کی تھی۔

”پولیس نا..... میری مٹی کی تصویر دکھائیں نا مجھے“

”تم ابھی سو جاؤ..... میں کل تم کو تصویر دے دوں گی۔“ انہوں نے اسے

”نہیں..... مجھے تصویر ابھی دیکھنی ہے بی اماں! اگر میں نے تصویر ابھی نہ دے“

بی اماں جاننی تھیں کہ اول تو وہ ضد کم ہی کرتا تھا۔ مگر جب ضد پراڑ جاتا تو پھر اسے توڑنا ناممکن،

ہا تھا۔ وہ ہر صورت ضد پوری کر کے دم لیتا تھا۔
 ”اچھا..... تم رکوڑا۔ میں لاتی ہوں۔“ انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا اور اسے وہیں چھوڑ

کمرے سے باہر نکل گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں موٹا لی وہ تصویر کی۔

میں وہ لہجہ بکری بیٹھی تھی۔ کیا شواہدوں والی اہل بان اور شان تھی۔ پر پور پور کی کسی پر شاندار اماں بیٹھی تھی۔ ہوتوں پر بادشاہی دم مہم مسکن کی تھی۔ یہ تصویر لی امان نے چپکے سے الگ کر کے پاس کپڑوں کی الماری میں منہال لی تھی۔ سونا کو وہ بہت جانتی تھی۔ ان کی موت کے بعد ہم کی تصویروں کو بھی منظر سے غائب کرنے کا حکم دیا گیا تب لی امان نے یہ تصویر چھپالی تھی۔ یہ زندگی کی پہلی اور آخری چوری تھی جو کہ لڑکے ہاتھوں بھجور ہو کر انہوں نے کی تھی۔ انہوں نے اب تیسرے کے منہ کرنے پر وہ تصویر لا کر اس کے حوالے کر دی تھی۔ تیسرے تصویر دار مارے اشتیاق کے ہنسنے پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں تصویر تھام رکھی تھی۔

”لی امان! میری کی تھی پر تھی..... تھی یہی تھی تھی..... مام سے بھی زیادہ..... زیادہ۔“ اس نے بے اختیار ماں کی تصویر کو چوم لیا۔ ”لی امان! آج میں کہانی نہیں سنوں گا۔ آج مجھے میری مامی کے بارے میں بتائیں۔ وہ کیسی تھی؟..... ان کے بارے میں سب باتیں بتا دو۔ وہ ان کی کوئی سرسبز کر لیت گیا اور تصویر کو پیسے سے گھر کر بلاش کر ڈالی۔

لی امان بہت دیر تک اس سے سونا کے حلقے ہاتھ کر رہی رہیں۔ وہ بے حد اشتیاق اور خوشی ساتھ اپنی ماں کا تذکرہ سنتا رہا تھا اور اسی طرح اب اس کی آنکھوں کی تھی اسے خبری نہ ہوئی۔ اس دن کے بعد سے تیسرے کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ لی امان سے لورا قریب ہو گیا تھا۔ رؤف علی خان کی توجہ پہلے بھی اس پر کم ہی رہتی تھی مگر پہلے وہ اپنی زیادہ پر دہا بھی نہیں تھا۔ لیکن اب اُسے اپنے پایا کا انتظار رہتا تھا۔ وہ باپ سے زیادہ توجہ حاصل کرنا چاہتا دیتا سے تو وہ اس دن کے بعد بہت غم ہو گیا تھا۔ پہلے وہ ان کی توجہ اور محبت چاہتا تھا۔ مگر اب ان کی زیادہ پر دہا نہ ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ وہ ان کی پر دہا ہی نہ کرتا تھا۔ نہ از مرضی، پسند نہ باتوں کو خاطر میں لاتا تھا۔ تیسرے کی باپ کی طرف یہ جتنی توجہ اور رؤف علی خان کی سے بڑی محبت و توجہ نہ دیتا کو توشیح میں ڈال رکھا تھا۔ وہ اسے پہلے بھی بڑے گورگ بھیجے کے رؤف علی خان پر زور ڈالتی رہی تھی۔ اب بھی وہ اسی کوشش میں تھی کہ تیسرے کی نہ کسی طرح اس سے دور ہو جائے۔ رؤف علی خان سے دور ہو جائے۔ اور پھر وہ اپنے مفقود میں کامیاب ہوئی تو کسی اُس دور پھر اتفاق ہی تھا کہ رؤف علی خان، دینا اور تیسرے کے ساتھ چل کر رہے تھے۔ ان اتفاقات بھی بکھار دی ہوئے تھے۔ رؤف علی خان دیکھا تو فوج دینا اور تیسرے سے ہاتھ کر کے چار بچے۔ مگر ایک دم دینا نے تیسرے کے کالونٹ چاہنے کا تذکرہ نکال لیا۔

”مگر آپ نے کیا سوچا؟“
”میں ہمارے میں؟“ رؤف علی خان کچھ نہ سمجھنے کے اعزاز میں دینا سے پوچھنے لگے۔
”تیسرے کو کالونٹ بھیجنا ہے..... امان کی بات کر رہی ہوں۔“ دینا نے کہا۔
”یہی جگ پچھو تو میرا دل نہیں مانتا۔ یہ سکول بھی برا نہیں ہے جہاں اب تیسرے جا رہا ہے۔ ا کالونٹ سے بھی اپنی لیل چس لگا۔ پھر اپنی دور سے بھیجے۔“

اس نے اس کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔ ”رؤف! میری بات کو سمجھیں۔ ہم دونوں اپنی عمر فراغت میں دن رات گم کر رہے ہیں۔ جو بچہ ہے۔ ایک ملازمہ اس کی کہاں تک دیکھ بھال کر پاتا؟ اس کی اسٹڈی ماسٹر ہو سکتی ہے۔ وہاں یہ بھترین بچوں کے ساتھ رہے گا۔ بھترین پڑھائی، مارل، بھترین اسکول کے سہا ہوں گے۔ اور پھر اس کا کلا بن بھی دور ہو گا۔ وہ بچے بھی کچھ سالوں وراہت ہے۔ اس کے بعد قرا سے ہائز اسٹڈی کے لئے باہر چلے جانا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں گے اس نے آنے کے بعد تیسرے میں کس قدر پائزہ پہنچ آیا ہو گا۔ یہ منظم اور بھترین عادات کا مالک ہائے گا۔ میں اس کی ماں ہوں۔ مجھے اس کی زیادہ فکر ہے۔“ دینا نے نرم لہجے میں دلائل دیئے۔
”بہن! تو تم ٹھیک ہو۔ مجھے بھی یہی فکر ہے کہ کہیں یہ ”ہوم سک“ نہ بن جائے۔ خیر، ٹھیک ہے۔“
”ہیں۔“ رؤف علی خان نے غم پر مضامین کاغذ پر کر دی تو دینا نے اطمینان کا سانس لیا۔ لوہے کو کر کے ضرر میں تو وہ بک سے لگا رہی تھی۔ اب اس ایک آخری کاری ضرب کا انتظار تھا۔
”میں ہوش نہیں جاؤں گا پایا!“ تیسرے جو ابھی تک چپ چاپ بیٹھا کر رہا تھا، بڑی غصہ کی سے اٹھ اٹھا۔ دینا نے اس کی طرف سے تیسرے کو گورا اور رؤف علی خان نے اسے چپک کر دیکھا۔
”کیوں بیٹے! ہوش میں جانا تو آپ کے لئے اچھا ہو گا۔ وہاں آپ کے بہت سارے فریڈز ہوں گے۔ آپ پور نہیں ہوں گے۔“ رؤف علی خان نے کہا۔

”میرے فریڈز یہاں بھی بہت ہیں۔ مجھے سے فریڈز نہیں بنائے۔ مجھے اسی اسکول میں پڑھنا پڑا۔“ دینا نے کہا۔
”تیسرے بیٹے.....“ دینا نے کہا۔

”آپ خاموشی رہیں میری مامی کر کے۔ یہ میرے اور پایا کے درمیان ہونے والی گفتگو ہے۔ آپ مداخلت نہ کریں۔“ اس نے انگریزی کی سی چتر میں لپٹ کر جملہ کو دے مارا۔ وہ پہلو بدل کر وہ لگئی۔
”تیسرے میری بات ہے بیٹے۔ آپ اپنی مام سے ایسے بات مت کریں۔“ رؤف علی خان نے بھی لہجہ کر لیا۔

”میں نے کوئی بدکاری نہیں کی ہے پایا! آپ.....“ اس نے کہا۔
”مام سے سو رہی کہ تیسرے“ رؤف علی خان نے کہا۔
”میں نے کوئی بدکاری نہیں کی ہے پایا جو میں سو رہی ہوں۔“ وہ اکثر لہجے میں بولا۔
”بدکاری اسے کیسے ہیں جو تم کر رہے ہو۔ میں تم سے سو رہی کہ تیسرے ہوں۔“ رؤف علی خان نے اس بار سے سخت لہجے میں کہا۔

”رہنے دیں.....“ بچہ نے۔ دینا نے لگا دیا۔
”بچہ ہے، مجھی کو سمجھا رہا ہوں۔ بڑا اہل تو ایک لگا دیتا۔“ وہ ہنسے میں آ رہے تھے۔
تیسرے نے زہری نظروں سے دینا کو دیکھا اور کہا: چھوڑو! اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو؟..... کھانا کھم کرو اپنا۔" رؤف علی خان نے حکم دیا۔

"پاپا! میرا بیٹہ گھبرا گیا ہے۔" دو گئی سے بولا۔

"تجور!..... تم حد سے باہر جا رہے ہو۔ میری کوئی بات سننے ہی نہیں۔" رؤف علی خان۔

"پاپا! آپ کا حکم ہوتا تو ضرور مانا۔ مگر آپ اس عورت کی زبان بول رہے ہیں جو میری ماں ہے۔ میں اس کی بات بھی نہیں مان سکتا۔" وہ انگریزی میں بولا۔ اس کا لہجہ بے حد سرد اور بے حد سرکش تھا۔

"تجور!..... بند کرو اپنی بکواس۔" رؤف علی خان اس کی بات پر جیسے سے اکڑ گئے اور لڑائی اٹھانے سے روک دیا۔ وہ رؤف علی خان کا زبردست ساتھی تھا۔ کچا ہوتا۔ "نانی کنڈیشن۔ یہ تجور کو کیا ہو گیا ہے؟..... اتنا بدلتا ہو گیا ہے۔" رؤف علی خان بہت غمزدہ نظر آنے لگے۔

"جی لے لے تو کدھری ہوں کہ اسے بھیج دیں کاؤنٹ۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" دینا نے آجپت کی جو کار کا رکڑت ہوئی تھی۔

"ہوں..... ٹھیک ہے۔ تجور اب وہوشل میں ہی رہے گا۔" انہوں نے کچھ سوچے ہوئے ڈیٹا دیا۔ دینا کے لیوں پر قہقہہ مٹکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"میں وہاں نہیں رہوں گا..... آپ دیکھ لیجئے کہ کس میں وہاں سے کتنی جلدی آجائے گا۔" لیلا اسے تیار کر رہی تھی۔ آج اسے مری کاؤنٹ میں جانا تھا۔ رؤف علی خان کے اسٹے تعلقات تھے۔ تجور کو وہاں اس وقت ایڈمیشن دے دیا گیا تھا جبکہ وہاں پر داخلے بند ہو چکے تھے۔ مگر رؤف علی خان کا دوسرا اتنا تھا کہ یہ ممکن کام ممکن بن گیا تھا۔ تجور کو کالینکس پر ایک راسڈ اس قدر شاندار تھا کہ اسے وہاں سے کسی کوئی کول فرمیں کر سکتا تھا۔

رؤف علی خان کو یہ اطمینان بھی تھا کہ تجور اپنی غیر معمولی ذہانت کی بنا پر پچھلا کورس جلد ہی کر لے گا۔ انہیں اگر نہ تھا تو صرف اس چیز کا کہ کیا وہاں ایڈمیشن کر لے گا؟ وہ جانتے تھے کہ لیلا اس سے بے حد اچھی ہے۔

"میرا دل آپ کے بغیر نہیں گھٹے گا لیلا! میں آپ کو بہت مس کروں گا۔" وہ منہ بسورے رہا تھا۔

لیلا اس نے دس سالہ تجور کو دیکھا۔ وہ ایک دن کا تھا جب سے ان کے پاس تھا۔ دس سال پہلا نے اسے گھر کی طرح نہیں بلکہ گھر میں سے بڑھ کر چاہا تھا، پروان چڑھایا تھا، اس کے بازوؤں اٹھائے تھے، اس کی ضدیں پوری کی تھیں۔ مگر انہوں نے ابھی اسے خود سے دور نہیں ہونے دیا تھا۔ اب دس سال بعد وہ لیے عرس کے لئے ان سے دور ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ پھللی سی آنکھوں میں

لیلا انہیں بھی رولا رہے تھے۔

انہوں نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ "میری جان!..... میرے بچے! میرا ہاتھ تو تجھے بھی خود سے اگ نہ ہونے دیتی۔ تجھے بغیر میرے کبھی کبھی پاؤں کی؟" انہوں نے کہا۔

"جی! اس کے رخساروں پر بچتے آنسو اپنے آپ گھل سے پونچھے۔" تم مرد ہو تجور! مردو تے ہیں۔" انہوں نے ہونے سے کہا۔

"میں جان کے قصوری زور پا ہوں؟ یہ تو میں خود خود رو آ رہا ہے۔" اس نے ہیکے لیے کھینچا۔ "مگر تاجے! تم اب جس سکول میں جا رہے ہو وہ بہت اچھا ہے۔ وہاں تم کو خوب دل لگا کر پڑھائے گئے۔" لیلا نے کہا۔

"جی! وہ سکول تمہارے پاپا کے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور وہ....." "بہت پیار کرتے ہیں اسی لئے مجھے اتنی اور بھیج رہے ہیں؟" وہ ان کی بات کاٹ کر طنزیہ انداز بولا۔ "پاپا! مجھے نہیں ہیں لیلا! ادوام کے کہنے پر مجھے اس والے سکول بھیج رہے ہیں۔ مگر آئی ہیں۔ میں وہاں زیادہ نہیں رکوں گا۔ پاپا خود مجھے لینے آئیں گے۔" وہ دیکھ بیٹھے گا۔" اس کے لیے

لمبی ضدی پن نمودار کیا تھا۔

لیلا اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ اس کی رنگ رگ سے واقف تھیں وہ۔ اس کے انداز کی ہر اونچ نیچ دیکھ لیں۔

"اچھا! تم حیدر سے تو ملو۔ وہ بس آئے والا ہو گا۔" انہوں نے اسے بھلا دیا تھا۔

اسی وقت حیدر نگر لائبریری میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ حیدر آسامی کا ہم عمر تھا مگر اس جیسا عمری ذہن نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے کلاس کے حساب سے بھی اس سے خاصا پیچھے تھا۔ مگر دوستی میں وہاں خوب تھی۔ حیدر کے آنے پر اس کا ذہن وقتی طور پر سوسو سے گھٹ گیا تھا۔ مگر دل و دماغ ابھی یہ کہہ کچھ اور سخت ہو گئی تھی۔ اب وہ دینا کے ساتھ ساتھ باپ سے بھی متنفر ہو رہا تھا۔

مری کاؤنٹ سکول کا ماحول اس کے پرانے سکول سے کچھ خاص مختلف نہ تھا۔ یہاں کے اساتذہ اچھے تھے۔ اس کو اپنی ہی کلاس میں ایڈجسٹنگ کا کوئی مسئلہ نہ ہوا تھا۔ وہ ہر ماحول میں اپنے جھٹ رنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یا یہ کہنا چاہئے کہ اگر اس کا دل چاہتا تو وہ ہر طرح کے ماحول میں خود کو محال لینا تھا۔ اور اگر اس کا دل نہ چاہتا، اس کی مرضی نہ ہوئی تو کوئی کتنا ہی ہاتھ بندھا رہے، وہ کسی بھی ایڈجسٹ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا حراج شاہانہ تھا۔ مرضی کا مالک تھا۔ ضدی تھا۔ کسی سے متاثر نہ ہوا۔ یاد دہانی ہوتا تھا۔ اتنی ہی عمر میں بھی اس کے انداز دیکھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ تجور علی خان اب ہوتی ہی خاص چیز ہے۔ مگر اس کو خدا نے بہت ہی فراغت کے لحاظ سے بنایا تھا۔ اک

وہ اس شخص اس کے اندر سے جتنی بھی جو کہ لوگوں کو اپنی طرف مبذول کرتی تھی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جتنی جگہ پر اس کے لئے ایڈجسٹنگ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھی مگر وہ یہاں رہتا اس چاہتا تھا۔ یہ اپنی طرف سے ہونے والے دوستی کے ہاتھ کو قبول کر سکا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے اپنے

پرانے دوست، مگر، ماں باپ، سکول، اساتذہ وغیرہ یاد آتے تھے۔ اسے کچھ یاد نہیں آتا تھا سوا لہاں اور حیدر کے۔ مگر وہ یہاں کی طور پر رہنے پر آمادہ نہ تھا اور نہ ہی خود کا ذہن بنانا چاہتا تھا۔ میں تو وہ بہت پر فیکٹ تھا۔ اس کے اساتذہ کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر ہوٹل میں وارڈن نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اسے یہاں آئے تین ماہ گزر چکے تھے اور ان تین مہینوں میں ہمارے ہوٹل وارڈن نے اس کی شکایت روٹل علی خان کو کون کر کے دی تھی۔ کبھی وہ کھا کھاتا۔ کبھی ڈانٹنگ ہال میں لوگوں سے بھڑ جاتا۔ کبھی اپنے دم بیٹ سے لڑ بیٹھا تو کبھی راتوں تک جاگتا رہتا (وارڈن کی سمجھ اور دھمکانے کے باوجود) اور اس دن تو حد یز کر رہی تھی کہ حیدر نے ہوٹل میں رہنے والے ایک لڑکے کی جو کہ اس سے بڑا بھی تھا، ریکٹ سے سرمت کر بے چارے کی ناک سے خون نکل آیا تھا۔ جب وارڈن نے روٹل علی خان کو نوٹس دے کر بلوایا تھا جب وہ وہاں آئے تو وارڈن نے حیدر کی شکایتوں کی کتاب سکول دی۔ شکایتیں کیا تھیں، پندرہ ایکس تھا جو کھلا تو روٹل علی خان سر قہام کر بیٹھ گئے۔ وارڈن کی مہوار سے وہاں رکھتے پرورد نہ تھا۔ مگر روٹل علی خان نے بہت سخت سزا بت کر کے بڑی محکوم سے اسے راضی کیا تھا۔ یہ ہوا تھا کہ اس بچے کے والدین تک سناٹا نہیں پہنچایا گیا تھا ورنہ بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ روٹل علی خان کے بہت معذرت کرنے پر حیدر کو ایک آخری موقع دیا گیا تھا۔ روٹل علی حیدر سے ملے تھے اور اس پر بہت ناراض ہوئے تھے۔

"حیدر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟..... تم اسے بھڑکاو اور بدتر کر دیتے تھے۔ تمہاری وجہ سے آج کتنی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ تمہارے اس رویے نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ میں نے تمہارا وارڈن سے وعدہ کیا ہے کہ حیدر اسکو ہر کی حرکت نہیں کرے گا۔ اور تم اب شرافت یہاں دہتا۔ ورنہ تم ہوٹل سے نکال دیئے جاؤ گے۔" انہوں نے بہت دیر تک اسے کھنپایا تھا۔ واپس لوٹ گئے۔ مگر حیدر کو ان کی ناراضگی پر فخر آنے کی بجائے ہنسی آتی تھی۔ ان کے ایک کے چمک چمک نتیجہ یہ نکلا کہ حیدر نے اس واقعے کے ٹھیک کارروار ہوا اپنے دم بیٹ سے بھڑکا کر اس کی ساری کتابیں سمجھا دیں۔ اس کے پیچھے نظام پر عمل دی اور اس کی پٹائی بھی کی۔

اس بار ایک بار پھر روٹل علی خان کو بلوایا گیا اور انہیں صاف صاف کہہ دیا گیا کہ وہ حیدر کو سے لے جائیں۔ حیدر کے احتجاج بھی ابھی نہیں ہوئے تھے۔ اتنی جلدی اس کو پھر سے سکول بدلوانا آسان کام نہ تھا۔ روٹل علی خان کو غصہ بھی کہیں اس کے سکول بدلوانے سے پتھر میں اس کے اندر نہ آجائیں۔ ہوٹل میں تو اب اس کے رہنے کی گنجائش تھی نہیں۔ روٹل علی خان نے کچھ کچھ کے بعد اسلام آباد میں ایک قیث کرانے پہلے لیا۔ یہ ایک گھڑی اپنا رشتہ تھا جو کہ ایک دوست توسط سے انہیں ملتا تھا۔ اس قیث میں انہوں نے ضرورت کا ہر سامان رکھا دیا تھا۔ حیدر کے کپڑے، کھانے، میز وغیرہ وغیرہ۔ پھر انہوں نے بی لہاں اور ایک ملازم کو وہاں بھجوایا۔ ملازم ڈرائیونگ اچھی طرح جانتا تھا اور مگر کے دوسرے کاموں کے لئے بی لہاں کی مدد کر سکتا تھا۔ روٹل علی خان

اب بھی ایک مل نظر آیا تھا کہ حیدر کے استخوانوں کے ہونے تک وہ اسے کرائے کے قیث میں لہاں کے استخوان کے بعد تو ظاہر ہے ان کو اسے واپس کراچی لے کر جانا ہی تھا۔ حیدر کو انہوں نے قیث سے ننگ کیا۔ اپنے ایک دوست کے مگر رکھا ہوا تھا جہاں سے وہ روزانہ اپنے ران اپنے ہی ڈرائیور کے ساتھ جاتا تھا اور پھر چٹائی میں وہی ڈرائیور اسے لے کر گھر آتا تھا۔ مگر رانے کے بعد انہوں نے حیدر کو وہاں سے منگوا لیا تھا۔ وہ حیدر سے بدگمان تھے کہ وہ ان کے ساتھ کے مگر بھی اتنی سیجی حرمیت کر کے ان کو شرمندہ نہ کر دے۔ حیدر بہت خوش تھا۔ بی لہاں سے وہ پورے ساڑھے چار ماہ کے بعد مل رہا تھا۔ ان کی گود میں ماں کو اپنے "کا ناموں" کی تفصیل بتا رہا۔

"حیدر! تم نے جان بوجھ کر یہ سب حرمیتیں کی ہیں نا، تاکہ تم ہوٹل سے نکل سکو؟" بی لہاں اس کی ادنیٰ شمن سننے کے بعد بولیں۔

"بی لہاں! حیدر علی خان ہیں ہم۔ جو کہتے ہیں کر کے دکھاتے ہیں۔ ہم نے کہا تھا نا آپ سے کہ ہوٹل میں نہیں رہیں گے۔ دیکھ لیں۔" وہ نگریا تو بی لہاں نہیں پڑیں۔

"غیر!..... بہت تیز ہو تم۔" انہوں نے اسے گلے لگا کر محبت سے سمجھایا۔

"اچھا! لہاں! حیدر کیسا ہے؟" حیدر نے پوچھا۔

"اچھا ہے..... حیرے میں ہے۔ تم کو بہت یاد کرتا ہے۔" وہ تائید لگیں۔

"بس بی لہاں! کچھ مہینوں کی بات ہے۔ پھر میں واپس کراچی چلا جاؤں گا۔ آپ کے اہم۔" وہ انہیں اس سے بولا۔

"ہاں..... چلی بات ہے یہ کہ میرا اپنا بھی اتنی حیرے بغیر نہیں لگ رہا تھا۔" انہوں نے دل کی انداز دی۔

"جانتا ہوں..... آپ کو میری یاد آتی ہوگی۔ اور میں بھی تو آپ کو کتنا یاد کرتا تھا۔" وہ اپنے بیگ سے اس کی تصویر نکال کر اپنے بیگ کے سر پہاڑ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"حیدر! تمہاری تصویر کو یوں باہر نہ رکھو۔ اگر تمہارے پیپے نہ دیکھ لیا تو وہ خفا ہوں گے۔" بی لہاں نے کہا۔

"کیوں؟..... میں میں خفا ہونے والی کیا بات ہے؟" اس نے جیسے اعزاز میں بی لہاں کو دیکھا۔

"تمہیں بتایا تھا میں نے کہ تمہاری ماں کی تاکید ہے کہ مونا بی بی کی کوئی تصویر سامنے نہ لکھ لے۔" بی لہاں نے کہا۔

"آئی ڈونٹ کیکر۔ اس عورت کو کیا چن ہے کہ میری بی بی کی تصویر میں بیٹائے۔ جی۔" وہ غصہ ایک انداز میں بولا۔

"ہا۔ حیدر! تم نے اپنی ماں کو گالی دی؟" وہ ہوتوں پر ہاتھ رکھے اس کا منہ گلے لگتے۔

"ہا؟..... مائی فٹ۔ وہ میری سوتیلی ماں ہے۔ اسی کے کہنے پر پیپے نے مجھے ہوٹل بھیجا تھا۔

آئی بیٹ ہر سو بج..... (اس میں سے بہت زیادہ غرت کرتا ہوں) "تجور کے لیے میں۔ غرت تھی۔

"تجور! میں نے تجھیں یہ سب تو نہیں سکھایا۔ پھر تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھ لیں بیٹے؟ یہ بات ہے۔ تمہاری یہ باتیں مجھ کو تکلیف پہنچاتی ہیں۔" وہ سر دلی اور تاسف سے بولیں۔

"فانکرٹ اسٹ آف لی! اس!..... وہ بھی اڑانے کے سے انداز میں ہاتھ لہراتا ہوا بولا۔ لی! تارانتلی سے اسے دیکھتی رہیں۔" آل رانٹ ہائی ڈارنگ لی! اس! میں اسکو ایسا نہیں بولوں اوکے، ناؤ جیتر آپ..... آپ کی باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" وہ ان کے گلے میں با ڈالنے ہوئے بولا تو لی! اس گمراہی۔

"میں کہاں کی تم سے فخر وہ سکتی ہوں؟" انہوں نے اسے رخسار پر بیکار کیا۔

سالانہ امتحان دینے تک تجور، لی! اس کے ساتھ اسلام آباد میں رہا تھا۔ وہ ان کی گھرائی بڑی شرافت سے تیار ہوتا، ہائپرڈائٹ اور انہیں خدا حافظ کہہ کر ڈرائیور کے ساتھ سکول جانے کے کار میں جا بیٹھتا تھا۔ کار میں ڈرائیور کے ساتھ ایک گمنام بھی ہوتا تھا۔ اس گمنام کو بھلور نے روڈ علی خان نے تجور کی حفاظت کے لئے سامور کر لیا تھا۔ تاکہ جتنا عرصہ وہ اسلام آباد میں رہے، محفوظ رہے۔ خود روڈ علی خان ہر روز فون پر تجور کی خبر سے روز پاشت کیا کرتے تھے۔ خود بھی اپنے میں کم از کم دو مرتبہ ضرور چکر لگاتے تھے۔ گو کہ لی! اس کی موجودگی میں ان کو یہ اطمینان تھا تجور اب "سدر" ہوا ہوگا۔ مگر وہ مگر اور ہوٹل سے باہر ایک قیث میں ملازمین کے ساتھ رہ رہا سو آئیں اس کی خاص تقریر تھی۔ انہوں نے ہر دن ممالک جانے کے دنوں میں بھی تبدیلی کر لی تھی ان کا سارے کا سارا شینڈل تجور کی ایک حرکت کی وجہ سے ڈسرب ہو گیا تھا۔ مگر بحال، وہ ان انکوئی اولاد تھا اور ان کو ہر کام سے زیادہ اس کی پروا تھی۔ بلکہ ان چند ماہ میں وہ دو مرتبہ جس بار وہ ان کے لئے اسلام آباد میں ٹھہرے بھی تھے۔

خدا خدا کہ تجور کے امتحان ختم ہونے تو روڈ علی خان نے شکر کا سانس لیا اور جس روز آخر پر چہ دے کر تجور واپس آیا تھا وہی روز شام کی قنات سے روڈ علی خان، لی! اس اور تجور کے واپس آ گئے تھے۔ باقی دونوں ملازمین کو کوئی پروا نہ تھا۔

وہ انے تجور کا سواگت سرود چہرے اور لٹکتی ہوئی نظروں کے ساتھ کیا تھا۔ مگر تجور کو مطلق پرہا نہ تھی۔

تجور کے آنے کے اگلے ہی دن روڈ علی خان اور دنیا امریکہ چلے گئے تھے۔

تجور کا ایڈمیشن پھر سے پرانے سکول میں کر دیا گیا تھا۔ اب تجور بہت شوق سے اپنے سکول جاتا تھا۔ اس نے مری کا فونٹ میں بھی ٹاپ کیا تھا اور یونی اپنے ریکارڈنگ پر قرار رکھے ہوئے تھیں مگر عادی لے کر رہا۔ اس کے کمرے میں خرافوں، کیوں، شینڈل اور سر ٹیکس کا اضافہ بتدریج ہوتا چلا جا رہا تھا۔

وہ اس کے سر و مہریاں بیڑی میں جاری تھیں۔ وہ اپنی خالی گود کی جلیں اور محرومی تجور پر مری لگاتی تھیں۔ تجور کی ہر کامیابی ان کی محرومی اور تنہی میں اضافے کا سبب بنتی تھی۔ تجور ہر وہ کام کرنا تھا جس سے وہ اپنے شیخ کی تھیں یا خاندان کی تھیں یا جو کام وہ بنا کو پائندہ ہوتے تھے۔ اس لیے وہ بنا کو پلانے کا شغف کرتا تھا۔

وہ ان کو بے ترتیبی سے چڑھتی۔ وہ ہر نئے منظم اور اپنی جگہ پر دیکھنے کی عادی تھیں۔ تجور ہر طرف ۹۰ ڈیگریاں کر رکھتا تھا۔ لی! دی کا سوسٹ اکٹھ ڈانگ بیکل یا پھر سنگ دم میں نظر آتا تھا۔ لی! دی ان میں رکے صفوں کے ترتیب وار کھنچو کھنچو پر گرے نظر آتے تھے۔ تجور دیکھتا کو پلانے اور ڈالنے کی خاطر اس کے کیم کا کر ہڈول لاؤنج میں چھوڑ دیتا تھا۔ موٹک پہلی کے چھلکے پر سے مگر میں غم سے نظر آتے تھے۔

وہ ان کو سوٹ کارن بے حد پائندہ تھے۔ تجور سوٹ کارن کا کین افہا کہ ان کو دکھا دکھا کر حیرے لے کر رکھتا تھا۔ وہ ان کو اس کی کامیابیوں سے غرت تھی۔ وہ صرف انہیں جلانے کی خاطر وہ انہوں پر کامیابیاں حاصل کرتا جا رہا تھا۔ بلکہ اس کی کامیابیوں میں اسے فائدہ دینا کا ہی تھا اس کی خدش میں آ کر تجور ٹھکی میدان کے ساتھ ساتھ کھیلوں کے میدان میں بھی اور اس کے ساتھ ساتھ شوٹنگ کے مقابلوں میں بھی "نمبر دان" کا ٹیکل چسپاں کئے ہوئے تھا۔

وہ ان کو Pets سخت پائندہ تھے۔ خاص طور پر کتہ۔ وہ اس سے ڈرتی تھیں۔ مگر تجور نے روڈ علی خان سے بے حاشا خدا کر کے اعلیٰ نسل کا کتا منگوا لیا تھا۔ اس کتے کے آنے کے بعد وہ اپنے بے انتہا گھر گیا تھا۔ انہوں نے روڈ علی خان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس گھر میں زیادہ کتا رہے گا یا برا۔ وہ ان کے اس قدر شوشر چانے پر روڈ علی خان نے وہ کتا اپنے کسی دوست کو دے دیا تھا جبکہ اور ان سے بہت ناراض ہو گیا تھا۔

"پاپا! کو میری پسند کو کوئی خیال نہیں۔ اس عورت کی بہت پروا ہے۔ کل کو وہ کہے گی، تجور اس گھر لہارے گا یا نہیں۔ تب کیا پاپا بھی مجھے گھر سے نکال دیں گے؟" لی! اس کی گود میں سر رکھے وہ لہار دیا تھا۔

"تم ان کے بیٹے ہو۔ اولاد ہو ان کی۔ اور اپنی اولاد کو کوئی گھر سے تھوڑی نکالے۔" انہوں نے اس کے ریشم جیسے ہاتھوں میں اٹھایاں بچیرے ہوئے کہا تھا۔

"لی! اس!..... جب میں خود اپنے ہڈوں پر کھڑا ہو جاؤں گا تب میں ایک الگ گھر بنواؤں گا ہاں صرف میں اور آپ رہیں گے۔ یہ عورت واپس نہیں رہے گی۔" اس نے لی! اس سے کہا۔

"اچھا، اچھا..... تمک ہے۔ مگر تیری ڈھن کو تو رہے گی؟" انہوں نے اس کا موڈ بدلنے کی خاطر بچیرا۔

"ڈھن!..... نووے۔" وہ بے ساختہ بولا۔ "ڈھن! جلی فٹ۔ میں بھی شادی نہیں کروں گا۔" اور نے ٹھکی انداز میں کہا۔

”وہ کیوں بھلا؟..... شادی تو ضروری ہوتی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”شادی ضروری ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ مجھے کوئی اعتراض ہی نہیں ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولا

”اچھا..... اور اگر جو کوئی لڑکی من کو بھاگی تو؟“ وہ مسکرائی۔

”تو دے“ وہ جلدی کی سے بولا۔ ”بی اماں! عمر تو اس کی نہیں ہوگی۔ ماما کی طرح ہوتی ہیں

پاپا جیسے لوگوں کو ان کے بچوں سے دور کر دیتی ہیں۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”نہیں بچو! سب عمر تو ایک جیسی نہیں ہوگی۔ اپنے دل کو دیکھنا ہے صاف کرو۔ میری مٹ

بھی تو ہے تمہارے سامنے۔“ انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”آپ جیسا تو کہی دوسرا بھی نہیں سکتا۔ آپ تو بہت چارگی ہیں۔“ تیمور نے ان کے ہاتھ

لے۔ بی اماں کے دل سے اگلے دو چیزوں کو دماغ میں محفوظ کر لیا۔

سکول اس نے اپنی عمر سے بہت پہلے ہی پاس کر لیا تھا۔ رؤف علی خان اسے باہر بیٹھا جانے

تاکہ وہ اپنی اسٹوڈنٹ ویس سے کھل کرے۔ مگر تیمور جانتا تھا کہ یہ بھی دینا کے ”مشوروں“ کا نتیجہ ہو

دینا اسے کسی قیمت پر بھی رؤف علی خان سے، اس مگر سے الگ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت آہ

سے رؤف علی خان سے کہہ دیا تھا کہ وہ کراچی ہی میں ایک اچھی یونیورسٹی میں بی اے آنرز کے

اپنا کر چکا ہے۔

”تمہیں اپنے بابا سے مشورہ لینے یا ان کو بتانے کی زحمت گوارا نہیں ہوئی؟“ وہ نے حیران

میں کہا تھا۔ اس خبر نے تو ان کے دل میں تیمور کے لئے اور زیادہ صدمہ برپا تھا۔

”بڑھتا مجھے ہے۔ کیا اور کہاں اس؟..... یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ مگر میں اس معاملہ کا

رہا ہوں۔ جس یونیورسٹی میں، میں نے اپنا کیا ہے وہ میری کوئی معمولی یونیورسٹی نہیں ہے۔ پاکستان

اسے۔ وہ یونیورسٹی ہے۔“ وہ بہت اطمینان سے بولا۔ وہ صرف پہلو بدل کے رہ گئی تھی۔ مگر وہ

اس سے کچھ کہنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ وہ اس آکڑ بزدلانہ منہ پھٹ اور بدلیز لڑکے کے،

فہم لگنا چاہتی تھی۔ (یہ سارے خطاب انہوں نے ہی تیمور کو دیے تھے)

رؤف علی خان نے بھی زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی۔ ان کے خیال میں تیمور نے کوئی غلط کام

بھی نہیں تھا جس کے لئے وہ اسے نوکسے یا منع کرتے۔

”تمہیک ہے..... اپنا آنرز تم جہاں سے کرو۔ مگر مزید باہر اسٹوڈنٹ کے لئے میں تم کو باہر

دوں گا۔“ انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا جسے تیمور نے سرسری لے لیا تھا۔

یونیورسٹی کی آواز اور بے باک فضاؤں میں اس کی ملاقات صبا سے ہوئی تھی۔ صبا ملک ایک

صد امیر اور آزاد مگر اس نے فطرت رکھتی تھی۔ وہ اس سے ایک سال سنیئر تھی۔ بے انتہا خوب صورت

بے حد طرح دار لڑکی تھی۔ اس کے والدین سنگ پور میں رہتے تھے۔ صبا پاکستان میں بی اے آن

کرنے آئی تھی اور مرزا ہوش میں رہتی تھی۔ تیمور سے وہ عمر میں پانچ چھ سال بڑی تھی مگر اسے قند کا

لور بے بی نہیں کی۔ وہ سہ ماہی پر تھی۔ تیمور نے ہمار سال چھٹی ہی تھی۔

مور سے اس کی ملاقات لاہور ہی میں ہوئی تھی۔ تیمور کے لئے لڑکیوں کے ساتھ دوستی کرنا کوئی

اہم بات نہیں تھی۔ سکول میں بھی اس کی کافی لڑکیاں دوست رہ چکی تھیں۔ صبا ملک نے تیمور کے بے

پامردانہ حسن سے متاثر ہو کر اس کی طرف دینی کا ہاتھ بڑھایا تھا مگر بعد میں وہ اس کی بے پناہ قابلیت

و اپنائت کی گردید ہو گئی تھی۔ دونوں میں دوستی پہلو ہانے سے شروع ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ اس دوستی

لہان کے درمیان موجود ہر پوار کو گرا دیا تھا۔

اس روز صبا کی ہر جگہ سے تیمور اس کے اپنے تمام دوستوں کو (جن میں لڑکیاں اور لڑکے بھی

آل تھے) کو ڈنڈیا قلاب دوست متروہ وقت پر ہائٹ کلب میں موجود تھے تیمور کو رک پر تھے،

ہر لڑکے کو لڑکیاں جب ہانچ گانے سے فارغ ہوئے تو ڈنڈے کے ڈانگک ہال میں بیٹھ گئے۔

نہیں مگر اسے باغی میں ڈنڈے کرنے کے بعد وہ لوگ باہر نکلے۔ اس وقت ان کے گروپ میں ٹولہ کے

لڑکیاں تھیں۔ باغی لڑکے اور چار لڑکیاں۔ ان میں سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تو رک گئیں۔ ان

نیں صبا ملک اور تیمور بھی شامل ہو گئے۔

”ظفر! ہم تو آج رات حسن کے قیام پر رہیں گے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ ان میں سے ایک

”اس کا نام تو تھا، اس نے آپ کے لڑکے سے پوچھا۔

”اگر ریٹیم میرے ساتھ ہوئی تو پھر میں ضرور رک جاؤں گا۔ مگر جب ریٹیم ہی نہیں ہے تو میں

نہیں کر سکتا۔ سب کی ویلے بے پناہ؟“ ظفر نے ہاتھ بے ہودگی سے مسکراتے بولا تو تیمور کے سوا سب

نہ لگے۔

”بیکہ..... چلو، ٹیکسٹ ڈانک سمی۔“ حسن نے آکھ مارتے ہوئے کہا۔

”اور تیمور ابھی تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ ظفر نے اس سے پوچھا۔

”میں..... میں.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”تیمور بھی آج کی رات دس کے گھارے ساتھ ہے۔ تیمور؟“ اس کے جواب دینے سے قبل صبا

نے جواب دے دیا تھا۔ اس کا دلچسپ سا اور اچھا اور انکھیں کچھ خاص بیٹام دے رہی تھی۔

تیمور کچھ گڑبڑا گیا۔ دوستی کی بات دوسری ہی مگر اس طرح کسی لڑکی کے ساتھ رات گزارنا اور

نہیں پوری رات کے لئے عاقب ہو جانا..... یہ وہ پہلی بار نہیں کر رہا تھا۔

”اگر کے گا؟“ مگر میں چلوں۔ گنہ گار۔“ ظفر اپنی ہونٹ کی طرف بڑھ گیا اور باقی لڑکے اور

لڑکیاں اس کی کار میں بیٹھ گئے۔

”مگر..... صبا! میں نے مگر میں نہیں بتایا ہے کہ میں رات کو نہیں آؤں گا۔“ تیمور نے اس

سے کہا۔

”تو کیا یہ اہم ہے؟ فون کر کے کہہ دو کہ آج رات تم دوستوں کے ساتھ ہو۔ سچ آ جاؤ گے۔“ صبا

نے اس کو مل بتایا۔

تیمور نے چنٹ کی جیب سے سو پائل نکالا اور مگر کا فبر ڈائل کر دیا۔ کچھ دیر بعد فون کی ٹونگ

رہیو کیا تو اس نے وہی کچھ دہرا دیا جو سنا نے اس سے کہا تھا اور پھر منوں بند کر لیا۔

حسن، صبا ملک کا کلاس فیلو تھا اور اس کا قیث بھی قریب میں تھا۔ ان لوگوں کے گروپ وہ صرف تیور ہی بنا تھا۔ کمراب وہ "نیا" نہیں رہا تھا۔ تیرہ سبقتی سننے ہوئے وہ لوگ ہلکا جاتے تھے مگر گزری اپارٹمنٹ میں بیٹھے۔ قیث پوری طرح سے ویل ڈیکورڈ تھا اور اس میں پانچ سے چھ بجائے کرے بھی تھے۔

"تمہارے پیش کس کہاں ہیں؟" تیور نے خالی قیث دیکھ کر سوال کیا۔

"وہ لوگ امریکہ میں ہوتے ہیں۔ میرے ڈیڈ وہاں پڑھ کر رہے ہیں اور میں یہاں پڑھتا ہوں۔ یہ قیث میں نے ڈیڈ سے کہہ کر خریدی تھی۔ بوشل وغیرہ میں میرا دم کھتا ہے۔ ایک ایک جج حساب دینا پڑتا ہے وہاں۔ یہ سب مجھ سے تو انہیں نہیں ہوتا۔ یہاں آزادی ہے۔ بے گنہی ہے۔ دیکھ لو اگر میرا قیث نہ ہوتا تو آج کی رات ہم سب بچے سے ہی رہ جاتے۔" حسن نے بڑا کئی میں بازو سال کر کے ہونے آگے ماری اور پھر منوں پڑا۔

"واقعی..... ہر مریجسن کا قیث ہی ہمارے "کام" آتا ہے۔" سونیا نے معنی خیز انداز میں کہا "تم لوگ ہر سال اسی طرح یہاں آتے ہو؟" تیور نے حیران سا ہوا۔

"سال میں کم از کم تین چار مرتبہ تو ضرور آتے ہیں۔" صبا نے سکڑا کر بتایا۔ "مور اس بار تم ہمارے ساتھ ہو۔" صبا، تیور کے بہت نزدیک آتے ہوئے سر کوئی سے سے انداز میں بولی۔

"میں ڈرنک بناتی ہوں۔ چلو نہا سونیا! میری مدد کرو۔" صبا ٹوکوں سے مخاطب ہوئی۔ پھر تینوں بڑی بے تکلفی سے حسن کے خوب صورتی سے بچے ہوئے بکھن میں جا کے بکھن کیسٹ سے شراب کی بوتلیں نکال کر گھجھو میں اڑھ بیٹھ گئیں۔

تیور کے لئے یہ سب نیا تھا۔ آج سے پہلے نہ اس نے "اس حد تک آزادلو" دوست بنائے تھے، نہ شراب پی لی تھی۔ اس کی دوستی صرف حیدر کے ساتھ بہت گاڑی تھی اور وہ اسی کے ساتھ رہتا تھا حیدر بہت سکھا ہوا اور اچھی عادات کا لڑکا تھا۔ شاید یہ اس کی ماں کی تربیت اور باپ کے رعب کا تھا کہ وہ لوگ ملاؤں ازم کے شوق میں اپنی اقدار کی حدود کو پار نہیں کر پاتے تھے۔ جبکہ تیور کا کے پیار اور باپ کی توجہ دونوں سے محروم ہو کر کسی اور ہی سمت جا رہا تھا۔ لی ایل اس سے کتنا ہی دینی، سچی ہی توجہ دیتی تھی۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ اس کی سبکی ماں نہیں تھی۔ تیور نے ان کے علم سے چشم نہیں لپکا تھا۔ اُسے سبکی ماں کے ساتھ ساتھ باپ کی شیش توجہ اور وقت کی بھی ضرورت تھی جو اسے بالکل نہیں ملے تھے۔ پھر بے چاری لی ایل ایل کہاں کہاں تک اسے دینی پابند کر رہا تھوکتی تھی روپیہ اور نام کمانے کے جنون میں جو لوگ اپنی اولادوں کو پش پش ڈال دیتے ہیں ان کے لئے گلہ ہے کہ کیا وہ سب ان کی اولاد سے زیادہ ضروری ہوتا ہے؟ اور اگر "ہاں" تو پھر ملاؤں کو صرف دے کر ہے کہ کیا وہ نام دے کر کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے؟ ان کو بھی کسی دیک کے لاکر یا کسی خفیہ جبری د چھپا کر رکنا چاہئے تاکہ ان کے قدم پھٹیں نہیں۔

ارک بنا کر لڑکیاں لاؤنج ہی میں لے آئی تھیں جہاں انہوں نے اپنے اپنے ساتھیوں کو اپنے انہ سے ڈرنک سرو کیا تھا۔ پھر خود ہی اپنے اپنے گلاس لے کر اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جکر لگا لگی تھیں۔

تیور نے ایک نظر ان سب پر ڈالی۔ وہ لوگ بڑے اطمینان اور معمول کے انداز میں "لی" رہے تھے۔ تیور نے ایک نظر ان پر ڈالی اور دوسری نظر اسے گلاس پر۔ کرشل کے جیتی گلاس میں سے کمرہ ۱۰۰ واہر سیال ماہہ نظر آ رہا تھا۔ اُس نے گلاس کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ دھڑ دھڑا سیال ماہہ اس سے ملنے سے ہوتا ہوا اس کے منہ سے میرا اتر گیا۔ تیور نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ "ارے، یہ کیا؟ تم نے گلاس ایک ہی گھونٹ میں ختم کر لیا؟" حسن نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "ہاں تک میرا خیال ہے تم نے پہلی مرتبہ شراب پی لی ہے۔" حسن نے پوچھا۔

"ہاں..... اسی لئے تو ایک گھونٹ میں خالی کر دیا ہے گلاس۔ بہت ہی برا آندہ ہے اس کا۔" وہ نا کر بولا تو حاضرین زور سے منں پڑے۔

"میری جان! پہلی مرتبہ اس کا آندہ برا ہی لگتا ہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ اس ڈالنے کا سرور اپنا" الہا ہے۔ حسن نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

صبا نے اس کے لئے دوسرا گلاس بتالیا۔ "کو....."

"نہیں..... میں اور نہیں پیوں گا۔" اُس نے منہ کر دیا۔

"کیوں یا ایک ہی گلاس نے "من" کر دیا؟" حسن پٹا۔

"نہیں..... اصل شرا شراب میں کہاں؟ اصل شرف تو....." تیور نے صبا کی طرف دیکھتے

نہ بات اور صوری چھوڑ دی۔

"او....." سب نے معنی خیز نظروں سے تیور اور صبا کو دیکھا۔

"صبا! تم جی جی لے جاؤ تیور کہ اس کا سر بھی نشو پڑے۔" سونیا نے صبا کو آگے ماری۔

"کیوں تیور اور ڈرنک نہیں کرتی تو....." صبا نے معنی خیز نظروں سے تیور کو دیکھا تو وہ ہلکا ہلکا ہوا گیا۔

"اوکے گاؤز!..... گڈ نائٹ۔" تو کم بھی "آدھا نشہ" بھد میں پورا کر لیا۔ "صبا نے ہنسنے ہوئے

ہاکی سے کہا۔

"ہوں..... اچھا مشورہ ہے۔ چلو گاؤز! اب صبا کے مشورے پر سب سے پہلے عمل کرنے میں

ایسا بجا رہے ہیں۔" حسن بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

صبا اور تیور اس کر کے میں آگے تھے۔ صبا نے کر کے کا نائٹ بلب جلا دیا تھا اور وہ اس دم

اور روشنی میں تیور کو دیکھنا نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

تیور کی زندگی کی وہ پہلی رات تھی جو اس نے گھر سے باہر ایک ایسے ماحول میں گزار دی تھی جس

اسے لاکھوں سے کلام "تجربہ دہی" میں دیکھ لی تھا۔ تیور عملی خاکم اپنی عمر سے کئی گنا زیادہ بڑا

”اے کھڑا۔“

”تو رات بہت خوش ہوئے جا رہے ہو۔ میری کسی بھی بات کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت ہی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”آپ کے بارے میں بھی میری جی رات ہے۔ آپ بھی تو کبھی میری ذات کو، میری مرضی کو نہیں دیتے۔“ وہ بھی نے ہلکا توڑ دے جتنی سے اسے دیکھنے لگے۔

”کیا؟“ میں تم کو اہمیت نہیں دیتا؟..... تمہاری ذات، تمہاری پسند، تمہاری مرضی کی میرے لیے اگر اہمیت نہ ہوتی تو میں تمہاری ہر ضد کو یوں آرام سے پورا نہ کرتا۔ یہ سب تمہارے لیے تو کر رہا ہوں تاکہ میرے بعد تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔“ وہ مسک کر بولے۔ وہ خاموش رہا۔

”ملک ہے..... تمہیں جہاں سے ایم بی اے کرنا ہو کر دو۔“ وہ ناراضگی سے کہتے ہوئے وہاں پہلے گئے تھے اور تھوڑے ہی لمحے میں اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے تاقین کو کریدتے ہوئے جانے لگا۔



”پاپا! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ایم بی اے باہر سے ہی کروں گا۔“

دوڑ ملی خان اس وقت کلب جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے جب تھوڑے انہیں ان کے بیٹے ہمارے پر چڑھی۔ مانی کی ناٹ باٹے باٹے ان کے ہاتھ کو لمبر کو رک سے لگے۔ انہوں نے اس کا زلزلہ بیٹے کی طرف موڑا۔ بیٹے کی ٹیٹھی سیٹل پہنچتی دینا بھی چپک کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”پاپا! کب فیصلہ کیسے بدل دیا تم نے؟“ مکھل تک تو تم یہاں سے جانے کو تیار نہ تھے۔“ دینا دھڑلے سے پوچھا۔

”راہل! نام! میں نے سوچا کہ پاپا کی خواہش کو پورا کر دینا چاہیے۔ آخر پاپا بھی تو میری اتنی اہمیت میں ہیں۔“ تھوڑے بعد آتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”وہی بھی پاپا کے سارے بڑے کو صرف اس نے ہی سمجھنا ہے۔“ اس نے ”صرف میں سے“ پر زور دیا تھا۔ ”اس کے لیے ہارڈ بھی دہنی سے ایم بی اے کرنا زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے ہاتھ والے آفس کا کام بھی کر لوں گا۔“ کیوں پاپا؟“ اس نے دل جلانے والے انداز میں دینا کو جواب دیا اور پھر ”اب اس سے باپ کی دست محکم کیا۔ دینا ملے گا کہہ کر گئیں۔“

”شباب! میرے بیٹے!..... مجھے تم سے کبھی امید تھی۔ تم کو اتنی میری پرواہ ہے۔“ دینا ملے اس نے فرط محبت سے اس کے شانے پر چھٹی دی۔ ”مجرب اپنی کی کر رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اپنا بیٹے کرنے کے بعد ہی آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔ تم چار پونے تھریوں میں اپنا بیٹا کیا؟“ اس نے سرری سا بتایا۔

”گفہ..... جس تو پھر جیسے ہی رہائی آئے تم جانے کی تیاری کرنا۔ وہاں ویسے بھی لمبا رشت تو

ہو گیا تھا۔ اسے مختلف تجربات کرنے کا شوق تھا۔ اس رات بھی اس نے اپنی زندگی کے تجربات کی طرح کے افسانے کئے تھے جس نے اس کی زندگی میں خاصی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔

حیدر اگر اس کے ساتھ ہوتا تو شاید اس کی زندگی میں یہ موزن نہ آتا۔ مگر حیدر نے اپنی فیملی اور جی جی اے برین اسپیشلسٹ بننے کا شوق تھا ہی اس نے اسے کالج سے ایف۔ ایس۔ سی کرنا نہیں سے تھوڑا اور حیدر کی راہیں بھی جدا ہو گئی تھیں۔

لی اے آنرز کے اختتام تک حیدر ملی خان سے شاد کرل فریڈر بدل چکا تھا۔ صبا ملک اب اس کے پرانے لباس کی طرح ہو چکی تھی جسے وہ استعمال کے بعد انار کر پھینک چکا تھا۔ وہ کلب بھی کر چکا تھا۔ باقاعدگی سے تو میں مگر اکثر وہاں جاتا تھا۔ البتہ سوئنگ وہ باقاعدگی سے کر عادی تھا اور تقریباً ہر روز ہی سوئنگ کے لئے جاتا تھا۔ حیدر سے اس کی دوستی ویسی ہی تھی مگر وہ میں ملاقات کم ہوتی تھی۔ حیدر اپنی زحالی کی وجہ سے اسے کم وقت دینا تھا اور تھوڑے کے پھیلائے ہوئے کھیلے تھے جن میں اچھے کر وہ حیدر کی طرف نہیں جاتا تھا۔

تھوڑا سا بھی دینا کو بلائے اور ننگ کرنے کا کوئی موقع چاہے نہ نہانے دیتا تھا۔ اس کی تمام تصاویر کمرے سے لٹکوا کر پورے کمرے میں جہاں جہاں دینا کی تصویریں تھیں، ان کے ساتھ آواز سن کر دی تھیں۔ دینا صرف تھلا کی تھیں۔ اس بات کی شکایت وہ دینا ملی خان سے کر چکی تھیں۔ کیا کہیں وہ ان سے کہہ تھوڑے اپنی مرحوم ماں کی تصاویر پھر سے پورے کمرے دی ہیں۔ کس قدر مضحکہ خیز شکایت ہوتی ہے۔ وہ صرف خون کے ٹھوٹے بھر کے رہ جاتی تھیں۔ مگر کے لی اے کرنے کے بعد انہوں نے خوب پر پھر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ تھوڑے کمرے کے یونیورسٹی بھجوا دیں۔ دینا ملی خان نے اس مسئلے میں جب تھوڑے بات کی تو وہ اطمینان سے بولے۔

”مجھے نہیں سے ایم بی اے کرنا ہے۔ میں اس کے نہیں جاناؤں گا۔“

”مگر کیوں؟ تم نے پورے سوچے میں سوچ لیا ہے۔ ڈیٹ وہاں تمہارے لئے چانسز ہیں کامیابی کے۔ آگے بڑھنے کے۔ پھر تمہارا بڑے بھی تو تمہیں ہی دیکھنا ہے۔ اس کے لئے بھرتی ہو کر دینی سے تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔“ دینا ملی خان نے سمجھایا۔

تھوڑے کی اے کرنے کے دوران کالی کر تھوڑے اسے اپنے ساتھ آس لے جائے تھے اور خیر کو سمجھا دیتے تھے کہ وہ تھوڑے کے ساتھ سارا کام سمجھائے رہے۔ خود دینا صاحب بھی کاروبار سے مشغول چھوڑ دیا تھا اور پائلٹس سمجھائے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا کام ان کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹائے۔ خیر ہے ان کے بعد اتنا بڑا کاروبار کی کوئی سمجھنا تھا۔ جے ہے پناہ دینی ملا جیوں کو وہ اپنی دنیوں بچ کر چکے تھے اور یہ جان گئے تھے کہ وہ ان سے کیا کام انداز میں یہ کاروبار چلا سکتا ہے۔ نہ صرف چلا سکتا ہے بلکہ خاصی مثبت تبدیلیاں لا کر حیرت کا کام قاعدہ سے مل سکتا ہے۔

”میرا زور ہوا تو میں اس کے چلا جاناؤں گا پاپا! اور نہ پلیز مجھے مجبور نہ کیا جائے۔“ اس نے دینا

ہے ہی ہمارا۔ تم ہو مل میں رہتا جاو یا پارٹمنٹ میں، جہاں مرضی ہے۔" انہوں نے خوشگوار میں کہا۔

"میں اپنے فلیٹ میں رہتا جاؤں گا یا؟" اس نے جواب دیا۔

"ابن بوش..... گلو گلو۔" وہ مسکرائے۔ تیسروں کے تاثرات دیکھ کر سے لگا تھا۔



اؤہ..... میرے خدا! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔" وہ دونوں پر ہاتھ رکھے۔ بھتی سے بھائی کی

"یقین کر لیجئے۔ یہ حقیقت ہے، خواب نہیں۔" اس کے بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ کم مہم سی بھائی کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"ارے بھئی! اس طرح بے یقین ہونے کی بجائے تم ہمیں اپنی شاندار کامیابی کی خوشی میں مشغول ہونا۔" نیرے کھٹکلا کے بولیں۔

"اُم..... مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں نے ٹاپ کیا ہے پوری یونیورسٹی میں۔" وہ بے انتہا خوش

تھا۔ معید ابھی ابھی اس کا رزلٹ انٹرنیٹ پر دیکھ کر آیا تھا۔ اس نے جرنلزم میں ٹاپ کیا تھا۔ سب

مخوش تھے۔ نیرے کا سر فخر سے بلند تھا۔ عارضین عادل اپنی لائق فائق بیٹی کی شاندار کامیابی پر اپنے

کا شہر ادا کر رہے تھے۔ معید بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو اپنی بہن کی کامیابی کے بارے میں بتا

امبارک یاد وصول کر رہا تھا۔ آٹا قافیلے اور خاندان بھر میں اس کی کامیابی کی خبر پھیل گئی تھی۔

ابک بادوینے والوں کا تانا سنا بندھ گیا تھا۔ ایک آ رہا ہے تو ایک جا رہا ہے۔ سو با اور ملا بھی اپنے

پنڈو ہوں اور بچوں کے ہمراہ اسے مبارک باد دینے آئی تھیں۔ کسی کے لئے چائے بنا رہی تھی تو

لی کے لئے شربت تو کسی کو کھانے پر رکتا دیکھ کر کھانے کے انتظامات میں پڑ گئی تھی۔ پورا ہفتہ تو

کی مہمان داریوں میں نکل گیا تھا۔ وہ بری طرح تھک کے چور ہو گئی تھی۔ اکیلی ہی سے بھی اس نے

بڑیاں لے رکھی تھیں کہ مال پر کام کاج کا بوجھ ان دنوں زیادہ ہو گیا تھا۔

اس رات وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر کچن میں دھو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آج وہ عارضین

ہل سے بات کرے گی۔ اسنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ وقت اور موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اسے زیادہ

پڑ نہ تھی کہ اس کے والدین اس کی خواہش کے مطابق اس کا ساتھ دیں مگر وہ دل ہی دل میں

لہان کر بیٹھی تھی کہ اسے اپنے ماں باپ کو اور بطور خاص باپ کو ملنا ہے۔ اصل مسئلہ انہی کا تھا۔ وہ

ابھی ہو جاتے تو نیرے کی رضامندی کا دوسرا انہی کا بن جاتا تھا۔

وہ برتن دھونے کے بعد وائس بین سے ہاتھ دھو رہی تھی کہ معید نے اسے نیرے کا بیٹا م دیا۔ "ایچا!

ام آپ کو کمرے میں بلا رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر معید تو اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہ اسٹینڈ سے گئے تو لمبے سے ہاتھ صاف کرتے

ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ تم کو اس نے اپنی خواہش پر مانگا ہے۔ اس سے پہلے بھی تم رشتوں کو "نہ" کہہ چکی ہو۔ تہماری اس "نہ" میں سے کہیں رشتے آئے نہ بند ہو جائیں۔ جیسی رہنا اپنی ڈگریوں کو کھانے۔ زندگی ان ڈگریوں کے سہارے نہیں گزرتی۔ زندگی زندہ لوگوں ساتھ کافی جاتی ہے۔ "نہ" سے خراب نہ بنائے گئیں۔

"ام امرا" سے تو میں بھی شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ دوسرے لئے بھائیوں کا ہے۔ اگر اس نے میرے لئے ایسا سوچا ہے تو میرے لئے انہوں کی بات ہے۔ پھر یہ کسی کا عمار سے تو شادی ہرگز نہیں کر لی۔ تعلیم بھی اس کی صرف انٹر سائنس ہے۔ "وہ سنہ" "انٹر سائنس" سے، کوئی چائلز ان پڑھ نہیں ہے۔ اپنا کتا تو لیتا ہے۔ آسان کام ہے۔ کما ہے؟ "نہ" سے مراد کی طرف دلائی کی۔

"اول تو مجھے اس رشتے سے سخت انکار ہے۔ ام ام میں کم از کم مراد سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور کسی بھی جیت پر نہیں۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔" دوسرا اور حتی الامکان میں بولی۔ اسے وہ بڑے شہ پتا ڈاڈا آ رہا تھا کہ اس نے اس کے لئے رشتہ بیچنے کی بات کی ہے۔ عارضین عادل خاموش تھے۔ وہ ماں بچی کی بھراؤں میں رہتے تھے۔

"بابا! پلیز ام کو سمجھائیں۔ یہ بڑی ان شادی کو میرے سر نہ توہیں۔ مجھے ہر صورت ڈپر کرنا ہی ہے۔ یہ ایک گولڈن چانس ہے اور مجھے یہ چانس مس کرنا ہی نہیں۔ ایسا موقع صرف والوں کو ملتا ہے۔ تقدیر نے یہ موقع میرے ہاتھوں کی گھیر میں رکھ دیا ہے تو آپ لوگ کہ میرے ہاتھوں کی گھیروں سے مٹنا چاہتے ہیں؟ پلیز بابا! میری بات مان لیں۔ میرا خواب یہ جارہا ہے تو آپ لوگ کیوں اس خواب سے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں؟" وہ باپ سے بولی۔ ڈیڈی ان آنکھوں کی اچھال سے عارضین عادل کا دل متکا دیا۔ یہ باتیں سب سے بھلائی، سعادت اچھی نہیں تھی۔ جس نے سوائے علم کے حصول کے اور کسی چیز کی فرمائش ان سے نہ کی تھی۔ ا شوق اور لگن نے عارضین عادل کو مجبور کر دیا کہ وہ فیصلہ اس حق میں دے دیں۔

"نیکم ہے بیٹا! تم اپنے خواب کی تعبیر حاصل کر لو۔ میں جسیں اللہ کے سپرد کرنا وہاں سے چند لمحے سوچنے کے بعد اس کے سر پر دست شققت رکھتے ہوئے کہہ دیا۔

"اور وہ بابا! جھٹکے بابا! وہ فرط حسرت سے ان کے ساتھ بچوں کی طرح چٹ گئی۔

"یہ آپ....." "نہ" سے کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ کہنے سے باز رکھا۔ "اب تم جانتے ہو کہ اس کی چیز کی مدد چاہتے ہو تو مجھے بتانا۔" انہوں نے کہا۔ وہ دوپٹے سے اسے صاف کرتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ آندہ جو خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

"میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی بابا! یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" اس نے معیاد

میں کہا۔

مجھتی رہو..... پروردگار جسیں قدم قدم پر کامیابوں سے ہمکنار کرے۔" عارضین عادل

ماں بچی تھی۔ وہ ناراض بیٹیوں میں ایک سرسری ایک نگہ ڈال کر سرشاری باہر چلی آئی۔ ماں کی نئی نے اسے یہ سبیں ضرور کر دیا تھا کہ وہ جاتی تھی کہ عارضین عادل "نہ" کو سمجھائیں گے۔ وہ اپنے لبریکر کی عادت کو وہ جاتی تھی۔ وہ زیادہ دیر اپنے بچوں سے ناراض نہیں رہ سکتی تھی۔

"پاپے نے کیا، کیا؟" کشف کے کمرے سے باہر نکلنے میں "نہ" عارضین عادل پر ہنس پڑیں۔ "پاپے نے کیوں اس کی بات مان لی؟" وہ تو کم سن تھا۔ زیادہ آگے کی نہیں سوچ سکتی۔ آپ تو ہوش ہیں۔ کھانے کے بجائے اس کا ساتھ دے دیا۔ آپ کی فہم پر ہی وہ اپنی خود غور ہو گئی۔ پہلے اپنا بھرا لے۔ پھر ان کے بھی کر لیا اور اب یہ دخل ان کے کرنے کا شوق۔ "وہ فہم سے کہہ لیں۔" "نہ" رشتے آئے تھے اس کے لئے۔ اسے زیادہ اور اتنے اچھے رشتے تو پورے خاندان کی بھی لڑکی کے لئے نہیں آئے تھے۔ بلکہ سو بار وہاں کے لئے بھی نہیں۔ یہ تو خوش قسمت ہے جو کے لئے رشتوں کی تلاش کی ہے۔ نو میں میں بھی سب سے رشتے آئے شروع ہو گئے تھے۔ پہلے ہاتھ کرتے رہے کہ بچی ہے، ابھی اسے شادی بیاہ کے بھائیوں میں نہیں اچھا نہ۔ مینی بچی کہہ لیا اسے میں پہنچا دیا کہ "پاپی" بڑی نہ ہوئی۔ اب ان کے کر لیا ہے۔ لیکن تو عمر ہوتی ہے۔ افسار ہواں ماتم ہو جائے گا اب کے برس ان کے میں اور انیسواں سال شروع ہو جائے گا۔ سو بار وہاں کی اس تو سترہ سالوں میں ہی کر دی تھی۔ یاد ہے؟ "وہ بے فکران بولتی رہیں۔ عارضین عادل دنی سے ان کی سختی رہے۔ وہ شاید یہ چاہتے تھے کہ "نہ" کی بھراؤں میں اچھی طرح نکال لیں۔

"اب لندن جانے کی بات کی تو آپ نے یوں ہی اپنی بھری کر گویا کہ بچی سے حیدر آباد جاری ہو۔ پہنچتی ہوں کہ ہمارے خاندان میں بلکہ سات بیٹوں نے بھی لڑکی کو کرنا ہے۔ باہر بیٹا ہے لہذا ہمارے خاندان کا تو بھی لڑکی کو لڑکھان، امریکہ نہیں گیا۔ آپ جوان لڑکی کو کتنا پیچھے پر آمادہ نے کی ہے؟ ہماری کشف کیا خاندان کی دوسری لڑکیوں سے الگ ہے؟ مختلف ہے؟ آخر کیوں اس لڑکی کا؟" دوسرے بڑے کہہ گئے۔

"نہ" ہمارے کشف واقعی خاندان کی ہر لڑکی سے الگ ہے۔ وہ دوسری لڑکیوں سے جدا ہے۔ وہ خاص ہے۔ میرے لئے قدرت کا ایک اہم اہل تھے۔ ہمارے دوسری لڑکیوں تو ایک طرف وہ تو اس سے بھی زیادہ قابل ہے۔ اس میں بہت صلاحیتیں ہیں۔ وہ اپنی اہل صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہی ہے تو ہم کیوں اس سے منع کریں؟..... اگر اس کی بجائے معیاد ہو اور وہ ایسی کوئی بات کہتا تو؟" اس نے نرم لہجے میں یہی کوئی سمجھایا۔

"یہ یہ کی بات اور ہے۔ وہ لڑکا ہے۔" "نہ" نے عارضین عادل کی بات کاٹی۔

"میری نظر میں بیٹی یا بیٹے کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ نہ میرے لئے بیٹا اور بیٹی برابر ہیں۔ اور اب کو میں اس لئے کسی بات سے منع نہیں کرتا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی خدا اور صلاحیتوں اور ہر ہمدردی وچ سے قربان کرے۔ کشف پر مجھے باز ہے۔ آخر ہے۔ قربان سب سے بڑھ کر اس پر رہے۔ کشف اس بیٹیوں پر ہمارے ہی ہے۔" وہ انہیں قائل کرنے لگے۔

"مگر ہے تو لڑکی۔ اس حقیقت سے آپ کو اکتا تو نہیں ہے؟..... ذکر کیاں منع کرے اللہ۔ کرتے یا دنیا میں نام پیدا کر لے کرنا تو اس کو بھی وہی چاہنا پڑی ہے۔ اگر عمر گل گئی انہی کھ میں تو کون پوچھے گا؟" وہ اپنی پریشانی تاریخ میں۔

"اللہ جب انسان کو پیدا کرتا ہے تو اس سے بھی کئی دواں اس کا جڑنا لیتا ہے۔ اگر کشف کا ہوا گیا ہے تو یہی اس کا مقدر رہے گا۔ ورنہ ہم جگہ بھی کر لیں، ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں۔" عارفین نے یقین پھر لے لیجے میں کہا۔

"مگر ان کی لڑکی کو اتنی دیر بیچنے پر لوگ باتیں نہیں بتائیں گے؟" نیر کو اب دوسری فکر آ جی تھی۔

"لوگوں کا تو کام ہی باتیں بتانا ہوتا ہے۔ کشف کی بجائے اگر معید بھی چلا جاتا تو لوگ اسے باتوں کا نشانہ بناتے۔" عارفین عادل نے فوراً جواب پیش کیا۔

"میرا دل ڈرتا ہے۔ میں کیا کروں؟" وہ پریشان تھیں۔ ماں تھیں۔ عارفین عادل جانتے تھے ان کے دل میں چھپی مانتا کے خوف سے واقف تھے۔

"سب بہتر ہو گا۔ اللہ جو کرتا ہے اچھے کے لئے کرتا ہے۔ تم اپنی بیٹی کو دعا کے ساتھ رخصت کرو گی تو تمہاری دعا میں اس کے لئے ایسا قلمدین جائیں گی جس کے اندر وہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ عارفین عادل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"فیک ہے۔ خدا اسے اپنی امان میں رکھے۔ میری تو سانس میرے بچوں کے لئے دعا کر رہی ہے۔" آخر انہوں نے پار مانا لی۔

"عارفین عادل کھراے۔" چلو۔ اب سو جائو رات بہت ہو گئی ہے۔"

"نہیں..... میں نے ابھی عشاء کی نماز ادا نہیں کی ہے۔ آپ سو جائیں۔ میں نے نماز ادا کر ہے۔" نیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔



اس کی آنکھ گہری نیند سے کھلی تھی۔ چند لوگ تھوہ ہے جس وحشت پس پوچی بستر پر لیٹی رہی پھر آہستہ آہستہ اس کے دواں جگہ پر آئے۔ اس نے دو تین مرتبہ اپنی چٹکیں جھینکیں، پھر ادھر کی نظریں گھما لیں۔ کمرے میں نیم چار کی بجلی ہوئی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر سکی کہ وقت کیا ہو رہا ہے یا رات کا کون سا پہرہ ہے۔ کیونکہ کمرے میں کھڑکیوں پر بھاری پردے چائے تھے جن کی وجہ سے باہر کا سا بالکل چھپا ہوا تھا۔

اس نے سائید خیمل پر دیکھ کر غم میں کوستی سے دیکھا۔ رونق رہتے تھے۔ وہ غم دیکھنے کے بعد بھی پوچی پر بیٹھی رہی۔ اس نے سر ہٹھا کر بیڈ کے دوسرے کونے پر نظر ڈالی۔ یہ خالی تھا مگر اس طرف پادریجن آٹھویں اور کھل ہوا تھا جیسے کوئی وہاں سے اٹھ کر گیا ہو۔

اب کی بارہ آنکھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے لائے لائے ہاں سے تڑپ ہو رہے تھے۔ اس نے اندازہ کیا کہ یہ سلسلہ اسرار اور پھر کبھی کوئی کسی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ تم کو اتنا ہے تو آتا ہے۔ بس اس مرتبہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔"

سلسلہ اسرار اور پھر کبھی کوئی کسی۔

ساتھ دل کر چڑیں دیکھ گئے۔

”یہ دیکھو..... یہ فریم کیا ہے؟“ کشف اسے ایک بڑا ڈونو فریم دکھاتے ہوئے پوچھنے لگی
اُس کا دھیان نہیں اور تھا۔ اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ”دھیان کدھر ہے تمہارا؟“ کشف
اسے ٹوکا۔

”دھیان؟“ ذرا سانس تو دیکھو۔ پھر تمہارا دھیان بھی ابھر اُھر نہیں جائے گا۔“ رابعہ اُ
ٹھٹھی سانس بھرتے ہوئے کہنے لگی۔

کشف نے رابعہ کی نظروں کے تعاقب میں اپنی آنکھیں دوڑائیں۔ دونوں سے چند قدم
فاصلے پر ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک ایٹش وائٹ کاکر لگا رہا تھا۔ اچھا خوب صو
جیولری ہاکس موجود تھا اور وہ تنہی نظروں سے اس جیولری ہاکس کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نوجوان
ڈارک بیوکلر کی جینز اور بیوکلر کا ٹیٹا پہن رکھا تھا۔ اُس کے سیاہ بالوں پر وہ پاپ کا پشہ لگا ہوا
اُس کا رنگ بے حد صاف تھا جو کان کی فیشی لائٹوں میں اور زیادہ چمک رہا تھا۔ اُس کا جسم سٹ
اور ورزشی تھا۔ وہاں موجود کدھار سمیت دو تین اور لڑکوں کی نسبت خاصا لمبا تھا۔
”رابعہ! تم ابھر دیکھو۔ یہ فریم کیا ہے؟“ کشف نے قدرے بیزاری سے لڑکے پر
نظریں ہٹا کر کہا۔

”ہائے کشف! اس شہزادہ گنگام کو دیکھ کر بھی تم کو اس فریم کا ہوش ہے بھلا؟“ رابعہ نے او
سے اسے دیکھا۔

”فار کاڈ سیک رابعہ! چھوڑی حرکتیں مت کرو۔ اس کو بول غیہ سے پن سے مت دیکھو۔ وہ ا
ی دیکھ رہا ہے۔“ کشف نے تجویز کی ہے کہا۔ رابعہ نے دیکھا کہ وہ نوجوان جیولری ہاکس پر سے نظر
ہٹا کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ رابعہ اسے مسلسل دیکھ
رہی ہے۔ کشف بھی اس وقت اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظروں کا تقاسم ہوا۔ نوجوان کی آنکھوں میں شہ
کی چمک ابھری۔ کشف نے جلدی جلدی چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ تو نوجوان کے چہرے کا ر
قدر سے بدلا تھا۔ رابعہ نے بھی جلدی سے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظروں کا تقاسم ہوا۔ نوجوان کی آنکھوں میں شہ
نوجوان کا ڈنٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کشف اور رابعہ بھی کا ڈنٹر کی طرف بڑھنے لگیں۔ رابعہ نے
فریم پسند کر لیا تھا۔ فریم واپس باقی خوب صورت اور قیمتی تھا مگر رابعہ اسے خریدے بغیر فوراً کر سکتی تھی
کشف کی نسبت اس کے مالی حالات زیادہ اچھے تھے۔ کیونکہ اس کے دونوں بڑے بھائی دینی
تھے اور والد کا اپنا بڑا بیٹا تھا۔ جس وقت وہ دونوں فریم لے کر کا ڈنٹر پر پہنچیں تو کدھار اس لڑکے
نے جیولری ہاکس بیک کر رہا تھا۔

”میڈم! آپ اپنی پٹن سے گفٹ بھیجے پسند کر کے بھیجے دیں۔ میں یہ فریم اسی میں بیک
دوں گا۔“ کدھار نے کشف سے کہا۔

”تمہیک ہے۔ آؤ رابعہ!“ کشف ایک طرف اسٹینڈ میں ترتیب سے رکھے گفٹ بھیج رہی تھی۔

اگر۔ رابعہ نے اس کی تھلید کی تھی۔

جس وقت وہ دونوں گفٹ بھیجے پسند کر کے کا ڈنٹر پر آئی تھیں تو وہ نوجوان لاکا اپنا سامان لے کر
اپنا رہا تھا۔

”ارے..... دیکھئے، یہ ہمارا سامان نہیں ہے۔ جو ہمارا سامان تھا اس پر پٹی اپنی دوسری والا
نہ بھیج رہا تھا۔“ کشف نے شاہر کو کول عادت سامان چیک کیا تھا اور اندر موجود پیکٹ کو
بہن ہی تجزیے میں بھیج دی تھی۔

”ارے واقعی..... یہ تو پیکٹ بھی چھوٹا ہے۔ جبکہ ہمارے والا پیکٹ بڑا تھا۔“ رابعہ نے بھی کہا۔
”میرے خیال میں جو صاحب ابھی ابھی لکھے ہیں وہ غلطی سے آپ والا شاہر لے گئے ہیں اور اپنا
اس بھول گئے ہیں۔“ کدھار نے کہا۔

”یقیناً۔“ رابعہ فوراً کدھار کی خیال میں پھنس گئی۔
”چلو، اس کو روکو۔ کہیں وہ نکل نہ جائے۔ میں بے منت کر کے باہر ہی آتی ہوں۔“ رابعہ نے
دلہی سے کہا تو کشف جھٹلائی ہوئی شاہر ہاتھ میں لے کر باہر کی جانب تیز رفتار سے بڑی۔ کدھار
اور اوازہ کھول کر وہ باہر نکلی اور دائیں بائیں نظریں دوڑائیں۔ بائیں جانب وہی نوجوان حڑے سے
الہامین میں تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ اسے شدید غصہ کیا۔

”اے مشر!..... چلو..... اسکیج ڈی.....“ وہ کبھی ہوئی تیزی سے اس کے پیچھے چلی۔
”میں بھی کیا معصیت ہے، میں کب سے آپ کو آواز میں دے رہی ہوں اور آپ ہیں کہ پلے

ہا پار ہے ہیں۔“ وہ پچھلی کا پچھلی نوجوان کے سامنے مڑی تھی۔
نوجوان بے اختیار ڈک گیا۔ ”مجھے کیوں آواز میں دے رہی تھیں؟“ اس نے غصی نظروں سے
”ف کو دیکھا۔

”آپ کو شاید دوسروں کا سامنا اپنے سامان سے بدل لینے کی عادت ہے..... اُس دن آپ
نہیری کتاب اپنی کتابوں میں کس کس کی تھی اور آج آپ میرا پارسل اٹھا کر اپنا پارسل چھوڑ کے
پلے آئے ہیں۔ حد ہوتی ہے لاپرواہی کی۔ دھیان کدھر ہوتا ہے آپ کا؟ آپ کی وجہ سے مجھے کتنی
پیشانی ہوئی ہے۔ دونوں سرجہ اعزازہ ہے کہ آپ کو؟“ کشف سخت جھٹلائی ہوئی تھی۔ اُس کی آواز اڑ
لہی تیز ہو گئی تھی۔

تجور نے اسے دکان کے اندر ہی پھانسا لیا تھا۔ اُس روز والے ناخوشگوار واقعے کو اس کا حافظہ
ارادش کر چکا تھا۔ مگر آج ہونے والے اس واقعے نے اُس دن کے واقعے کو پھر سے اُس کی
اداشت میں تازہ کر دیا تھا۔ اُس نے کشف کو گھور کر دیکھا۔ اُس نے آج بھی سیاہ اسکارف سے اپنا
رہا رکھا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ ہلکی سرتی لے ہوئے تھا۔

تجور نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاہر کو بے اختیار کھول کر دیکھا۔ واقعی بیٹنگ روپ اور
اصل کا ساڑھ اس کے خریدے ہوئے سامان سے بالکل مختلف تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں

اتنی جلت کا مظاہرہ کر بیٹھا اور غلطی سے اس کا رخ بدلتا ہوا نظر آ گیا۔

”دیکھئے کتنے سارے یہی محض اتفاق ہی ہے کہ وہ درجہ میں نے نقلی سے دوسرا سامان اٹھالیا۔ اور اتفاق ہی ہے کہ وہ سامان دونوں سرچہ آپ کا ہی نکلا۔ مگر اس میں میری شہسوار کو شش کا کل نظر نہیں ہے۔ یہ محض اتفاق تھا اور بس۔ اپنی دے..... لیجئے اپنا سامان۔“ تیمور نے اس کی بات شاید بڑھا دی۔

”انسان کو خیرہ داری کرتے وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔“ کشف بد مزگی سے بولی اور کے ہاتھ سے شاید نے کراس کا شاید دے دیا۔

”آپ اتنی جلدی کیوں رہتی ہیں؟“ تیمور نے شاید لیتے ہوئے یکدم پوچھا۔
”جی.....“ وہ دم بخود ہو گئی۔ شاید تیمور سے اسے اس قسم کے سوال کی توقع تھی۔

”میں نے پوچھا ہے کہ آپ اتنی جلدی کیوں رہتی ہیں؟“ تیمور نے اس بات قدر سے مسکرا کر شاید وہ اس کی جھلکا ہٹ سے اب محفوظ ہو رہا تھا۔

”جی نہیں..... میں جلدی کی نہیں رہتی۔ ہاں، البتہ آپ ضرور غائب دماغ رہے ہیں۔“ وہ کر بولی۔

اس سے قبل کہ تیمور کہہ سکتا، رابیدہ دکان سے نکل کر ان کی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ کشف ا دیکھ کر فوراً اس کی جانب بڑھ گئی۔

”کشف! لے لیا سامان وہاں؟“ رابیدہ نے دوری سے پوچھا۔
”ہاں..... چلو چلیں۔“ کشف نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر روڑ کی جانب لے کر

ہوئے۔ تیمور چند لمحوں تک کشف کی پشت کو دیکھتا رہا۔ وہ اس دن کی طرح آج بھی معمولی سے ا میں تھی۔ وہ پہنچی اس روز کی طرح شانوں پر ہی اسٹائل سے پہلایا ہوا تھا۔ ایک آپ سے بے

چہرے پر ہمارا کھٹکا گھبرا اڑ گئے ہوئے۔ تیمور نے ناہنہ دیکھ کر غصوں سے اسے کچھ لمحوں تک د بھر بازنگاہ ایریا کی جانب قدم بڑھا دیے۔

”بڑا زبردست بندہ تھا.....“ رابیدہ اس اسٹیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے تہرہ کر رہی تھی۔
”پتہ نہیں..... میں تو نہیں کیا۔“ کشف اطمینان سے بولی تو رابیدہ کی جان ہی جل گئی۔

”تمہارے اندر تو بدھی روح طلوع کر گئی ہے۔ مجال ہے کہ ذرا اثر ہو جائے۔“ وہ بل کے رہی تھی۔

”اور جی نہیں سہرو گی۔ یہ پھٹنے کی عادت چھوڑ دو۔ کاشف کو ہلک پڑ گئی تو.....“ کو نے رابیدہ کے منگھیر کا نام لیتے ہوئے دانستہ جملہ اھورا چھوڑ دیا۔

”ہائے.....“ بھی تو روتا ہے۔ کاشف پہلے ہی مجھے تنگ کر چکا ہے۔ دور نہ.....“ رابیدہ نے سے جملہ اھورا چھوڑ دیا۔

”ابیں سہرو گی۔“ کشف نے اسے گھورا تو وہ کام سے اچکا کر سکرادی۔

”اُمین میں کیا بہن رہی ہو؟“ رابیدہ نے پوچھا۔
”اُمین وہ دن ہیں فلک کی منگھنی میں۔“ کشف نے اسے جیسے یاد دلائی کرائی۔

”کیا ہوا؟ وہ دن تو یوں چکیوں میں نکل جائیں گے۔ کپڑے تو منتخب کرنے ہی ہیں تا پہلے“ رابیدہ نے اطمینان سے کہا۔

”ابکون کی کوئی اچھا سا جزا؟ تم کیا بہن رہی ہو؟“ کشف نے سادہ سے لہجے میں کہتے ہوئے اُٹھ کر دیکھا۔

”میں بھی آج دیکھوں گی۔ کوئی ڈھنگ کا کپڑا ہوا تو بہن لوں گی۔ دوسرے میڈ خریہ لوں گی۔“
”ہاں نیازی سے بولی۔“ اور پلیز! تم ذرا ڈھنگ سے تیار ہونا۔ اور کم از کم یہ اسکارف مت لیا۔“

”لے جایا ہے۔“
”آہنگ سے تیار ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ کشف نے اسے گھورا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ کپڑے بالکل سادہ مت پہننا۔ بلکہ پھٹکے کام والے پہننا۔ اور ایک آپ بھی لڑنا۔ ایک آپ تو درکار کم آپ ایک تنگ نہیں لگائی۔ اور ہاں کٹے چھوڑا ہوا نہ کوئی اچھا سا کپڑا

ما۔“ رابیدہ نے کشف کی بات دہرائی ہوئی تاکید کر رہی تھی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم ان سب چیزوں ہاں بھانجی ہو جیسے لوگ بھوت سے بھاگتے ہیں ڈر کر۔ مگر پلیز! تم اس فکشن میں ڈھنگ سے

.....“
”فارغا میک رابیدہ! خاموش رہو۔ تمہاری بیک بک بن کر میرا سر ڈھکنے لگا ہے۔“ کشف نے

دوربان ہی میں ٹوک دیا۔
”بیک بک ہے؟“ رابیدہ نے اسے گھورا۔

”اچھا سنو! فضول باتیں چھوڑ دو۔ تم کو جلدی تو نہیں ہے مگر پہننے کی؟“ کشف نے پوچھا۔
”نہیں..... اتنی جلدی نہیں بھی ہے۔ کیوں؟“ رابیدہ نے سوچا کتنے ہوئے پوچھا۔

”مجھے کتنا کشمیر خیرہ ہی ہیں۔ پہلے یاد نہیں تھا۔ اب یاد آ گیا ہے تو سوچا گئے ہاتھوں خیرہ ہی“ کشف نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے..... کہاں سے لوگی؟“ رابیدہ نے پوچھا۔ ”اس ایریا میں تو کوئی تنگ نہیں ہے“
”فکشن“ کے وہیں سے لے لو۔“ رابیدہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

کشف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مراد کی دکان پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ رشتے والی بات ابھی تک کے دماغ میں تھی اور اس کا دل مراد کی طرف سے برا ہو گیا تھا۔ یہ بات رابیدہ کو معلوم تھی۔ کشف

بہت قریبی نکلی ہوئے کے ہاتھ اس سے یونہی ذکر کر رہا تھا۔
”مراد کی دکان سے نہیں۔ نہیں اور سے لے لیتے ہیں۔“ کشف نے منع کر دیا تھا۔
”کیوں؟“ مراد کی دکان میں کیا کر رہی ہے؟“ رابیدہ نے تنگ کر پوچھا۔

”اے بکس کاٹل بنادیں۔“ گامک کی آواز نے اُسے چونکا دیا تھا۔

کشف اپنی مطلوبہ بکس میں لے کر کاڈنٹر پر پہنچی اور مراد سے مل جانے کو کہا۔

”میں کی کیا ضرورت ہے کشف؟ تم سے پہلے لینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ مراد نے کہا۔

”اور آپ سے مفت کتابیں لے کر پڑھنا مجھے پسند نہیں۔“ بلینز، مل بنادی۔ ”اس نے“

سے کہا تو مراد نے دوبارہ اسے ہتھکنٹس کہا۔ بس خاموشی سے مل جانے لگا۔

مل کی یہ سہنت کرنے کے بعد کشف اور رابعہ جانے لگیں تو اس نے آواز دے کر کشف کو

”کشف! ذرا میری بات سننا۔“ بلینز۔

کشف نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ”جی۔۔۔۔۔“ وہ مرگ گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔ بس ایک منٹ۔ اگر تم ہائٹل نہ کرو۔“ مراد نے پہلے

کو دیکھا، پھر جھپٹتے ہوئے اجازت طلب کیے میں بولا۔

رابعہ نے کشف کو دیکھا تو وہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کشف کچھ کہتی کہیں

ی بول پڑی۔ ”کشف! میں ادھر ہوں۔ تم بات کرو۔“ رابعہ نے اس طرف قدم بڑھا دیے

طرف پوسٹ کارڈز سے ہوئے تھے۔

کشف نے بڑی بے بسی کی مراد کو دیکھا۔ ”جی کہنے۔۔۔۔۔ کیا کہنا ہے؟“ وہ اس کے ذ

ہے اس کا ہاتھ ساتھ کھڑی ہو چوری تھی۔

مراد کی سمجھ میں ایک لمبا کوڑا یہی نہیں آیا کہ وہ اس سے بات کرے کیسے۔ یہ لڑکی جو دیکھنے

پھولوں کی ڈاک سی ڈال لگتی تھی، مگر کسی چٹان کی طرح مضبوط تھی۔ جس کے سامنے کھڑے ہو کر

کرتا ہی بہت مشکل کام لگتا تھا۔

”وہ۔۔۔۔۔ تم نے انکار کیا کیوں کیا ہے؟“ مراد نے گھما پھرا کر بات کرنے کی بجائے سیدھا

سوال کر ڈالا تھا۔

کشف خوبصورت چپ سی ہو گئی۔ اس کے خیال میں نہیں تھا کہ مراد اس طرح اچانک اس سے

سوال کر لے گا اور وہ بھی اتنی مصروف جگہ پر۔ اُس نے ایک گہری سانس لی۔

”میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب آپ کو پسپو دے بھی ہوں گی۔“ وہ بھینچتی سے بولی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ای نے بتایا تھا کہ تم نے ممانی سے کہا ہے کہ تم ایم اے کرنے کے لئے لندن

چاہتی ہو۔ لیکن کشف! میں تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔“ مراد نے کہا۔

”میرے خیال میں یہ جگہ اس قسم کی گفتگو کے لئے نامناسب ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں

انکار کی تعمیل ہی وجہ ام کو ہوا ہوا کرتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ وجہ اختصار کے ساتھ آپ تک پہنچائی

ہے یا نہیں؟ مگر بلینز میں اس ٹاپک پر دوبارہ بات کرنا پسند نہیں کروں گی۔ ہم ابھی کرنا ہیں۔ بس

ایک رشتہ کا کافی ہے ہمارے لئے۔ کسی نئے رشتے کو میرا دل قبول کر جائے گا اور نہ ہی ذہن۔ ا

میں چلوں گی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ خدا حافظ!“ کشف نے مختصراً کھلم کھلا میں کہا اور آگے ب

اور صرت زدہ نظروں سے کشف کو دیکھ رہا۔ وہ رابعہ کو ساتھ لے کر دکان سے باہر چلی گئی

اور اوشے کے دروازے سے بھی اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور تب تک دیکھا رہتا جب تک

دک مڑ کر قلاب نہ ہو جاتی۔ مگر تھوڑی سی آواز پر وہ چونک گیا۔ تھوڑا اُسے مل جانے کو کہہ رہا

ہے کہ چونک کر اُسے دیکھا، پھر مل جانے لگا۔ تھوڑی ہی سی فز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کی کون جی؟“ تھوڑے مراد سے سرسری سا سوال کیا۔ یہ جانے بغیر کہ یہ سوال اسے برا بھی

ا ہے۔ مراد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں مل گیا ہے کہ میں نے ان محترمہ کو نہیں دیکھا ہوا ہے۔ شاید کسی انٹینیوٹ میں۔“ تھوڑ

اور محبت بولا۔

”میری کرن ہے۔“ مراد نے اختصار سے کام لیتے ہوئے بتایا۔

”وہ۔۔۔۔۔ اچھا اچھا۔ مگر تمہارے کیوں تمہاری کرن مجھے بڑی دیکھی بھالی سی لگ رہی ہے۔“

لے جے کمال کی ایکنگ کرتے ہوئے کہا۔

”وسکا ہے تم سے اُن سی وی پی دیکھا ہو۔“ مراد نے سادگی سے کہا۔

”لی وی پی؟“ کیا کوئی ایکٹریٹر وغیرہ ہیں؟“ تھوڑ بولا۔

اُسے نہیں، کشف ایکٹریٹر نہیں ہے۔ یہ آخر ہے۔ رائٹر ہے۔ اخبارات، رسائل وغیرہ میں

ا ہے۔ آج کل تو اس کا ایک ڈرامہ بھی آرہا ہے۔ کشف کے بول کو ذرا مایوسی دے کر کرنی وی

والے پیش کر رہے ہیں۔ کشف اپنے لکھی نام کائنات کے نام سے لکھتی ہے۔ اس کا انٹر و بھی

اچھا ہے لی وی پی۔ ایک مریج جب اس کا ناول ڈرامے کی شکل میں آنے والا تھا تب اور دوسری

اب اس نے یہ خودی میں ٹاپ کیا تھا تب۔ ہو سکتا ہے تم سے تب ہی دیکھا ہوا ہے۔“ مراد

بہ بات سے انداز میں بتا رہا تھا اور تھوڑ کائنات کے نام پر چونک گیا تھا۔

فائنات نام کی ادیبہ جو پچھلے کچھ عرصے سے اس کی پسندیدہ رائٹر میں شمار ہونے لگی تھی۔ کشف

دات ایک سی لڑکی کے دو نام تھے مگر کیا یہ اہوا تھا۔ اس کی تحریریں اسے بہت پسند تھیں۔ اُس کا

پاں، اُس کے ناولوں، افسانوں کے پلاٹ بہت اگ قسم کے ہوتے تھے۔ اُس کے قلم کی بے

دلی کسی تھوڑ کی طرح سیدھی دل میں کھپ جاتی تھی۔ اور کشف وہ لڑکی تھی جس سے تھوڑ کی تحن

دلی ہوئی تھی اور تین سی ملا تھیں بہت ناخوشوار ثابت ہوئی تھیں۔

”کائنات اور کشف ایک سی لڑکی ہے؟“ تھوڑ بڑا برا تھا۔ ”ناٹ کنڈ۔“ اس نے منہ بنا کر مراد

کہا اور مل سے کہہ کر شاہ رخا کر دکان سے باہر نکل آیا۔

”جتنی جتنی لڑکی خود ہے، اس سے کہیں زیادہ کڑوا دات اس کی تحریر میں ہے۔“ تھوڑ پارانگ ایسا

ہات بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

جواب دیا۔

”خاصا بیک گھٹ خرچا ہے تم نے اس کے لئے۔ اپنی دے تم جاؤ۔ میں بھی جا رہا ہوں۔
ولید دراز میں سے ایک سفید رنگ کی فائل نکالے ہوئے عام سے کچے میں بولا اور باہر نکل گیا
بھی اس کے پیچھے پیچھے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی آئی۔ ولید اور وہ دونوں پورے تک آگے
ہوئے آئے تھے۔

”ہائے۔“ ولید نے سسکا کر ہاتھ پٹایا اور اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ماہ نور اس کے ”پا۔“
جواب میں سسکا بھی نہ سکی۔ بس خاموش کڑی اس کی کار کو باہر جاتے دیکھتی رہی۔ جب ولید کو
گیت سے باہر نکل گئی تب وہ دوسری کار میں بیٹھی اور ڈرائیور کو مطلع کر چکے کو کہا۔ ”مگر آگے
روڈ پر دھڑکی ہوئی چلی جا رہی تھی اور ماہ نور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے پر کچھ
آنے والے تاثرات تھے۔



”زندگی اتنی بڑی محبتیں دیتی ہی کہاں ہے کہ اس میں سے نفرت کے لئے حصہ الگ کیا
جائے؟“ جو نفرت کرتے ہیں ان کے دلوں میں اس کی جگہ اس لئے بن پائی ہے کہ وہ خود نفرت کو
میں جک دے دیتے ہیں۔ میری نظر سے زندگی کو دیکھو تو زندگی صرف محبت ہے۔ اور محبت خدا
”محبت بادشاہ ہے جذب کے عالم میں کہہ رہے تھے۔
”محبت خدا ہے۔“ خدا محبت ہے۔ یہ کائنات وجود میں آئی تو کیونکر آئی؟..... کوئی بتا سکتا
ہے؟“ وہ خاتون پر نظر ڈالتے ہوئے سوال کرنے لگے۔
”اس لئے کہ خدا کو اپنی مخلوق تخلیق کرنی تھی، اپنی عبادت کے لئے۔“ ایک خاتون نے سوچ کر
”دیا۔“

”عبادت کے لئے فرشتوں کا ایک جہم پہلے ہی سے موجود تھا۔ کائنات کی تخلیق کا سبب عبادت
انہیں ہے۔“ وہ بولے۔

”غرض میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں سوال تھا۔

”آپ ہی بتا دیجئے سرکار“ ایک اور خاتون نے کہا۔

”عشق..... محبت..... یہ کائنات وجود میں آئی مگر عشق کی وجہ سے۔ میرے پیارے
پاکستان..... وہ عشق جس نے اپنے رسول ﷺ، اپنے پیغمبر سے کیا۔ اپنے پیارے حبیب محمد
ﷺ سے۔ آپ ﷺ کی خاطر ہی تو یہ دنیا تخلیق کی گئی۔ یہ کائنات بنائی گئی۔ میرے رب کو
اپنے حبیب کا کائنات محمد ﷺ سے عشق تھا۔ آپ کے عشق میں یہ دنیا بنی تاکہ ہم بھی اپنے حبیب محمد
ﷺ سے محبت کریں۔ آپ ﷺ نے بھی پیغام محبت دیا ہم انسانوں کو..... پیغام محبت..... پیغام
الہی..... ”سبحان اللہ!“ ان کے چہرے پر عشق رسول کا رنگ نمودار کیا تھا۔

”جب ہمارے اللہ اور اس کے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ نے ہمیں محبت کرا سکھایا ہے تو پھر ہم نفرت
کے کیسے کیسے گئے؟ جب ہماری بنیاد ہی ”محبت“ ہے تو نفرت کی دیکھ اس میں کس طرح لگ گئی؟
ہی تو میں اپنے پیارے نبی ﷺ کا پیغام ان کی امت تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہوں۔ محبت کرو اور
محبت پاؤ۔ یہ حسد، بغض، یہ نفرت، یہ سب اڑوڑ ہیں جو تمہارے دلوں میں جبکہ پاکیزگی کے
دھماکے ہیں اور موقع ملنے ہی پر ہم کو بڑپ کر جاتے ہیں۔ کوئی تم سے زیادہ پیسے والا ہے تو تم کو حسد
اور شروع ہو جائے گا کہ یہ بندہ مجھ سے زیادہ آسائش میں کیوں ہے؟..... کوئی کامیابی پالے تو تم

اے ہے۔ اور اگر یہ دیوانگی رب کے لئے ہو تو.....
 "یہی دیوانگی میرے رب کے لئے نہیں، میرے محبوب کے لئے ہے۔ میں رب سے محبت کرتی
 ہوں، مگر اپنے محبوب کے سوا مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا، کچھ بھائی نہیں دیتا۔" وہ ان کی بات کانٹے
 لے کر بھاگنے لگی۔

لوہر کو حنا سے بادشاہ خاموش ہو گئے۔ سب خواتین بھی گم گم ہو کر ماہ نور کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔
 "لوہر کب رہی ہے کم بخت۔" ایک مرد سیدہ خاتون نے بے حد جاگواڑی سے قد رے بلند آواز
 لے کر پھونکنے لگی تاہر کی۔

ماہور نے نظروں کا لہو یہ اس عورت کے چہرے کی طرف موڑا۔
 "کون نہیں..... عشق....." ماہور نے ذرا سا سکر کے کہا۔ اس کی جھیلی سی آنکھوں میں جھپٹتی تھی
 اداس شمع تھی۔

"ہمارے نماز کا وقت ہو چلا ہے۔" اسی جملے حنا نے بادشاہ نے ہماری آواز میں کہا۔ اس کا مطلب
 کہ اب غفلت بھی بڑا خواست ہو گئی ہے۔

خوشی احترام کے ساتھ انھیں سلام کرتی ہوئی یکے بعد دیگرے باہر نکل گئیں مگر وہ بیخوبی
 ہی پورا کرہ خالی ہو گیا تھا۔ حنا نے بادشاہ دوسرے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسی اس
 دلیلی جگہ سے اٹھتے ہوئے انھیں کہا۔

"آواز رکھو کہ میرے سر کا راز....." بڑا عجیب سا انداز تھا مگر کیا نہ تھا۔ اس کا ان کو مخاطب کرنے کا
 وہ ایسی انداز تھا۔ حنا نے حنا سے بادشاہ کو کہہ گئے۔

"یہ ایک نذرانہ ہے آپ کے لئے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔" اس نے قرآن پاک بعد
 لے کر احترام و ادب کے ساتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔

حنا نے بادشاہ کچھ کہتے کہتے دروازے کے ان کی نظریں قرآن حکیم کی طرف تھیں مگر ان کی نظروں
 لاشعور کی کیفیت صاف تھی۔

"تم جانتی ہو ہم نذرانہ نہیں لیا کرتے۔" کچھ لمحوں کے سکوت کے بعد وہ بولے۔
 "یہ صرف نذرانہ نہیں ہے....." وہ کہتے کہتے رکی۔

"تم ایسی چیز لاتی ہو کہ ہم اس کو نہ قبول کریں تو تمھارے ہونے کا ڈر ہے..... ٹھیک ہے۔" وہ
 بات میں سر ہلاتے ہوئے بولے اور اپنے پیچھے ٹھکڑے خدمت کار کو اشارہ کیا۔ خدمت نگار کا
 ہاتھ کھینچا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے احترام سے قرآن پاک کو اصل سیٹ افغانیا۔ حنا نے
 اٹھانے کی بڑی عقیدت کے ساتھ قرآن حکیم کو بوسہ دیا۔

"یہ تجھ کو نہیں دیتا۔" وہ کہہ کر اس کے بدلے تم کو کیا چاہتے؟..... جو مانگو گی، ہم دیں گے۔
 دیکھو وہ ہماری استغاثت کے دروازے میں ہو۔" انہوں نے ماہور سے کہا۔

ماہور نے لوہر کو خلی جھیلن کو امید کے چاند سے روشنی کی۔ اس نے ان کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں

کو جلیں شروع ہو جاتی ہوئے کہ یہ کامیابی ہی کو کیوں ملی؟..... کوئی نہیں رہا ہے تو تم نفرت
 کو دیکھتے ہو کہ یہ نہیں کیوں رہا ہے؟..... کوئی اچھائی کر رہا ہو تو دل میں غور شک آئے گا
 اچھائی کر رہا ہے اس کے پیچھے اس کے کیا مقاصد ہوں گے؟..... بھائی، بھائی کا دشمن ہے
 بہن سے ملتی ہے۔ بیٹا، باپ سے خائف ہے۔ ماں سے بیٹی شاک ہے۔ یہ سب کچھ

ہے؟..... اس کی بیاہ بھی سبکی ہے کہ ہم نے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم شیطان کو اپنے دل
 دے دیتے ہیں اور بس۔ پھر باقی کام ہی کا ہوتا ہے۔ وہ نفرت کا ہزار ہا سائے اندر بھرتا شروع
 ہے اور اس ذہن کو اپنی روگوں میں پھیلانے کا کام ہم خود کر لیتے ہیں۔ چاروں کی زندگی ٹوٹ

کیوں نہ اسے محبت کی پٹائی میں بھگوئی۔ کیوں اسے نفرت کے زہر میں ڈبو کر اپنی عاقبت بھی
 کریں اور اپنی دنیا بھی؟..... نفرت سے صرف بے سکونی ملتی ہے، بے چینی ملتی ہے، درد ملتا ہے،

کرنے والے صرف کھوتے ہیں۔ ہاں، اگر کچھ پاتے ہیں تو یہی کچھ جو ابھی میں نے بیان کیا۔
 کو ہانپنے کو دامن میں بھرا رہا ہے کہ کبھی تم اپنا دامن خالی نہیں پاؤ گے۔ یہی محبت جو ہم
 رسول ﷺ تک لے جانے کے بعد سیدہ امیہ اپنے اللہ سے ملانی ہے اور ہم عشق رسول ﷺ کے

اپنے رب تک پہنچ جاتے ہیں۔
 غور میں بہت غور سے ان کی بات میں رہی تھیں۔

"بندے سے عشق کہاں پہنچاتا ہے سرکار؟" ماہور جو ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی وہ
 بیٹھی۔ اس کی آواز نے خاتون کو اس کی جانب مڑنے پر مجبور کر دیا۔

"بندے سے عشق تو ایک روزن ہوتا ہے۔ بندے سے عشق صرف عشق حقیقی تک پہنچنے کا
 ہوتا ہے۔ اس روزن سے نکل کر سکھ سید ان میں آ جاتے وہ لای عشق حقیقی کی مہمان پاسکے۔
 اس روزن کو دھڑک کر آگے نکلنے کا راستہ تلاش کر لے، وہی کامیاب رہتا ہے۔ اور جو اس روزن
 "نکل" سمجھ لے اس کے لئے آگے کے سارے دروازے بھی بند کر دیے جاتے ہیں۔" وہ

بادشاہ نے جواب دیا۔
 "اور جو یہ روزن خود ہی آگے کا راستہ نہ دے تو؟" ماہور نے پوچھا۔

"روزن خود سے بھی راستہ نہیں دیتا۔ بندے کو خود اس میں سے راہ دکھائی ہوتی ہے۔ یہی وہ
 پڑی تیریاں خود سے بھی نہیں نکلتیں۔ ان کو ان کا پڑنا ہے۔ من میں گن جگانے سے بچتی ہے۔ امید
 روشن کرنا پڑتا ہے، خود سے روٹی نہیں پھوٹ پڑتی۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

"مجھے نہیں چاہیے۔ میں صرف اسی روزن تک محدود ہونا چاہتی ہوں جس کے عشق
 مجھے حقیقت میں عشق کے معنی سمجھائے ہیں۔ میں اس کے بعد کسی اور کے عشق کی تمنا نہیں بدھتی۔
 نور کے لیے میں کچھ تو عجیب تھا۔

"ہم نے کہا، روزن میں سے راہ دھڑکنا بندے کا کام ہوتا ہے۔ تو راہ نہیں دھڑکے گی تو
 روزن تک محدود رہ جائے گی۔ اور اگر تو راہ دھڑکنا نہیں چاہتی تو اس کا کیا کیا جائے گا؟"

ہاؤور پر نہیں لگی تھی مگر ان کی آنکھیں جیسے کہیں کسی اور دنیا میں جھانک رہی تھیں۔ ہاؤور، آنکھوں کے جلال کی تاب نہ لاکر اس نے پلٹیں جھانکیں۔

”میرے سر کا راتھ تو جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مجھے اس کے بدلے کچھ نہیں چاہیے۔

لے لیجئے بہت ہے کہ آپ نے اس تجھے، اس نذرانے کو قبول فرمایا ہے۔“ وہ عقیدت سے بولی۔

”بھڑکی اگر زندگی میں کسی بھی کچھ چاہو تو ہم سے کہہ سکتی ہو۔ ہم نے تم سے وعدہ کیا ہے۔

خالی نہیں نہیں لوں گی۔“ وہ بولی۔

”بھڑکی میرے سر کا ایسا نام رکھ دیکھیں گے جو صرف آپ ہی سے ہمیں مل سکا

وہ ذوقی لہجے میں بولی۔

معاذ بادشاہ نے بے حد بنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔ ان کے چہرے پر بنجیدگی کی جھلک اور گرم

مٹی تھی۔

”جو بھی مانگو، مانگ لیتا۔ مگر اس بات کا خیال رکھنا، مانگ تمہاری حدود اور ہمارے مقام

تجاوز نہ کر پائے۔“ بیڑے ہی معنی خیز انداز میں انہوں نے گویا اُسے کھنڈیا تھا۔

وہ پلٹ گئے اور ہاؤور جیسے سر اور جھکی نظروں کے ساتھ ان کے قدموں کے نشانات دیکھتی رو

”ہم نے سب کے لئے انگلیں پہلے ہی سے خرید لے تھے اور بیک بھی کر لے ہیں۔“ ہاؤور کافی

محنت بھرتے ہوئے کہنے لگی۔

”گنڈ..... کافی اچھا ہنٹ ہو۔“ ولیدہ سرگرایا۔

”جینک یو۔“ وہ بھی ہولے سے سرگرائی۔

”تمہاری کھلی کا کھر کہاں ہے؟..... میرا مطلب ہے کہ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟“ ولیدہ

باہر عام سے انداز میں پوچھا اور ساتھ ساتھ کافی کھلی پینے لگا۔

”بس چند روٹ کی ذرا سی پر ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔“ ہاؤور نے بتایا۔

”وہ قرآن پاک کہاں ہے خریدنا قائم ہے؟“ ولیدہ نے سوال کیا۔

”خیر ہے؟“ اس نے کھلی پوچھ رہی تھی۔

”بس یو، کھنڈے کافی پر ٹینک چڑھ گئی تھی۔ کافی پسند آیا تھا۔ کسی کو گنٹ کرنے کے لئے بہت

اچھا چیز ہے۔“ ولیدہ نے سادہ سے لہجہ میں کندھے اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ہاؤور نے اسے دکان

وامر اور وہ جگہ بھی بتادی جہاں سے اس نے قرآن پاک خریدا تھا۔ اس کے بعد ولیدہ نے ہاتھوں کا

بار اصرار موڑ دیا اور ہاؤور کے دل میں جو کلک سا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔



”بیٹو تمہارا ہاؤ آ رہی؟“ رمیز پر چور ہوا تھا۔

”ویری فائن..... تم تھاکو؟“ تیمور خوش دلی سے پوچھ رہا تھا۔

”جسے میں ہوں..... تم تھاکو، تھاریاں ہو گئیں؟“ رمیز نے معافانے کے بعد اسے کرسی پر بیٹھنے

کا اشارہ کیا۔

”کبھی تھاریاں؟“ تیمور نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

”ہاؤور پر نہیں لگی تھی مگر ان کی آنکھیں جیسے کہیں کسی اور دنیا میں جھانک رہی تھیں۔ ہاؤور،

آنکھوں کے جلال کی تاب نہ لاکر اس نے پلٹیں جھانکیں۔

”میرے سر کا راتھ تو جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مجھے اس کے بدلے کچھ نہیں چاہیے۔

لے لیجئے بہت ہے کہ آپ نے اس تجھے، اس نذرانے کو قبول فرمایا ہے۔“ وہ عقیدت سے بولی۔

”بھڑکی اگر زندگی میں کسی بھی کچھ چاہو تو ہم سے کہہ سکتی ہو۔ ہم نے تم سے وعدہ کیا ہے۔

خالی نہیں نہیں لوں گی۔“ وہ بولی۔

”بھڑکی میرے سر کا ایسا نام رکھ دیکھیں گے جو صرف آپ ہی سے ہمیں مل سکا

وہ ذوقی لہجے میں بولی۔

معاذ بادشاہ نے بے حد بنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔ ان کے چہرے پر بنجیدگی کی جھلک اور گرم

مٹی تھی۔

”جو بھی مانگو، مانگ لیتا۔ مگر اس بات کا خیال رکھنا، مانگ تمہاری حدود اور ہمارے مقام

تجاوز نہ کر پائے۔“ بیڑے ہی معنی خیز انداز میں انہوں نے گویا اُسے کھنڈیا تھا۔

وہ پلٹ گئے اور ہاؤور جیسے سر اور جھکی نظروں کے ساتھ ان کے قدموں کے نشانات دیکھتی رو

”ہم نے سب کے لئے انگلیں پہلے ہی سے خرید لے تھے اور بیک بھی کر لے ہیں۔“ ہاؤور کافی

محنت بھرتے ہوئے کہنے لگی۔

”گنڈ..... کافی اچھا ہنٹ ہو۔“ ولیدہ سرگرایا۔

”جینک یو۔“ وہ بھی ہولے سے سرگرائی۔

”تمہاری کھلی کا کھر کہاں ہے؟..... میرا مطلب ہے کہ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟“ ولیدہ

باہر عام سے انداز میں پوچھا اور ساتھ ساتھ کافی کھلی پینے لگا۔

”بس چند روٹ کی ذرا سی پر ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔“ ہاؤور نے بتایا۔

”وہ قرآن پاک کہاں ہے خریدنا قائم ہے؟“ ولیدہ نے سوال کیا۔

”خیر ہے؟“ اس نے کھلی پوچھ رہی تھی۔

”بس یو، کھنڈے کافی پر ٹینک چڑھ گئی تھی۔ کافی پسند آیا تھا۔ کسی کو گنٹ کرنے کے لئے بہت

اچھا چیز ہے۔“ ولیدہ نے سادہ سے لہجہ میں کندھے اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ہاؤور نے اسے دکان

وامر اور وہ جگہ بھی بتادی جہاں سے اس نے قرآن پاک خریدا تھا۔ اس کے بعد ولیدہ نے ہاتھوں کا

بار اصرار موڑ دیا اور ہاؤور کے دل میں جو کلک سا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔

”ہاؤور پر نہیں لگی تھی مگر ان کی آنکھیں جیسے کہیں کسی اور دنیا میں جھانک رہی تھیں۔ ہاؤور،

آنکھوں کے جلال کی تاب نہ لاکر اس نے پلٹیں جھانکیں۔

”میرے سر کا راتھ تو جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مجھے اس کے بدلے کچھ نہیں چاہیے۔

لے لیجئے بہت ہے کہ آپ نے اس تجھے، اس نذرانے کو قبول فرمایا ہے۔“ وہ عقیدت سے بولی۔

”بھڑکی اگر زندگی میں کسی بھی کچھ چاہو تو ہم سے کہہ سکتی ہو۔ ہم نے تم سے وعدہ کیا ہے۔

خالی نہیں نہیں لوں گی۔“ وہ بولی۔

”بھڑکی میرے سر کا ایسا نام رکھ دیکھیں گے جو صرف آپ ہی سے ہمیں مل سکا

وہ ذوقی لہجے میں بولی۔

معاذ بادشاہ نے بے حد بنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔ ان کے چہرے پر بنجیدگی کی جھلک اور گرم

مٹی تھی۔

”جو بھی مانگو، مانگ لیتا۔ مگر اس بات کا خیال رکھنا، مانگ تمہاری حدود اور ہمارے مقام

تجاوز نہ کر پائے۔“ بیڑے ہی معنی خیز انداز میں انہوں نے گویا اُسے کھنڈیا تھا۔

وہ پلٹ گئے اور ہاؤور جیسے سر اور جھکی نظروں کے ساتھ ان کے قدموں کے نشانات دیکھتی رو

”اے بھی باورڈ جانے کی۔ اور کون سی تیاریاں سمجھ رہے ہو تم؟“ ریزہ اپنے مخصوص پے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”اوہ ہاں..... وہ تو ہوری ہیں۔ ابھی کچھ بچے زور دیکر سب مٹ کر دانتے ہیں مجھے۔ ویسے ابھی دو دفعہ حائل ماہ ہیں جانے میں۔“ تیمور نے جواب دیا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ یہ والا تجربہ کیا کر رہا ہے؟ یہ ڈانگ والا؟“ ریزہ نے پوچھا۔

اس وقت تیمور اور ریزہ اس جگہ پر تھے جہاں ریزہ مختلف ماڈلز کو ریسرچل کروا رہا تھا۔ ریزہ ریسرچل کے لئے سبکس آتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جو مختلف قسم کی ڈانگ اور ایکٹنگ ولیم ریسرچل میں کام آتا تھا۔ آئے دن شوہر سے متعلق لوگ یہاں کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں آتے تھے۔ اس بلڈنگ میں ایسے سات سے آٹھ بڑے بڑے ہال موجود تھے۔ اس ہال میں اسٹیج بنا ہوا تھا جہاں ابھی ماڈل لڑکیاں اور لڑکے پر پیش کر رہے تھے۔ ریزہ ان کی ریسرچل کروانے میں مصروف تھا۔ جبکہ تیمور کچھ دیر قبل ہی وہاں آیا تھا اور چونکہ اس ریسرچل سے اس کا تعلق نہیں تھا صرف ریزہ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ سو وہ ریزہ کو مصروف دیکھ کر اسی ہال میں رکھی خالی کرسیوں سے ایک پر بیٹھ گیا تھا اور ریزہ کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ریزہ بھی اسے دور سے دیکھتا تھا اور ہاتھ ہلکا کر بیٹھتا تھا۔ تیمور نے اسے اشارے سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنا کام اطمینان سے کر لے۔ ریزہ ڈانگوں مختلف دایات دینے کے بعد اپنے اسٹنٹ اور اپنی بیوی کو وہاں کھڑا کر کے تیمور کے پاس چلا آتا تھا۔

”خیر رہا ہے..... اس دنیا کا بھی ایک اپنا ہی چارم ہے۔“ تیمور بلا۔

”تو پھر کیا خیال ہے؟ آگے بھی اس شوق کو جاری رکھنا ہے نا؟“ ریزہ نے پوچھا۔

”یہ میرا شوق نہیں ہے۔ وہ تو بس میں کچھ زیدی صاحب کے شدید اصرار پر اور کچھ سنے تجربہ کے شوق میں اس راہ پر آ گیا ہوں۔ بس جنس سا تھا کہ جب لوگ دولت کے ساتھ شہرت پاتے ہیں کیا محسوس ہوتا ہے۔“ تیمور نے مسکراتے کہا۔

”ویل۔ تو کیا لگا ہے تجربہ؟“ ریزہ نے تجسسی سے اسے دیکھا۔

”اچھا تھا۔ لوگ مجھے پہچانتے تو تھے میرے اپنے سزاؤں تک اور سیرکل کے لوگ۔ اس سے ہٹ کر بھی مجھے پہچانا جانے لگا ہے۔“ تیمور ہنسا۔ ”کیا تم یقین کر گے کہ مجھے قلم میں ہیرا آفر ہو چکا ہے۔“

اس کے انکشاف پر ریزہ چونکا۔ ”گنڈ۔ پھر کیا ارادے ہیں؟“

”پانگل ہو گئے ہو؟“ میرے باپ سے جو بے پروا دانتے ہیں؟..... پہلے ہی ڈانگ بات پر شدید غصہ ہو رہے تھے۔ اور ابھی میں میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ میں پاکستانی قلم میں آ کر ہوں۔ اس سے اچھا ہے کہ میں پاکستانی ڈرامے میں کام کر لوں۔ چاہے میری کہ بجائے دن کا کام ہی کیوں نہ ہو۔“ تیمور نے سنا سنا کر کہا۔

”ایسا برا نہیں ہے..... تمہارے جیسے ٹیلنٹ کی تو ہماری چھٹی، بڑی دونوں اسکرینز کو اشہ..... ہے۔“ ریزہ نے سر ہلایا۔

”نہیں یارانی الحال تو اپنی اسٹریڈ کا سوچنا ہے۔ ایم ٹی اے کر لوں، پھر سوچوں گا آگے کا بھی۔“ نے کہا۔

”اچھا اگر ہالی وڈ سے آفر آ جائے، جب کیا کرو گے؟..... کیا تب بھی انکار کر دے؟“ ریزہ نے پوچھا۔

”ہاں..... کیونکہ فی الحال مجھے ان ایکٹیوٹیز میں اتنا دلچسپی نہیں ہوتا۔ ویسے بھی میں کوئی کام تب ہی کروں جب میرا دل میرا ساتھ دے میں اپنی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ ڈانگ میں سنے اپنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بات پسند نہیں آتی تھی۔ مجھے بے حد کم وقت میں اپنے آپ کو ان تمام باتوں سے متوانا تھا جو مجھے بہترین طور پر کار ہیں۔ اور دیکھو، میں نے خود کو متوانا لیا۔ تمہارے اس پرانے ڈانگوں ایک طرف اور میں، تیمور علی خان ایک طرف۔ جس نے مکمل پندرہ ماہ میں ہی سب بات یاد کر دیا ہے۔ کیوں، مانتے ہو نا؟“ تیمور کا لہجہ ضرور سے بڑھ رہا تھا۔

”کس قدر مغرور ہو تیمور علی خان! اور کس قدر بے غرور ہو چکا ہے تم پر۔ ہاں ہاں اتم بالکل صحیح ہو۔“ ڈانگوں تمہارے سامنے چاروں شانے چت ہو گئے ہیں۔“ ریزہ نے ہنسنے جیسے ہان مار لی اور مسکراتے لگا۔

”پرفیشنل کس چیز کو بتاؤ گے؟“ ریزہ نے اس سے پوچھا۔

”فی الحال میرا دماغ ان چیز پر نہیں گیا۔ جب جانے گا تب سوچوں گا۔“ تیمور نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”جب بھی سوچ، ایک بار شوہر کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے سوچنا۔ یہاں بھی تمہاری ضرورت ہے۔“ ریزہ کے انداز میں اصرار تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ہلکی سی ہنسی کر دیا۔ پھر وہ لوگ اپنی باتوں میں مگن ہو گئے تھے۔

اسی وقت شایلا وہاں چلی آئی۔ شایلا، ریزہ کی مائل تھی۔ بے حد حسین، بے حد مہر طر دار۔ اس نے ریزہ کو آواز دی۔

”ریزہ! میرا کاشیم فیک ہے۔“

ریزہ کے ساتھ ساتھ تیمور نے بھی گردن کھما کر دائیں جانب دیکھا۔ ٹاپ لیس، بے حد فنگ والی ہری رنگ اور اسکن لکری جھلکتی ہوئی ٹیکسی میں شایلا کھڑی تھی۔ ٹیکسی کی آستینیں عمارتیں۔ اس کا گلا اگے اور پیچھے سے بہت زیادہ کھرا تھا۔ نیم مرل لباس میں ٹاپ میک ایک اور بھی سی چمپری میں وہ ہنسنے ہنسنے اچھا حسین اور ایمان خراب کرنے کی حد تک جاذب نظر اور پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اس کے بازو لگے ٹائٹل پر عمرے ہالوں کے درمیان اس کا کٹائی چھوٹا گلاب کی طرح دکھایا ہوا تھا۔ جاذب تو وہ ریزہ سے بھی کم نظر نہیں تیمور علی خان پر کڑی ہوئی تھی جو بڑی گہری نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

۱۱۔ لی صفحہ ۲۴ پر بڑی بے فکری اور خاصی آزادی سے مردوں اور لڑکوں سے بغیر جھجکے یہاں اں چل پھر رہی تھیں۔

وقت گھر میں فلک کی ساگر و اور معنی کی خوشی میں یہ اہتمام نظر آ رہا تھا۔ ایک کھنے کا انتظار ہو گیا۔ کچھ کھانسی پہننے کی رسم اس کے بعد ادا ہوئی تھی۔ اور کھانسی ابھی کھانسی نہیں تھی۔

جیسی یہ فلک کرکے کیوں نہیں کاٹ رہی ہے؟ اسے کہو کہ کرکے کاٹنے۔ پھر انگوٹھی پہنانے کی رسم ادا کرنی ہے۔ ”فلک کی والدہ انچی چھوٹی بیٹی دیا سے کہہ رہی تھیں۔

وہ کسی فریڈ کا انتظار کر رہی ہیں۔ اور بلند ہیں کہ جب تک ان کی وہ فریڈ آ نہیں جائے گی تب ایک نہیں کاٹھن کی۔" وہ بیانے بتایا۔

ان کی فریڈ ہے بھئی؟“ قلک کی می نے حیرت سے پوچھا۔

کاخوردی فریڈ ہے۔" دیبا نے سرسری سا بتایا۔

اب نجانے اس کی فریضہ کب آئے گی۔ تم اسے بلاؤ جا کر۔“ انہوں نے بی بی سے کہا تو وہ غلغلہ مچا لی گئی جو بہت خوب صورت اور اسٹاکش سے عروسی جوڑے میں دلہن کی گھٹ پر کھڑی

ن کو وہ عظیم کہہ رہی تھی اور ساتھ ہی کشف کا انتظار کر رہی تھی۔

میں کا بیٹا قلک کو دینے جا رہی ہوں کہ اب وہ اپنی دوست کا انتخاب چھوڑیں اور کیک کاٹیں آ

ایک دیکھ دیکھ کر تو میرے منہ میں اپنی جڑ جڑا رہا ہے۔ دیکھنے سے پہلے سے ایک اور
 حیوان نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔

یہاں چنانچہ پورا نام - دروازہ سترائے سروں کوئی گریوں کے رستے میں سے ہیں۔ - یوں
 کہ گھوڑا۔

لی ہوں گی۔ آپ کا اس ماڈل جو بن گئے ہیں۔“

اے کہا۔

الحالہ عامرہ نہیں، ذی اللہ ہے محمد نے فرمایا: ”وہ اترا کے ہوا۔“

دے مٹو رہا ہے۔ "وہ جانے منہ ملتے ہوئے کہا۔

کہا خلد ہوں؟“ تیمور نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

نہیں..... بالکل نہیں۔“ وہ ہنس بڑی تو تھوڑا مسکرا دیا۔

ارے دیا! تم یہاں کھڑی تھوڑے سے باتیں بکھار رہی ہو اور وہاں می کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔ فلک کو نہیں بلایا؟“ ماہ نورانی سا ذہنی کا کچھ سنسناہتی ہوئی وہاں آ گئی۔

”ہاں..... ایک دم پریکٹ لگ رہی ہو۔“ رمیز نے پروفیشنل انداز میں کہا۔

”اوہ..... باگے داوے، یہ تیمور علی خان ہیں۔ ہمارے ماڈل۔“ ریمز نے تیمور کا تعارف

”نہیں کون نہیں جانتا؟ یہ تیمور علی خان ہیں۔ جنہوں نے اپنے جلوے دکھا دیکھا کر اپنے پاؤں کی قطاریں بنا رکھی ہیں۔ جن کی صرف دو بار کی مازنگ نے ہورسٹرہ کو ہلا کر مار دیا۔“

..... ذیلو تیمور علی خان! آئی ایم شیدا..... شیدا کرم اللہ۔ میں بھی ماڈل ہوں۔“ شیدائے ہند سے اپنا لگاؤ کی بات کر کے بڑا حالہ تھیں۔ زندگی بھر کے لیے۔

ہائے....." تیمور نے شاکا کا ہاتھ اٹھا کر اس کا سر دبا کر چھو دیا۔

’ریمز! پلیز، ذرا ادھر آنا۔‘ ریمز کی بیوی اسے کسی کام کے لئے بلاری تھی۔ وہ معذرت کرتا چلا گیا۔

مسو..... مسٹر تیمور ملی خان! اگر میں آپ کو کافی کی دعوت دوں تو؟ شیلا نے بے جاں نظریں دور کو دیکھا۔

تو میں اسے شکر یہ کے ساتھ قبول کر لوں گا۔" تیمور نے بھی بے تکلفی سے کہا۔

گنڈ..... تو پھر کل شام؟..... کل میری ریپرسل نہیں ہوگی۔ میں فارغ ہوں گا۔“

او کے۔" تیمور نے رضا مندی ظاہر کر دی۔

لو کے..... پھر کل لٹے ہیں۔ اوہ..... ایک منٹ..... آپ میرا موبائل نمبر لوٹ ڈالو؟
اس نے کبھی خیال کے تحت کہا۔

دو کواکس کا بغیر فوت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا حافظہ کافی تھا۔ مثلاً اسے ہائے کہنے کی طرف اشارہ تھا اور تھوڑی سی بے باک نظریں اُس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔



یہاں جیسا بلکہ جسے نور بنا ہوا تھا۔ جنگلے کا وسیع و عریض لان اس وقت روشنیوں سے منور تھا۔ پول کے نزدیک نزدیک کرسیوں کو جو چھوٹے چھوٹے حساب سے منٹ کر کے درمیان میں رکھا گیا تھا۔

وہ وقت خالی تھا۔ لان کے وسط میں ایک میز خوب صورتی سے بھی سجائی رکھی تھی جس پر ایک

”نور بھائی! میں تو باتوں میں بھول رہی تھی۔ ابھی جانتی ہوں۔“ دبیانے شہنشاہ کر کہا اور چلے گئے۔
”سیرا خیال ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ فلک خود ہی آ جائے گی۔“ دبیانے
پر ہاتھ اور تیرور نے ایک ساتھ گیت کی طرف دیکھا۔ ”فلک کی دوست آ چکی ہے۔“

تیرور چونک سا گیا۔ رستہ میں پر فلک کو کھٹ واتی اور سکر کر چلی ہوئی ان دو لڑکیوں کو،
طرح پہچان گیا تھا۔ ان میں سے ایک وہ تھی جس کو رابہ نے کشف کہہ کر پکارا تھا۔ فیروز زما
مگر تے، دانش و دانش مگر کے ذیل شیڈ چوڑی دار پاجامے میں وہ لمبوس تھی۔ دو پٹہ سبک کا
کے بازو پر پلکا ساموئیل کا نازک سا کام بنا تھا۔ اس دو پٹے کو اس نے ابھی طرح پھیلا کر
اودھ رکھا تھا۔ اس نے کانوں میں نازک سے فیروز زما اور سکور رنگ کے آؤرے میں مبینہ رنگے
آج اس کے ہونٹوں پر روز پٹک ٹھکری اپ اسٹیک تھی جس سے اس کے چہرے کا واحد میک اپ
اسٹیک تھی۔ آج اس کے سر پر اسٹیک نہیں تھا۔ اس کے بال آج مکمل سر پہ تیرور نے دیکھے تھے
حدادہ۔ بعد چونک دار، بعد فلک دار، جنوں کو چھوڑے۔ اس وقت اس نے اپنے
دراز مختصرے بالوں کو اصل ڈھائی سی چوٹی کی شکل دے رکھی تھی۔ وہ بے حد معمولی سی جگہ
مگر اس کے ساتھ کھڑی رابہ نقل فیشن میں تھی۔ اسٹیکس سا شوش رنگ کا لباس زیب تن
سب سے تیار بہت باریک رنگ رہی تھی مگر تیرور کی نظرس تو کشف پر ہی جمی ہوئی تھیں جہاں
میں بھی بہت پر کشش، حسین اور بار بار نظر آ رہی تھی۔

”یہ فلک کی کینلی ہے؟“ تیرور نے دبیانے پر چھا۔
”ہاں..... کشف ہے ان کا نام۔“ یو نورٹی نیلو ہیں۔ بہت سی لائق ہیں۔ پوری یو نور
چاپ کیا ہے انہوں نے۔ اب اسٹیک شپ لگی ہے۔ آسکھوڑو یو نورٹی جاری ہیں ایم اے کر
دبیانے اس کی معلومت میں اضافہ کیا۔

”اچھا، پھر تو ان سے ملنا چاہئے۔ کیوں نور بھائی؟“ تیرور نے نظرس جماتے ہو
نور سے پر چھا۔

”ہاں بھئی..... ایسی قابل لڑکی سے کم از کم ملاقات کا چانس نہیں چھوڑنا چاہئے۔“ ہانا
اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”اس کے ہاں کتنے خوب صورت ہیں۔ میں نے آج تک اسنے
کسی کے دیکھے ہی نہیں۔“ ہانا نور سے ساختہ ہل پڑی۔

تیرور خاموش رہا مگر دل میں وہ ہانا نور کی بات کی تاثیر کر چکا تھا۔
”تم دونوں اتنی دیر سے آئی ہو۔ ہم سے دیر مرچہ ڈانٹ کنا بھیجی ہوں کہ تمام لوگ کیک
انتظار کر رہے ہیں۔“ فلک ان دونوں کی کلاس لے رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جینوں ہولے،
چلتی ہوئی میز کی طرف بھی جا رہی تھیں جہاں کیک ان کا منتظر تھا۔

”سارا قصور اس کشف کی بیٹی کا ہے۔ یہ چار ہی نہیں ہو رہی تھی۔“ رابہ نے فوراً ہلچہ کشف

”یوں بھئی؟..... کیا یہ سچ ہے؟“ فلک نے سوالیہ نظروں سے کشف کو گھورا۔
”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ رابہ نے اسے انھیں دکھائی۔

”تہااری جگہ راج تو بھیجی تھی ہے۔“ فلک نے اسے ٹھکڑا نظروں سے دیکھا۔

”میں تو چھ بچے کی تیار اس کے گھر بھیجی تھی۔ یہ مجھ سے ہی غریب دکھائی تھیں۔ اس کو تیار کروانے
پر ہم راج خانہ خانی ہوا ہے۔“ نور، یہ ویلا لہاس مبین رہی تھی۔“ رابہ نے کشف کے تن پر بے
صورت سے گزرتے اور پاجامے کی طرف اشارہ کیا۔ ”نہ یہ میک اپ کرنے پر راضی تھی۔ اور تو
ابھی اسٹیک میں آنے والی تھی۔ ورنہ تین کر کے، دھکا دھکا کے، ڈانٹ ڈپٹ کر کے تو
ہانا بھی تیار کر لیا ہے۔ یہ جو تم اس کی شکل دیکھ رہی ہو، یہ میری بدولت لگی ہوئی ہے۔ ورنہ تو
آج ابھی وہی کالا لہاس مبین کر آتا تھا۔“ رابہ نے بی محول کر اس کی شکایت کی۔

”اب میں بھی گھر رابہ!“ کشف نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اب تم صحت دھکاؤ مجھے۔ میں نہیں آنے والی تمہارے رعب میں۔“ رابہ نے لاپرواہی
کہا۔

”کشف! واقعی تم بہت باریک رنگ رہی ہو۔ آج پہلی بار تم کو اس چہرے میں دیکھا ہے۔ اور
ہاں بے بال تو مائی گڈ نہیں..... اس قدر خوب صورت ہیں اور تم ان کو اس لئے اتنا چھپا کر رکھتی ہو
رہی کی نظر نہیں لگ جائے۔“ فلک نے سناٹا نظروں سے اسے دیکھا۔

”اچھا، چھوڑو بھی میری قصیدہ گوئی۔ جلدی چل کر کیک کاٹو۔ ورنہ تمہارے ہونے والے معجزہ
اب نہیں انتظار میں رہا نہ مل جائیں۔“ کشف نے کہا۔

فلک نے سب سے پہلے کیک کاٹا۔ میز کے گرد اس کے تمام قریبی رشتہ دار جمع تھے۔ اس نے
بروٹا اشارہ کیا اور وہ دونوں کچھ پرے ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ لیون کی گونج میں کیک کاٹ
لنا برتھ ڈے ٹوے کا کیک تھا جس کو ہانا۔ پھر ساتھ ہی مگنی کی رعب بھی ادا کر دی گئی۔

ان تمام رسوم سے فراغت کے بعد جب ڈانس گاہا ہوا تو جب فلک ان دونوں کو ڈھونڈ رہی تھی تو
انہی جہاں وہ دونوں کر تیں اور انکے تنگ بیٹھی جو ٹھٹھکی تھیں۔

”تم خواہ خواہ انکا ہنگامہ کر رہی تھیں۔ یہاں دیکھو کسی کا لباس پر انھیں ہے۔ آدمے آدمے
باز میں بھی سب کیسے بے قراری سے گھوم بھر رہی ہیں۔“ رابہ آہستہ سے اس سے کہہ رہی تھی۔

”ان کی بات نہ کرو رابہ! یہ سب ان کی سوسائٹی کا حصہ ہے۔ تم تم ایسے ماحول کی پروردہ نہیں
ہیں۔ میں یہاں بہت ان کسٹریٹ لبل کر رہی ہوں۔ یوں بھی ہم صرف فلک کی سیلابی ہیں، اس کی
فردار نہیں۔ بس کچھ دیر بیٹھ کر بیٹھتے ہیں۔“ کشف کو یہاں اس قدر آزاد اور بے باک ماحول میں
گہرا ہٹ ہونے لگی تھی۔

”تمہارا تو صرف اس ماحول میں یہ حال ہو رہا ہے، تم لندن جیسے شہر میں جا کر دو سال کیسے گزر اورو
لیا، وہی اکیس؟“ رابہ نے اسے دیکھا۔

”وہاں میں فنکشن میں مجسٹ بن کر نہیں جاؤں گی۔ بلکہ میں وہاں ملے کے حصول کے لیے“ کشف نے جواب دیا۔

”اچھا، اچھا..... تمہیک ہے۔ کم از کم فلک ہے تو دو گھڑی باتیں کر لیں۔ وہ اصرار ہے۔“ رابعہ نے فلک کو دور سے اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔

”تم دونوں یہاں کونے میں بیٹھی ہو اور میں پورے لان میں تم دونوں کو ملاحظہ کر رہی ہوں۔ ان کے سر پر آن گھڑی ہوئی۔

”بس یو لکی..... یہاں بیٹھ کر زیادہ سکون کے ساتھ ہم سب دیکھ رہے تھے۔“ کشف مسکرا کر چلا آؤ۔ تم دونوں کو اپنی جگہ سے اٹھانے کے لیے۔

”فلک نے دونوں کے ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔ رابعہ نے نظروں سے نظروں میں اسے خاموشی سے اٹھ جانے کی تحییر کی۔ وہ دونوں کو سب سے طواری رہی۔ اپنے ماں باپ سے۔

”حیدر بھائی سے تو تم بچہ دہشتی میں ہی مل چکی ہو۔ یاد ہے، یاد ہے ایک مرتبہ مجھے لینے آئے فلک نے کہا۔

”ہاں۔“ کشف نے سر ہلایا۔

”یہ سونا ہے..... میری بولنے والی بھائی اور حیدر بھائی کی بھیبت۔“ کشف اور رابعہ نے اس کی خوب صورت کی سونا سے ہاتھ دیا۔

”یہ لید بھائی ہیں۔ ہم سب سے بڑے بھائی۔ یہ اسلا میں ہوتے ہیں۔ یہ باؤر بھائی ہیں۔ ولید بھائی کی سسر۔

”یہ انور بہت اچھے طریقے سے ان سے مل چکی۔ کشف کو اس غیر معمولی حسین لڑکی کی آنکھوں میں سادہ دھڑا آ رہا تھا جسے اس نے اپنا وہ کچھ کر چمک دیا۔

”اچھے پیار کرنے والے شوہر اور آسانگوں کے ہوتے ہوئے کون دیکھی ہو سکتا ہے؟“ اُس سوچا تھا۔

”اور یہ ہیں ہمارے کزن عدیل طوی خان..... یہ تو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ باپ پوپڑا ہولڈر جنکشن بلکہ جرجنکشن میں..... یہ ماڈلنگ کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ پورے صوبے میں نام

ہو چکا ہے۔ اب یہ امریکہ جا رہے ہیں، ایم ای اے کرنے کے لیے۔“ فلک کے تعارف کرانے کشف نے اسے اٹھا کر اس دراز قد والے مضبوط جسم سے لڑکے کو دیکھا جس سے اس کی مٹا جگہ تو ہرگز نہ تھی۔ وہ اتنا خوب صورت لگا رہا تھا کہ لڑکے کو کشف بھی ٹھنک سی گئی۔ مگر بھر اس

بڑی بچیدگی سے نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹا لیں۔

”تجربہ یہ میری بیٹ فریڈ ز ہیں، رابعہ اور یہ کشف۔“ فلک تعارف کرانے لگی۔

”بیٹو! تجھ سے مسکرا کر کہا تو رابعہ نے مسکرا کر بیٹو کا جواب دیا۔ جبکہ کشف نے اس کی زحمت نہ کی۔

”اے اے! وہی پرکھی مرتبہ آپ کی ماڈلنگ ٹیلی کاسٹ ہو چکی ہے۔ آپ کا تو انٹرویو بھی آیا تھا۔ شاید ہمارے میں باپ کرنے پر ہی آپ کا انٹرویو دی وی میں آیا تھا۔ میں پورا تو نہ دیکھ سکی مگر حیدر!۔

”ہاں، ہاں میں ہے۔“ رابعہ کھڑکی سے۔

”بہت خوش ہوئی آپ سے مل کر۔ مگر کتنے ہے کہ آپ کی فریڈ کو کچھ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔

”میں میرے بیٹو کا جواب نہ نہیں دیا۔“ کشف نے رمان بھرے لہجے میں کہا۔

”اسی کوئی بات نہیں ہے۔“ کشف نے رمان بھرے لہجے میں کہا۔

”میں نے ہی بھی نہیں کہا۔“ کشف نے بچیدگی سے جواب دیا۔

”یہاں ہم جواب ہے۔ کشف میں نہیں آیا۔“ حیدر بولا۔

”لف کشف یہی تھی کہ وہ بات برائے بات نکال رہا ہے۔ مگر مجبور یہی تھی کہ وہ اسے کوئی سچ بات

کہہ سکتی تھی۔ وہ فلک کا فرسٹ کزن تھا اور کشف ان لوگوں کے گھر سہمان بن کر آئی تھی۔ وہ

اُن کی رہی۔

”میں نے سنا ہے کہ آپ کشف بھی ہیں۔“ حیدر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”جی۔“ کشف کو اس کی نظروں سے ابھیں ہو رہی تھی۔ اور یہ آج پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ اس پہلی بار گراؤ ہوا تھا وہ اس کی آنکھوں سے ابھیں محسوس کر سکتی تھی۔

”میں نے آپ کے باؤر پاپے میں ہیں۔ اچھا کھتی ہیں۔ مگر بہت کڑا کشفی ہیں۔ جیسے قلم میں

ڈالائی نہیں، ذرا ہر ہر ہاں!۔“ حیدر نے تجرہ کیا۔

”میں صرف حقیقت کشفی ہوں اور حقیقت ہمیشہ سچ ہوتی ہے۔ کشف کئی ہوں اور کچھ ہمیشہ کڑا دہوتا

ہے۔ ہر ایک سے اس کی کڑواہٹ اور کئی قسم نہیں ہوتی۔“ وہ وہی انداز میں بولی۔

”خائن! صرف سچ تو نہیں ہوتا ہے۔ زندگی میں خوب صورتی بھی تو ایک کچ ہے۔ اس خوب صورتی

کا تذکرہ آپ کی تحریر میں ملے گا کیوں ہوتا ہے؟“ حیدر نے پوچھا۔

”خوب صورتی کو کشف نے اسے ڈھانچ کر دے والے بہت ہیں۔ مگر اس خوب صورتی کے پس

ہاں جو بد صورتی چھپی ہے اسے منظر عام پر لانے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جبکہ ضرورت اس چیز

لی زیادہ ہے کہ ان بد صورتیوں کو سامنے لایا جائے تاکہ لوگ ان کے متعلق بھی جان سکیں۔ یہ بھی

روٹی کا ایک پہلو ہے۔ بہت ہی خوف ناک پہلو۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ جیسی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ لڑکی اتنی سچ ہو سکتی ہے۔“ وہ

طربا۔

”میں سچ نہیں ہوں۔ بس سچ سامنے لاتی ہوں۔ شاید اسی لئے آپ کو میری تحریریں سچ لگتی

ہیں۔“ اس نے بڑے وقار سے جواب دیا۔

”آپ کو یہی آف لائف انسپائر نہیں کرتی؟“ حیدر نے سوال کیا۔

محبت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ فلک نے انہیں اسی ذرا بعد کے ساتھ روانہ کر دیا تھا جو انہیں آقا۔ فلک ان دونوں کو چھوڑنے کے بعد گھٹ سے گھٹ واپس چلی اور تیمور کی طرف بڑھ گئی جو اس میں گم رہا تھا۔

بل گئیں تمہاری مہمان خصوصی؟“ تیمور نے اسے دیکھ کر کہا۔

ی۔ جلی گئیں۔ آپ سے خاصی ناراض ہو کر گئی ہیں جناب عالی؟“ فلک نے اسے گھورا۔

ابھا۔۔۔۔۔ اطلاع خفی ہے میرے لئے۔ بڑے داغ ہے، ناراض ہونے کی وجہ؟“ وہ انجان بنا آقا۔

”یہ تم تو چاہتی نہیں ہو۔“ فلک نے اسے گھورا۔

کوہ اچھا۔۔۔۔۔ وہ تعریف والی بات ہے۔ کمال ہے، کبھی بڑا ذوق سیلیاں بنا کر گئی ہیں تم نے۔ اپنی لب و لہجہ ہوتی ہیں۔ دیکھا حیدر انتم نے اس کا میٹ؟“ تیمور نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

”اگلی۔۔۔۔۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“ حیدر نے سر ہنجایا۔

”بھائی ایہ تیمور ہے نا۔ اس۔۔۔۔۔ میری سیلیاں بہت اچھی ہیں اور ان سب سے اچھی کشف ہے۔ وہ

ایک طرف لڑکی ہے۔“ فلک نے کشف کی طرف دہرائی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ اس کے بڑے ایلے کی ہیں؟“ تیمور نے مذاق کیا۔

”میں نہیں۔ اس کے پی بہت خوب صورت ہیں۔“ بے ساختہ فلک بول اٹھی۔

”یہ فلک۔۔۔۔۔ تیمور نے فوراً اعتراف کیا۔

”وہاں ہائی نیچر عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ اس کے ساتھ قہر کا تو سوتا بھی مت۔ شکر کرو کہ

لے لٹاؤ میں چپ کھٹی ہو۔ ورنہ تمہارا آج خوب بھرتہ ہوتا۔“ فلک نے اسے ڈرایا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا شیف ہے وہ؟“ تیمور بھلا کر کسی کے رعب میں آنے والا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ جینڈا تو کہیں ہے۔“ فلک چڑکے بولی۔

”حیدر اس لڑکی کی محبت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکوؤں سے اس کے تعلقات ہیں۔ فوراً اس کی مصیبت

میں بندوبست کرو۔“ تیمور معنوی تنبیہ کی بے کھیر رہا تھا۔

”وہیے ایک بات تو ہے۔ تمہاری یہ دوست۔۔۔۔۔ بری طرح چلی گئی رہنے کی عادت ہے اسے؟

وہ کیسے چڑھا رہتی ہے۔“ تیمور نے حیدر کو آکھ مار دے ہوئے فلک سے خاصی تنبیہ کی سے

حیدر جانتا تھا کہ وہ فلک کو سٹار کمرز لے رہا ہے۔ تیمور اس کی عادت سے بھی وہ واقف تھا۔

”میں نہیں۔ بالکل بھی اس کے ماتھے پر ہل نہیں ہے۔ تم اپنی آنکھیں میٹ کر آؤ۔“ وہ مٹی چلی۔

”چھاپلو چھاپو۔۔۔۔۔ رنڈا۔ ایسا کرتے ہیں کہ تمہارا تیمور وہ چلی کشف کی باتوں پر خوب تنقید

داں گا۔“ تیمور نے مسک جو بچے میں کہا۔

”کیوں؟“ تنقید کیوں؟“ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

”بھی تعریف تمہاری دوست کو پسند نہیں ہے تو پھر تجھے تعریف ہی تو رہ جاتی ہے۔“ تیمور نے سادہ

اچھے طریقے سے تیار ہوئی ماہور اپنی مخصوص چپ کے ساتھ سیدھی دل میں اترتی محسوس ہو اس کے لائے، آدھیر کی مانند چپ کو بچنے بال پٹ سے کشف نے محسوس کیا کہ وہ چپ

میں لے کر صرف نیچلی ہے۔ کھانچیں رہی۔ اسے چرے پر کچھ میں نہ آنے والے تاڑا۔

اس کی نظروں میں اس کی نیکیوں پھیل گئی۔ آنکھوں میں بھی محسوس کی گئی۔ کشف نے

رشتہ میں اس کی نیکیوں پھیل گئی۔ آنکھوں میں بھی محسوس کی گئی۔ کشف نے

تنبہ کی یا پھر بڑی دیر سے اس نے ٹپکس نہیں سمجھیں کشف۔ اس وجہ سے کشف نے کشف میں آگئی تھی۔

کشف نے اس کی آنکھوں کے کس کو بڑھا دیا تھا۔ کشف کو ماہور کشف کی نظر میں بہت پسند آئی تھی

”فلک! تمہاری بھائی تمہاری رشتہ دار بھی ہیں؟“ کشف نے فلک سے پوچھا۔

”کون سی والی؟ چھوٹی یا بڑی؟“ فلک نے کھرا کہنے میں پھنسا کر کشف میں ڈالا۔

”بڑی والی۔“ اس نے ہائی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

”نور بھائی۔۔۔۔۔ نہیں، وہ آؤٹ آف فمیلی ہیں۔ ولید بھائی کے ایک دوست کی کڑ

ہیں۔ ولید بھائی نے کسی تقریب میں دیکھا تھا انہیں اور پھر ان نئی جلیوں کے قیدی بن گئے

نے بتایا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ لومبرج؟“ ولید نے سر ہلایا۔

”نہیں۔“ فلک نے زور سے سر ہلایا۔

”بہت حسین ہیں۔“ کمران کے حسن میں کچھ غیر معمولی بات ضرور ہے جو عام طور پر ف

آتی۔“ کشف نے کہا اور راجہ نے اس کی تائید کی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ ہے۔ تم تو خیر ویسے بھی مصنف ہو۔ اور آرٹس، مصنف وغیرہ لوگ ہم پر ہر

بہت سے پہلوؤں اور ضرورتوں سے دیکھتے ہیں۔“ فلک نے کہا۔

اسی لمبے تیمور علی خان کی نظروں کشف پر پڑی تھیں جس کی نظروں بالکل اتفاقاً ہی اس پر

تھیں۔ وہ اسے اپنی جانب دیکھنا پھر مسکرایا۔ بلاشبہ اس کی مسکراہٹ بہت حسین تھی۔ مگر کشف

زیر ہرک رہی تھی۔

”ایمیت! دل ہی دل میں اسے خطاب دے کہ وہ چہرے پر دل بھر کر بڑبڑا کر سچائے

طرف دیکھنے لگی۔ تیمور جس طرح اس کی خیروں پر تبصرہ کر رہا تھا، اس نے کشف سے اس بات

حد تک بدلا تھا جو کچھ لمبے کشف میں تیمور کے بارے میں اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی

شرع میں اسے پور کر رہی تھی مگر بعد میں وہ اس کی باتوں سے اسے ایک عجیبہ انسان سمجھنے لگی تھی

پھر اس کے بعد تیمور نے جو حرکت کی تھی اور برملا اس کی تعریف کر ڈالی تھی، اس نے کشف کو ایک

پھر اپنے تاثرات و خیالات اس کے بارے میں بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اس کی نظروں میں

کا احتجاج اور بھی خراب ہو گیا تھا۔ وہ اسے قہر سے سمجھ رہی تھی۔

کھانے کے بعد کشف اور راجہ نے فلک سے اجازت چاہی۔ وہ دونوں اس کی والدہ سے

"آں..... ہاں..... میں کچھ دیر اندر جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ میری طبیعت کچھ لڑ ہے۔" وہ کمرہ سے کچھ میں بولی۔

"خیر عت؟ ایک دم ہی کیا ہو گیا؟" ولید کو تشویش ہوئی۔

"ہیں..... ایسے ہی، ذرا چکر سے آرہے ہیں۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ سے۔ میں اندر چلی، کچھ دیر لیٹوں گی تو آرام آجائے گا۔" اُس نے بات بنائی۔

"چلو، میں چل ہوں ساتھ۔" ولید نے کہا۔

"نہیں..... میں چلی جاؤں گی۔ آپ میری وجہ سے اپنی پارٹی خراب نہ کریں پلیز۔" اور فوراً منع کیا تھا۔

"نکھر....." ولید نے کہنا چاہا۔

"پلیز! میں کسری ہوں نا، میں چلی جاؤں گی۔" وہ اس بار کچھ جھلجھلا گئی۔

"اوکے..... کچھ میڈیسن لے لیتا۔" ولید نے دعا دے دی تو ماہور نے سرانہات میں ہلاہلا "بھائی! کو نظر لگ گئی ہے شاید۔ وہ اتنی تو بیدار لگ رہی ہیں۔" فلک نے ماہور کے پاؤں

نکھرے شہری بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ولید کی آنکھوں میں سوچ کے سائے تھے۔ وہ لوگ باتوں میں گتے ہوئے تھے۔ مگر ولید کا ذہن فوراً ہی اٹکا ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ وہ یہ مشکل دہاں کھڑا رہا، کھانا کھا، پھر گھر کے اندر چلا گیا اور

کمرے کی طرف بڑھا جہاں وہ کمرہ ماہور کے ہونے کی امید تھی۔ یہ اس کا ہی کمرہ تھا۔ ولید اور ماہور جب بھی کراچی آتے تھے، یہیں رہتے تھے۔

ولید نے کمرے کا دروازہ بہت آہستگی سے کھولا اور اندر جھانکا۔ اس کا خیال تھا کہ ماہور سو کے لئے لیٹ گئی ہوگی۔ مگر اندر خوب لاش کی روشنی میں جو منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا، وہ دیکھ کر کوہا ہوا بی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر تھا اور چہرے پر حیرت۔



"اچھا! اب میں چل ہوں۔" تیمور نے اپنی کٹائی پر بندھی رست وادج پر گاہ ڈالی۔

"وہ جاؤ اور ہی آج۔ کبھی کبھار تو ہاتھ نکلتے ہو۔ میرا دے بھی کھر جا کے بھی سونا ہی ہے جیسے حیدر نے اصرار کیا۔"

"نہیں! پارا چلوں گا۔" تیمور نے کہا۔

"اچھا! کل کیا کر رہے ہو؟" حیدر نے پوچھا۔

"کل.....؟" تیمور نے سوچتے ہوئے اسے دیکھا، پھر مسکرایا۔ "ڈیٹ ماروں گا۔" وہ دم سے بولا۔

"یہ کام تو تمہاری روٹین میں شامل ہے میرے بھائی! میں اس روٹین ورک سے بہت کمزور ہوں۔" حیدر نے یوں کہا جیسے تیمور کی اس "ہائی" سے قدرے بیزار ہو۔

اس کے علاوہ تو کچھ خاص نہیں۔" تیمور نے ہارل سے انداز میں کہا۔

نئی فونیک ہے پھر۔ تم شام کو میرے ساتھ مل رہے ہو۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

ہاں؟" تیمور نے پوچھا۔

جو میں کل ہی بتائی تھی۔ حیدر نے اطمینان پھرے انداز میں جواب دیا۔

وہ بتاؤ، پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں مل رہا ہوں یا نہیں۔" تیمور نے کہا۔

اور اگر میں نہ بتاؤں پھر؟" حیدر نے اسے گھورا۔

اور پھر جہاں تم جانا چاہتے ہو وہاں آکھیں۔ چلے جانا۔" وہ فوراً ہی انداز دیکھے میں بولا۔

وہ کے بچاؤ! اوکے۔ تم سے جتنا بہت مشکل ہے۔ حیدر نے جیسے بار بار لی۔ "پارہ اور اصل مجھے کے لئے جانا تھا۔"

اور اس میں اتنا سسپنس پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سیدھے سیدھے بتا دیجئے۔" تیمور نے انا۔

تمہاری یہ ضدی طبیعت کا علاج کرنے والی کوئی لگتی مگر! اب پچھلے کا تم کہ۔" حیدر نے اس

انے پر دائیں ہاتھ کاٹنا نہ کر کے لکے سے مارتے ہوئے کہا۔

اسا ہل پڑا نہیں کیوں کرتے ہو؟ اچھا یہ بتاؤ کہ انکوش کھیلنے کیوں نہیں آ رہے اسے دونوں

"تیمور نے فوراً موضوع منتقل کر دیا۔

"اسٹری میں بہت بڑی قیادار دو ایک دنوں میں آؤں گا کلک کھیلنے۔ تم تو رینگلے جاتے ہو نا؟"

نے پوچھا۔

"ہاں..... میں رینگلے جاتا ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ آج کل کلک کھیلنے پر شائد تمہارے؟ کس کلک کے ساتھ چارے ہو؟"

"انہما کے ساتھ۔ سوئٹنگ پول پر ملاقات ہوئی تھی اس سے۔ بہت جانا دار لڑکی ہے۔" تیمور نے

مدارتے ہوئے کہا۔

"سدرہ کے گاہیں تو۔ بی ایماں سے کہوں گا کہ" کوئی ڈھونڈیں تیرے لئے۔" حیدر نے دھمکی

"بی ایماں کی چوٹیں سے ہی تو جیسے میں گتے میں غمگین یا غموں گا۔" وہ فحش ہوا۔ "ان کی پسند پر

"تو کوئی" سوائانی" لے آئیں گی میرے لئے جو گھر کو بھی در سنا دے گی۔"

"ہاں تو جی! تجھے اس کی سخت ترین ضرورت بھی ہے۔ تجھے سحرانے کے لئے کسی" سوائانی" ہی ضرورت ہے۔"

"کم آن..... پورمت کرو اب۔" جنہیں پچھے کے میرا اہل تو شادی کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ اگر

اں گا بھی تو صرف اپنی پسند سے۔ اپنی چوٹیں کی لڑکی سے۔ اور میری چوٹیں کی لڑکی مجھے جب بل

اب ہی یہ کام ہوگا۔" تیمور آؤں کر بولا۔

”اور تیری چہ اُس کی لڑکی ابھی تک خدا نے بنائی نہیں ہے۔ رات کو؟ جب تک تیری مرضی اور والے کی چٹھری سے بن کر نکلی، تو دادا ابا کی عمر کو بچے چکا ہوگا۔ سمجھا؟“

تیوہر نے مسکرا کر شانے اُپکانے۔ ”جب بھی دیر نہیں ہوگی۔ کم از کم باپ کی طرح کسی شاہ اور ایک بیچے کے باپ کا درجہ رکھنے والے مرد سے تو بہتر ہی ہوں گا۔ پتھر بھی بھی شادی کر جرات ہی رہے گا۔“ تیوہر کا اطمینان اور خطر قابل دیدہ تھا۔

”تو نہیں سوچ رہے والا۔“ حیدر نے تاسف سے سر ہلایا۔

تیوہر پر کون سا اثر ہونا تھا۔ اس نے اطمینان سے ویٹر کو اشارہ کیا جو کولڈ ڈرنکس لے لے اور مہمانوں کو سرور کر رہا تھا۔



ایک کمرے کا دروازہ چوراکھول کر اندر آ گیا تھا۔ اُس کے سامنے تالین پر مصطفیٰ بچائے ہوئے اور انجیلی تھی۔ وہ شاید غمزدار نظر کر چکی تھی اور دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا ہاتھ انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ بازو لب دھیرے دھیرے جنبش کر رہے تھے۔ اس کے ہاتھ نہیں تھکی۔ نہ ہی چہرے پر میک اپ تھا۔ نہ ہی وہ کوئی جیولری پہنے ہوئے تھی۔ اُس نے مادہ سالیاں پہن رکھا تھا۔ بڑا سا چادر نماؤ پڑھناز کے اسٹائل میں لے رکھا تھا اس نے۔ اس میں لمبوس، سفیدی بڑے سے دو پنے کو اپنے جسم کے گرد لپیٹے ہوئے بہت مقدس لگ رہی تھی۔ کوئی بہت ہی خاص کیفیت لے وہ اس قدر بے خبر تیوہر بھی کر ولید کی آمد اور اس کے ہاتھ آہٹ پر بھی وہ نہیں چڑھی تھی۔

اُس کے انداز کافی دن سے کچھ عجیب اور مشکوک سے لگ رہے تھے۔ وہ اسے پچھلے چند سے کچھ بدلی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ اس کی شادی کو دو سال ہونے لگے تھے اور ان دو سالوں کا نور کو بیوی کی حیثیت سے خاصا جان گیا تھا۔ اُس نے اُسے کسی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ ہاں زیب تن کئے، میک اپ، جیولری سے حریں سیدھی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ بے نیکی تھی مگر نور جب اس کی زندگی میں آئی تو تب اس نے جانے کہ وہ بھی انہی کی کلاس کی لڑکیوں کی طرح ہے۔ فیشن، کھانا پینا، مگھنا پھرنا وغیرہ۔ یہ سب اس کے شوق دوسری لڑکیوں کی بات تھی۔ انہی کلاس کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی نہ بہت کچھ صرف اس حد تک مانتی تھی کہ اللہ ہے۔ محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ قرآن حکیم اللہ کی مقدس کتاب ہے۔ اور وہ بیلے انہی ہے اور بس۔ ولید نے اسے ان دو سالوں میں نہ تو کبھی نماز پڑھنے دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی نرس یا ننگی عادت کرتے ہوئے پایا تھا۔ اور جہاں تک اُسے یاد پڑتا تھا، ماہور نے آج تک کسی آستین کی لمبوس، مگر نہ وغیرہ بھی نہیں پہنا تھا۔ وہ بہت آرام سے غیر ملکی لباس زیب تن کرتی اس کے لباس میں نیم عریانی واضح ہوتی تھی۔ لیکن آج کی تقریب میں اس نے ساڑھی پہنی اس کے جلاؤ کا گلا آگے اور پیچھے سے خاصا تنگ تھا اور جلاؤ کی آستینیں بھی پوری تھیں۔

اور دعا مانگنے کے بعد جب چہرے پر ہاتھ بھیرتی ہوئی آنکھیں کھول کر مصطفیٰ اٹھاتے ہوئے پہلی تو ولید کو دیکھ کر چونک گئی۔ اگلے چند سیکنڈ تک تو وہ بس خاموش کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔ اسے کسی نے ”آئینچو“ کر دیا ہو۔

تم نماز پڑھ رہی تھیں ماہور؟ ایک عجیب سا طرز تھا ولید کے انداز میں۔

"ہاں، کیوں..... کیا نماز نہیں پڑھ سکتی ہوں میں؟" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بڑے سے بولی۔

"آ..... نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ گڑبڑا گیا۔

سکتی عجیب بات ہے کہ کوئی لکڑہو دوسرے لکڑہو کو عبادت الہی میں شکیں دیکھ کر یہ سوال کر۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ انداز میں حیرت ہو۔ ولید جس گلاس سے صلیق وہاں مسلمان ہونے کا مطلب صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ زبان سے کہہ دینا کافی ہوتا۔ ولید بھی ایسا ہی مسلمان تھا۔ اس کا گھر اب بھی مذہبی نہیں تھا۔

"دراصل..... تم کو اتنے عرصے میں یہی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یوں بھی تم" تمہیں کہ تمہاری طبیعت سا ساز ہے۔ میں تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ اب کیا محسوس کر رہی ہو؟" ولید۔ حیرت رہتا ہے کہ وہ بولے ہوئے پوچھا۔

"بافل ٹھیک ہو گئی ہوں۔ نماز پڑھ لی ہے۔ طبیعت عبادت سے ہی از خود بہتر ہو گئی ہے مسکرائی۔ اس کے چہرے پر واقعی ایسی تازگی کی کیفیت تھی۔ مجھ کو دل ہی جو زبردی چھائی ہوئی وہ کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

"کوئے..... پھر تم باہر آ جاؤ۔" ولید نے کہا۔

"نہیں ولید! میں اب سونا چاہوں گی پلیز۔ دو بارہ باہر نہیں آنا چاہتی۔" اس نے صاف دیا۔ "آپ جائیں۔ میں اب ٹھیک ہوں۔" لاہور نے کہا۔

"کوئے..... ولید اس کے رشاک کو ہولے سے چھوڑا وہاں ہار لنگ گیا اور اس کے جاگنے سے یاما دروازہ بند کیا اور بسز کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے مشین لکائی ہوئی تھی۔ کپڑے زیادہ بیع نہیں تھے۔ اس کی عادت تھی کہ وہ ہفت روزے کر کے کپڑے ساتھ ساتھ دھوئی رہتی تھی اس لئے کپڑے زیادہ بیع نہیں ہو پاتے تھے۔ اس نے مشین سے کپڑے نکالے اور لٹل کے کٹیلے بہتے پانی کے نیچے نہیں تھارے گی ساتھ ساتھ نوٹا نمبر کی سریشوں کو چیل بھی دکھائی جاری تھی جو کبھی سلیے کپڑوں کی ٹھوڑی پر آ جاتیں تو کسی بہتے پانی کے نیچے چلی آتیں۔ آخر وہ زچ آگئی اور ہاتھ میں کپڑی ڈھلی ہوئی بغیر پر پٹا دیکھی۔

"ام!..... اپنی ان چھتیں کو بٹائیں یہاں سے۔ ورنہ آج وہ پہر میں ان سب کو دوست گی اپنے بٹ..... سو رنگ سے شیل کر رہی ہیں۔" اس نے ہاں سے دھکا دے کر۔

"تم کو کیا کہہ رہی ہیں یہ چارے؟ پانی میں تھیل کو دکر رہی ہیں، کرنے دو۔" نمبر نے عادت اپنی لاڈلی سریشوں کی طرف داری کی۔

"تو ٹھیک ہے..... پھر انہی..... یہ چاروں" سے کہیں کہ یہی کپڑے دھولیں۔ اس طرح

میں ہاں ہو جائے گا اور کپڑے بھی دھل جائیں گے۔" وہ صراحتاً مٹی۔

ابھا..... بھائی ہوں۔" نمبر سخن میں آگئیں اور سریشوں کو بڑی چاہ اور محبت سے ان کی طرف ہاتھ لگائیں۔

وہ بے ہم! کتنا چاہتی ہیں آپ ان کو۔ دنیا کی انہی محبت۔" اسے یکدم فہمی آ گئی۔

ان بات بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔

انہں ہے۔؟" نمبر نے وہیں کھڑے کھڑے با آواز بلند پوچھا۔

مراؤں مائی! مراؤں آواز سنائی دی۔

ابھا بیٹے! کھٹکتی ہوں دروازہ۔" نمبر نے کہا اور دروازہ کھولنے پر بڑھ گئیں۔ جبکہ کشف نے گلے ہائے دوپٹے کو ابھی طرح پچھا کر بیٹے اور سر پر اوڑھ لیا۔

ام! اب اسے سینک سخن میں نہ بٹھا لیجئے گا۔ میں کپڑے دھو رہی ہوں۔ ادھر کرے میں لے گا۔" اس نے فوراً ماں سے کہا تو انہوں نے سر ہلادیا اور دروازے کی جھنکی کھول دی۔

السلام علیکم مائی! "مراؤں سیاہ پینٹ اور آف وہاٹ دھاریوں والی ٹی شرٹ میں لمبیں سامنے تھا۔

والیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟" نمبر نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا۔

ٹھیک ہوں۔" مراؤں نے مسکراتے کہا۔

ادھر آ جاؤ۔" انہوں نے اسے بلایا اور خود اس سے پہلے لپٹ کر آگئیں۔ دروازہ مراؤں نے ہی تھا۔ نمبر آ کے پھر سریشوں کو ان کے کھٹکانے کی طرف دیکھنے لگیں۔

راہ نے کشف کو دیکھ لیا تھا۔ لون کے ہاتھ عام سے کپڑے پہنے۔ دوپٹے کو سلیقے سے سر پر وہ کپڑوں کے ساتھ طبع آزمائی میں کھن نظر آئی۔ اس کے متقی چہرے پر سیاہ بالوں کی لمبیں چٹکی

میں جو بیٹے اور پانی کے چھتوں کی وجہ سے کھلی ہو رہی تھیں۔ چہرے پر شہید کی چھائی ہوئی تھی۔

الہی طرف دیکھتے یا کر اس نے اسے سلام کر دیا۔

نہیں ہو؟" مراؤں نے کبھی نظروں سے اسے دیکھا۔ کشف کو ابھنسی ہوئے تھی۔ حالانکہ اس کی ہاتھ کوئی گندنی نہ تھی۔ کمرجی نظروں سے وہ کشف کو دیکھ رہا تھا، ان میں اپنا بیت تھی۔

میں..... مال تھا۔" اچھا تھی۔

ابھی ہوں..... پچھو وغیرہ کیسے ہیں؟" اس نے اپنے موز کو تاپوش کرتے ہوئے پوچھا۔

ب ٹھیک ہیں۔ آج بڑے سٹانی مٹایا جا رہا ہے۔" مراؤں نے کپڑوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

اوں..... یہ تو روشن درک ہے۔" اس نے سرسری سا جواب دیا۔

اں..... یہی روشن درک تو کھیلوں کا اصل درک ہوتا ہے۔" مراؤں کا انداز عام سا تھا مگر

لا لاکہ کہ جیسے وہ اسے کچھ جانتا ہے۔

کچھ کہہ کر نے جانتا! بڑے ذات کا اصل کام تو کھر کی حصار دھاری کے اندر ہی ہوتا ہے۔

ڈگریوں کی لائن لگا لے یا دیا سر کر لے، کرنا تو اسے سبک کام پڑتا ہے۔" اماں نے جھٹ جھٹ میں ہلنے ادا کئے۔

کشف نے خشک آنکھوں سے مراد کو گھورا، پھر ماں کو ہار ہنسی سے دیکھا۔

"نظر بے بدل لیجئے ام! آج کی عورت گھر کے دھندے سنبھالنے کے ساتھ ساتھ دنیا کر کے کی جت اور زور اٹھ رہی ہے۔ عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند کر کے بٹھانے کا بتایا گیا ہے۔" دو جگہ کر بولی۔ "مراد اگر ڈگریوں کی لائن کھینک سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں! صرف مردی کو حصول علم کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ علم کے حصول کے لئے مرد عورت کی نہیں کی جاتی ہے۔" اس نے بل کر کہا۔

"ہاں، تو اتنا پڑھ لینا کافی ہوتا ہے عورت کے لئے کہ وہ صحیح و غلط کی پہچان کر سکے۔ پڑھ آنا چاہئے بس۔ نری بھتیجی ان پڑھ نہ ہو اس قدر پڑھنے کی کیا تکلفی ہے کہ سر کے بال چاہیں۔" نصیر نے اپنا خیال پیش کرتے ہوئے کشف پر حملہ کیا۔

"نہیں! ام! علم کی زندگی بہ مقرر ہوتی ہے نری اس کے شوق پر بند باندھے جاسکتے ہیں۔ ڈگریاں لینا ہی حصول علم کا مقصد نہیں ہوتا۔ آگئی وہ پہچان ہی تو علم کا اصل مقصد ہوتا ہے۔" اماں کے خیالات کی تردید کی۔

"کشف فیک کھدی ہے مای! طم کا حصول جن کا شوق بن جائے وہ پھر کسی چیز کی پا کرتے۔" مراد نے بحث میں حصہ لیا۔

"لو، اب تم بھی اس کی طرف داری کرنے لگے۔" نصیر نے ہنسی سے اسے دیکھا۔

"نہیں مای! میں تو کشف کے خیالات کو سراہتا ہوں۔ اتنے بلند خیالات والی لڑکی کے لئے بلند ہی ہوں گے۔ ایسے لوگ صرف گتار کے غازی نہیں ہوتے، واقعی میں کچھ کر دکھانے کی دیکھتے ہیں۔" مراد نے کہا۔

"چڑھاؤ اسے اس کے باپ کی طرح۔ اسے ایسی ہی باتوں میں اس کا دماغ عرق مٹی ہے۔" نصیر بولیں۔

"ارے مای! چھوڑیں اسے قے کو۔ آپ نائیں، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے جھپٹے ہوئے موضوع کو شکوہ بدلا۔

"بس بیٹا! شوکر کا مسئلہ رہتا ہے۔ کبھی زیادہ ہو جاتی ہے تو کبھی کم۔ باقی تو اللہ کا کرم ہی ہوں۔" وہ بھی مریضوں کو "لھکانے کا ذکر" اسی کے پاس بیٹھ گئیں اور کشف دل ہی دل میں تاب کھانے لگی۔

"ام سے کہا تھا کہ اسے اعزہ نہ بنائیں۔ مگر انہیں اپنی باتوں میں کب کب یاد رہتا ہے۔ دیا ہے میرے سر پر حرم کو۔"

"آپ پر بیڑ بھی تو نہیں کرتی ہیں۔ پر بیڑ کیا کریں۔" اس نے مشورہ دیا۔

ایں بیٹا! یہ سوا پر بیڑ تو نہیں ہوتا مجھ سے۔" ٹھیکے کی آبی خوشیں ہوں۔ چالوں میں تو دل انکا اکر دوں! چھوڑ دوں کچھ نہیں لک سکتی۔" بڑی ہے چارگی اور مصیبت سے وہ کھدی تھیں۔

"اے..... اور وہ جو جھٹے میں دو دن چالوں کی دُش بقی ہے تو وہ کون کھاتا ہے؟ اور اس روز اس جو کھک بٹایا تھا تو وہ کس نے کھایا تھا؟" کشف فوراً بولی۔

"اے تو میرے نواسے کتنی کہتا رہتا ہوں۔ تھوڑا سا پیکاری تو تھا۔" نصیر نے ہرمان کے کہا۔

"ہی..... اسی کو پھینکا کہتے ہیں کہ شوگر لیول 300 کر اس کر گیا تھا۔ پھر معید اور بابا بے دات کو لے کر ہاٹل بھاگے تھے۔"

دہما پل، چپ کر ماں کی دکھائیں گاتی ہیں بیگم صاحبہ۔ انہوں نے ڈنچا تو کشف مسکرانے مراد کی نیس کی صورت دیکھ کر مسکرائے گئے۔

"آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا ہے مای! ای بھی کھدی تھیں کہ آپ سے کھوں آنے کے لئے۔" لہ کیا۔

"آؤں گی بیٹا! بس یہ گھر کے دھندوں سے نگلوں تو کچھ کروں۔ کشف تو اپنے کاموں میں ابھی ہے۔" بھائی کی ساری ذمہ داری ہے۔ اب گھر کا دیکھوں یا آنا چاہا کروں۔" کشف میں بھی کئی کئی جاتے ہیں کسی کے گھر میں جھانکے۔ صبح سے کاموں میں جت جاتی ہوں تو رات کب سر پر آ جاتے، خبر ہی نہیں ہوتی۔ آؤں گی تہا دی طرف بھی۔" وہ اپنی مصروفیات کا رونا روئے لگیں۔ تہا دی اسی سے تو مجھے کچھ کام بھی تھا۔ خیر، بجلی یا پوسٹ پر کڑاؤں گی۔ تم بیٹھو، میں تہا دی لے لاتی ہوں۔ آج تم اچھی رکنا، کھانا کھا کر چانا۔ تم قریب بٹھائے ہیں۔ تم کو پسند بھی ہیں۔" وہ بٹھ گئی اٹھنے لگیں۔

"کشف نہ کریں مای! میں کھانا پھر کسی وقت کھائوں گا۔ ابھی تو بس یونگی ملے چلا آیا تھا۔ کافی مجھے تھے آپ سے ملے بھی۔" اس نے انہیں دکھا۔

"چھا، چاہئے تو بیوے؟ میں بٹھ کے لاتی ہوں۔" وہ بچن میں چلی گئی۔

"کشف خاموش اپنے کام میں مگن تھی مگر مراد کی خود پر پڑنے والی نظریں اسے محسوس ہو رہی تھیں۔

"تم اندر بیٹھ جاؤ۔ یہاں گری ہے۔" اس نے خودی کھدی۔

"نہیں..... اتنی بھی گری نہیں ہے۔ موسم خاصا تبدیل ہو چکا ہے۔ پھر اندر اکیلے بیٹھ کر بیرو لے آ چھا کہ کہیں بیٹھوں۔" مراد نے نری سے کہا۔

اور تم کو تاڑتا رہوں۔" کشف تھلا کے دل میں بولی۔

"آپ کی مرضی۔" وہ کہہ کر اپنے کام میں جت لگی۔

مراد کن انہیوں سے اسے دیکھنے کے لیکن کونے میں تھا جہاں نصیر چائے بنا رہی تھیں۔ جس تخت پر بیٹھا ہوا تھا وہ کچن میں تھا اور بچن سے ذرا فاصلے پر ہی تھا۔

"معید کی پڑھائی کیسی جاری ہے؟" اس نے کئی خاموشی سے اس کا پر چھا۔

”ٹھیک جا رہی ہے۔ اس کے بچہ نہ ہونے میں ابھی وقت بڑا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تجھیں اس روز میری بات بری تو نہیں لگی تھی؟“ مراد نے چند سیکنڈ بعد پوچھا۔

”کون سی بات؟“ کشف بھڑکتی آنکھوں میں اس نے تھیلے پر ہاتھ رکھا۔

”وہ۔۔۔۔۔۔ اس روز جب تم میری دکان پر آئی تھی تو۔۔۔۔۔۔“ مراد ہچکچایا۔

”کچھ؟“ کشف نے ذک کر اسے دیکھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ تم جی سی بولو۔“ مراد نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ بہت برا لگا تھا۔“ کشف نے سنگ دلی سے کہا۔ لڑکھڑکھ کر مراد کے چہرے پر

ی چھائی تھی۔ اس کے چہرے کی تارکی کو دیکھ کر کشف کو ہلکا سا غصہ بھی نہیں ہوا تھا۔

”مجھے یہ مشورہ کر کے عبت کی تھی موصوف نے؟“ اس نے بیزار سی سوچا۔

”آئی ایموری میری سوری کشف! میں تم سے معذرت کرتا ہوں۔“ مگر کچھ تو یہ ہے کہ میرے دل

اختیار نہیں رہا تھا۔ میرے جذبات کی فحش نے میرا سینہ جلا دیا تھا۔ تمہارا انکار مجھ سے برداشت

پایا تھا کشف!“ مراد نے اختیار بول پڑا۔

”اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟“ میرا جواب تجھیں معلوم ہو گیا ہے۔ میں ابھی شادی نہیں کر

چکا۔ آئندہ کچھ سالوں تک تو اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرے کچھ بے وسوسہ ہیں۔

”میرا یہ سب کچھ۔۔۔۔۔۔“ اس نے تلخ سی کہہ۔

”میں انکار کر سکتا ہوں کشف! میں ساری عمر تمہارا انکار کر سکتا ہوں۔“ وہ بے قراری سے

کشف نے ایک ٹھٹھکا ہوا غلط اس پر ڈالی۔ ”ان باتوں سے کیا حاصل مراد؟ لا حاصل باتوں سے

پڑنے کا کیا فائدہ؟“

”کچھ باتوں میں فائدہ اور نقصان نہیں دیکھا جاتا۔ کچھ باتیں ان سب چیزوں سے ملنا

ہیں۔ سو درخشاں سے بے نیاز۔“ وہ ڈرامائی سے مسکرایا۔

”مراد تو ایک ایسے انسان ہو۔ میرے انکار میں وقت ضائع کرنے سے بچنے کے لیے تم کو

ساتھی جان لو۔ میرے انکار میں رہے تو شخص وقت ہی ضائع کر دے گا۔ بعد میں پچھتانے سے اب

کرا بھی سوچ لو اور فیصلہ کر لو۔ اس اور ابھی ی لڑکی کا ہاتھ تمام لو۔“ وہ سمجھانے لگی۔ ”مراد! زبرد

اسے مثال کرنا چاہتے ہو آپ کی طلب کرے۔۔۔۔۔۔ آپ کو چاہے، آپ سے عبت کرے۔ اُسے

جیسے ہم سمجھتے ہیں، جس کو ہم چاہتے ہیں، جس سے ہم عبت کرتے ہیں۔ میں نہ تو تمہارے ہا

میں ایسے جذبات اپنے دل میں بیڑا کر سکتی ہوں اور نہ ہی ایسا کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ ذرا سناڑی۔ مراد اس کے گفتگو کے ٹنڈے سے لہو بھڑک رہا تھا۔ وہ بڑی ہی جلدی سے اسے

دھکی دھکی۔ بڑی سفاکی کے ساتھ اس کو اپنے خیالات سے آگاہ کر رہی تھی۔

”کتنی سنگ دل ہو کشف!۔۔۔۔۔۔ میرے جذبات کی آج کی تمھیں محسوس نہیں کر سکتی ہو۔ وہ ہے

بگ۔

”اور آجی بات تو یہ ہے کہ میں ایک پکٹیکل لڑکی ہوں۔ یہ عبت وجہ پر مجھے یقین نہیں ہے۔“

ای بی کیے جا رہی گی۔

”تو ہمارا اپنی خیروں میں عشق کا ذکر کہ کیوں کرتی ہو؟۔۔۔۔۔۔ کیوں عشق پر بحث کرتی ہو؟“ وہ بے

ادب کہنا لگا۔

”میں عشق پر یقین رکھتی ہوں مراد! عبت پر نہیں۔“ آج کی عبت پر یقین نہیں رکھتی ہوں۔ وہ

بے غلیہ وی بولی۔ ”آج کے دور میں۔۔۔۔۔۔ مادہ پرستی اور ہوس کے زمانے میں کس کو فرصت ہے

ادبیت کی راگدوس سے ہونا ہو عشق کی مسراج حاصل کر لے۔ مجھے۔“ آج کی عبت پر یقین نہیں

ہے۔ میں نے بہت سی عبتوں کو ختم لینے دیکھا ہے۔ بہت دلوں کی بے تابیوں دیکھی ہیں اور ہمارا

دن کی ایک دوسرے سے بیزار بھی دیکھی ہے۔ تم اپنا کمر بٹا لو گے۔ چند سال بعد اپنی بی بی،

پاپا، اپنے گھر میں کھو کر تم کو یہ یک بھول جائے گا کہ کبھی تم نے مجھ سے اس قسم کی باتیں کی

ہیں۔ کہ اپنے دل کی اس آرزو اور ان احساسات کو اپنی بی بی کے لئے سنبھال کر رکھو۔ میری باتیں تم

اور ان کو بری لگ رہی ہوں گی۔ تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ میں کتنی چھڑل ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے

کہ جب چند سالوں بعد تم اپنی ازدواجی زندگی میں گم ہو جاؤ گے تو میری یاد تو درکنار میرا خیال تک

میرا ذہن آئے گا۔ اور اگر جو بھی اپنی مصروفیات سے تم کو وقت مل گیا اور تم کو بھولے بیٹھے میرا خیال آ

جی گیا تو تم میری آج کے دن کی باتیں یاد کر کے اس کی سن میں فہم کرے۔ اپنے آپ پر فہم کرے

رہی تم نے مجھ سے اگلا عبت کیا تھا۔“ کشف نے ہنستے ہوئے ٹھٹھکا دیا۔

”تم میرے جذبات کا احترام نہیں کر سکتی تو کم از کم ان مذاق کو نہ آؤ۔“ وہ برہان لگایا۔

”میں تمہارے جذبات کا مذاق نہیں آؤاری ہوں۔ بلکہ تم کو“ آئندہ کی تصویر دکھا رہی ہوں۔“

”کشف! تم نے کسی سے عبت نہیں کی ہے شاید۔“ تجھی ایسا کہہ رہی ہو، خیر، میں دعا کرتا ہوں کہ

میں بھی کسی سے عبت ہو جائے۔ اور جب تم عبت کے درد اس کی تڑپ کو سمجھ سے جانو گی۔ جب تم کو

دے سے جذبات کو سمجھ اور اک ہو گا۔ جب تم جی طرح سے میرے جذبات کو سمجھ پاؤ گی۔“ مراد نے سلفی

غزوں سے اسے دیکھا۔

”میری عبت؟۔۔۔۔۔۔ یہ تو بہت ہی قبل از وقت بات کہہ دی تم نے۔“ وہ مسکرائی۔ ”خیر چھوڑو ان

ادب کی۔ یہ بتاؤ کہ“ کشف“ کیسا لگا رہا ہے؟“ اس نے موضوع بدلا تو مراد نے گہری سانس لیوں

کے غارتگری کی۔ وہ جان چکا تھا کہ ان لوگوں میں جل نہیں ہے۔ کشف ان لڑکیوں میں سے ہے جن کا

عہد اپنے آپ کو دنیا کے سامنے منوانا ہوتا ہے اور ان کے عزائم میں شادی اور عبت جیسی

”خوافات“ شامل نہیں ہوتیں۔ تو اس نے اپنے دل کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس نادان کو سمجھنے

میں وقت درکار تھا۔

وہ لندن جانے کی تیاریاں ساتھ ساتھ کرتی جا رہی تھی۔ وقت کم رہ گیا تھا اور کام زیادہ اس کا اندر بوجھ چکا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہی تھی۔ اس روز اس نے سعید سے پوچھا۔
"کل تم فارغ ہو؟"

"فارغ..... مطلب؟" سعید نے دیکھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"مطلب کہ کچھ کڑی نہیں رہے ہو؟"

"نہیں..... خیریت؟"

"ہاں..... پھر کل تم میرے ساتھ مارکیٹ چلنا۔ مجھے کچھ سامان خریدنا ہے۔ رابہ لاہ ہے۔ ورنہ اسی کو لے جاتی۔ اور اس کے ساتھ شاپنگ پر جانا خود کو سزا دینے کے مترادف ہے۔ راستے وہ "تھکاوٹ، تھکاوٹ" کی گردان کرتی جاتی ہیں۔ پھر گھر آکر میری شامت آ جانتے۔ انہیں دیوار بوا کر بفر کر دیں گی۔" وہ اس کی کانپ لگاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے غصہ و کیزوں کا نظریہ ایک طرف رکھا اور ذہن پر کپڑا بچھا کر اس کی کرنے لگی۔

"یار نا! آپ خواتین کے ساتھ شاپنگ کے لئے جانا بھی کوئی سزا ہے کم نہیں۔ پلیز، آم نکلی کو لے جائیے۔ یا پھر دونوں آپاؤں میں سے کسی کو پکڑ لیں۔" سعید مشتایا۔

"رابہ کے علاوہ کوئی اتنی کلوز فرینڈ ہے نہیں۔ اور دونوں آپاؤں کی تو بات مت کرو۔ وہ! کے بعد اپنے اپنے میاؤں اور بچوں کی چٹاؤں میاؤں میں ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ یہ بات غیر ارام دہن ہیں کہ ان کا ایک عدد دیکھ بھی ہے جہاں ان کے والدہ، والدہ، ایک عدد چھوٹی بہن اور ایک بھائی جیسا بھائی بھی موجود ہے۔" اس نے آخری جملہ صرف سعید کو چھیڑنے کے لئے کہا تھا۔ اس بہت دراز تھا اور حسامت ڈلی تھی جس کی وجہ سے اس کا دل ہلکا ہوا تھا۔ وہ اپنے لیے قہر باعث اپنی عمر سے بڑا ایسا لگتا تھا۔

"آ! پھر مجھے ہنس کہا ہے آپ نے۔ اب میں آپ کے ساتھ بازار نہیں جاؤں گا۔" وہ کرچٹا۔

"اے میرے چاند! میرے گھرو بھیا! میں تو خالق کر رہی تھی۔ تو میرا چندا لانا ہے۔ دوڑ جے ہو ہی تنگ کر رہی تھی۔" سکسف نے فوراً بچوں کی طرح پکارنا شروع کر دیا۔

"آپ بہت پیٹھی ہوئی ہیں آپو جانی! فوراً میڈیٹا ریل لیں۔" وہ مسکرایا۔

"کیا کریں، زمانے کا اثر ہے۔" وہ کندھے سے پچا کر بولی۔

"اچھا آئی! وہاں لندن میں اکیلے ڈرنس لگے گا؟" وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"لو..... ذرا کیوں گئے گا بھلا؟ لندن جا رہی ہوں۔ کوئی عدم تسدھار رہی۔" وہ اس کو مسکراتی۔

انہی کرتے کرتے سکسف نے اپنے پیار سے بھائی کی طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ اونچا لپٹا ہوا گل سعید جس کے چہرے پر ہونجانی کی نشانی کے طور پر چلنے لگے دوپٹے میں ہونٹوں سے اوپر لٹک رہے تھے۔ سعید نے شیوٹس بنائی تھی۔ شیوٹ بنانے کی ابھی اس کی عمر ہی تھی۔ انکھوں میں جنس، وہ عجیب کی اس نے بھائی کو چار پھر ہی نظروں سے دیکھا۔

"بیٹے! بات دراصل یہ ہوتی ہے کہ انسان اگر اپنے دل میں کچھ کرنے کی ٹھان لے اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ کر لے تو پھر دل سے خوف خود بخود نکل جاتے ہیں۔ میں خوفزدہ نہیں ہوں، بڑا اعتماد ہے۔ میرے عزائم میری راہ کے ہر کٹنے کو پھول میں بدل رہے ہیں۔ پھر لندن تک مجھے بس میں یا راس ٹیوڈی ہی سفر کرنا ہے؟ بلین میں جاؤ گا۔" وہ جواب دینے کے ساتھ ساتھ کپڑے بھی لپی کر رہی جا رہی تھی۔

"ہوں..... یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔" سعید نے سر ہلایا جیسے اس کی بات کچھ چکا ہو۔

"پھر بلین کے سفر میں کوئی نہ کوئی بہ وطن، ہم زبان کی تو لازمی ہوگا۔"

"نہ بھی بوجھ بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے سہارے دھوٹنے کی عادت نہیں ہے۔" وہ دھوٹنے والے بیٹھ کر دھو رہے ہیں اور میں خود کو سہارے دھوٹنے کی عادت نہیں بنانا چاہ رہی۔

"کے لیے جس مشیوٹی بھی۔ سعید نے اپنی پڑاؤں اور دھوٹنے کو بہن کا عقیدت و محبت سے دیکھا۔

"تو مجھے پھر بازار کیوں لے جا رہی ہیں ساتھ؟" وہ خوشی سے ہلکا۔

"ناکریاں بھلا کر دوں گی کچھ۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی۔

"کیا مطلب؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ جسٹس کچھ ٹرٹس اور جلا دوں۔ پر اپنی ٹرٹس کے کھر، ڈیج ان اور ان ہاؤس کی کتنی تک پیادہ ہو گئی ہے۔"

"اوہ؟" جینک یو آپو جانی! یو آر سو سوٹ۔ یو آر جی اے! ڈرائنگ کسٹر۔" وہ خوشی سے ہل پڑا۔

"اچھا! اچھا! زیادہ مسکنہ لگاؤ اور مجھے پانی چاؤ۔" وہ مصنوعی عجیبی سے بولی۔

"کیوں تو کولڈ ڈرنکس لاؤں؟" وہ بچھا چار پاتا۔

"جی نہیں..... فی الحال پانی ہی لاؤں۔" اس نے اس کی نقل اتاری۔

"ابھی لایا۔" یہ کہہ کر وہ صباک سے باہر نکل گیا۔

"پکلی....." وہ مسکراتے لگی۔

اگلے روز وہ دونوں مارکیٹ چلے گئے سکسف نے اپنی ضروری چیزوں کی خریداری کے ساتھ سعید کو بھی اس کی شاپنگ کروائی تھی۔ اس کی ٹرٹس، ایک بنجر، ایک..... ایک جوتوں کی ڈی۔ دوسر شادی کے عالم میں تھا۔ سکسف نے ٹیبلے کے لئے ایک بڑا اور عارضہ..... اس کے لئے خرچے سے تھے۔

میں سیدھے اپنی پر حال کی رتوجہ دو۔ سمجھے یہ دھوکے کی دنیا تو میں اب سراپ ہوتی ہے۔
 ہوتی ہے۔ تمہاری منزل یہ نہیں ہے۔ تمہاری منزل بہت دور ہے اور تمہاری ذمہ داریاں بھی
 اتنے سیدھے خیالات کو ذہن میں جگہ مت دو۔" بڑی بہن کی مشیت سے وہ اسے ڈانٹنے
 پر معنی تھی۔ سو اس وقت وہ اپنے اس حق کو خوب اچھے طریقے سے استعمال کر رہی تھی۔ وہ
 نہ تو ایک دوست کی طرح ہے، نہ ایک دوست کی طرح اس پر بھی جھڑپاتی
 اس کے خیال میں چھوٹے بھائی کو ایک دوست کی طرح اور ایک بھور دھوکے کی طرح ڈیل کرنا
 ہوتا ہے۔ البتہ اپنے بے گناہ وقار اور عجب قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جبکہ دونوں بڑی
 مود و رفاقت سے مکلف تھا اور نہ ہی اس سے اتنی دوسری تھی کسی اس۔

۴۔ آپ! اس تو مذاق کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے کانٹھوں پر دم دار یوں کا بوجھ بھی نہ لائے بھی دوسری ہے۔ "عید نے جلدی سے اسے پکڑ لیا۔

اب سے سکڑا کر سر ہلا دیا۔ "جانتی ہوں میرا بھائی کیسا ہے۔ مجھے اسی طرح معلوم ہے۔
 ہے۔ جہوں نے بھائی کو دیکھ لیجئے۔ اسی طرح باتوں میں وہ من تھے کہ یکدم ایک سرخ اسپورٹس
 کار قریب آ کے بندھنے سے رکی۔ دونوں بین بھائی چلے گئے اور کار کو دیکھنے لگے۔ کار کے سیاہ
 پچھوٹے دیکھنے لگے۔ اور اگلے ہی لمبے جس پھر سے کو دونوں نے دیکھا وہ ان دونوں پر دو
 م کے جہازات چھوڑتا چلا گیا تھا۔
 اولیٰ خان کو دیکھ کر معیدہ حیران اور خاصا غلغلہ آ رہا تھا۔ جبکہ کشف کے ماتھے پر نگاہوں کی
 ابرو اٹھیں۔

دلہا: ”خاصی خوش دلی سے اس نے کشف کو ہیلو کہا تھا۔“

نے بے اختیار بہمن کی طرف دیکھا جو بالکل سرد و نازات لائے کھڑی تھی جس نے جواب میں ہلے کہنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی

اپ کہاں جا رہی ہیں؟ چلئے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“ بڑے بے تحفانہ اسٹائل میں آخر

ہم چلے جائیں گے۔" اس نے روکے سے انداز میں کہا۔

ناکلف نہ رہیں۔ آجائیں، بیٹہ جائیں۔ بڑی حسرت امرتسری میں اس کے اپنے سوسوں
 نے اصرار کیا۔

حرف کیجئے گا..... اشیوں سے لطف لینے کی عادت مجھے نہیں ہے۔ اس کا انداز ہنوز ویسا

ابنی..... مائی گاڈ! "وہ غصہ پڑا۔" ہماری یہ جہلی ملاقات تو نہیں ہے۔ پھر ہم ابھی کیسے ہو
 وہ بھی وحیث تھا۔

۶۔ دل ہی دل میں تملیاری تھی۔ اسے معینہ کی فکر لگ گئی تھی کہ وہ نبھانے کیا سوچ رہا ہوگا۔

”آئی! ایک بات تو بتائیں۔“ شہر زکا جو اٹھائے وہ بہن کے شانہ بٹانہ ملتے ہوئے بچہ چڑھتا ہے۔
”ہو پھو!“ کشف نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی کیا لاری تھی ہے؟“
”کیوں؟“ کشف نے اسے دیکھا۔

”یہ اتنی فراخ دلی کس لئے بھئی؟“ اس نے سامان کے شاہزکی طرف دیکھا۔

میں اس وقت کے دوسرے کٹارے پر بس اسٹاپ تھا۔ اس وقت سڑک پر اتنا ٹریفک تھا کہ کہ

”بڑے مٹنے کا تجسس ہو رہا ہے اس لئے آم کھانے کی سرت ادھوری لگ رہی ہے۔“ معیہ

”تو اس جھنڈ کے ساتھ پہلے روڈ گراں کرنے کی سوچ، کس طرح پار کریں اس میں مراد“

نے گاڑیوں کے اڈو حام کی طرف دیکھا جو زن زن کرتی ہوئی یوں گزر رہی تھیں گویا کبھی نہ اور کسی کو راستہ نہ دینے کا تہیہ کر لیا ہو۔

”سینکڑ ریل ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کے بغیر تو یہاں سے گزرنا بہت مشکل ہے اور رول لے رہیں گے تو ڈی۔ اور خرچہ خانے کے ورے ہوتے ہیں۔“ معتمد نے منہ ہٹا کر کہا۔

”ہوں“ کشف نے سر ہلایا۔

آپ نے بتایا میں اپنا اس کے بچے ہوں اس کے آپ سے پاس اس عقیدہ کو اپنا سواں

”ہاں.....“ معیہ مسکرایا۔ پھر جو بھی روڈ پر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں اُس نیون سائن

غیر کہیں جو سڑک کے کنارے لگا تھا۔ شاید کسی ریڈیو میڈ کارمنٹس کا بورڈ تھا جس پر ایک لڑا لڑکی مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے کندھوں پر بازو دکھائے بڑے اشکالی سے کھڑے تھے۔

”بہت زبردست ماڈل ہے۔“ معید کے منہ سے بے اختیار نکلا اور کشفِ چراپے خیال میں۔

”کون؟“ اس نے معید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر معید پر سے ہوتی ہوئی اس

”آج کل ہاپ ون ماؤں یہی ہے۔ تیمور علی خان۔ کیا اسٹائل ہے اس کا۔ کیا لگتا ہے۔ اور

”اور بابا سے بچوں..... اور مگر سے نکالا جاؤں۔“ کشف نے اس کے جملے کے آگے گھڑاؤ

”اسی ڈرنے تو ہمت توڑ دیتی ہے۔“ وہ بے چارے سے بولا۔

”دیکھئے ہلچل! صرف پہلو ہائے کوئی جان بچان والا نہیں بن جاتا۔ ہائے وا میرا بھائی معید ہے۔“ اس نے خود پہ تاج پاتے ہوئے معید کا تعارف کیا۔
 ”ہیلو.....“ معید نے مصافحے کے لئے ہاتھ مڑکری سے اندر بڑھایا۔

”ہائے۔“ تیمور نے اس سے ہاتھ ہٹایا۔
 ”ہمیں ایکسلرڈ رکھیں۔ ہماری بس آنے والی ہے۔“ کشف نے فوراً کہا اور معید کا ہا تقریباً کھینچے ہوئے روڈ کر اس کے آگے بڑھ گئی جبکہ تیمور صرف خاموشی کے ساتھ اسے ہونے دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس سے سناڑ کیوں نہیں ہوتی تھی؟..... کیوں اتنی خاموش تھی؟..... انجمن ہونے لگی تھی۔

”جنتی ہے..... یہ بل کلاس لڑکیاں صرف توجہ حاصل کرنے کے لئے پوز کرتی ہیں۔“
 مرکز سوا اور غیر تبدیل کر کے کار آگے بڑھا دی۔

”آپ تیمور علی خان کو جانتی ہیں؟“ معید بس کی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد پوچھ رہا تھا۔
 ”راہد کارکن ہے۔ اس کی منگنی میں طاقات ہوئی تھی۔ اشارے۔ خود کو آسمان پر بیٹھا ہیں مصروف۔ مجھے تو ذرا پسینہ نہیں ہیں یہ شوہر کدک۔“ وہ گرم دماغ کے ساتھ اپنے خلیلا مکر رہی تھی۔

”مگر مجھے تو بڑے مقول انسان لگے۔ کتنی تیز اور اخلاص کے ساتھ پیش آرہے تھے۔ کہ ان کی لٹ والی آفر کو قبول کر لیتیں آپ۔ اس کھمارا کے انتظار میں مزید چندہ منٹ تو ہوتے۔“ معید نے منہ بنا کر کہا۔

”کیسے قبول کر لیتی اس کی آفر؟ میرے کچھ کا پتا لگتا ہے؟“ وہ قوف۔“ کشف۔
 ”یوں ہر ایک سے سدا افکا کے لٹ لینے لگے تو اماں ہاوا نے کمرے کے کال باہر کر کیجئے۔ اور یہ کھرا ہے ہ۔“ کشف نے طنز پر اعزاز میں جواب دیا۔ ”اسی کو تینیت سمجھو ہا چل چل کر نکلیں تو نونے سے تو یہ بھی بھڑی ہے۔“ وہ اس کی کلاس لے رہی تھی۔

معید منٹاپا۔ ”نہیں..... میرا مطلب تو تھا۔“

”اچھا پہلو، دوغ کر دو۔ کچھ اور بات کرتے ہیں۔“ کشف نے موضوع گفتگو بدل دیا تھا۔
 علی خان کے لئے اس کی پانچویں کی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ آج اس کی وجہ سے معید کے اس کی رپویشن خراب ہوتے ہوئے رہ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تیمور آئندہ اسے اس قدر دینے کی طاقت نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کا رویہ ہی ایسا تھا کہ کوئی بھی مقول انسان اپنی پنک کر سکتا تھا۔

وہ اپنی وارڈروب کھولے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کی نظریں اپنے پیکڑوں پر بھی ہوئی تھیں سے ایک اہلی کپڑا تھا۔ ایک سے ایک ڈیزائن والا اور نہیں لباس تھا۔ پیکڑوں کی قیمت ہی

ارہ ہوئی تھی اور لاکھوں تک پہنچ جاتی تھی۔ اپنے جانے والوں اور متعلقے میں وہ سب سے زیادہ اپنا مشہور تھی۔ اس کی پسند کا بھی تو جواب نہ ہوتا تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک پسند کی اس کی۔ اور لباس کے انتخاب میں اس کی نگر کا کوئی نہ تھا۔ وہ خود جتنی حسین اور نرس کی اس کا انتخاب اس ہی بڑھ کر حسین، نفیس اور قابل ستائش ہوتا تھا۔ مگر اس وقت وہ خالی خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

”پانی کا کمر دے گا ہے..... ایک لبر آئے گی اور یہ مگر دعائی میں مل کر مٹی بن جائے گا.....“
 ہاوا اس کی ساتوں سے بھڑکی۔ ”سب کچھ اسی مٹی میں مل کر رتے میں بدل جائے گا۔“
 اس نے الماری کے پیٹ سے چیٹن لے کر آگئیں موعہ لیں۔

”نعرے سرکار! میں ایک کپڑا کا فرمان بھول جاؤں؟“
 ”سب ملتا ہے۔ یہ سب وہاں ہے۔“ عاتق ہاوا کی آواز کا ظلم اس کی ساتوں میں ڈاک تھا۔

”ہاں..... یہ سب وہاں ہی تو ہے۔“ اس نے دشتی ہرنی کی طرح اپنی وارڈروب کی طرف مٹا۔ پھر نہانے اسے کیا ہوا کہ اس نے اپنے تمام پیکڑوں کو ایک ایک کر کے الماری سے نکال کر باہر انا شروع کر دیا۔ وہ دواؤں کی طرح سارے کپڑے نکال نکال کر تالین پر ادھر ادھر پھینکنے لگی۔ نا

اماری الماری خالی ہو گئی تو وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھک کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
 اسی وقت ولید کے روم میں داخل ہوا تھا کہ روم میں پھیلے پیکڑوں کی اختر حالت دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ ان بکھرے ہوئے پیکڑوں کی طرف ان کی نظریں تھیں نظریں آہستہ آہستہ وارڈروب کے پاس دوڑا تو

لی ماہور پر جا کر رک گئیں۔
 ”ماہور.....“ وہ اسے روٹے ہوئے دیکھ کر برق رفتاری سے آگے بڑھا۔ ”کیا ہوا میری جان؟“
 ”ہاں رو رہی ہوں؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ وہ کچھ

ولی۔ وہ کچھ بولنے کی حالت ہی میں تھی۔ اس دوری تھی۔
 ”اور یہ سب کیا ہے؟“ اس نے کمرے کی حالت کی طرف اشارہ کیا۔ ”کسی نے کچھ کہا ہے؟“
 ”نہیں..... وہ کیا دیکھ رہی ہے۔“

”مجھے سے کوئی گفتگی ہوئی ہے؟“ ولید نے پھر پوچھا۔ دوسری سمت سے صرف سسکیوں کی آواز میں ہی تھیں۔
 ”نورا..... جان! ادھر دیکھو۔ میری طرف۔“ ولید نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بتائے۔

”اوہ گاڈ.....“ اس کا سرخ چہرہ وہ تو سرخ آنکھیں دیکھ کر بے ساختہ ولید کے منہ سے نکلا۔
 ”نور..... پہلو، پہلو پر آؤ۔“ اس نے شانوں سے ماہور کو گھٹا اور بندیک لے آیا۔ پھر اسے بٹا کر
 اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی ڈال دیا اور اس کی طرف لے آیا۔
 ”لو..... یہ پو.....“ اس نے گلاس ماہور کو تھما لے کر اسے بجائے خود اس کے لبوں سے لگا لیا۔

گئے۔ پروفیسر کرمانی نے کہا اور ساتھ ہی اپنی پرستش ازلی سے ان لوگوں کے فون نمبر دیکھ ایک کاغذ پر لکھ کر اس کی سمت بڑھا دیئے۔

اتنے میں چڑائی ہوگئی اٹھائے اندر آگیا۔ اس نے پروفیسر کرمانی اور کشف کو کولڈ ڈرنکس "میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں سر! آپ کے دیئے ہوئے یہ حوالے میرے کافی ہیں۔" اس نے کشف کے ساتھ دوپچہ لے لیا۔

"تمہیں وہاں جاب بھی تو کرنی ہو گی کشف! وہاں کے اخراجات برداشت کرنے، اسکالرشپ کی رقم کے لئے بھی تمہارے لئے جاب کرنا ضروری ہوگا۔" پروفیسر کرمانی نے دوسری طرف دلائی۔

"جاب؟..... محرم سر! اس بارے میں تو میرا ایمان ہی نہیں گیا تھا۔ وہاں جاب کیسے کا کی؟ اور پھر کیا جاب کروں گی؟" وہ کچھ پریشان ہی ہوگئی۔

"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کا بندوبست کرادوں گا۔ مجھے جہاں تک ہے تم نے داکٹر بننا بھی سیکھا ہوا ہے۔ ہے؟" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں..... داکٹر بننا میرا شوق ہے۔ اسی شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے وہ سیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تم آرٹنگز اور ٹائول اور انسٹال وغیرہ بھی لکھتی رہتی ہو۔ اس کے علاوہ ایم اے؟ دیکری بھی تو ہے تمہارے پاس تم کو وہاں جاب مل جائے گی۔ میں اپنے تعلقات کو استعمال آؤں گا۔ تم کو پارٹ ٹائم کام کی بھی جاب دلوانے کی کوشش کروں گا۔" انہوں نے اس کو تسلی دے کر سرے پیسے بھاری ہو کر کھڑک گیا۔

"آپ کے احسان کا بوجھ کس طرح اتاروں گی سر؟" وہ کشف سے لبریز نظروں سے انہیں گئی۔

"ہاں..... ایک طریقہ ہے اس احسان کو اتارنے کا۔" وہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے بولنے سرا..... کیا؟" وہ سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔

"بس وہاں جا کر وہاں کے رنگ میں مت رنگنا۔ یہ مت بھڑانا کہ تم ایک مسلمان لڑکی ہو۔ پھر اور تمہاری شناخت پہچان پاکستان سے ہے۔ اس کی سادہ و نام کا خیال رکھنا۔ اس کے قواعد معیار کا خیال رکھنا۔ ہمارے پاکستانی جذب و یاد غیر جاتے ہیں تو ان میں سے انکڑی حرکات، ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو کوسج بھی شرم آجائے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس مطلب وہیں پرستہ لسٹ میں ایک اور نام کا اضافہ ہو۔" پروفیسر کرمانی بولتے بولتے ڈرا کر..... وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو دیار غیر جا کر اپنے وطن کا نام دام سبب جیتے ہیں۔ محرم سر!..... ایک بڑگ اور ایک استاد ہونے کی حیثیت سے چند باتیں آپ وہاں کے طور پر کہنا لازمی تھیں۔"

راجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھے اپنی شفقت آہیز بھیتوں سے روشناس میں نہ کرنی دھڑکی کروں گی اور نہ ہی وعدہ کر میں ایک چیز کی یقین دہانی ضرور کرواؤں گی کہ میں اپنی فہرست میں اپنا نام لکھنا پسند کروں گی جو دیار غیر میں ہے جس تک مقصد کے حصول ہاتے ہیں، اس میں سو فیصد کامیابی لے کر ہی واپس لوٹے ہیں اور سن کی وجہ سے ان کے ملک اور ان کے راجز سے ہر کوئی سیاہ و صبح نکلتا۔" اس کے لہجے میں غمزہ تھا۔ چائی تھی اور آنکھوں میں لہانے کی جوت چمک رہی تھی۔

لیجے سے بھی امید کی کشف! پروفیسر کرمانی بہت خوش ہو کر بولے۔

اب وہاں کچھ دور اور بیٹھی تھی۔ پروفیسر کرمانی اسے پاکستان سے لندن تک کے سفر کے بارے وہ چیزہ معلومات دیتے رہتے تھے۔ پھر انہوں نے اسے وہاں کے لوگوں کی فہرست کے بارے انعام کیا تھا۔ یہ بخیر نئی سے متعلق بھی چند ضروری معلومات بجم پہنچائی تھیں۔ وہ ان کی باتیں ات بہت غور سے سن رہی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ایک ایسی ہی انجان سطر میں اس کی راہبر تھیں۔

پروفیسر کرمانی کے آفس سے فلیجی تھی تو اس کے پاس خاصی معلومات تھیں اور ان سے یہ ہوا تھا کہ اسے اب وہ گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی جو پروفیسر کرمانی کے ملاقات کرنے سے قبل اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب اسے اتنی مشکل درپیش نہیں آئے گی جتنی ان معلومات کے حصول کا وہ محسوس کرتی تھی۔

یہ بخیر نئی سے فلیجی اور بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں پہلے ہی کچھ لڑکے لڑائیاں کھڑے تھے ان میں کچھ بات کر رہے تھے۔ کچھ لڑکیوں نے اپنے موہاں فون کا ن سے لگا رکھے تھے۔ وہ فریاد اڑا کر تھیں وہیں کھڑی ہو کر اپنے روٹ کی بس کا انتظار کرنے لگی۔

آپ اپنے روٹ کے لئے وین کر رہی ہیں؟" ایک لڑکی اپنا موہاں آف کر کے اپنے بیک لے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

جی۔" کشف نے اسے دیکھا۔

بے کار ہے۔" لڑکی بولی۔

اس مطلب؟" کشف پوچھی۔

مطلب یہ کہ بسوں کی پڑتاں ہو گئی ہے۔ بالکل غیر اطمینان..... ہمیں بھی ابھی اطلاع ملی میں نے اپنے بھائی کو فون کیا ہے ابھی ابھی وہ مجھے بانگ پر لینے آ رہے ہیں۔ آپ کہاں آگئی؟" لڑکی نے پوچھا۔

مجھے تو گھسٹن جا رہا ہے آگے جانا ہے۔" کشف کچھ فکر مند سی ہوئی۔ "ویسے یہ اپنا ک

پک کی کال کیسے ہوگئی؟" کشف نے پوچھا۔

میں بس ڈرائیوگر کی فریک سار جنٹ سے مل رہی تھی۔ بس کسی سیاست دان کی ملکیت تھی۔

اس ادارے بزرگوں، بڑوں اور دوسرے مسلمانوں نے اپنی جانوں کو قربان کیا تھا ۱۳۲۷ء میں یہ کابو خراج اٹھا۔ اس ملک کی بنیادوں میں اینٹ، پتھر جس جگہ ہمارے اسلام کا کابو اور قربانیاں مثال۔ ہمارے بزرگوں نے اس پاک سرزمین کو اپنے خون سے دھویا ہے۔ اور آج..... آج ہم اس ملک کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ ایک دوسرے کا خون کر رہے ہیں..... ہر پلٹ کر رہے ہیں..... ہر چور بازاری، حرام کا دھور ہے۔ زندگی میں صرف اپنی ذات کا سوچ رہے ہیں..... صرف ہمارے میں..... ہم نے اس ملک کی بڑوں کو کھٹکوا کر دیا ہے۔ لسانی اختلافات کو بنیاد بنا کر..... بڑوں کو گور دینا کر..... ہمارے سیاست دان..... ”کسی“ کے حصول کے لئے کئی کے کتوں کی طرح مار رہے ہیں۔ عام عوام اس لڑائی میں ایسے سر رہے ہیں جیسے کھیاں اور جھمر۔ بے نیلے اور..... ہر ایک دوسرے کی کات میں لگا ہے۔ خود کو پاکستانی کہتے ہیں مگر پاکستانی ہونے کا مطلب اس مجھے..... خود کو محب دکن کہلانے کا شوق ہے مگر ”محب دکن“ کا معنی کیا ہے، یہ نہیں جانتے..... وہ دل میں ملتی، کسوتی، کسوتی سرک کے کنارے کنارے چل رہی تھی اس کا خون اور دل اس کی طرح کی خروں پر چلے گئے تھے۔ آج فلاں پارٹی نے ہڑتال کر دی۔ آج فلاں مسئلے کے نمبر بند۔ آج پیر جام۔ آج، یہ آج وہ..... اس کا مٹی کرنا تھا کہ وہ ان سیاست دانوں کو لائیں اور لاکر کے شوٹ کر دے جنہوں نے اپنے مناد کی خاطر اس ملک کا بیڑہ خرق کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں غلط تھی، جیسا ایک رکشہ اس نظر آ گیا۔ اس نے اسے یہ قیمت سمجھا۔ یہی ہماری سرک اس وقت بالکل سنان ہو رہی تھی۔ کشف دہی سے یہ دل چل رہی تھی اور خامی تھک بھی چکی تھی۔ اس نے اشارے سے دیکھنے کو دھکا دے رکشہ اس کے پاس آ کر رک گیا۔ لے کر کاپہ بتایا تو کسے والے نے جو رقم مانگی وہ ڈھل سے بھی زیادہ تھی۔ اس کا خون ابلنے لگا۔ ”یہ تو زیادتی ہے۔“ آخر قریب تو ہے راستہ۔ آپ موقع کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“ اس نے فصرہ ضبط کر لیا۔

”لی لی کی بھی موقع کا فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ ام کو ن سالہ کام کر رہا ہوں یا دوسروں سے کم؟“ یہی کر رہا ہوں جو سب کرتے ہیں۔ اسے خراب حالات میں ام آپ کے کرے گا۔ اگر دیکھیں تو کیا ام کو کوئی نقصان پہنچا تو اس کا نقصان تو ہی صرف ام کو ہو گا۔ آپ تو اپنے مگر پہنچ رہے ہیں۔“

”نئے والے کی بات پر وہ چپ ہو گئی کہ یہ لی لی امال اس کی مجیدی تھی۔ درشتانے بیٹوں میں وہ امال نہ تھی۔“

”اچھا..... ٹھیک ہے۔“ وہ لی لی اور ابھی کرکے میں بیٹھے والی تھی کہ دھماکے کی آواز پر.....

”ا.....“

”خانہ خراب..... ایک ہیٹ ہو گیا۔“ کسے والے کے منہ سے بے ساختہ لگا تھا۔ کشف.....

”میں کھما کر دایں جانب روڑ پار دیکھا جہاں سرخ اسپرڈس کا بکھر چکے تھے مگر ابھی تھی اور

بہن ڈرائیو نے سارنٹ سے پچھڑی کی تو سارنٹ نے اسے حلالیت میں بند کر دیا اور چالان بھی کر دیا۔ ڈرائیو نے اسے دھکی دی۔ سارنٹ کوئی آکٹر داغ تھا۔ اس نے دھکی کر واہ نہ کی۔ اس پر بس والوں نے ہڑتال کر دی۔ پورے شہر کی بسوں نے پیر جام ہڑتال کا دیا ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ان کے ساتھی کو چھوڑا جائے اور نہ صرف چھوڑا جائے بلکہ وہ اس پر ڈرائیو سے معافی بھی مانگے۔ اور سارنٹ یہ کرنے پر راضی نہیں ہو رہا۔ کہتا ہے کہ کوئی غلطی نہیں۔ بس ڈرائیو دھرے روڑ پر اچھڑی رہی ڈرائیو نے گھر کر دیا تھا۔ اور اس بات پر تھا کہ اس نے سارنٹ کو کئی کا مالک ایک سیاست دان ہے۔“ لڑکی کی بجائے وہاں کھڑے ایک نے جواب دیا۔

”مگر آپ کو یہ اطلاعات کیسے ملیں؟“ کشف نے حیرت سے پوچھا۔

”میرا بھائی لی لی میں تھوڑا پاور ہے۔ اس نے ابھی ابھی یہ ساری خبریں مجھے دی ہیں۔ ابھی میں سوار تھا جس کا ڈرائیو اس وقت حلالیت میں بند ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”مگر اب ہو گا کیا؟..... مگر کیسے جائیں گے؟“ ایک اور لڑکی نے یہ پٹائی سے اس لڑکے کو پوچھا۔

”تم کو تو میں مگر چھوڑ دوں گا۔ ڈنٹ دے۔“ وہ لڑکا شاید اس لڑکی سے واقف تھا۔

”ٹھیکس.....“ لڑکی نے کہا۔

”اوہ گاڈ!..... یہ تو مسئلہ ہو گیا ہے۔“ کشف نے تلک کر اپنی شہادت کی اگلی سے اپنی سمجھائی۔ کوئی رکشہ بغیر وہ لیا نہ پڑے گا۔“

”کشف سوچنے کی اس جگہ پر رکشہ چلنے میں بھی دیر لگ جائے گی۔“

”آپ کیسے جائیں گی؟“ اس نے پوچھا جس نے ہڑتال کا بتایا تھا۔

”میں رکشہ نے لوں گی۔ خدا حافظ!“ کشف کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ روڑ پر آہستہ آہستہ چلے وہ دھماکرے بھی کوئی رکشہ نظر آ جائے۔ اس جگہ پر رکتے ہوئے بھی کسی کم ہی نظر آتے تھے۔

”ایک تو ان ہڑتالوں نے ہمارے ملک کو ختم کر دیا ہے۔ بھی پیر جام ہڑتال، بھی بھوک اور کاروبار..... یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ایک عام آدمی ان ہڑتالوں سے کس قدر متاثر ہوتا۔“

”خود روڑ ہڑتال کی کات ہے۔ ان کی روڑ کی کات ہی ان کے پیٹ کا لینڈ بن رہی ہے کاب جو اور ان ہڑتالوں میں وہ بے چارہ جب کاتے گا نہیں تو کیا غروں سے چھین کرے گا؟“

”بازار بند، کاروبار بند، سکول اور دوسرے تعلیمی ادارے بند..... ملک کو ہم کیا دے رہے؟“

”محبت ہماری کہاں پہنچ رہی ہے؟“ ہمارے بیٹے اور نوجوان تعلیم اداروں میں بھی سیکے آج فلاں بات ہو گئی تو ہڑتال کر دو۔ آج فلاں بات سناؤں ہے ہڑتال کر لو۔ فلاں مطالبہ نہ ہا ہڑتال کر دو..... بس ہڑتال ہی ہر مسئلے کا حل سمجھی۔ اور مسئلے پھر بھی اپنی جگہ پر ہیں۔ ایک ایک نہیں ہوئے۔ بلکہ بدھتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا ان سب باتوں

کار کا پونٹ میز حایر جاہو چکا تھا۔ اندر بیٹھا مضمحل اسٹیزنگ پر جمکا ہوا تھا۔ کشف کو بتا دیے۔ مضمحل سمجھ سے نظر نہیں آ سکا تھا اور اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کھسکتا زخمی ہے اور اسے کتنی چنبر ہیں۔ کیا وہ بے ہوش ہے یا محض زخمی ہوا ہے۔

"اودہ..... چلو دیکھتے ہیں..... خان! چلو میرے ساتھ۔" کشف نے کہا اور پھر رکش ڈرائیج انتہا کرنے کی بجائے سڑک پر اچر اچر دھکی مڑک پار کر گئی۔ روڈ بالکل سناٹا تھی۔ کہیں کوئی زانو نظر نہ رہا تھا نہ ہی گاڑی کا زیا سوا ساری۔

وہ بھانپتی ہوئی کار تک پہنچی۔ کار کا انگا حصہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ اندر ایک ہی لڑکا تھا اور اسٹیزنگ پر اوجھار ہوا تھا۔ کشف نے دروازہ کھول کر اس کا شانہ ہلایا۔

"ہیلو!..... مسٹر! کیا آپ میری بات سن رہے ہیں؟" اس نے لڑکے کو سیدھا کیا اور ہاتھ پڑی۔ اس کے سامنے جو طویل خان موجود تھا۔ اس کے سر سے خون نکل نکل کر اس کے چہرہ کوں اور گردن پر جان کا پھونکا جا رہا تھا۔ کار کی وڈر اسکرین کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید اس کی کہ ٹوٹ کر اس کے سر میں لگی تھی۔ اس کی ٹی فرٹ سے جھانکتے اس کے سڈول بازو میں خون لت پت تھے۔ وہ ابھی پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں اس نے اوپر جھکی کر مندی کشف کو دیکھا۔ وہ کسی کو آواز دے رہی تھی۔

"خان!..... تم اپنا درکش جلدی سے اوپر لاؤ۔ اسے پتہ چلے کہ رہا ہے۔ خون بہت سے نکل رہا ہے۔" کشف ڈرائیج پر تقریباً چٹا کر کہہ رہی تھی۔ ڈرائیج روڈ پر ہی سے اس کے لیے کی طرف بھاگا۔

کشف کا دل خون کو دیکھ کر اچھل پھٹل ہو رہا تھا۔ مگر اس نے بہت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعصاب پر قابو پایا۔ اس کا خون رونگتا ضروری تھا۔ کشف نے کار میں نظر دوڑائی۔ کوئی بھی کپڑ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جلالت میں اپنے سر پر پہنا اسکارف اٹھا کر تیموری کی پیشانی پر زور سے ہانک اور دقت و مصروف انسانی بھردی کے تحت ایک انسانی جان بچانے کی کوشش میں تھی جس کی اور اثر لئے اسے بھرپور کوشش تھی۔ تیمور نے مندی ہوئی آنکھوں سے اس کی سفید چھتی ہانک کو دیکھ کر کہا۔

"آپ کے گھر کا نمبر کیا ہے؟" اس نے تیمور سے سوال کیا۔ تیمور نے جواب دینے کی کوشش کی مگر اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اس نے پھٹکل جڑوں میں گرے موٹا دل خون کی طرف اشارہ کیا۔ کشف نے اس کے جڑوں میں رکھے موٹا جبک کر اٹھایا۔ تیمور کی آنکھوں کے آگے اندر اس کا چھایا تھا اور وہ کشف کو دیکھنے لگا جو اس پوچھ رہی تھی مگر رفتہ رفتہ کشف کی آواز ذوقی جا رہی تھی۔ اور چند لمحوں میں ہی تیمور ہوش و حواس بگاڑنے لگا ہوا تھا۔

"اودہ گاڑ!..... تو بے ہوش ہو گیا ہے۔" کشف کے ہاتھ پھر پھول رہے تھے۔ رکش ڈرائیج رہا رہا رکش اسٹے کٹ سے ٹھکرا رہا تھا۔ کشف، تیمور کو سہارا دیتے ہوئے تھی

اس کی نظر ٹی فرٹ سیٹ پر پڑے گرے کچھ رسالوں پر پڑی۔ ان رسالوں کو دیکھ کر کشف کے دل تک ایک تلخ بات بدل گیا۔ وہ رسالے اور میگزینز انگریزی تھے اور ان پر غریبوں کی لڑکیوں کی بیانیسی واضح نظر آ رہی تھیں۔ کشف نے ایک ٹھنکس نظر لے ہوش تیمور پر ڈالی پھر بڑی ناگواری باندھ کر اس طرف چروہ موڑ لیا جس طرح سے خان اپنا رکش لا رہا تھا۔

"خان! اسے کچھ سیٹ پر بٹھانے میں مدد کرو جائیز۔" کشف نے اس سے کہا۔

"آپ بہت جا بولی! ام! اس کو اٹھا کر سیٹ پر لا رہا ہے۔" وہ پھٹان دیکھنے میں غامضی حساست اہل سے قد کاٹھ کا ٹھکانا اس میں غامضی طلعت تھی۔ اس نے کشف کی مدد کے بغیر ہی تیمور جیسے اس کے منہ لڑکے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر رکش کی کچھل سیٹ پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ بے ہوش تھا اس بار بار سیٹ پر لے کر اٹھ جاتا تھا۔

"بی بی! آپ کو اسے سنبھالنا ہو گا۔ ورنہ یہ رستے سے باہر گر جائے گا۔" ڈرائیج کے کہنے پر کشف کی سست سے رستے میں آکر ٹیٹھکی اور پھٹکل تیمور کو سنبھال لیا۔

"کون سے ہسپتال لے جانا ہے؟" خان نے پوچھا اور ساتھ ہی رستے میں چنچہ گیا۔

"کوئی بھی قریبی ہسپتال لے چلو۔ اس وقت تو اس کی جان بچانی ہے بس۔" کشف نے جلالت لہ کیا۔

رکش ڈرائیج نے تیزی سے رکش چھایا۔ رکش سناٹا سڑک پر بھاگ رہا تھا اور اندر کشف بہت اوجھل سے تیمور کو سنبھالے ہوئے تھی کہ جیسے ہی اس قدر دگ رہے تھے۔ اسی چکر میں وہ موٹا اٹھ رہا اس نے اپنے کپڑے میں ڈال دیا تھا) بھی نہ دیکھ پانچ تھی کہ تیمور کے گھر کا نمبر و فیروزہ میں اس کا رکش۔

"خان! تمہارے پیسے ڈھل ہو گئے ہوں گے۔" کشف کا اشارہ ٹی کی طرف تھا۔ "اودہ، چھوڑ دو بی بی! اتنی افسانیت تو اندر سے اندر گیا ہے۔ ایک مرتے آدمی کو بچانا اندر سے ایک زیادہ ضروری ہے۔ مگر ام! آپ کو ایک بات بتا دوں، ام! صرف آپ کو ڈاکٹر کے پاس چھوڑے گا اندر نہیں جائے گا۔ یہ ایک سیٹف کا کیس اسے۔ پولیس خانہ خرابہ ڈاکٹر کے پاس ہارام نے لایا ہی ایک ٹیکسی لگی تھی کسی کے ساتھ۔ پولیس والوں نے اندر جب کھالی (خالی) کر دیا تھا۔ اس ہارام نے ہسپتال چھوڑنے کی ٹیکسی کرے گا۔ اندر آپ جانو اور یہ بندہ۔" اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے بھائی! تم ہسپتال تک پہنچنا دو۔" بھیا احسان کیا کم ہے۔ میں وہاں سے اس کے گھر والوں کو نہ کر کے اطلاع دے دوں گی۔ وہ خود ہی منت لیں گے آگے۔ میں بھی صرف اسے ہسپتال ہی پہنچاؤں گی۔" کشف نے جواب دیا۔

"مصلحتی مندی بی (بھئی) بھیا اسے آج کل ٹیکسی کا زامنا نہیں اسے۔" ڈرائیج نے اپنے خیالات ادا کیے۔

سڑکوں پر پرائیویٹ ٹریک تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ غیر اطلاع ہسپتال کے سب لوگ جلالت

میں سارا کاہلو پار زندگی سینے مگروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کراچی..... جڑبھی روٹنیوں کا د کرتا تھا..... آج بڑبڑاؤں اور سیاسی سازشوں کی نذر ہو کر اندھیر گلی بن چکا بار تھا۔ کشف کو مگر والوں کی بھی فکر ہو جاتی۔ وہ یقیناً اس کے لئے فکر نہ ہو رہے ہوں گے۔ وہ سوچ رہی تھی تھوڑا کو ہسپتال میں بھروسہ کر وہ اسی رکنے میں سیدھی اپنے گھر چل جائے گی۔ تھوڑے جسم سے والے خون نے کشف کے کپڑوں کو بھی پوری طرح خراب کر دیا تھا بلکہ خون کے دبے اس کے پا پر بھی لگے ہوئے تھے۔ تھوڑا اس کے کندھے پر سر دوڑ گئے ہوئے تھا اور وہ بہت بیزاری سے بار بار سر ہلاتی مگر وہ بے ہوشی کی وجہ سے پھر اس کے شانے پر آ کر تھکتی۔

رکش ڈرائیور نے ایک پانچ بیٹ ٹیکس کی پارکنگ میں رکشہ روک دیا اور کشف سے کہا کہ وہ اتر جائے۔ کشف رکنے سے نیچے اتری۔ ڈرائیور نے تھوڑا کو اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ کشف ڈرائیور دونوں نہایت تجزی سے ہاتھل کی فحاشت میں داخل ہوئے۔ ہر آدمے میں دیکھے سزا تھوڑا کو ڈالنے کے بعد ڈرائیور نے کشف سے کہا۔

”بی بی! ڈاکٹر کو بلاؤ۔“

کشف ریسیشن کی طرف بڑھی۔ اور پھر چھری لگوں بعد تھوڑا کو ڈاکٹر ڈر آپریشن تھوڑے کے لئے گئے۔

”خان! ابھی تھوڑی دیر اور نہ، میں اس کے گھر کا نمبر ڈھونڈ کر اطلاع کر دوں۔ پھر مجھے بھی مگر جانا ہے۔“ کشف نے ڈرائیور سے کہا اور بیک سے تھوڑا کو موبائل نکال کر نمبر ڈھونڈنے ا اس کے پاس فلک کا ٹیکسٹ نمبر بھی نہیں تھا اور نہ وہ اس کو مطلع کر دیتی۔

”مرحبا“ میں اسے حیدر کا نام لگا کر لیا تو اس نے فوراً اس کے سبل نمبر کو ڈائل کر دیا۔ چند لمحوں حیدر کی آواز لیٹر میں سے آئی۔

”کیو تھوڑا اس وقت کیسے فون کر لیا؟“ ابھی وہ سمجھنے پہلی ہی تواب تھی۔ ”حیدر کہہ رہا تھا ”دیکھیں..... میں تھوڑی نہیں ہوں۔ میں فلک کی دوست کشف ہوں۔ آپ فلک کے بھائی م بات کر رہے ہیں؟“ کشف نے فحاشت میں اس کی بات کائی۔

”جی ہاں..... مگر.....“ حیدر کی آواز میں غامضی تھی جی تو واضح ہو رہی تھی۔

”دیکھیں، تھوڑا کا ایک ہیڈ فون ہو گیا ہے۔“ کشف نے پھر اس کی بات کائی۔

”کیا؟“ ”اوہ گا؟..... وہ کیا ہے؟“ حیدر کو شاید بھگا لگا۔

”وہ آپریشن تھوڑے میں ہے۔ میں ہی اسے یہاں لائی ہوں۔ آپ پلیز اس کے گھر والوں کو اطلاع دے دیجئے۔“ کشف بولی۔

”آپ مجھے ہاتھل کا ایڈریس دیجئے۔ میں ابھی پہنچتا ہوں۔“ وہ بے حد فکر نہ تھا۔

فلک نے جلدی جلدی حیدر کو ہاتھل کا نام اور لوکیشن بھیجی۔

”ٹیک ریڈیو ہے۔ میرے آنے تک وہیں رہنے گا۔ جس مائی ریڈیو۔“ پلیز! ”حیدر“

میں ابھی بھی تھی اور جگرت بھی۔ اس نے کشف کی بات سننے سے پہلے ہی فون بند کر دیا تھا۔ کشف وہ چاکر دو بارہ فون کر کے اسے کہہ دے کہ وہ اپنی ذمہ داری اور فرض پورا کر چکی ہے اور اب اپنے رجا رہی ہے۔ یہاں رکا اس کے فرض میں شامل نہیں۔ مگر اس سے پہلے ہی آپریشن تھوڑے کے ایک رجا پہنچا اور اس کی طرف بڑھی۔

”کشف کو خون کی ضرورت ہے..... لی بازو بلڈ گروپ ہے اور اتفاق سے ہمارے بلڈ چیک اس وقت یہ گروپ بھی موجود نہیں ہے۔ پلیز آپ آرٹھ کرائیں۔“ کشف کی حالت بہت ڈانگ

”..... خون بہت بہر چکا ہے۔“

”سم..... مگر میں کہاں سے کراؤں آرٹھ؟“ وہ بڑبڑائی۔ ”اوہ.....“ ڈھنڈے اُسے ایک خیال آیا۔ ”میرا لہپ لی بازو ہے۔ آپ چاہیں تو میرا خون لے سکتی ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ٹیک ہے.....“ ”نرس نے فحاشت میں کہا۔

”خان! تم اپنا ہاتھل تک کا کرایہ لو۔ مجھے تو یہاں خاصا وقت لگ جائے گا۔“ کشف نے پنے بیک سے نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”لو لی! رہنے دو..... آپ خدا واسطے ایک انجان آدمی کے لئے اپنا خون علیہ حق و ام ملی بغیر کرایہ لے آپ کو خدا نے پامان کہہ سکتا ہے۔“ ڈرائیور مسکرایا اور باہر کی طرف چلا گیا۔

”مجھے لوگوں کی کی نہیں ہے۔“ وہ نرس کے پیچھے چلتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ ”میں اپنے گھر ایک کال کرنا چاہتی ہوں۔“ پھر آپ بلڈ ٹیسٹ کر لیجئے گا۔“ کشف نے کہا۔

”ٹیک ہے..... مگر ذرا جلدی کریں۔“ ”نرس نے کہا۔

کشف نے جلدی سے ریسیشن سے اپنے بڑبڑ میں فون کر کے مختصری تفصیل بتائی اور یہ بتا کہ لڑکی کس کے گھر اطلاع دے دی جائے گا مگر کھروالے پریشان نہ ہوں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ اسی بلڈ ٹیسٹ نرس کے عہدہ چلی گئی۔



اں ہیں۔ جگہ جگہ جڑیں رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے بچا پایا تھا ہوں۔ پھر اڑ بھی ہو رہا ہے ارا۔" حیدر بتا رہا تھا۔

"جو کچھ میں نے کیا وہ ایک انسان ہونے کے نام پر افرض تھا۔ تیمور کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو میں اس کے لئے بھی ایسا ہی کرتی۔ مگر مجھے مگر جانا ہے۔ میں مگر کس طرح جاؤں گی؟" حیدر کی اتنی لمبی بات کے جواب میں بس اس نے اتنا ہی کہا۔ حیدر کی زبانی شہر کے حالات کا سن کر وہ مزید فکر مند ہو کی تھی۔ شہر کے حالات کا اسے کراچی کے شہری ہونے کے نام پر اعزاء تو پہلے ہی تھا مگر اب جو کچھ ہارنے بتایا تھا تو اس نے اسے ششیل سے نکال کر پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں خود آپ کو آپ کے مگر چھوڑ آؤں گا۔ وہ بے بسی ڈاکٹر سے ہی آئے ہوتے بات ہو چکی ہے۔ تیمور اب خطرے سے باہر ہے۔" حیدر نے اسے تسلی دی۔

"بھئی کس!..... تو پھر اڑ بھی مجھے چھوڑ آئیں مگر۔ میرے مگر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" وہ اندر کر جوتے پہنتی ہوئی تیار کمر لڑی تھی۔

"مگر آپ کی طبیعت....."

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس خدایت ہے۔ اور کچھ نہیں۔ میں مگر جا کے آرام کروں گی تو لمب ہو جاؤں گی مگر تک۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے جگت میں بولی۔ وہ تو جیسے ایک کھوکھلا دھواں ہو کر گزرنے کو تیار تھی۔

"مگر ڈاکٹر سے پریشان تو نہ لیں۔" حیدر نے اسے دیکھا۔

"پریشان کیا کہی ہے؟ میں پچھت تھوڑی ہوں۔ بس ریسپشن پر اطلاع کر دیں گے۔" وہ قدرے جیسی نظروں سے حیدر کو دیکھتے ہوئے کمر لڑی اور پھر حیدر سے پہلے خود کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس نے ریسپشن پر کوئی نرس کو دیکھا تھا تو اسے کمرے میں نہیں دیکھا تھا۔ اُن نے اسے صرف انداز میں دیکھا کہ وہ مگر جا رہی ہے اور حیدر کے ساتھ چلی گئی۔

"آپ مگر کراچی میں تائیے۔" حیدر نے اپنی گاڑی ہاسٹل کی پارکنگ سے نکال کر روڈ پر اڑاتے ہوئے پوچھا۔

کشف نے اسے اپنے مگر کا پتہ سمجھا دیا۔ حیدر اس کے سمجھاتے ہوئے پتے کی طرف رواں ہو گیا تھا۔ راستے میں انہیں دو تین جگہ ٹائزڈ اور ایک جگہ آگ لگی ہوئی نظر آئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیس میں افرابھی نرے بازی کرتے نظر آ رہے تھے۔ ٹریفک بالکل بھی نہیں تھی۔ بس اڈا کا کوئی گاڑی یا بائیک یا موٹر سائیکل نہیں کہیں نہیں نظر آئی تھی۔

"کب یہ بھنگدہم کس زمین روڈ تو جاری رہے گا۔" حیدر نے خاموشی کی دیوار کو توڑتے ہوئے کہا۔

"ہوں..... جی تو درست کہا آپ نے۔" کشف نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"ہمارا ملک تو ان بڑبڑاؤں کی نذر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کدو رو دے رہے ہیں اپنی قوم کے ہماروں کو۔" حیدر کے اعزاز میں تاسف تھا۔ "ہمارے ملک کے کرتا دھرتا جو کچھ کرتے ہیں، ہم لوگ

وہ بڑبڑاؤں دینے کے بعد وہ بے حد طحال ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت اسی ہاسٹل کے باہر کمرے میں تھی اور جوں کا کھاس اس کے ہاتھ میں تھا جو کراچی ابھی کچھ دیر قبل ہی ایک نرس اسے پینے کے لئے دے گئی تھی۔

جوں کا آخری گھونٹ سٹل سے اُتارنے کے بعد اس نے کھاس بند کر کے ہارنے کی میز پر رکھا۔ خود لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا دل پاؤر پاؤر کا کدو سو جائے مگر بچتا تھا۔ اس کے حالات کے بارے میں بھی وہ فکر مند تھی کہ کجانی کے باہر حالات کیسے ہوں۔ اس نے دائیں کلائی بندھی دست و پا کی کہ وہ ڈھالی۔ مگر وہی کی سوسائیاں اسے بتا رہی تھیں کہ وقت کس قدر زیادہ گیا ہے۔ اسے یہی فکر تھی کہ وہ اپنے مگر کے جاے گی؟..... اتنی دیر ہو جانے کے بعد وہ اپنی کلائی سے گھبرا رہی تھی۔ شہر کے حالات کا بھی اسے کچھ اعزاز نہ ہو رہا تھا کہ اب حالات کیسے ہیں اس نے سوچا کہ عارضین عادل کو فون کر کے بلائے۔ مگر کمر سوچنے لگی کہ اگر حالات کشیدہ ہو۔ تو وہ کس طرح ہسپتال تک پہنچ سکیں گے؟ اس نے سوچا کہ وہ ایک باہر مگر فون کر کے بات لے۔ اس نے یہی سوچ کر بہتر سے اٹھنا چاہا مگر اس وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور حیدر اسی نرس۔ ہر اور اندر داخل ہوا جس نے کشف کو جوں کا دیا تھا۔ اس وقت حیدر کے چہرے سے پریشانی ہو جا رہی اور وہ خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ مگر خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔

"ہیلو!..... حیدر نے اس پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"ہیلو!..... کشف نے دو پتہ پہنچے سے اوڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"جیک! یہ سسر! آپ جا سکتی ہیں۔" حیدر نے سوز کر نرس سے کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مجھے ابھی اندر آتے آتے سسر نے تیمور کی کنڈیشن اور آپ کے خون ڈونٹ کرنے کے بارے میں بتایا ہے۔ تیمور کی جان بچانے کے لئے میں تھوڑے سے آپ کا شکر گزار ہوں کشف! آج آپ ہاں کی جان بچا کر سب سے بڑا احسان مجھ پر ہی کیا ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ مجھے کس قدر عزیز ہے۔" حیدر اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس کے ایڈیٹنگ کی خبر سن کر تو میرے دل سے تین دن کی نکل گئی تھی۔ آپ کا فون ہر وقت رہے سو کیا تھا اس وقت میں اپنے کمرے میں نہیں تھا بلکہ کہیں اور تھا اس لئے مجھے وہاں سے آنے میں رادہ ہو گئی۔ کیونکہ ایک تو وہ جگہ یہاں سے خاصی دور ہے اور دوسرے شہر کے حالات بھی کچھ ٹھیک

دی ان سے وصول کرتے ہیں۔ اس ملک کو برکنی اپنی فناء کے مطابق چلانا چاہتا ہے۔ کیا کریں حیدر کے لیے میں افسوس تھا۔ اور چونکہ میرے قصہ بھی تھا۔

”دراصل ہمارے عوام بہت معصوم ہیں۔ لیکن کریں ان پر ایمان ہونے والوں پر بھروسہ کریں اور جی بھروسہ انہیں بھاری پڑ جاتا ہے۔“ کشف نے جواب دیا۔

”کشف! دراصل ہمارے لوگوں کو جو کچھ کھانے کی عادت ہوگئی ہے۔“ حیدر نے مسکرا کر کہا۔

”جی..... کیا مطلب؟“ کشف نے دیکھنے والے انداز میں پوچھا۔

”دیکھیں!..... عرصہ دروازے سے جو لوگ اقتدار کی کرسیاں سنبھالے ہوئے ہیں وہ ہمارے لوگوں کو کیا دے رہے ہیں؟ جو کچھ انہیں دے دے، شہر سے بچنے، کسی پورے نہ ہونے والے خراب۔

اقتدار والے عوام کو بار بار اپنے نام میں پھنسا لیتے ہیں اور بے چارے عوام بیست بیس کچھ جاتے ہو جیتے ہیں ان کے چال میں پکس جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہی نہیں سبز باغ دکھانے جارہے ہیں ہم بھرکی ہوئے لوگ حق نہیں لیتے اور بجائے اس کے کہ سنے لوگوں پر بھروسہ کرنے کا رسک اٹھائیں، اپنی پرانے فکر ان کو اپنے جتنی دھڑ دے کر تھوڑا دیتے ہیں اور نتیجہ بار بار ہمیشہ سے زیادہ خراب صورتوں میں سامنے آتا ہے۔“ حیدر نے مڑا کر بتائے ہوئے جواب دیا۔

”مجھ کہہ رہے ہیں آپ۔“ کشف نے سر ہلایا۔ ”یہاں سے بائیں موڑیے گا۔“ ساتھ ہی اس نے ایک چوڑی سی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ حیدر نے اسی سمت گاڑی موڑ لی۔

”اس گلی سے نکل جائیں۔ کافی کشادہ گلی ہے۔ یہ گاڑی آرام سے چلی جائے گی۔“ کشف نے سڑک کے کنارے بنی ایک صاف ستھری چوڑی گلی کی طرف اشارہ کیا۔ حیدر نے گاڑی اسی طرف ٹرن کر لی۔ یہ سڑک کی نسبت خاصا محفوظ راستہ تھا۔

”مگر قصور وار تو مجھ عوام بھی ہوئے نا۔“ کشف نے بحث کا آغاز پھر سے کرتے ہوئے کیا۔

”سب سے پہلے تو سنے اور شخص لوگوں کو بہت سے کام لینے ہوئے آگے بڑھتا جائے۔ ہمارے عوام کو بھی ان سنے لوگوں کو آگے بڑھانے میں مدد کرنی چاہئے۔ ان سانسوں کا سچا دل دینا چاہئے جو بار بار انہیں آستین میں بیٹھ کر دے پلے جاتے ہیں۔ لوگوں میں معلومات اور علم و تعلیم کا گھنٹاں ہے جو کہ کھٹ ڈالنے سے دور کرنا چاہئے۔ حیدر صاحب! دراصل راستے بھی تب ہی ملتے ہیں جب انہیں

کھوجا جاتا ہے۔ اللہ بھی تب ہی بد کرتا ہے جب اس سے مدد مانگی جاتی ہے۔ اور اللہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو مدد مانگنے کے۔ اچھے ساتھ رہتے ہیں تلاش کرتے ہیں۔ ہم لوگ صرف ان لوگوں کے اشاروں پر چلتے ہیں جو کہ چٹوٹی کی طرح ہمیں نہاتے ہیں اور اپنی اغراض کو ہم لوگوں کی معمولی

معمولی ضروریات کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ لوگ ہمارے بہت اچھے ہیں، معصوم ہیں۔ مگر جو ہاتھ ان کے سروں پر ہیں وہ اپنی ہر اندھا اندھانے بیٹھے ہیں اور وہی ہاتھ انہیں گمراہ کرتے ہیں۔ اور جی بات تو یہ ہے کہ اب ہم لوگوں کو کسی گمراہی اور اندھے پن میں نہ آئے گا

ہے۔ ہم انہی کمبختوں میں بے غری و محو کر زندگی کو گزارنے کے حامی ہو گئے ہیں۔“ کشف نے

فہم لیے میں کرا دیا۔

”آپ تو راضی ہیں۔ اپنے قسم کے ذریعے لوگوں میں شعور اجاگر کر سکتی ہیں۔ قسم کا تو اپنے قسم کی کٹ لٹ ہوتے ہوئے کھٹے اٹھ سکتے ہیں۔“ حیدر نے منظور دیا۔

”ابھی کرتی ہوں میں۔ اور اسی لئے شاید بہت سے لوگوں کو میری تحریریں چھتی ہوئی محسوس ہیں۔ زندگی کا جی بہت ہی خوف ناک ہوتا ہے اور یہ میناک پہلو برکنی دیکھنے کی تاب کہاں لا

گا۔“ وہ بولے سے ہنس پڑی۔ ”یہاں سے راستہ کیسے لگے گا۔“ اس نے ساتھ ہی راستہ بتایا۔ حیدر انہیں طرف موڑی تو ایک اور گلی نظر آگئی۔

”بس..... یہاں روکنے کی ضرورت نہیں۔“ کشف نے گھر کے دروازے کے پاس کار

”آپ اندر آجے بائیں آپ اس کو چاہے کے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ ورنہ ٹھک جھکے لڑے اس کے بھائی کو چاہے تک نہ پوچھی۔“ کشف نے مسکرا کر کہا۔

”تفصالت رہنے دے بیٹا! مجھے واہیں پا چل جانا ہے۔ تھوڑا وہاں بائیں اٹھ گیا ہے۔ پھر بھی

”حیدر نے مذہب انداز میں منع کیا۔

”اپنا خفا ہوں گے اگر آپ کو کوئی چلے گئے۔ کم از کم ان سے مل ضرور لیں۔ یہ مناسب نہیں لگے گا

آپ کوئی دروازے سے لوٹ جائیں۔“ اس نے زہی سے کہا تو حیدر باوجود جھک کے انکار نہ کر

ٹھف سے نکل بیٹھائی۔ ایک لمبے بعد دروازہ کھل گیا اور معید کا چہرہ نظر آیا۔

”اوہ آئی!..... خدا کا شکر ہے کہ آپ آ گئیں۔ ہم سب کتنے پریشان تھے۔“ معید بڑھتے

نا اچھے سے کچھ نظر پل رہا تھا۔

”میرے ساتھ ٹھک کے بھائی آئے ہیں معید! ہم باپا کو اطلاع دو۔“ کشف نے درمیان ہی میں

اور اس کی توجہ حیدر کی طرف دلائی۔ معید نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سلام کر کے مصافحہ کیا اور

چا گیا۔ دو عارضین عادل کو جانے کیا تھا۔

”آپ کم از کم ایک گلاس شراب ہی پی لیں۔“ کشف کو ٹھک کی نسبت سے حیدر کا یوں باہر

رہتا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”اوصار ہا۔ پھر کسی ٹھک کے ہمراہ آ کے شراب اور چائے دونوں سے شفق اٹھاؤں گا۔ مگر اس

نہیں۔“ حیدر نے دست و پاچہ نظر ڈالی۔

اسی وقت عارضین عادل تیزی سے باہر سے نظر آئے۔ معید ہمراہ تھا۔ کشف، حیدر کو اندر بیٹھنے

لے مزید اصرار نہ کر پائی۔ عارضین عادل نے حیدر سے مصافحہ کیا۔ پھر دیکھ گیا۔

اس کے بعد حیدر نے اجازت مانگی۔

اس کی کار چھب نظروں سے اوصل ہوگئی تب معید اور عارضین عادل اندر آ گئے تھے۔ کشف کو

ات ہو رہی تھی اس نے وہ پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔ کمرے میں اس وقت کشف اپنے کمرہ والوں

ہمراہ ہو جو تھی۔ فیہ نے اسے کھانا گرم کر دیا تھا اور وہ صبح کرنے کے بعد کھانا کھا رہی تھی۔

”آپ کے کپڑوں پر خون دیکھ کر تو مجھ پر بھیجیں، میرے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ یہ خیال وہ تکلیف دہ تھا کہ آپ کو بدلتی ہوئی اور وہ خون آپ کا ہے۔ مگر خدا شکر کہ وہ خون آپ کا تو کوئی چٹ آپ کو لگی ہے۔“ اس کے انداز میں ہانپوں والی محبت اور پریشانی تھی۔ وہ جس مسکرا دی۔

”اچھا یہ بتائیں کہ یہ فیصلہ صاحب سے ملاقات کسی رسی؟“ معینہ نے موضوع بدلا۔
”بہت اچھی اور سفید۔ انہوں نے جو بات بتائی تھی وہ میرے کافی کام آئیں گی۔“ اس جلدی سے وہ دھکا دھکا گلاس ختم کیا۔ ”اچھا، آپ تمہا کو یہاں سے۔ اور یہ برتن بھی لے جاؤ۔ میں تمہک کی ہوں اور اب آرام کروں گی۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہنسی لے کر کہا۔
”کل آپ سہل چٹنا ہے تا تیور کو کیجئے؟“ وہ جانتے جانتے حزا۔

”ہوں۔“ کشف نے کمرے کی لائٹ آف کر کے مائٹ پلپ آن کرتے ہوئے سر ہلایا۔
کے جانے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ تھکا مایا، تھکا ہٹ زور بستر پر پڑے ہی بے سكون ہو گیا اور وہ کھوں میں ہی غافل ہو گئی۔



مختلف قسم کی آوازیں اس کی ساتوں سے گزر رہی تھیں۔ ذہن کی دیواروں سے وہ آوازیں گہرا زحمت کر رہی تھیں۔ لفظ مجھ سے بالاتر تھے۔ جنوں کی کچھڑی سی تھی۔ کچھ مجھ میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

پھر آہستہ آہستہ وہ ہوش میں آئے تو جیسے اور الفاظ بھی صاف ہونے لگے اور شور کے اسی میں اٹھی رو کی تھیں مٹھوں ہوئیں تو بے اختیار اس نے لب بچھنے لے۔ اس کے کانوں۔ آواز گرائی تھی اسی آواز کو وہ بے شمار آوازوں کے گھوم میں بھی شناس کر سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ نیو لائٹ کی دو دو سیاہ روشنی اس کی آنکھوں میں مٹیوں کی طرح چھٹی تھی۔ اور فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ پھر دوبارہ اس نے آنکھیں ذرا سی کھولیں۔ منہ دل آنکھوں سے اس دانیں جانب دیکھا۔

چلی گئی کہ اس کی جس پر پڑی تھی وہ اپنی امان تھیں۔ سفید چادر کے بالے میں اس کا نہر اور پیرو۔ ہی اس کی آنکھوں میں خشک آہڑ آئی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ دوسرے چہرے نظر پڑتے ہی وہ اسے بھی پہچان گیا۔ وہ کشف تھی۔ تیور کو بے اختیار وہ ہل پڑا دیا گیا جب وہ اپنے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تھی۔ جب اس نے اپنا ہاتھ اگلا کر سر پر سے اتار کر اس کا روکنے کی کوشش کی تھی اور اس ہل اس کی چپتی سفید ٹانگ پر تیور کی نظریں ٹکی تھیں۔ اور جب وہ کئے میں اس کو سہارا دیتے ہوئے تھی۔ جب بار بار تیور کا جسم اس کے وجود سے مس اور وہ بڑی بیزاری سے اسے خود سے دور کر دیتی تھی۔

اس سے اس کے سر پر سفید رنگ کا اسلاف تھا جس نے اس کے سارے بالوں کو چھپا کر

اگر کے لباس میں مخصوص انداز میں دوپٹے پہنے ہوئے چلائے ہوئے تھی اور بڑی محنت سے بی لباس بیچی ہوئے ہلے باتیں کر رہی تھی۔ ان کی کسی بات پر اس کے غم اور گھبراہٹ کیلئے کچھ نہ سنکر اس نے اور تیور نے دیکھا کہ اس کا روشن چہرہ اس کی ایک مسکان سے کس قدر چمک نور انگلی باغ سے اس کے چہرے کو تکتا چلا جا رہا تھا۔ یہ اس کی نگاہوں کی کچھ تھی کشف ہم نہک کر تیور کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ابھی بے باکی کا تھا کشف سبک کے رو تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے کہتے پر تیور کی عیادت کے لئے آئی تھی عارضی عارضین عادل اور معینہ تھے۔ وہ دونوں عید اور نصف ملی خان سے باتیں کر رہے ان کا شکر یہ ادا کر رہے تھے اور اس بات کے ممنون تھے کہ کشف نے ان کے بیٹے کی جان بچائی تھی کشف کی باغ میں لے رہی تھیں کس نے اپنا خون دے کر تیور کی زندگی بچائی تھی کی ذات پر بڑا احسان کر دیا تھا۔

ان نے سوچا تھا کہ تیور کے ہوش میں آنے پر اس کا حال احوال پر چھوگی۔ مگر اس وقت انہیں چھڑا ہوا جسم لے کر پڑا ہے مگر گھومنے سے باز نہیں آ رہا۔ خواہ وہ ہی اپنا خون

جپا ہے۔ ایسے بے شرموں کا تو سر جانی بہتر ہوتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں اسے کوس رہی اس کی جان بچانے پر کڑھ رہی تھی۔

اب اجازت دیجئے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ یکدم ہی کھڑی ہو گئی۔ ”چلیں بابا! اس صبح عادل سے کہا۔

میں ایک بار پھر آپ کا بہت شکر یہ ادا کرنا چاہوں گا۔ اور بیٹے! آپ کو زندگی میں بھی کسی بھی کسی کی ضرورت ہو، کوئی کام پڑے تو آپ بلا جھجک مجھ سے کہئے گا۔ آپ کا احسان تو ہم نہیں اتار کے کام آ کر میں خود بھی بے حد ہوگی۔“ روف ملی خان کشف سے کہہ رہے تھے۔

اس کی ضرورت نہیں ہے اگلے آج میرا فرض تھا، میں نے وہ کیا۔ اور کوئی بھی میری جگہ ہوتا تو اس نے سنبھال لیا۔ کہا۔ پھر وہ عارضین عادل اور معینہ سے پہلے ہی کمرے سے نکل گئی۔ وہاں ایک گھر کو کتا بھی اس کو حال نگہ رہا تھا۔ تیور کی نظریں اسے اپنے جسم کے آ رہا ہوتی رہی تھیں۔ وہ گھبراہٹ سے نظر انداز کر دیتے تھے اور جاتے جاتے اس نے راسی بھی اس کا رافٹ دیکھا تھا۔ جبکہ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر عارضین عادل اور معینہ دونوں ہی رک کر اس پر پڑے تھے۔

ان کے بعد وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے نظر آئے۔
اب آپ کو کم از کم تیور کی خیریت ہی در یافت کر لینی چاہئے تھی۔ وہ ہوش میں تھا۔“ معینہ نے یہ کہا۔

اب بیٹے! جب یہاں تک آئی تھی تو اس کا احوال ہی در یافت کر لیتیں۔“ عارضین عادل بھی

اسے ٹوک رہے تھے۔

”آپ دونوں نے مزاح جی کر لی۔ بس ایک نئی بات ہے۔ اس نے سرسری سا جواب دیا۔ ”مجھے خبر پڑا! وہ کیا سوچے گا؟“ مارفین عادل نے اپنی طبیعت اور مزاح کے مطابق کہا۔ ”کچھ نہیں سوچے گا۔۔۔۔۔۔ وہ کچھ اچھا سوچنے کے لائق ہی نہیں۔“ پھر جلد آدھ گھنٹے سے اپنے جملہ اس نے دل میں دانت بچھتے ہوئے پورا کیا تھا۔ دو سوچ رہی تھی کہ شک ہے اس کے کہ اس کی عمر بھر سوچنے لگی کہ مصون نہیں اس کا رچل کیا ہو؟ وہ اس کی بہت اچھی پہیلی کی طرح کا کزن تھا۔ دو بھی بہت قریب کا۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ کہ تیسویں اس کی نظروں۔ نیچے آگیا تھا۔ پر ملاقات کے بعد تیسویں کی نظروں میں کبھی نہ ہوتی چلی جاری تھی۔



تجور کو ہوش اس سے پہلے ایک مرتبہ اچکا تھا کہ وہ چند منٹوں بعد دوبارہ ہوش ہو
اب دوسرے دن اسے اس وقت ہوش آیا تھا جس وقت کشف بھی کرے میں ہوش ہو گیا۔
ہوش آیا تھا اب اس کی حالت کچھ صحیح نہ تھی۔ مگر اب جب ہوش آیا تو ڈاکٹر نے چیک اپ
اسے اس کے کردیا تھا۔

”آپ اب چاہیں تو انہیں دوسرے ہاتھل شفت کروا سکتے ہیں۔“ روف علی خان نے،
 ایسے ہاتھل میں شفت کروا چاہے تھے مگر کل اس کی طبیعت کے پیش نظر ڈاکٹر نے اجازت
 تھی۔ اب جب اس کے تفصیلی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر ازل کو ایمان ہو گیا تھا تب دوسرے
 سے کہہ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے..... میں ایسیو لیس منگوا لیتا ہوں۔“ رؤف علی خان نے کوٹ کی جیب سے فون نکال کر اپنے فلیڈا کٹر کا نمبر لکھایا۔

اسے آج بچا چل میں تیرا روز تھا کہ ان میں دونوں میں دینا اسے ایک بار بھی نہیں آتا۔ اس نے خود تو ان کے بارے میں نہیں پوچھا تھا کہ روز علی خان نے اسے خود ہی بتایا تھا کہ سیکے میں ہیں اور ان کی کسی بھانجی کی شادی ہے وہی وجہ ہے کہ وہ تیرے لئے نہیں آئیں۔ نہ صبح کے لئے تیرے کہ دل میں شکوہ جاگا تھا۔

”کیا میری نیک ناک کا جیٹا ہوتا ہو گا بھی وہ اس طرح بھائی کی شادی ایذا دے گا؟“ وہ یہ سوال اس کے لبوں پر آیا تھا۔ تب رؤف علی خان صرف خاموش ہو گئے تھے۔ اس کا غماز بھی سمجھتے تھے اور محسوس بھی کرتے تھے کہ وہ جانتے یہاں اس نازک موقع پر بھی اپنا سر نکال دیا ہے۔ مگر وہ انہیں کچھ کہہ کر بات بدھ کر گھر کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتا رہے تھے۔

پھر اسے دوسرے ہسپتال میں شفٹ کر دیا گیا۔ یہ ہسپتال شہر کا سب سے بڑا اور باوجود غماز ڈاکٹروں کے مطابق اس کے سر کا زخم بھرنے میں ابھی حیرانہ ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ لیکن یہ ایک ہفتہ رہنا تھا۔ اس کی عیادت کرنے والوں کا ہاتھ بٹا ہوا تھا۔ رؤف دانا

میں بڑا بڑا کے مختلف لوگ جن سے اس کی جان پہچان تھی، اس کی گرل فرینڈ ز، فہیم اللہ زیدی اور لہ مراد بی بی کے آئے تھے۔

میں غم و غارتا رہ اپنی۔ غمروں میں آگے ہو دشمنوں کی۔ "زیدی صاحب نے اس سے کہا تھا اس نے مسکرا دیا تھا۔

اں سکر اہٹ پر تو جان پھار کرنے کوئی چاہتا ہے صاحب! بس یہی سکر اہٹ تو جاتی ہے۔
صاحب کے بے ساختہ تو مصیبتیں جیلے پردہ ہلکے سے فہم پڑا۔

راہی صاحب آپ کو طعنت لگتے ہیں مجھ کو۔“ حیدر علی اس وقت وہیں تھا۔ آج ہی وہ
 اپنی اپنی راجس گزارد رہا تھا۔ اس ہاسٹل میں صرف ایک اینڈنٹ کو رکھنے کی اجازت تھی
 اسی نے فریڈرک انجام دے رہا تھا۔ بلکہ دن کو بھی وہ کمرے سے فریڈ ہوئے کے بعد دوبارہ نہیں آ
 سکتا تھا۔ آج ہی ایک نئی ماحول مجھ کو مل رہی تھی۔

اس میں تو شک کی کوئی گنجائش ہے ہی نہیں صاحب! پوچھ لیجئے تیمور سے۔ یہی گواہ ہیں اس
اسب سے بڑے۔" نرہ کی صاحب بے ساختہ ہولے۔

نہیں جناب! اس کی ضرورت نہیں۔ ہم ایمان لائے آپ کی بات پر۔“ حیدر برہتہ بولا تو صاحب سحرانے لگے۔

اور! اب بس جلدی جلدی یہاں سے نکلنے کی کرو بھی۔ یہ جگہ اور تم دونوں مس فٹ نکلتے ہو۔
مادب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

میں تو خود ہیر ہو گیا ہوں بہت۔ بس یہ آکر زور دیا جیسا چھوڑ رہے۔ "تو خود بھی شاید اچھا تھا۔ بیماری کی زندگی سے بلکہ بیماری کے چند دنوں سے۔ وہ کب ایک جگہ کب کر بیٹنے کا تھا۔ اور اب جو چار پانچ روز سے ایک ہی کمرے میں پڑے ہوئے گزارنے پڑ رہے تھے تو رگمردار بھی۔ نہ کلب، نہ گرل فرینڈز، نہ لی ایگ ڈراما اور نہ ہی وہ کردہ سیال مادہ جس کو قلعہ دار کر، و فنت کی وادی میں پہنچ جاتا تھا۔

ایڈی صاحب کچھ دیر اور وہاں بیٹھے تھے اور پھر چلے گئے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد تیمور ۱۱ سے پوچھا۔

۱۰۔ امیری کار کس پوزیشن میں ہے؟

۱۰.....؟ بیٹا! تمہاری کار کا جو شتر ہوا تھا..... "حیدر نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "شکر ادا کرو، اب کبھی تمہاری....." وہ اس کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ "مگر یہ تمہیں دن کے اُجالے میں "لی" کے

اے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟“
 ’نہ بار!‘ ”جوعل“ دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ بس ایک لمحہ ہی تھا اور اس ایک ہی لمحے نے قیامت عبادی

نامور نے سر کو تکیے سے ٹکادیا۔
 اہمیت آنے کے لئے صرف لمحہ ہی کافی ہوتا ہے تیمور! اُس روز وہ لڑکی نہ ہوتی تو نبھانے کیا ہو

جاتا۔" حیدر بکثرت سنجیدہ ہو گیا۔ تیمور کو کھودینے کا احساس ہی اس کے لیے بے حد تکلیف تیمور کو اندازہ تھا کہ حیدر کے دل میں اس کے لیے کیا جذبات و احساسات ہیں۔ اور ان میں تو حیدر نے اپنے احساسات کو چھپانے کی کوشش تک نہ کی تھی جو وہ اس سے کئی ہرگز بھی کرنا چاہتا تھا۔

"کشف کا روز خدا نے فرما دیا رحمت بنا کر دو ہاں بیٹھا تھا۔" حیدر کہہ رہا تھا۔
"مجھے وہ لڑکی بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ اس لیے تم ہمارا باس کا نام مت لو میرے سامنے نے فوراً بڑبڑا دی ہے اسے ٹوکا۔"

"کیوں؟..... اس بے چاری نے کیا، کیا ہے؟" حیدر غصا۔
"بے چاری؟" تیمور نے ٹھہرے لیچے میں کہا اور اسے دیکھا۔ "وہ بے چاری خود کو ٹھکڑا ہے۔ معمولی سی لڑکی ہے اور حراج آسمانوں کو چھوتا ہے۔ کبھی سیدے منہ بات کرنا ہی تم کرتی۔ اس روز ہسپتال میں میری حراج برسی کے لئے آئی تھی مگر میرے سوا ہر ایک ہی پوچھتے ہوئے اس نے۔ اتنی گھنڈی کیوں ہے وہ؟" تیمور سڑکے کہہ رہا تھا۔
"غلط..... تم اس کے بارے میں غلط فہم کیا ہے۔ وہ نہایت شریف اور اچھی لڑکی حیدر نے فوراً اس کی بات کا جواب دیا۔

"اچھا..... تم نے کیا اسے شرافت اور اچھائی کا پانچ پڑھایا ہوا ہے؟" تیمور نے پھر ٹھکڑا "نظر بھی کی کچی ہوئی ہے تیمور امیری نظر میں وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔" حیدر سنجیدہ "اچھا..... خاصے ساتھ رکھتے ہو تم۔ کیا ارادے ہیں؟" تیمور نے جیسے ہوئے انداز میں کہا۔
"نکومت۔ یہی تمہاری گھٹیا سوچیں تم کو کہیں کا نہیں چھوڑیں گی۔" حیدر نے اسے "میرے لئے وہ غلط سے کم نہیں ہے۔ سمجھے؟" حیدر کو کچھ صبر آ گیا تھا۔ "اور یہ تم بڑ ہسپتال میں اسے گھر گھر کر دیکھ رہے تھے تو اس بات کو اس نے شدت کے ساتھ نوٹ کیا ہوا تمہارے ہوش میں آتے ہی وہ وہاں سے چلی گئی اور یقیناً ہر اماں کر گئی تھی۔ جیسی تمہاری ح نہیں کی۔" حیدر کا تجویز بہت گہرا تھا۔

"وہ کوئی نکوین اگرچہ ہے جو میں اسے گھروں کا؟..... میرا ٹیٹ اتنا خراب نہیں ہے ڈھٹائی سے بولا تو حیدر نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا مگر بولا کہ تم نہیں۔ کیونکہ کمرے کے دروازے سے نرس اندر داخل ہو گئی تھی۔

"آپ کی میٹھ لین کا نام ہو گیا ہے سر؟" وہ پوچھنے لگا۔
"نہیں!..... یہ بد روایاں اور کتب تک مشق سے نیچے اتار دینی چاہی؟" وہ بڑبڑا پوچھنے لگا۔

"جب تک آپ پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتے۔" نرس مسکرائی۔
"میں لگ رہا ہے جیسے کسی سزا میں ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ حیدر نے مسکرا کے اسے دیکھا مگر

ساتھ دیوار گیر گھڑی کی سوئیوں کو کھربا رہا تھا۔



اُسے مکے میں دھوم مچی ہوئی ہے تمہاری۔ ہر کوئی تمہاری جرأت مندی کی داستان سناتا پھر رہا اور مکرر انجام دیا ہے۔ دل خوش کر دیا ہے۔" رابعہ بکڑوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہہ

"کر جسیں کہیے یہ چلا؟..... تم تو کلا ہو گئی تھیں۔" کشف پوچھ رہی تھی۔
"ناچا تو ہے ابھی ابھی..... سارے مکے میں دھوم مچی ہوئی ہے تمہاری۔ غلہ (نیر) نے ہر

ایک بھاری کاچ چا کیا ہے۔ مجھے تو لاہور ہی میں خبر مل گئی تھی۔ امی نے فون پر ہی بتا دیا تھا۔ مگر ان؟" رابعہ تو اسے بولتے ہوئے پوچھنے لگی۔ وہ سچ ہے اس کی طرف آئی ہوئی تھی اور آتے آتے م کے قریب نظر سب سے پہلے بکڑوں اور چائے کی فراخ کر ڈالی تھی کہ اس ابر آورد، بیگے بیگے، موسم میں گرم گرم بکڑوں اور بھاپ آڑنی ہوئی چائے کا اپنا ہی لطف و مزہ ہوتا ہے۔ اور ان بکڑوں کے ساتھ پڑے اور اپنی کی پختی، چائے اور کھر میں بنا ہوا ایک ٹرے میں سجائے اور مانتے پختی۔ رابعہ نے تو سب سے پہلا سوال ہی اس سے۔ یہ کیا تھا کہ اس نے اتنی ہمت و گھٹائی کیسے؟ کشف نے اسے پورا واقعہ بتا دیا تھا۔

"اور وہی تھا..... غلط کارکن۔" کشف نے چائے کی پیالی اٹھا کر لبوں سے لگائی۔
"لوں سارا والا؟..... درجن بھر تو کن ہیں اس کے؟" رابعہ نے پوچھا۔

"وی..... تیمور علی خان۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔
"ہائے..... وہ..... تیمور علی خان؟" رابعہ نے بے ساختہ چیخ ماری۔

"مطلق میں سائنٹر ف کرا لوم..... پہلے ہوئے دھول جیسا دایم ہے تمہارا۔" کشف نے اسے مکر آھر کے پوچھا۔ "اس کی ایک ساٹھ منٹ تو تیمور کے نام سے سو گنا بڑھ گئی تھی۔
"ادگی یو آرا..... تم تیمور علی خان جیسے بندے کے کتنے قریب تھیں۔ کتنا قلمی سائنس ہوگا۔
"اوہ تمہارے شانے پر سر رکھے ہوئے اور تم اسے اپنی ہاتھوں میں سہارا دیے ہوئے۔" رابعہ نے اسے چھیڑا۔

"تم بکڑے کھاؤ۔" کشف نے اسے گھورا۔
"ہم! جب تم باہل اسے ملنے گئی تھیں جب تو اس نے تمہارا ٹھہرے ضرور ادا کیا ہوگا۔" رابعہ نے اسے پوچھا۔

"ہیں..... اس نے میرا ٹھہرے ادا کیا تھا، نہ ہی میں نے اس کا احوال پوچھا تھا۔" کشف نے بولی۔

"ہاں.....؟" رابعہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔
"وہ جہ جہ وہ وہ اور اور فضول قصص سے رہا! جب میں وہاں بیٹھی تھی جب وہ ہوش میں آ رہا تھا۔

میں نے اسے دیکھا تھا وہ پوری طرح سے ہوش میں تھا۔ محروہ اس قدر بدتر فیض ہے۔
گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پوری کی پوری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر۔ حالانکہ اس وقت کمرہ والوں سے گھرا
اس کے والد، اس کی آیا، بلکہ کا بھائی، بابا اور معید اور دو ڈاکٹر بھی وہاں موجود تھے۔ مگر اسے
کا لحاظ تھا، نہ ہی کسی کا خیال۔ وہ عریضوں کی طرح مجھے گھور رہا تھا۔ حتیٰ تو چاہتا میرا کہ کس
تصویر رسید کروں اس کے من پر۔ حالانکہ میں وہاں اس کی عیادت کی نیت سے گئی تھی مگر اس
بے ہوشی پر تو میرا بھی چاہا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ دوں جن سے وہ اپنی بے باکی سے مجھے
تھا۔ وہ دانت کچکا کر کھڑی تھی۔

”بائے..... ایسے تو نہ کہو۔ کس قدر حسین ہیں اس کی آنکھیں۔“ رابعہ نے بے اعتنا
داری کی۔

”حسین نہیں، گندی۔ غلاشت کی پٹلی چلتی ہیں۔“ کشف نفرت سے بولی۔ ”خیر چھوڑ دو
بتاؤ کہ لاہور کا نور کیا رہا؟ کزن کی شادی ایشیز کرنے کی تھی۔ کیا رہا سب؟“ کشف نے
جلا اور رابعہ زور و شور کے ساتھ لاہور کے قصے سنانے میں لگن ہو گئی۔



وہ آہ دم سے باہر نکلتی تو ولید بیٹہ پر بیٹھا تھا۔ اس نے ٹائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ کمرے میں
کا ٹائٹ بلب آگ تھا جس کی فوس خیر روشنی میں سارا کمرہ بے حد رونما لگ رہا تھا۔ ایئر
کی گرم خوشبو نے کمرے کی لنگھا میں عجیب سی حسین کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔
اوپر کے ہاتھ میں ریسیٹ کنٹرول تھا اور وہ بی بی چیل تبدیل کر رہا تھا۔ ماہور گولڈن اینڈ اسکن
سٹائٹ میں لمبوس تھی۔ اس کے آجڑا جیسے بال کر پھر لہو رہے تھے۔ ٹائٹ بلب کی خواب
میں وہ جنت کی حرر لہو رہی تھی۔ ولید نے ایک گہری سی نظر اس پر ڈالی۔ ماہور اسی کو دیکھ
میں ولید اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ماہور کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔ وہ اس مسکراہٹ کا
لوب بھتیجی تھی۔ ایک سال پہلے جب ولید اس طرح مسکراتا تھا تو ماہور کے ایک ایک میں
انہی انکڑیاں لینے لگتی تھی۔ وہ بھی اس کی مسکراہٹ کے جواب میں بیڑی دل نواز مسکان کا
”لی تھی مسکرا آج..... اس میں..... اس میں..... اس میں مسکراہٹ نے ماہور کا
بالے دکھ دیا تھا۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ ولید نے اپنا بازو پھلادیا۔ وہ اسے ہلا
ماہور کا دل جیسے پھلایا توڑنے پر آمادہ تھا۔ وہ ولید کے پاس آنے کی بجائے ہسٹر کے
انارے پر کبھی کبھی ٹپک گئی۔

نور وہاں کیوں نہیں ہو؟ میرے پاس آ جاؤ۔“ ولید کے لہجے میں صرف چار تھا اور ماہور کا دل
انکار دہاں کمرے سے ہی بھاگ جائے۔ ولید اسے ہلا رہا تھا۔ اس کا صبر اور خوب سمجھ رہی
وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کا جائزہ قانونی حق دار۔ اس کا شرعی مالک۔ اس کا عیازی خدا۔ وہ اسے
”میں تو نہیں سمجھتی تھی۔ اور اگر کرتی تب بھی کوئی وجہ اس کے پاس نہ تھی۔ اس کو بال خواست ولید
ہاں میں آنا ہی پڑا۔ ماہور اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔

”قرب آؤ نا..... کیا ہوا ہے؟“ ولید کچھ حیران ہوا۔
”نک..... کچھ نہیں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہور نے بھانہ بتایا۔

”کوہ..... تم آن ڈارنگ! طبیعت وغیرہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ میں تم کو ایک گھنٹہ دینا چاہتا
ہے۔“ رابعہ نے ہنس دیا۔ ”ولید نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”گھنٹہ دینا..... سر ہائز..... اب تو میں ایک ہی وجہ مجھے خوش کر سکتا ہے..... ایک ہی آواز
انہی کی کو سرب کر سکتی ہے۔“ ماہور نے سوچا۔

وہ اس کی دلی کیفیت سے بے پردہ کھ رہا تھا۔ ”اگلے پختہ ہم سونڈر لینڈ جا رہے ہیں۔ ہم

وہاں کچھ دن رہاں گے۔ خوب سوچ سہی کریں گے۔ وہ دن، وہ راتیں صرف ہماری ہوں گی میں اور تم..... ہمارے درمیان تیرا کوئی نہ ہوگا۔" ولید بڑی خوشی سے کہہ رہا تھا۔ ماہ نور بس رو گئی۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" ولید نے اس کے سپاٹ چہرے کی جانب دیکھا۔

"نہیں..... مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔" ماہ نور نے جیسے اس کا دل رکھا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔ مگر جان میں بھی مجبور تھا۔ اتنا عرصہ تم کو نام نہ نہ مطلب ہے ہرگز نہیں کسی تمہاری پر وہاں کتنا یا تم سے محبت نہیں کرتا۔ نہ میری محبت تم کو ہی عی میں تم سے خائف ہوا ہوں۔ بس کام کا لو! اتنا بد حال تھا کہ تمہاری طرف آنکھیں کم ہو گئی تھیں اب ہم چھٹیاں منائیں گے۔ وہاں صرف ہم ہوں گے۔ میں اور تم۔ وہاں کوئی کام نہیں ہوگا۔ بس صرف پیار ہوگا۔ میں اپنی نوک سے چہرے پر پھر وہی مسکان دیکھنے کا خواہاں ہوں۔" ولید فرما رہا تھا۔

چہرے میں کہہ رہا تھا اور وہ بس صرف سن رہی تھی۔ ولید کی طرف اس نے غالی غالی نظروں دیکھا۔ بڑی عی میں سوہ لینے والا انداز تھا۔ بغیر گردن خمائے، تناس کی طرف مڑے اس نے وہ خوب صورت آنکھوں کو چٹکاتا کر کے اس کی طرف دیکھا تھا۔ حسن کو بذات خود اک ادا ہوتا ہے یہاں تو ادا ہی عی میں حاصل تھی۔ ولید تو انہی حسین اداؤں کو دیکھ کر کمرے کے کمرے لٹ گیا تھا۔ دیکھ کر بس ایک عی میں نظر میں اس کا دیوانہ ہو گیا تھا اور اسی بل اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ولید نے بے ساختہ اس کے حسین چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں ڈھاب لیا اور با احتیاط استعمال کرتے ہوئے اس پر چمک گیا۔ ماہ نور یکدم تر ہئی اور ایک جھٹکے سے اس نے خود سے الگ کر لیا۔ ولید حیران و پریشان اسے سنکارا ہوا۔

"واٹ پھنڈ؟" ماہ نور کا کیا ہوا؟

"کچھ..... کچھ نہیں۔" ماہ نور نے خود کو سنہٹنا چاہا۔

"آرے اوکے؟" ولید نے اس کی طرف مجبور دیکھا۔ ماہ نور نے سر ہلا دیا۔

"شیرہ؟" ولید نے کھلی کرنا چائی۔ ماہ نور نے کچھ کہنے کی بجائے بے بسی کے عالم میں ولید



رات کے تھن بنا رہے تھے۔ ولید بے خبر اور گریں سوز ہر ہاتھ کر اس کی آنکھوں سے نیند کو دور تھی۔ ولید کمرے لے ہوئے تھا اور وہ بالکل سہلک لیتی تھی۔ اس کی آنکھیں محبت کو کھور رہی اور ان میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ آج ولید اس کے پاس تھا۔ اس کے ساتھ تھا۔ مگر اسے ولید وجود تک کا احساس نہ ہوا تھا۔ آج جو ہاتھ اسے چھو رہے تھے وہ ولید کے ہاتھ نہیں تھے۔ آرا سائیں اس کی سانسوں سے گھرا رہی تھیں ان میں ولید کی خوشبو نہیں تھی۔ آج سے پہلے انہی سائیں

ماہ نور نے اس طرح "کسی" کے لمس کو محسوس کیا ہوا..... آج سے پہلے اسے ولید کے وجود "کسی" کا لمس نظر نہیں آیا تھا۔ آج سے قبل اس نے ولید کے چہرے میں "کسی" کی شبیہ کو نہیں کیا تھا۔ آج سے پہلے اس نے ولید کی آواز پر "کسی" کا دھوکا نہیں کھایا تھا۔ مگر آج یہ گئی اور رہا۔ آج بہت کچھ عجیب ہوا تھا۔

اس نے اپنے پہلو میں سوئے ہوئے ولید کو دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ خردلی والے بے حد سفید ہاتھ..... یکدم سے وہ ہاتھ بدل گئے تھے۔ مضبوط، شفاف، لانی انگلیوں، لمبا، رنگت والے ہاتھ۔ جس پر سنہری سنہری سادہ ان کے حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ ماہ نور جھٹکا سا لگا۔ اس نے گھبرا کر بیٹے پر ہاتھ رکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"امیر! الیون ہے؟" اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پر پانی کی بوندیں ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پھیرا۔ اس نے قبل ایک طرف کیا اور خود اٹھ کر آئے تھی سے ہست چھوڑ دیا۔ اس میں بے خبری سے سدھو رہا تھا۔ وہ اچھی اور کمرے کی کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ چھوڑ گئی۔ چاند اپنی پوری آواز دے رہا تھا۔ چاند کی ساتھ چمک رہا تھا۔ چاند کی ساتھ سارے عالم کو اپنا سیرس رہا تھا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ موسم کے بدلنے کے ساتھ بہت کچھ بدل رہا تھا۔ وہ کی کے بند پٹ کے ساتھ ناک لٹکے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ کتنے جیسا لگا اور دودھ سے زیادہ دا۔ چاند کا وہ دم کہ ہم سب کھڑکی تھی۔

"کیا اور ہے؟" کیا اور ہے میرے ساتھ؟ چاند میں اسے وہی اک چہرہ نظر آ گیا جس

اس نے اس کی مسدود بینکین کی تھی۔ وہ اس چہرے سے مخاطب تھی۔

"میرا سر کارا۔" مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ آج سے کئی تو ایسا ہوا عی میں نہیں تھا۔ میرا

"میرے قریب تھا۔" اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہاں ولید نہیں، آ۔ آپ ہیں۔ مجھے

دل میں آ رہا تھا۔ مجھے ولید سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں..... میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا

"میرے سر کارا یہ میرے عشق کی انتہائی تو ہے۔ کہ جس کی بدولت میں آپ کو ہر سو پانی

"یہ میری دیوانگی کی حد تو ہے کہ میں آپ کو اب مجسم محسوس کرنے لگی ہوں۔ میں کیا

"ہاں؟ میں کیا کروں؟" میرا اختیار خود پر نہیں..... میں کیا کروں؟..... میں خود اپنے بس

"ہاں۔ میں کیا کروں؟" میں تو خود اپنے اندر بھی آپ ہی کو دیکھتی ہوں.....

اس کی بچوں سے دو ستارے ٹوٹ کر اس کے دامن میں چپ گئے۔

"مجھ کو طوم نہیں کہ میرا عشق مجھے کہاں لے جاتا ہے۔ مجھے خبر نہیں کہ میری بے اختیار مجھے انہماک تلک پہنچاتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ جب میں آپ سے لفظ لفظ سے سب کہوں گی تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ ہاں، میں جانتی ہوں تو صرف اتنا..... کہ میں آپ کو نہیں کرتی ہوں..... عشق..... ایک معمولی لڑکی ایک اللہ والے پر خدا ہو گئی ہے..... ایک لڑکی ایک عالی مرتبت سے دل لگ گئی تھی۔ اور میرے سر کارا..... دل کا لگا ہوا تھی تو نصیب

اں راتوں میں داب بیٹھے۔ ارے جس خاندان کے لئے کہ بس خالی غولی اتر پاس اور گرجے بٹ
اں کی لڑکی دیار غیر کا حکیم حاصل کرے گی تو لوگ کہاں سے چنہ بھکم کر سکیں گے؟.....
لاری ساری لوگ چنچہارے بھائی اور بھینگی کو بتائی، سبھائی۔ مگر وہ بانی بنی..... تو ہے، جنوں
نہیں رہتی ہے ان کے کانوں پر۔ "نیرے بٹے دل کے پھولے نند کے آگے پھوڑی نہیں۔
"کی بھائی! میں نے تو کشف کے انکار کرنے کے باوجود بھی بھائی کے سامنے جھولی پھیلائی تھی
اب کمری جھولی میں ڈال دیں مگر....." ذکیہ بے ادھرہ ہو گئیں۔

"اے ذکیہ! ایک خیال آیا ہے میرے ذہن میں۔" نیرے نند رازدارانہ انداز میں قدرے دھمی
میں دارا سا آگے جھکتے ہوئے نند سے کہا۔
"کیا بھائی؟" ذکیہ نے تجسس سے پوچھا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ کتنا تیرے سرکار کے پاس چلیں۔ ان سے دعا کرواتے ہیں۔ وہ اللہ کے
نندے ہیں۔ ان کی دعا پر پورا بھروسہ ہے۔"

"کیا تو بہت اچھا ہے۔ مجھے تو وہاں جانے کا دھیان ہی نہ آیا تھا۔" ذکیہ ان کی تجویز پر خوش ہو
اںہوں نے پوچھا۔

"نہیں ٹھیک ہے پھر۔ تم کل میری طرف آ جانا اور پھر ہم دونوں کل ہی نکل چلیں گی۔ مجھ سے تو
وہ انتظار نہیں ہوتا۔ ویسے بھی اب کشف کے جانے میں دن کم ہو گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں
اس کے جانے سے پہلے کم از کم مراد کے نام کی انجمنی تو اس کی انگلی کی ذیت بن ہی جائے۔"
واہ! وہی ہوتی تھی۔

"ٹھیک ہے بھائی! اکل سویرے ہی چلیں گے۔ کل ویسے بھی ہفتہ ہے۔ سرکار کا اپنی آئے ہوئے
رات سے ٹھکنے کے کرش بہت ہو گا کل۔" ذکیہ نے حای بھری۔

"یہ اچھا ہوا کہ انہوں نے دن مخصوص کر دیے ہیں۔ اب بیٹے کے دودن کر اپنی مگر راتے ہیں
والے کے دن اپنے گاؤں میں۔" سلام آباد۔ وہاں بھی سنا ہے کہ خاصا دل رہتا ہے۔ بہت پیچھے
ہیں۔ اس کو ٹھکر دیکھ کر ہی دل کا حال چان لینے ہیں۔" نیرے نے کہا۔

"اب لوگ ہوتے ہیں یہ بھائی! لوگ تو کونج میں لگے رہتے ہیں ان پیسے پاس کی۔" ذکیہ
کوئی سانس لینے ہوئے کہا۔

"اچھا! رانیہ نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی اور دونوں نند بھانوج نے مزید باتوں کا پروگرام
ا کرتے ہوئے بند چھوڑ دیا۔



مگر کی مٹائی سحرانی سے فارغ ہو کر اس نے کہا کہ کپڑے بدلے۔ فی پٹک کائن کے سادہ
اس میں وہ اپنے کپڑے ہاتھوں سے تیل لٹالتے ہوئے رت پر پھیلا رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کھانا
بعدہ دو کچھ کھائی۔ بہت دنوں سے اس نے کچھ نہیں کھا تھا۔ وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ آج

"مگر ٹوٹ جاتی ہے مین!..... بھانگی کے اس دور میں جب بھری ترکاری سونے
کئی ہو تو ہم درمیان بیٹے کے لوگوں سے کوئی پوچھنے حال دل..... ارے میں نے دعا کرتے
عزت اور بھرم رہے ہائی۔ سید پوش لوگوں کو تو اپنی جادوئی لندی (جنگ) پڑ جاتی ہے۔ ہر
پیر لگے اور ہر چاہت تو سرنگ۔" نیرے بھائی کا دردناک کریشہ نہیں۔

"جنگ کتنی ہیں آپ بھائی!..... اب اپنی عافیہ اور رانیہ کی تیاریاں بھی میں نے تب سے
کر دی تھیں جب یہ دونوں پانچ پانچ سال کی تھیں۔ پینٹ کاٹ کاٹ کر دونوں کے جہیز جوڑا۔
خدا کا شکر ہے کہ رشتے اچھے تھے ہیں۔ کوئی خٹا نہیں کئے ہیں دونوں دلدلوں نے۔ مگر
بہنیں کونوئی سے لے کر ڈک پر شے ہی درے رہے ہیں جہیز میں۔" ذکیہ بولیں۔

"اچھا..... ماشاء اللہ۔ اور مجھے بھی دکھانا ڈرا۔" نیرے اشتیاق سے کہا۔
"پائل بھائی! ضرور دکھانا کی..... اچھا یہ بتائیں کہ کشف بنی کیسی ہے؟ دن گزار گئے
صورت دیکھتے ہوئے۔ لے آئیں ساتھ۔" ذکیہ نے کہا۔

"نڈاؤں کی کسی روز سے بھی آؤ نا مگر۔" نیرے نے کہا۔ "مراد کا کام کیا مل رہا
انہوں نے پوچھا۔

"الحمد للہ بہت اچھا۔ ماشاء اللہ خاشا تھی کر لی ہے اس نے۔ اب تو اپنی دکان کے سا
دکان بھی خریدنے کا سوچ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ جب اب تک پڑتی جاری ہے۔ کچھ مزید بڑھا
سوچ رہا ہے۔" ذکیہ کے لیے میں فخر تھا۔

"ماشاء اللہ..... خدا ترقی دے۔ مجھی بہت ہی قابل لگا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔
کشف نے تو انکار کر کے مراد کی توڑ دیا۔" نیرے ایک سر آدھری۔

"ہاں بھائی! میں تو سمجھتی ہے ہی کشف کو اپنی بھو کے روپ میں دھنکی آئی ہوں۔ مراد کو
سیوت ہے۔ دونوں لڑکیاں تو خیر سے اپنے گھروں کی ہو جائیں گی۔ میں سوچتی تھی کہ کشف مگر
جانے گی تو میری عافیہ، رانیہ کی کی پوری کر دے گی۔ پھر مراد کی اپنی مرضی بھی مثال ہے۔

کشف کے انکار کے بعد تو مجھ کا سیکھا ہے میرا بیٹا۔ بھائی! آپ کشف سے بات تو کریں۔
"سبھائی اے۔ وہ پڑھنا جانتی ہے بے شک پڑھے۔ ہم روکیں گے نہیں۔ مگر کم از کم کھانے کی
راضی ہو جائے۔ ہم بڑی جادو اور مان سے جھولی پھیلائے ہوئے ہیں۔"

"ذکیہ! میری کہاں پتی ہے اس گھر میں۔ بھینچ چلاؤ کشف کے انکار سے جھیں اتنا دکھ
ہو گا جتنا کہ مجھے ہوا ہے..... بڑا لڑی تھی میں جہارے بھائی سے۔ یوں چال بند کر دی گئی
نے..... مراد جیسا داماد تو نصیب ہواں کو تھا ہے۔ اور پھر اپنے لوگ دیکھے ہوئے۔ جہارے
سے کتنا کہ ان ڈگر یوں کا بار ڈالے گی لڑکی؟ چلو جتنا پڑھنا تھا یہاں پڑھ لے گا۔ ایم اے اور
کم تعلیم تو نہیں ہوتی۔ مگر یہ غیر کہ میں تم جہا کے ڈگریاں لینے پڑتا ہے، ویسے ہمارے جہارے نہ
میں کہ..... وہ بھی لڑکی ذات۔ ارے دنیا والے ہزار باتیں بناتے ہیں۔ کتنے تو نہ

اس کا گلے کا قفل موڑ دیتا تھا۔

اسی وقت درختل بجی۔ وہ کبھی کبھار آگئی ہوں گی۔ لہذا نہایت اطمینان کے ساتھ وہ پندرہ بجے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور دواز و کھول دیا۔ مگر دوازے کے پتہ واکرے ہی ا۔ کا درست جھانکا۔ جتنی اسی وقت پورے قد کے ساتھ وہاں اس کے منافی کڑی کے یہاں اس دروازے کے سامنے کڑے ہوئے گاؤں خواب میں بھی نہیں دج تھی۔ ہا لئے تو جیسے وہ لگ ہی ہو گئی تھی۔ اس کی بھٹ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا رد عمل ظاہر کرے؟

”ہلکا“ تھوڑی سی خان اپنی تمام تر دوازوں کے ساتھ دروازے میں ایسا دھماکا کیا کہ آپ کو کیا ہے؟ ”پتھر“ کہہ کر ہلکا گئے ہیں؟“ تھوڑی دیر بعد اسی میں سکر لیا۔

کشف نے خود پر قابو پاتے ہوئے یکدم گہری سانس لی۔ ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں اور میرے گھر کا ایڈریس کس نے دیا آپ کو؟“ کشف نے بے حد حوصلے سے انداز میں سوال کیا۔ ”کم از کم جیلا کا جواب تو دے دیں۔ اور گھر کے اندر تو آئے دیں۔ یا بیٹیں سے سوال کے بجائے کا ارادہ ہے؟“ تھوڑے گہری نظریں اس کے دفتر پر اسے پر ڈالیں۔ اسی کو احساس ہوا کہ اپنی حیرت میں وہ پندہ بھی ٹھیک سے نہیں اوڑھے ہوئے ہے۔ اس نے فو شائوں اور سر پر پھیلایا۔

”سواری..... میں آپ کو اندر آنے کی دعوت نہیں دے سکتی۔“ اس نے لٹھے مار انداز میں اس کے منہ پر ماری۔

”اچھا پوچھتا ہوں؟“ تھوڑے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ شاید اسے کس اس حد تک صاف گوئی کی امید نہ تھی کہ بہر حال وہ اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ”اس وقت گھر پر میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور دوسرے ایک غیر مرد کو میں اندر کس جا کس تعلق سے بلاؤں؟“ وہ ہلکا سا کھنکھائی۔

”حوالے اور تعلق تو بنانے سے بچتے ہیں کشف!“ تھوڑے سن گھاس جیب میں ریک گہری نظروں سے اس پر نظر فرماتے ہوئے اس سے کہا۔

”مگر مجھے تو تعلق بنانے کا شوق ہے نہ ہی جانوں کی ضرورت۔“ وہ خاموشی سے پھٹ پھٹا۔ ”میں..... مگر اس وقت تو میں صرف آپ کو کھینکس کہنے آیا تھا۔ آپ نے میری جان تھی۔“ تھوڑے ڈھٹ بنا کھڑا ہوا۔

”کوہے۔ کہہ کیجئے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ لوگوں کی نظروں میں آ رہے ہیں ہم۔“ سے بولی۔ انداز ایسا تھا کہ جس کو، میری جان چھوڑ دو اور دج ہو جاؤ اور سے۔

”لوگوں کی پرواہ کیوں کرتی ہو؟“ تھوڑے تو ایک اپنے لٹھے کو تیار نہ تھا۔

”پرواہ کیوں کرتی ہے لوگوں کی۔ کیونکہ میں انہی لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا ہوں۔ اور مجھے لوگوں سے زیادہ اپنی عزت اور نام و ناموس کا پاس ہے۔“ دوسرے دیکھے ہوئے ہوا۔

”بڑی بے حرمت ہیں آپ۔ اندر آنے کو بھی نہیں کہہ رہیں۔ کم از کم ظلم کے کزن کی حیثیت آپ مجھے اندر آنے کی دعوت دے سکتی ہیں۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ ”ظلم کے کزن ہیں اس لئے اتنا کٹا کٹی کر رہی ہوں۔“ ہاؤ پیڈر ایسکسڈ۔ ”کشف کے صبر کا لہجہ ہونے والا تھا۔ اس نے بے حد مشکل سے خود پر کنٹرول کیا ہوا تھا۔ آخری جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے تھوڑے کے جواب کا انتھار نہیں کیا تھا بلکہ دھڑام سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”ایٹ..... مگر کب تک بیٹھی!“ وہ شے میں کھوٹی ہوئی بڑ بڑا رہی تھی۔ ہر اصرار تھوڑے کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ دوسرا جا رہا تھا۔ وہ نہایت تیزی سے پانا تھا۔

اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ ذہک اور نیرد کٹے میں بیٹھی تھیں۔ رکشہ تارکول کی سڑک پر ادا ز کا مخصوص ناگوار شور مچاتا تھا کہ چار چار تھا۔ نیرد اور ذہک تقریباً ایک کھٹے کے بعد ایک پیش میں ایک بہت خوب صورت اور بڑی کچی کے سامنے موجود تھیں۔ رکشے والے کو کرایہ ادا کر دیا۔ دونوں کیت کی طرف بڑھیں۔

”دبلی بار جب میں سرکار سے ملنے آئی تھی، جب کوئی دوسری جگہ تھی۔“ نیرد نے کوشی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی ”جھلی وفد“ کو بھی ایک زمانہ بیت گیا ہے بھائی! تقریباً چار پانچ سالوں بعد آپ آ رہے ہیں سرکار کی خدمت میں حاضری دینے۔“ ذہک کی یادداشت بہت تیز تھی۔ ”یہ کوشی حمایت سرکار کی سرپرستی ہے۔ جب بھی سرکار یہاں آتے ہیں اسی کوشی میں رکھتے ہیں۔ ان کے مزے بھی یہیں ہوتے ہیں۔“ ذہک نے ان کی معلومت میں اضافہ کیا۔

”اچھا اچھا.....“ نیرد نے سر ہلایا۔

”دیکھ لیں۔ ابھی صرف سوا تو بچے ہیں اور لوگ کتنے جیسے ہیں۔ باری باری اپنے نمبر سے جائیں۔“ نیرد سب.....

ذہک اور نیرد بھی ایک ہال نما کمرے میں بیٹھ گئی تھیں جہاں پہلے ہی سے چندہ میں خواہن بیٹھی تھیں۔ اب وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔

نہیں وقت ان دونوں کی باری آئی تھی دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ دونوں خالی ہاتھ ہی اندر گئی تھیں۔ نے ایک بار بہت پہلے عیانت بادشاہ کو نذرانے کے طور پر ایک مرادنا سوٹ میں اور پھر نقد رقم لیا۔ ہائی تھی تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا بلکہ خاموشی سے ہائی کوشی کی طرف دیکھ کر

”مارا کام نذرانے لینے سے مشروط نہیں۔ ہماری حاجت ہے سب نہیں..... ہمارے پتہ کا زمین تو ہماری عیادت ہے۔ اور اسی سے ہمارا رہتا ہے۔ لوگ کاندھ کے گھڑوں کے پیچھے ہاتھتے ہمارے کاندھ کے پیچھے ہاتھتے ہیں میں نے جیتے ہیں۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے خالی ہاتھ اٹھائے اور اسی طرف صرف بند کر کے کھوٹی کوشی اور ان کی خالی ہاتھلی دونوں سے بھر گئی تھی..... یہ کوئی شہیدہ

نہیں تھا کوئی بادشاہ تھا۔ یہ تو کرامت تھی۔ ایک اللہ کے مقرب بندے کی کرامت۔ جنہوں
جاہت کیا تھا کہ دنیا ان کے نزدیک صرف ایک سنگ پتھر ہے۔ مال و دولت ان کے لئے،
ذہن سے بھی بے وقعت ہے۔

نیر اور دیک جب اندر کرے میں داخل ہوئیں تو حیات بادشاہ صوفی پر برا بھلا کہنے لگے۔
چہرے کے گرد نور کا پالہ سا بنا ہوا تھا۔ بائیں ایسا جیسے چاند کے گرد چاند کی روشنی کا پہرہ ہوا
دونوں نے مذہب انداز میں انہیں سلام کیا تھا اور پھر ان سے کچھ فاصلے پر قائم رہ کر دوڑاؤ بیٹھے
”بندے کے قدموں میں کیسا ٹھکانا۔ جاؤ لی لی! اورہ بیٹھو۔ خدا کی زمین پر سب برابر
ہے پر فائز ہیں۔“ بڑا بڑا قدر اہل تھا۔ بہت خاص لہجہ تھا۔ وہ دوسرے صوفی کی طرف اٹھ
رہے تھے۔

”ہم آپ کے برابر کیسے بیٹھیں سرکار! تو گستاخی ہوگی۔“ دیکہ اوب سے بولیں۔
”تیرے محبوب محمد ﷺ کے لئے برابر کی بیشک گستاخی نہ پھری، ہم کون؟ جا لی! اورہ؟
وہ گویا ہوئے تو دونوں خاموشی سے دوسرے صوفی پر بیٹھ گئیں۔

”کشف.....“ دونوں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حیات بادشاہ کے منہ سے نکلا۔
دیکہ اور نیر ایک دوسرے کی نشیں دیکھنے لگیں۔
”اس لڑکی کا مقدور دلا کا نہیں ہے۔“ انہوں نے دیکہ کو دیکھا۔ وہ ان کا اشارہ سمجھ گئیں۔
”اس لڑکی کے سترے کچھ اور کہتے ہیں۔“

”کیا بادشاہ کار؟“ میری بیٹی کے ہواگ میں کیا ہے؟“ نیر بے تابانی سے پوچھنے لگیں۔
”اس کے نصیب میں ابھی بہت آثار چھ حاذ ہے۔ اس لڑکی کا بیچنا نہ پکڑو لی لی! اس کا کلمہ
انہا رستہ خود بنا رہا ہے۔ اب جائے۔“ انہوں نے مکلی آنکھوں سے جیسے کشف کا نصیب پڑا لیا تھا۔
اور نیر مزید کچھ بولے بغیر انہیں اور سلام کر کے برا بھلا کہیں۔ دونوں ہی چپ صوفی۔
بادشاہ کی ہم تنہا ان کی کیم سے بالاتر تھیں سر ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ کشف اور دراصل
ہو سکتا تھا۔



واپسی میں نیر اپنے گھر آگئی جس اور دیکہ راستے ہی میں اپنے گھر آگئی تھیں۔ جس وقت نہ
گھر میں داخل ہوئی تھیں اس وقت کشف بھی گھر میں تھی ہوئی تھی۔

”ام! اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ کہیں اور گئے تھیں؟“ وہ چوہے سی پوچھنے لگی۔
”رق بہت تھا اورہ۔ پھر راستہ بھی تو خاصا لمبا ہے۔ ہوئی گئی اورہ۔ مجھے پانی پلو آؤ۔“ وہ براہ
میں چار پانی پر بیٹھنے سے کھٹے کھٹے سے انداز میں بولیں۔

”کیوں پڑتی ہیں خضول کچل میں؟ یہ فقیر خدا تو نہیں ہوتے جو لوگ ان کے آگے نہ
پھیلاتے ہیں۔“ وہ پانی کا گلاس انہیں پکڑا دے ہوئے بولی۔

”نہ بولا کر لڑکی ایسے! یہ ایک بندے خدا کے مقرب ہوتے ہیں۔ بے شک یہ خدا نہیں ہوتے مگر
ضرور ہوتے ہیں اور ان کے توسط سے کرائی گئی دعائیں بھی ضرور قبول ہوتی ہیں۔ اور بادشاہ
جیسے لوگ تو نایاب ہوتے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ان تک پہنچ گئے۔ بھول گئیں؟
ابھی بھی تو ہمیں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“ نیر نے اسے قائل کرنے کی کوشش میں دلیل دی۔
”ابھی! ابھی! اچھا! آپ کے بادشاہ سرکار سے کی روز ملاقات کا شرف حاصل کریں گے اور دیکھیں
راپ کی عقلیت و عقیدہ کی مضبوطی کی اصل وجہ کیا ہے۔“ وہ بحث کو سینے ہوئے بولی۔ ”وہیے ام!
یہ میرے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ نہیں۔“ وہاں کو کچھ پھرنے سے انہوں نے بولی۔
”اگرے دہی تو پوچھنے لگی تھی۔“ بے ساختہ ہی ان کے منہ سے نکل گیا۔ ”مرا تو تیری قسمت میں
ہے۔ آگے کی اللہ خیر کرے گا۔“ وہ خود دکھائی کے سے انداز میں بولیں۔

”یہ انہوں نے بتایا ہے آپ کو؟“ کشف نے پوچھا۔
”اور کیا؟.....“ اور وہ بھی بتا ہمارے کچھ بولے، تاکہ کچھ کہے۔ پتہ سے کشف! انہیں تو تمہارا
ف معلوم تھا۔ مگر جب ہم ان کے پاس گئے جب کچھ دیکھ کر انہوں نے تمہارا نام لیا تھا
اں.....“ اور کہا تھا کہ اس لڑکی کا مقدور دلا کا نہیں ہے۔ ان کا اشارہ ورا کی طرف تھا۔ اور بیٹی!
اب ہونی ہوتی ہے۔ اللہ والوں کا ذکر عزت و احترام سے لیتے ہیں۔“ وہ اسے سمجھانے لگیں۔

”احترام کرتی ہوں ام!..... بہت احترام کرتی ہوں۔ اللہ کے سارے ولی، سارے بزرگ،
اب مقرب امتیں کا یہ حد احترام کرتی ہوں۔ مگر ام! یہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان ایک امتیں
ملا ملا کر کچھ جھپٹتے ہیں، مجھے یہ سب پسند نہیں ہے بے شک ان کی دعاؤں میں جو اثر ہوتا ہے وہ
اب دعاؤں میں شاید ہی ہوتا ہو۔ بے شک وہ دونوں میں جھاک سکتے ہیں۔ مگر ام! ہوتے تو وہ
بخری ہیں۔ لوگ حراؤں پر جاتے ہیں، تھکے کرتے ہیں، ماتھے جھپٹتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بس تو
میں مل کر..... ان احترام و تعلق احترام بزرگوں کو نانا کہہ دیتے ہیں۔ اپنے کمزور ایمان کی
پاسی ایسی عجیب حرکات کر جاتے ہیں کہ بس..... میں تو صرف ان باتوں کی خدمت کرتی
ہو جاتا ہے تو خدا سے مانگو۔ رانا تو وہ ہے۔ اور توسط سے مانگتا ہے تو ہی ان ہی، سردار ہی ان محمد
ابھی کے توسط سے مانگو جو اللہ کے محبوب ہیں۔ پہلے اللہ..... پھر محمد ﷺ اور پھر باقی۔ ام!
نہایتی سے سوچ تو لیں۔“ وہ بے حد بھیگی سی بولی۔

”یعنی تو تم ٹھیک ہو بیٹی! اصل یہ تو آپ ﷺ کی ذات اقدس ہی ہے۔“ نیر نے کشف کی
ساتھ ہونے لگا۔

ان دنوں دور تھیں کشف نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی معبد کھڑا تھا۔ اس نے کشف اور نیر
دیکھا۔

”اے! کھانا لگا دیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے بولا۔
”یہ یاد آتا تو ٹھیک کر رک گیا۔“ اسے ہاں..... میں تو بھول ہی گیا تھا۔“ دوسرے ہاتھ

مارتے ہوئے مزار اور ماں کو دیکھنے لگا۔ ”وہ سوہا بانی کی ساس ہیں نا، ان کی ہنگام ٹوٹ گئی ہے۔“
 ”ہائے..... خدا رحم کرے۔ کیسے ٹوٹی؟ اور تجھے کس نے بتایا؟“ نیرہ افسوس بھرے لہجے میں پوچھنے لگیں۔

”ان کے بڑے بیٹے کا چھوٹا بیٹا میرے ساتھ کانٹن میں پڑھتا ہے۔ ایک کلاس جونیئر سن۔ آج ملا تھا کانٹن میں..... کہہ رہا تھا کہ رادی کی ہنگام فریجر ہو گئی ہے۔“ معیہ نے بتایا۔

”اچھا..... مجھ کو جانا پڑے گا۔ عصر میں چلی جاؤں گی۔ تیرے میرے ساتھ چلا۔“ نیرہ نے پروگرام ترتیب دے دیا۔

”مگر ام! میری بڑھالی.....“ معیہ نے منٹنا کہہنا چاہا۔

”ہو جائے گی بڑھائی۔ ہم رات رہتے تو مری جا رہے ہیں۔ بس ایک آدھ گھنٹہ رکھیں۔“
 ”وہ سوہا بانی کی ساس ہے کہاں؟“ مگر یہ پوچھتا تھا۔ ”نیرہ نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتہ۔ نہ میں نے پوچھا نہ ہی اس نے بتایا۔“ معیہ نے کھنکھہہ ہنسا کر غماہ کر لی۔

”ایک تو تم بچوں کو ذرا متعل نہیں ہے۔ اور یہ بھی نہ ہو سکا سوہا بانی ماہ سے کرم از کم ایک نو دہائی۔ اب تو تہوار ہے۔ بابا نے مگر میں ہم لوگوں کی سہولت کے لئے فون نہیں لگوا لیا ہے مگر، شادی شدہ اور چار چار بچوں کی لائیں بن گئی ہیں مگر کھنکھ سے پیدل۔ فون کر کے خبر لی دے، یہ حادثہ ہوئے بھی جانے کتنے روز بیت گئے ہوں۔“ نیرہ کو دونوں بیٹیوں پر فخر آ رہا تھا۔

معیہ تو اس کی تائز اس لئے کہ وہ ان ہی اپنے کمرے میں جا گیا تھا۔ جبکہ کشف، معیہ ۱۰

کھانا کمرے میں سناے چلنے سے باز رہی۔

”ہو سکتا ہے ام! ان کو فرصت نہ ملی ہو۔ یا پھر خیال ہی نہ آیا ہو..... اتنی تو لمبی چوڑی ہے بے چارے کی۔ اس پر بچوں کی فوج۔ سہانا نہ داری تو عام دونوں میں کس قدر ہوتی ہے؟

یہاں۔ اب تو ساس صاحبہ کی ہنگام مسئلہ آ گیا ہے۔ خوب بھیڑی ہو گی۔“ کشف نے گناہ

ٹرے معیہ کو پینچا کر ہاتھ آرتے ہوئے بیٹیوں کی طرف داری کی۔

”لمبی چوڑی سسرال ہے، اسی لئے تو زیادہ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ ذرا سی بھول چکر بیٹیوں کے لئے طعنے دے بن جائیں۔ یہ بڑے نازک معاملات ہوتے ہیں۔ بہت ہی سچے دھارے

رشتے ہوتے ہیں جی! بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے ہر ہر بات کا۔“ نیرہ نے اسے سمجھایا۔

”کیا ضرورت تھی بے چارے کو کوچہ بستی کے محل میں قید کرنے کی۔“ کشفیں دیکھتے تو س جا رہا ان دونوں کی۔ کٹھو بھی کریں تو کیا کریں غریبوں سے۔ اس لشکر خدا کی خدمتوں سے فراہ

فصیب نہیں ہو پاتی ہے انہیں۔ جال، بھائی، بھائی، ان کے درون درون بھر رہے۔ نہیں۔ کے بھی بیچے۔ سب کو ایک جگہ جمع کر کے سوار کر رکھا ہے آپ کے دالداروں نے ان دالداروں پر۔“ کشف کو فخر آئے گا تھا۔

سب قسمت کے کھیل ہیں جی! اپنی سوہا اور بابا کو بڑی آرزوؤں کے ساتھ جیلا تھا بھرے

جائیں۔ مگر ان پر ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ دیکھ کر تجھے کسی بھرے گھر میں رہنے کی ہمت نہ

ہر تیرا حرا ج بھی بیٹیوں سے بالکل جدا ہے۔ نہ لٹا نہ کرنی ہے کسی کا نہ ہی کسی کی سستی ہے۔ ہر

رہ بار دینے کی عادت ہے تجھے۔ مراد کے رشتے پر میں اسی لئے سب سے زیادہ خوش تھی کہ

مگر یہ کوئی نہیں ہے۔ بس صرف ساس اور سسرالی کی ذمہ داری ہوئی۔ لڑکیاں تو اپنے اپنے

مال کی ہوتے والی ہیں۔ اس پر مراد صاحب! اعلا! عاتق! ہر لڑکا سے ایک اچھا شوہر ثابت ہوتا۔

رہائی صاحب کا حرا ج بھی نرم ہے۔ فضول کی جج جج کی عادت نہیں ہے ان کی۔ اکیلا مگر

ان کرتی تو۔ مگر بس.....

ایک سردی سانس بھر کے رو گئیں۔

”ام! آپ سوہا بانی کی ساس کو فون کر لیں۔“ کشف نے ان کی بات کاٹتے ہوئے جیسے یاد دہانی

کی۔ مگر کوئی ضروری تھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اچھے چھ گھنٹوں تک اسے مراد کے بارے

میں کس قسم کے قصیدے سننے پڑتے۔ اور وہ ان قصیدوں اور مراد کے نام سے خاصا پیچھا کرتی تھی۔

ارے ہاں..... میں تو باپوں میں بھولی ہی تھی۔ ملا دو ذرا نمبر۔ خبر تو لوں کہ اس کی ساس

ہاں..... نیرہ چٹاپ چٹپتی ہوئی پولیس اور کشف دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوئی فون کی

۱۰ دہائی۔



اس کا قلم انسانے کی آخری سطور کو کروں کی طرح کورے کاغذ پر بکھیر رہا تھا۔ وہ گرد و پیش کو

نہایت انسانے کو لکھنے میں مگن تھی۔ آج بہت دنوں بعد اسے اپنی دیکھ لکھنے کا موقع ملا تھا اور

واقعہ کو جانوں سے نہیں جانے دیتا جانتی تھی۔ نیرہ معیہ کے ہمراہ سوہا کے گھر گئی تھیں۔ ان کی

مطلب سے قبل تو کسی صورت ممکن نہ تھی۔ حارثین عادل کے کوئی دوست عمرہ کر کے واپس آئے

وہ ان کے عصر میں واپس آ گئے تھے اور تیار ہو کر اپنے دوست کو عمرہ کے کی مبارکباد دے دینے

گئے تھے۔

خف جانتی تھی کہ آج اپنے اس انسانے کو مکمل کر کے مع اس کو اس کی منزل تک پہنچا دے۔ یہ

شرعاً گئے اسے تقریباً ایک مہینہ ہونے کا تھا مگر بے حد مصروفیات کی بناء پر وہ کبھی لکھانے کا

مافیست رفتاری سے کر رہی تھی۔ یوں بھی اس کے جاننے میں دن کم ہی رہ گئے تھے۔ ہرگز نہ

اصلاتی شام اس کی بے باجوں میں اضافہ نہ کر رہی تھی۔ ایک تکیہ سمت کی طرف سڑا سے عجیب

ان میں جھلک دیتے..... ذرا دور گھبراہٹ، انہوں سے دور ہونے کا لڑکا لڑکا سا دکھ، انفرنگی وطن

دے دیار، فربک کے سڑکی انجمن دہلی، اپنی منزل کو پانے کے لئے ایک انجمن سفر، ایک ایسا

انہیں میں اس کو تھا ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ نہ نام ہو، نہ پناہ، نہ بھائی، نہ بہن، نہ

جہ، نہ رشتہ دار۔ ہاں..... مگر اس کی حیثیت ضرور سفر میں اس کی سستی ہوئی۔ اس کے

اے میرے دوست! وہاں کی من کو نہیں سمجھ پائیں۔ وہاں کو اپنی ان چھتوں کے سحر سے ٹھیک تو ہائی ہوئی وجوہ کا حشر لے سکیں گی۔“

وہ بتا کے کہتی۔ اس وقت وہ مکرم میں اکیلی تھی اسی لئے زیادہ اطمینان کے ساتھ دھن چمڑے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ خیالوں اور سوچوں میں آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس بات میں دہن میں کتنی کے چندہ گئے تھے۔ وہ فریور کمانی نے ہی اسے شوروہا تھا کہ وہ وہاں ال کی بجائے ایک ایسی من کو تیرا دے۔ ہاٹل اسے میچا گے گا۔ جبکہ وہاں اوقات وغیرہ کی رانی ہوئی ہے۔ فلیٹ سسٹم وہاں عام ہوتا ہے اور اسے کسی دوسرے فلیٹ میں عی رہنا پڑتا ہے۔

وہاں ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں وہاں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ملازمین بھی کرتے ہیں اوقات تو اسٹوڈنٹس اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے تین تین چار چار جگہوں پر دھرتے ہیں۔ وہاں تنخواہ کمزوروں کے حساب سے ملتی ہے۔ جتنے گنتے کام کروا لیں، اتنے پاؤں لگے۔ اب یہ تھمارے کورس پر منحصر ہے کہ وہاں یہ تھوڑی میں کتنے کام کروا لیں۔ ہر ایک بات اے تم نے یا بھی رکھنا ہے اور وہ ہے کہ تمہارا اصل مقصد وہ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس

آنا۔ نہ کہ وہاں ملازمت کر کے ملائے کے چال میں پھنس جانا۔ میری پہلی جس کا نام اور کنگڈم فبر ہے پاس موجود ہے، وہ بھی کبھی سسٹم انٹرنٹ میں ہی رہائش پزیر ہے اور وہ جگہوں پر لگ کر رہتی ہیں۔ رہائش اور ملازمت دونوں مسئلوں کے لئے میں اس سے بات کروں گا۔ قرۃ العین، ابھی لڑکی ہے۔ بیٹیا تھمارے لئے معاون و دھندہ ثابت ہوگی۔ پھر اس سے کہہ دوں گا کہ ان انٹر پورٹ پر وہ تم کو رہیو کر لے۔ وہ تم سے ایک سال سینئر ہے۔ انھیں میں بائزر کر رہی ہوں کہ ابھی طرح گائیڈ کر دے گی۔ تم وہاں جانے سے قبل ”سٹی پیٹر“ سے پاؤں دھو بیچ کر واپس آؤ۔ یہی فوری طور پر فیضوں کا مسئلہ بھی نہ ہو۔ وہاں ریسپورٹ بھی خاصی سبکی ہے۔“ وہ اسے گائیڈ کرتے۔

”وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟..... میرا مطلب ہے کیا وہ امریکیوں جیسے ہیں؟“ کشف نے

کہا۔ ”وہاں کے لوگ بہت سولہ نڈ (مہذب) ہیں۔ امریکیوں جیسے غیر مہذب نہیں ہیں۔ وہاں جا کر خود ہی اعزاز ہو جائے گا۔ اور دوسری بات یہ کہ تم کو توڑی بہت فرخ بھی لیکھ لیتا۔ وہاں دھن میں کتنی ہے۔“

وہ فریور کمانی کی باتیں سوچتے سوچتے وہ اپنی سوچوں کے محور سے باہر آئی جب دور تیل مارنے سے بھٹو مارا اس نے چمک کر داکن کو کرسی پر رکھا اور خود تھوڑی سے بیڑیوں کی طرف

پڑھیاں اترنے لگی۔

ارادے کی مضبوطی، جو ہر مشکل وقت میں اس کے کام آتی۔ من میں اپنے خیالوں کو حقیقت کا دھارے پر وہ سرور تھی۔ بے حد خوشی اور اپنے رب سے دعا کرتی تھی کہ زندگی کے وہ مشکل جو کر آئے والے تھے، وہ آدرا من میں جن سے اسے گزرتا تھا، بس ان میں وہ سرور ہو جائے۔

السنہ مکمل کرنے کے بعد اس نے کانڈ فائل میں ابھی طرح لگائے اور اس فنانے کو ایک پڑھنے کی کتاب کو کٹی لٹلی اگر سامنے آئے تو اسی وقت درست کر لی جائے۔ پھر فائل کے باہر لکھا۔ فنانے کا عنوان لکھا اور مستثنیٰ ہو کے فائل کو اپنی رانگنگ بیکل پر رکھا۔ اس کے بعد اپنی الماری کو کھلی اور الماری کے سب سے نیچے خانے میں سے داکن نکالا اور کمرے سے باہر

چل پئی تھی۔ مصر کی سپیدی شام کے آواں سامنے میں دھن چمڑی تھی۔ موسم خاصا سرد تھا۔ آج کل شامیں غمگینی ہو گئی تھیں۔ کرچی شہر میں سردی کا موسم تو بس خانہ پڑی کے آتا تھا۔ دہر اور جنوری کے مہینوں میں بھی موسم خوشگوار سردی کا اثر لے رکھتا تھا۔ یہی غمگینی آتی ہے نہ ہی ابو جند کے والے بھائی ہوائیں چلتی ہیں۔ اسی داکن نے بجائے کامل موڈ ہو رہا

مگر یہ بگڑا ڈالی تو مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔ اس نے داکن کو اپنی رانگنگ بیکل پر نماز کے بعد کسی۔“ وہ سوچنے لگی۔

اسی وقت فضا میں اللہ کی برکد اداں سے گونج گئیں۔ اللہ اپنے بندوں کو اپنی طرف پار دے مصلیٰ بھیج کر اللہ کے دربار میں حاضری دینے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ نماز کے بعد اس نے کوا

کے۔ وہاں گئے کے بعد مصلیٰ تھر کر اٹھا لیا۔ اب شام کے آواں سامنے رات کے اندھیر۔ مگر ہو رہے تھے۔ ہوسم کی غمگینی میں ابھی بکلی ہی آج کی تھی۔ وہ داکن اٹھا کر باہر نکل آئی

نے باہر کی طرف انھیں ابھی نہیں چلائی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور داکن پر بہت ہی صورت میں دھن چمڑی۔ اس نے داکن بجائے بجائے تھریں اٹھا کر سیاحی مال آسمان کو دیکھا آسمان آج بادلوں سے ڈھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ انہی بادلوں کے پردے کے پیچھے سے کبھی کبھی چا

بھٹک دکھا کے چمپ جاتا ہے۔ وہ داکن بجائے ہونے چاہی کہ آٹھ بج چکی دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ دیاں بہت پسند تھیں۔ ہر کی خاموشی اور کسی راتوں کو وہ اکثر جب فارغ ہوتی تو اسی طرح مکی چمپ پر داکن بجائی

داکن بجائے اس کا شوق تھا کہ کبھی اس کے شوق پر بھی اڑھن اڑھن تھا۔

”یہ میرا دین کا بابا جانتا ہے کہ اس کے شوق میں۔“ وہ بھی کبھی مکی میں کربتیں۔

”خدا کے لئے ام۔۔۔۔۔۔ میرا دین کا بابا کہہ کر تو تین تو مت کیا کریں۔ اتنا بھڑکنا اور

ہے۔ آپ تو بس۔۔۔۔۔۔“ وہ ماہان جاتی۔

”یہ نہیں میں جیسے بہت اچھی سمجھتی ہے۔ خدا جانے اس لڑکی کے شوق کیسے اٹھ سکے ہیں۔

کسی صاحب بہادر کی خوشی میں پیدا ہونا چاہئے تھا۔ یہاں کہاں پیدا ہوئی مگر فریبوں کے گھر

لٹھے پر ہاتھ مار کے بولی۔“ آپ کو اپنی چھتوں کی لٹ لٹ کرنے والا میزک سننے کی عادت

ایسا، کھانا، دوا دارو، چلتی کھلتی سب کچھ کیوں آچھا ہے۔ اس پر اسے اپنے پاس
ایسا، باقی فطرتی نعمتیں اور خورے سہنا آدھی ہو چکی ہیں چھپا۔ "نیر نے اس کو دیکھا۔
یوں؟..... باقی دوا بھائیوں بھی تو ہیں۔ وہ کیا چاہہاں ہیں مہندی لگائے بھیجیں؟"
نے بگڑ کر پوچھا۔

ہائی والی اور چوڑے نیچے کی ہوئی ہے۔ اس کے بھائی کی شادی ہونے والی ہے اس لئے میں نے پہلے چلی گئی ہے۔ اور پھر چلی والی بھی ساس کی جگہ ٹوٹنے کی خبر سننے ہی بخار میں مبتلا ہوئی اور آج نہ نیکے ہی میں ہے۔" "نیر نے اطلاع دی۔

اور وہ مندریں مساحان..... ان کو کیا تکلیف ہے؟ یوں تو ہر روز مع اپنے بچوں اور شوہروں کے ملتی ہیں۔ اب کہاں ہیں وہ جبکہ ان کی ماں کو ان کی زیادہ ضرورت ہے اس وقت؟ کشف کا اصل راز تھا۔

”ابا! تاراری جس کے تینوں بی ان چاروں میں صرف ایک مرید جاتی ہیں۔ کتنی ہیں کہ کام
 واپس لیں۔ ماں کے پاس رہ نہیں سکتیں۔ کیونکہ بچے سکول جاتے ہیں اور نیکے میں رہنے کے
 ان کی چھٹیاں ہو جائیں گی اور بڑھائی کا حراج ہوگا۔ اب کوئی بچہ ان سے کہ جب ہفتہ
 آئے گی نیکنے میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھی جس جب بچوں کی چھٹیاں نہیں ہوتی جس؟ بڑھائی
 نہیں ہوتی کچھ؟..... اب ماں کی خدمت کرنے کا وقت آیا تو سب نے نظریں پھیر لیں۔ واہ
 اس رشتے مطلب کے رشتے۔“ نیند نہ گہری سانس لی۔

مذہب باطنی اور ماہیاتی کو ان کے بے لوث خدمتوں کا صلہ دے گا اُم اور دونوں تو اپنے فرائض مائل نہیں ہیں۔ آپ دیکھئے کہ کرائس بھی کتنا جھلٹا چھلٹا ہے گا۔ کشف کو ماں پر دم آیا جو باطنی کی حالت پر کڑھ رہی تھی۔ اُس نے اُنہیں لڑی دی۔

پایا جیسا کہ سوچ کر خود کو کھلی دے دیتی ہوں۔ اور دیکھی بھی رہی ہوں۔ پہلے تو سوچا، کیا ان کا بھینا حرام کئے رکھتی تھی۔ نئی نئی شاہی ہوئی تھی دونوں کی۔ کھونے بچنے کے اور آرام کے لیے وہاں تھے۔ مگر ان کی سانس کے دونوں کو مگر کی پوری ذمہ داری سوچ کر خود کو بری الذمہ کرنا تھا۔ اور آج کا دن میں نے اپنی بچیوں کو بھی آرام سے بیک کر نہیں بیٹھے دیکھا۔ بیٹیوں گزر جاتے ہیں کی سورتیں دیکھتے۔ آج جب ان کی سانس کے پاس ٹیپھی تھی وہ دھیرے بچیوں کو چھو لی اٹھا اٹھا مایوس رہے مری تھی۔ کہہ رہی تھی کہ جتنی خدمت ان دونوں بہوؤں نے کی ہے اتنی تو میری نگہداشت نہیں کی۔ میری چپ کے قفل لگائے ہر زبانی کو خاموشی سے بیٹھے ہوئے ہیں خدمت کرنے والے۔ دونوں بڑی بہوؤں نے تو کبھی جھوٹے منہ جی ان سے یہ نہ چھوچھا کہ اماں کو کوئی کام ہے۔ میں انھیں یہ کہہ رہی بیٹیوں سے بہت خوش ہے۔ اور پھر اپنی دونوں بہوؤں سے خاصی باخبر رہے۔ میرے دل کو بھی تو سکون لاکھا کہ سو اور اماں کی خدمتیں اور قربانیاں اور انکی نہیں کریں۔ دعاگو کیا۔ اے مقدمہ نہیں ہوتیں۔ جہاں تھکے کے لئے دعا کے واسطے ملتے ہوتے ہیں دو لوگ بہت قسمت

خان کو کھڑے پایا تھا۔

”میں ہوں آلی!“

معید کی آواز پر اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

”اسلام تعلیم کا“ اس نے پہلے ماں کو سلام کیا اس کے بعد معید نے اسے سلام کیا جس کا
 وجہ ہوئی وہ سائنس پر ہٹ گئی تاکہ فیصلہ اور معید اندر آسکیں۔

”آپ جاؤ۔ میں دروازہ بند کر رہی ہوں۔“ معید نے اس سے کہا۔ وہ اور فیما آگے بڑھ کر پہنچیں۔

”بہت دیر لگا دی ہے آپ لوگوں نے۔“ اس نے ماں سے کہا۔

”ہر.....؟“ اس نے کہا! ”مجھے دعا میں دیں کہ میری راجہ سے اُم جلدی اٹھ سکیں۔ ورنہ، اٹھنے پر تیار تھیں۔ جب بھی کہنا کہ اب چلیں۔ فٹ سے جواب آ جاتا کہ ابھی پانچ منٹ تو جو آئے ہوئے۔ تو رام تو نے لیں۔ جلدی کیا ہے تجھے۔ جب میں نے اُم کو یاد دلایا کہ میری بیلا ہم۔ سپر کے تینا پیجے آئے تھے یہاں ادواب راج رہے ہیں مغرب کے ساڑھے سات۔ ہم عیادت کرنے آئے ہیں، کوئی رات ٹھہرنے نہیں۔ آخر بول بول کر تو اٹھایا! انہیں وہاں سے۔“

بھائے سعید نے داستان نازاؤلی۔

[illegible]

”واقعی..... اب انسان کا خرچہ کر کے کہیں جائے، دو سو روپے کا فروٹ خریدے
روپے کرپے لگا کر جائے تو اتنی رہی بیٹا مار جائے کہ ساتھ دوسرے لوازمات سے خالی معدہ
میں بن جائے۔“ معینہ نے مسکونی خمیدگی سے کہا۔ ”بگڑا امیر تو اب یہ سوچ رہا ہوں نہیں
کہا کہ کھار کر ہی آج بچا تھا وہاں ہے۔“ معینہ کی خمیدگی کا قائل دیکھ کر کشف صرف اُس کے
گوتھم۔ کئی نواسہ اہل بیت سے خور و قیہ کر کر ان کی بات سننے کی بھیجھ مانتی ہے۔

”یہی تو میں جیسے سمجھا جا رہی تھی۔ چلو اچھا ہوا کہ تم کو خود قیامت بھیج دی آگئی ہے مصیبت سے پولیس تو معیہ بھٹکل اپنی سرکراہٹ چھپا پایا جبکہ کشف نے عصبی نظروں سے دیکھا۔“

”اے چھوڑیں ام! آپ یہ بتائیں کہ حاجی وغیرہ سب ٹھیک تھیں؟ اور بھی کوئی مہمان موجود تھا؟“ کشف نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

ہوئے پوچھا۔

”میں تمہارے جانے سے قبل گھر میں آیت کریمہ کو فتم دلوانا چاہتی ہوں۔ ساتھ ہی فتم قرآن بھی کروا لوں گی۔ اور تم ذرا میرے ساتھ چلنا عیت سرکار کے آستانے پر بھی۔ ذرا نظر ہو جائے گی۔“

”اچھا ام! ابھی تو چراغ مینہ پڑا ہے۔ دیکھیں گے۔“ وہ لے والے انداز میں بولی۔

”دیکھیں گے نہیں، تم کو چلنا ہے۔ دیکھیں؟“ نیر نے قسم سنا دیا۔

”اچھا ام! اچھا چلیں گے۔ خوش؟“ اس نے جیسے پارہاٹے ہوئے ان کا دل رکھا۔ ”اب میں لے کے کھانے کی تیاری کروں۔“ وہ اٹھ کر کچن کی سمت بڑھ گئی۔



والے ہوئے ہیں۔“

”یہ تو کچن کھڑی ہیں آپ ام!“ سکف نے ان کی بات سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے ”اچھا یہ تو تازہ کرات کے لئے کیا بناری ہو؟“

”آلو قبرہ بنانا؟“ اس نے پوچھا۔

”نارو..... تمہارے بابا کو بھی پسند ہے۔ اور ہاں..... ساتھ میں گھساہو لے چاول ام

”ام!“ سکف نے ٹھیکسی نظر سے انہیں دیکھا۔ ”چاول منع ہیں آپ کو۔“ اس نے دہائی کرائی۔

”ہاں تو اپنے کھانے کے لئے تھوڑی سی کھڑی ہوں۔ تمہارے بابا.....“ وہ جلدی کر رہی تھی۔

”ام!“ سکف نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ ”بابا کے بہانے آپ بھی تو بڑا دارا سا۔ بس سبکی دو پلٹتے۔“ وہ قدرے خوشی سے بولی۔

”اچھا، تو تم میرے لٹو لے گئی ہو۔“ وہ معصومی ناراضگی سے بولیں۔

”اوں ہوں۔“ ٹھیکیں۔ ”سکف نے سابقہ انداز میں کہا۔

”شریر!“ نیر نے مسکرا کر اس کے سر پر چپت رسیدی۔ ”تم جلی جاؤ گی تو یہ گھر تو کھانے کو دوڑے گا۔ میں کیسے اکیلی رہوں گی یہاں؟“ اب وہ اس کی روانگی کا غم کھانے دینا

”اکیلی کہاں ام! بابا اور معید ہوں گے۔ پھر میں کون سا ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں سالوں کی سی تو بات ہے۔ یوں جنگی بجائے ہی گزار جائیں گے دو سال۔“ سکف نے دنا

ہوئے پچکے پچکے انداز میں جواب دیا۔

”تمہارے لئے ہوں گے صرف دو سال۔ میرے لئے تو دن، رات اور مہینے ہوں گے۔“ تم انھوں سے اسے دیکھا۔

”اوہ..... ام! ایسے نہیں۔ میرے لئے دما کریں بس۔ مجھے اپنی منزل تک پہنچانا ہے منزل ابھی دور ہے۔ مجھے آنسوؤں کی نہیں، دھواؤں کی ضرورت ہے۔ آپ کے آنسو لے

دیں گے۔ اور میں کڑوا رہی ہوں جتنا چاہتی۔“ اس نے آنکھیں سے ان کے عارضوں پر پہنچے اٹھیں کی ٹھیکیں پوروں سے جذب کئے۔ وہ جانتی تھی کہ نیر اس سے کتنی محبت کرتی ہیں

بہنوں کی رخصتی کے بعد وہ ان سے بہت زیادہ قریب ہو گئی تھی۔ نیر ہر کام میں اس کی مرضی مشورے کو اہمیت دیتی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے جانے کے بعد وہ خود کو بہت احمس کریں گی۔ جیسی دھڑکتا دھڑکاؤ ان کو دلا سے اور تسلیاں دیتی رہتی تھیں۔

”پگلی! ماں کی تو سانسوں کی آمد و رفت تک اولاد کو دما دیتی ہے۔“ نیر نے کہا۔ ”امہ کو کون سی تاریخ ہے تمہاری روانگی کی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں کیلنڈر دیکھ کر کبھی بتا دوں گی۔ لیکن شاید میں یا باجیس آ رہی ہے۔ کیوں؟“ کو

اے تو اسے اپنی دیوانگی کے سوا کچھ نہیں آتا..... اسے اپنی دیوانگی کے سوا کچھ بھائی نہیں
 "وہ سرکاری۔" بھائی نے آئینے میں اللہ کے نام کی بجائے اپنی لمبی کاٹھن دیکھ لیا تھا۔ وہ صرف
 اپنی دیوانگی تھی..... اس کا شوق تھا..... جس نے اسے اپنے رب کے نام کی بجائے اپنی محبوبہ کا
 نام لیا تھا۔ وہ لمبی کے شوق میں سرداری کو خوراک مار کر نصیر بن گیا تھا..... میں آپ کے شوق میں
 ہر کسب کچھ ٹھکرا کر آجاتی ہوں۔ بدلے میں کچھ نہیں مانگی..... نہ خنث تاج، نہ بادشاہی.....
 اور..... آپ کا نام..... ہم..... ہم بھی نہیں..... مجھے تو صرف آپ کی دایہ بن کر آپ کے قدموں
 ..اٹا ہے..... مجھے اس کی اجازت دے دیں۔" وہ ایک جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ حمایت
 بلکہ مجھ کو خاموش ہو گئے۔

"اس وقت تو چلی جاتی تھی!..... ابھی تو چلی جا....." وہ صرف اتنی ہی بولے تھے۔ ماموران
 پرے کے تاثرات نہ سمجھ سکی۔

وہ اپنے گھر کی جانب آہٹ رو سی سے بڑھ رہے تھے اور ماموران کی پشت پر کھڑی انہیں دیکھتی
 اس کی پیاسی نظروں کی تپش حمایت بادشاہ کو محسوس ہو رہی تھی مردہ پیچھے مڑ کے نہیں دیکھنا چاہتے
 نہ ہاتھ تھے نہ کر گھر پیچھے مڑ کے دیکھا تو اس کے حوصلوں کو ہوا مل جانے لگی۔ انہوں نے اس لئے
 وہ مکرے مستحق کا وہ سے دیکھ لیا تھا جو قیاس کے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ مگر انہیں اجازت نہ
 ان قدرت کے کاموں میں دخل اندازی کرنے کی۔ وہ صرف انتظار کر سکتے تھے۔ کیونکہ اللہ جن
 اس کو کرنے کی طمان لیتا ہے تو پھر کوئی دوا دے گی، دعا کوئی گزند گاہت، کوئی انتہا ہے۔ روک نہیں
 اور اپنی مرضی کا آپ مالک ہے۔ اس کے کسی کام میں کیا مصلحت نہیں ہے یہ ہم کسی کے بٹے
 انسان کیا جانیں؟ اس کے کسی کام میں کیا راز چھپا ہے اس کی خبر کسی کو؟..... سارہ..... چان تو وہ
 ہی سے بنے رکھتا ہے۔ بس میں مل میں انسانوں سے کروا دے کہ چلیوں کی طرح آدریں دار سے
 اسوں سے بڑھ کر وہ ان کے سرے اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ کسی سے کس دور کو مچھپاتا ہے یہ
 اور نہ جانتا ہے اور اس کی مرضی کے نام بھی کسی بلا نہیں کہیں کی مجال ہے؟

مامور نے حمایت بادشاہ کو ان کے گھر کے بڑے سے سبز گیت میں اندر جاتے ہوئے دیکھا۔
 ہم بھی پیچھے اپنی خود ساختہ کار کی طرف نکلتی آئی۔ آج اس کے ساتھ ڈرائیور نہیں تھا۔ وہ خود کار
 اور کے لائی گئی۔ وہ ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اسٹیرنگ پر سر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر
 ڈی۔ مغرب کا بھینٹا تھا۔ یہ گزر رہا تھی۔ گاؤں کی کئی کئی سڑکوں پر لوگ آتے جاتے نظر آ رہے
 بہت سے تے اب بھی اسے دیکھا تھا جب وہ حمایت بادشاہ کے ساتھ کھڑی ہاتھیں کر رہی تھی۔
 اس نے اب بھی اسے دیکھا تھا جب وہ اسٹیرنگ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اسے یہاں آتے ہوئے
 بال کا عرصہ گزر رہا تھا۔ اسے آج بھی روز اول کی طرح وہ دن یاد تھا جب حمایت بادشاہ سے
 اپنی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے آج بھی اسی طرح یاد تھا کہ اس کے دل پر ان کے دعب و کشش
 اپنا پس کیسے اتاری تھی۔

وہ مسجد سے واپس آ رہے تھے۔ بھی وہ بے قرار ہی گاڑی سے نچھ اڑ گئی۔

اس کے ذہن پر بے حد سادہ اور عام سا لباس تھا۔ اس کا پرادر جو ایک چادر میں چھپا ہوا
 چادر بنے اس نے اپنے سر پر پیشانی تک اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے پیروں میں عام سے، سستے
 تھے۔ چہرہ ہر قسم کے ایک اس پر ہرادر کا تھا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی غریب سے گھرانے اُ
 لگتی تھی۔ مگر اس کے ہاؤز اس کا غیر معمولی حسن اس طرح نمایاں تھا جس طرح آسمان پر اکی
 اس معمولی طبع میں بھی وہ ہوش آڑا دینے کے سارے ہتھیاروں سے لیس تھی۔
 ان کے ساتھ اس وقت کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔
 "تیرے سرکار!..... یہ دیوانی آپ کے حضور سلام عرض کرتی ہے۔" بڑا ہی انوکھا اور
 بے ساختہ انداز تھا۔

حمایت بادشاہ نے ٹھٹھ کر اسے دیکھا۔ "کیوں آ جاتی ہے بار بار یہاں؟..... بی بی ایجو
 ہے وہ تجھے نہیں مل سکتا۔ وقت ضائع مت کر۔ جا..... اپنی دنیا میں لوٹ جا۔" ان کا انداز اب
 پیچھے ہٹا ہے اسے سمجھا کچھ کر خود بھی تنگ آ گئے ہوں۔
 مجھے جو چاہئے وہ تو آپ ہی مجھے حمایت کر سکتے ہیں سرکار!..... ایک عالم یہاں آتا ہے
 کی مرادیں پاتا ہے۔ میں بھی سوال لے کر آتی ہوں۔ مجھے کیوں دھڑکا چار پاپے؟" وہ عاجزا
 بولی انداز میں مذہبی تھی۔

"جو سوال لے کر آتی ہے اس کے بدلے میں تیرے دامن میں ہم وہ کچھ نہیں ڈال
 جا..... اپنی دنیا میں لوٹ جا..... ہمیں نہ ستا۔" انہوں نے قدرے بے زاری سے کہا۔
 "تیری دنیا تو اب یہیں ہے میرے سرکار! آپ کے قدموں میں..... مجھے اپنی دایہ بنا لیجے
 کوئے کھدوے میں پڑی ہار کروں گی۔ آپ سے کچھ نہ مانگوں گی۔ نہ آپ کو پریشان کران
 آپ کے گھر والوں کی خدمت کروں گی اور نہ سے آف تک نہ کیوں گی۔ بس..... مجھے
 قدموں میں جکد دے دیجئے۔" وہ گڑگڑائی۔ اس کی آنکھوں کی جھلکیں پائوں سے ٹپڑتے ہو گئیں۔
 "کیا نہیں ہو سکتی بی بی!..... کچھ کچھ کیوں نہیں دے؟ تو شوہر والی ہے۔ میری بی بی ہے
 بہت محبت کرتا ہوں۔ سچے ہیں۔ تیری دیوانگی کچھ نہیں دیکھ رہی ہے۔ سب مشکل میں پڑ جائیں
 انہوں نے اسے سمجھایا۔

"آپ خود مانتے ہیں کہ میں دیوانی ہوں۔ ہاں..... میں دیوانی ہوں..... اور جب کوئی

اُس نے بے دلی سے کارنامہ کر کے اور اسی موڑی۔ پر رستے وہ بس ایک ہی چرواہے میں لے ہوئے تھے۔ ایک ہی خیال تھیں میں روشن ہو رہا تھا۔



موسم آج سویرے ہی سے خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ آسمان کی نیلا ہٹ میں سفید سفید زوئی گالے جیسے بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے یہاں سے وہاں ہوا کے دھبے پر ستر کر رہے تھے۔ ہوا کے نرم ہموں کے گھلوں میں اُسے کھٹ پھلوں کے نازک بدن کو چھوٹے ہوئے فضا کو مار رہے۔ سورج کی تیزی آج بالکل بھی گئی تھی بلکہ بہت ہی نرم سی شہری روشنی نے عالم کو روشن بنا رکھا تھا۔ وہ جس وقت بھاگ کر پہلے آزی تھی اسی وقت گھر میں زندگی گردش کر رہی تھی۔ کام والی اپنے روزمرہ کے کام نمٹا رہی تھی۔ فیہر باورچی خانے میں چڑھے کے سامنے کھڑی تھیں۔ چائے اُٹھنے پانی پی چکی ڈالنے کے ساتھ ساتھ وہ مای کو بھی کھٹ دیا کرتی تھیں۔

”ارے رانی! اگلیوں کے پیچھے سے بھی بھاؤ نہ نکال کر۔ سارا کچرا گھر سے سمٹ کر ان کے کپ ڈال جاتی ہے۔ اور یہ دسترخوان جب دھو تو سو ڈال کر ابھی طرح بال لینا۔ پکنائی وصل کر صاف ہو جاتی ہے۔“

”اچھا جی۔“ رانی فرما کر اندر ہی سے کدھر رہی تھی۔

عارفین عادل خان اپنے کمرے میں اخبار پڑھ رہے ہوں گے۔ وہ اپنی دکان پر ساڑھے نو بج چکے جاتے تھے۔ سفید ٹیڑھیں آ رہی تھیں۔ بیٹہ وہ کالچا چاچا ہو گا۔ صبح سات بجے ہی وہ کمرے سے نکلتا تھا۔ پبلک بس سے اسے کالچا جانا ہوتا تھا۔ قلعہ جلدی کھانا ضروری ہوتا تھا۔

”آج تو کتنی ہی صحو ڈال رانی!“ فیہر نے کہا۔

”بھئی دھولوں کی جی۔ آج مجھے بڑا کام ہے۔ دوسرے کمرے کے کپڑے دھوئے ہیں۔ تیسری ماہی استری کرتی ہے۔“ رانی اپنی مصروفیات کو بتاتے بیٹھتی تھی۔

”ارے آہ! ابھی تو رانی تو بہت ہی مصروف ہے۔ صحو پاکستان کے ممبر کی کرسی دلوا دی اسے؟“ بیڑھیوں سے استری ہوئی کشف نے تسکرا کر کہا۔

”کیوں مذاق کر رہی ہیں جی۔ کہاں پاکستان کا بادشاہ۔۔۔۔۔ اور کہاں ہم غریب۔“ رانی نے کمرے کے عاجز سی صورت بٹائی۔

”بادشاہ؟“ کشف ٹھٹھکا کر ہنس دی۔ ”مستزہ رانی صاحبہ! یادداشت میں نکالیں کہ پاکستان میں بادشاہت نہیں ہے۔“ کشف نے اپنی سے لاشہ نشی کو دھوئے ہوئے کہا۔

”چھوڑیں جی۔ ہمیں کیا؟ بادشاہ ہو یا کبھی بھی۔ کون سا ہم غریب کو پوچھتے ہیں۔ گھلوں میں رہتے ہیں۔ سرخ مسلم کھاتے ہیں۔ یوں والا اپنی (شرل واٹر) پہنتے ہیں۔ ان کو کیا جی؟ ذرا ہمارا زندگی کا ایک دن گزرا کہ بتائیں جب ہم بھی ان کو کچھ اہمیت دیں گی؟“ رانی نے پھول بھانڈے سے فرش پر پھرتے ہوئے کمرے کے دروازے کے کپڑے سے سینٹے ہوئے کہا۔ کشف خاموش ہو گئی۔

”ناہت۔“ اس نے کچن کے دروازے میں۔ جہاں کمرے سے کہا۔ بارے ہاپا نے بھی ابھی ناشتہ نہیں کیا ہے۔ تم اندر آجی کے پاس پلوہ میں لاتی ہوں۔“ فیہر نے بے مصروف سے انداز میں کہا۔

”اے ان دن (لندن) کب جا رہی ہیں جی؟“ رانی نے کچرا ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے

”بھری دن بعد انشا اللہ۔۔۔۔۔ کشف نے دو پندرہ پر پہنچا تو ہوئے ٹھنڈا سا جواب دیا۔

”کوڑی نہیں لگے گا بچی کشف؟“ رانی نے ہاتھ بھانڈے ہوئے پوچھا۔

”بھیا؟“ کشف نے حیرانگی سے پوچھا۔

”اور جائیں گی۔ اکیلی ہوں گی۔ انجان لوگ۔ انجان جگہ۔ اکیلی لڑکی کی ذات۔“

”وال کیا۔“

”نے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ وہاں بھی ہمارے تہارے جیسے لوگ ہی رہتے ہیں۔ جن بھوت

”اوتے ہیں۔“ کشف نے جواب دیا۔

”آپ کو اگر بڑی آتی ہے جی؟“ میرا گھر والا بتا رہا تھا کہ وہاں تو اگر بڑی ہی بولی جاتی

اور سوال خاصا احمقانہ تھا۔

”بھئی کچھ جاؤں گی وہاں جا کر۔“ کشف نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

”اں جا کر آپ بھی انجی بیسویں ہو جائیں گی؟“ رانی نے آہستگی سے سوال کیا۔

”اے۔“ کشف نے کندھے پر کچا کر کہا اور رانی کو حیران پریشان چھوڑ کر ادر کی طرف بڑھ گئی۔

”نا۔۔۔۔۔ نا آپ نے بچی فیہر!۔۔۔۔۔ بچی کشف کیا کہہ گئی ہیں۔“ رانی نے ہوتوں کو کولا کی

ڈالنے ہوئے اٹھیاں ہونٹوں پر رکھتے ہوئے فیہر کو دیکھا۔

”وہ ان کدھی تھی۔“ غویں سہی کی باتوں میں آ گئی۔ ”فیہر نے گرما گرم خست پر اٹھے چنگر پر

”کہا۔“

”۔۔۔۔۔ میں بھی سوچوں کہ ہماری بچی کشف ایسی تو نہیں ہے۔ بڑی ٹیک لڑکی ہے۔“ رانی

”انٹنٹ دیا۔“

”اے! تمہیں نہ بھگوار۔ جلدی کام ختم کرنے کی۔ کمرے کے ہاپا نے ابھی غسل خانے جانا ہو گا

لو لے۔“ ٹیپلر غسل خانہ دھوئے۔ ”فیہر نے اسے بھڑکی کے ساتھ جاہت دی تو وہ پوری

”جاہت کام میں ہوتی جی۔ شاید یہ بھڑکی کا اثر تھا۔“

”اے! تمہیں کیا؟“ کشف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چنگ پر بیٹھے ہوئے عارفین عادل کو

”اے! تمہیں کیا؟“ کشف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چنگ پر بیٹھے ہوئے عارفین عادل کو

”اے! تمہیں کیا؟“ کشف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چنگ پر بیٹھے ہوئے عارفین عادل کو

ہاں نے اجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ ہمارے قافلے میں جو لوگ تھے ان میں سے بھی ان لوگوں کا نام لیا گیا تھا۔ پھر جب ہم یہاں آئے تب ہم نے یہ سوچا تھا کہ اتنی قربانیاں اس ملک میں اب یہ پاک وطن میں ملا ہے تو اس کو ایک مثالی زمین بنائیں گے۔ "عارفین عادل"۔ میری سائنسی۔ ان کی آنکھوں میں جتنی بھی کھٹک تھی کھٹک نے صاف طور سے محسوس کر لیا تھا۔ مانی دین میں ہشتے کی ٹرے سے لے کر اندر دھکیلی تھیں۔

خبر یہیں کی معلوم تھا کہ ہم کو لوگوں کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں۔ جس سے خود غرض، اور مطلبی لوگوں کے لئے..... جن کے لئے پھر "ہم" سے شروع ہو کر "ہم" پر ختم ہو جاتی ہیں۔ پہلے اپنا سوچنے میں پھر دوسروں کا..... اس ملک کو جو بھی نکران مٹا ہے وہ پہلے اس خزانے اور کھائی کر کے جو عوام کے خون پیسے سے بننا ہے۔ اپنا پیگ ٹینک بڑھا تا ہے۔ عام آدمی

پوستار جتا ہے، پوستار جتا ہے، پوستار جتا ہے۔ کسی خون آشام پگاڑی کی طرح۔ پھر بھی اس کا ملک کے حصے کر کے اسے پیچھے پر بھی اس کا ملک نہیں کاٹنا۔ جو تا ہے بس صرف اپنا سوچنا اور اب تو ہمارے لوگ بھی اتنے سے جس ہو گئے ہیں۔ پھر بے بازار میں قتل ہو جائیں، سچ روڈ پر

نہ ہو جائے، اور اوہ ہواؤں کی کشتی..... لوگ صرف ایک ٹکڑا غذا انا ذرا ل کر چلنے پھرتے ہیں کہی

ہاں نے پھرنے میں ہاتھ ڈالے۔ اخبارات ایسے انکس تا کہ واقعات سے بھرے رہتے ہیں۔

لوگوں کے لئے یہ سب بھی "معمول" بنتا جا رہا ہے۔ یہ سب دیکھ کر تو ہی جتا ہی ہے۔ سوچنا پتا

ان کا اس لوگوں کے لئے ہم نے اپنی جانوں پر حکم کر کے انہیں ایک الگ، آزاد، خود مختار ملک کا

آقا؟..... دراصل لوگوں کو آزادی کی قدر جیت کا احساس تک نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب

نہ نہیں جیتا ہے۔ انہیں تو طوطا چارل گیا ہے۔ طوطا بنانے کی محنت سے تو وہ گزر رہے

ان کو کیا معلوم کہ انہیں رات کی مٹی اور یہ گھر خیر لانے کے لئے لوگوں نے اپنی جانوں

نہ قربان کیا ہے۔ کتنے شہیدوں کا لبوس سر زمین کی مٹی میں ملا ہوا ہے۔ تھانے لوگ کس دن

میں اس آزادی کی قدر کو؟ کب اپنے ملک و قوم کے لئے وہ جیتی جندہ اپنے اندر محسوس کریں

"مادین عادل نے ساف سے پھر چور چنیدہ لے لیں کیا۔

پہلویں ہی، سب باتیں بھول جائیں۔ اتنے برس بیت گئے مگر آج بھی آپ..... "نفسہ نے

نہ سے پھر رکھ کر گزری ہے کیا۔

اتنے برس بیت گئے بھی تو..... فیصلہ کیا ان لوگوں کو کچھ دینے کے لئے ہم نے اپنا سب کچھ

"کیا بابا! وہ ان سے ڈرنا قافلے پر چڑھ گئی۔

"آج جبر تھا کہ دمی کی؟" انہوں نے ہائی نوکل گماز کے اوپر سدا سے بھانکا۔

"نہیں تو بابا! کدو ہمارے سو گئی تھی۔ نیند بہت آ رہی تھی۔ رات نہ تھی دیر تک لٹتی رہی

اچہ سے۔" اس نے جلدی سے بتایا۔

"جیسے ابھر پڑنے کے بعد سو نہیں جا پئے۔ آنکھ اس بات کا خاص خیال رکھنا۔ کچھ

پھوٹی باتیں ہوتی ہیں جن کا ناچ ہر مسلمان کو ضرور ہونا چاہئے۔ یہ باتیں بے حد اہمیت کی ما

ہیں۔" وہ بچہ کی سے سمجھ کر کہنے لگے۔

"سوری بابا! آنکھ خیال رکھوں گی۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"بہتر کر لیا تم نے؟" انہوں نے اخبار کا صفحہ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... آپ کے ساتھ ہی کر دوں گی۔" آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"دو روزہ سروس کی خبریں۔" اچھا وہاری کی جنگ، مینگی کا پچھلا اور دھما، سیاست دانوں کی؟

چپقلش، اقتدار کی لڑائی، ملک کے دن پر دن، غراب سے غراب ہوئے حالات اور روز پر روز

ٹوٹی ہوئی کمر..... کبھی کبھی سوچا ہوں کہ اس ملک کا کیا ہے؟ کتنی قربانیاں دے کر ا

اسلاف نے یہ سر زمین حاصل کی تھی کہ ایک الگ ملک ہو گا۔ اپنا وطن۔ اپنی سر زمین۔ جہاں

سے ہم اپنے دین کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے زندگی گزاریں گے۔ تمہارے دادا دادا

چچا جہاد کی سب سے بڑی پیروی اور سب سے کتنے رشتہ داروں، عزیزوں کا لبو بھا تھا۔ مجھے آج

دن یاد ہے۔ جیسے ابھی کل کی ہی بات ہو۔ "عارفین عادل" باقی کے درختے کھول کر یادوں کی

میں جھانک گئے۔ کشف خاموشی سے ان کو دیکھ اور سن رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے باپ

میں جو غم لگے ہوئے ہیں وہ آج تک نہیں بھرے۔ ابھی بھی ان سے بھرا رہتا ہے۔

"آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے، الگ وطن کا مطالبہ کرنے کے جرم میں کس طرح ہند

نے ہمارے بھائیوں کے سر کاٹ کر درختوں سے لٹکا دیئے تھے۔ ہمارے بڑوں کے سینوں

گھونپے تھے۔ ہماری بھینسیوں کو کس طرح پھیل کیا تھا۔ ہمارے بچوں تک کو ہندوؤں اور

نے زندہ جلا دیا تھا۔ جب ہندوؤں نے پتھر اور پتھروں سے ہمارے اٹھارے مسلمانوں کی آہاری

قہار وہ قیامت مفری تھی کبھی کہ پھر موت۔" عارفین عادل کی بھوری آنکھوں میں جیسے وہیم

دن پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔

"دو بندو لوگوں کو ہم مسلمانوں کو باپ، بھائی، چنا کہتے تھے انہوں نے ہی ہمارے

کے چچو سے اڑائے تھے۔ وہ ہندو اور کچھ جہاد کی بیٹیوں کے سروں پر دست شہادت دیکھ

انہوں نے ہی ان کے سروں سے پادریں کھینچی تھیں۔ تمہارے پیٹھے بچا کے تنوں کے ہمارے

کٹاؤں سے کٹاؤں کر دیئے تھے۔ تمہارے دادا بھی ان بڑوں بھیلوں سے لائے تھے شہید

تھے، میں، جہاد کی دو پچھیاں اور چھوٹے چچا اپنے چند بچے مسلمان بھائی، بہنوں کے

”چھوڑیں..... پلیس ناشر کریں۔“ نیر نے آنکھیں پٹی لگیں۔

”اب کب سے کی ہوگی؟“ عارفین عادل نے طنزی کی سانس لی۔

”بابا! مجھے آج ہی ایئر میس صاحب سے بھی ملنا ہے۔“ کشف نے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔

”ابھی! کس وقت جاؤ گی؟“ عارفین عادل کی بجائے نیر نے پوچھا۔

”بس اس بجے تک نکلوں گی۔“ اس نے بتایا۔

”ابھی! ڈراما کیا کرنا کچھ سامان بھی لیتی آئے۔“ میں سٹو دے دوں گی۔ اور اپنے کپڑے بھی نیکر سے لے آئے۔“ وہ اسے چاہات دینے لگیں۔

”مٹی اچھا۔“ اس نے چائے کا کپ لوں سے لگایا۔

”موسم ایک دم سے بدل گیا ہے۔ تمہاری بیٹنگ کہاں تک پہنچی ہے؟“ عارفین عادل نے پوچھا۔

”بس بابا! ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اپنے تمام ضروری ڈاکویشن بہت استیلا کے ساتھ فائل میں لگا لیں۔ اور کوشش کرنا کہ اس کا کوئی کیریج (دستی سامان) میں نہ لگے۔ بلکہ تمام ضروری اشیا کی لسٹ بنا لیا کہ میں اس وقت پر کوئی رو نہ جا سکے۔ ورنہ بعد میں مسئلہ ہوگا۔“ عارفین عادل اسے مشورہ دیتے ہوئے سمجھا رہے تھے۔

”جی بابا! کشف نے سہ لگایا۔

”جسٹیں وہاں کوئی بھی پر اکرم ہو تو فوراً نکل بیٹنا۔“ عارفین عادل پر کمر کر رہے تھے۔

”آپ فکرت کریں بابا! اللہ نے چاہا تو کچھ برا بھلا نہیں ہوگی۔“ وہ مسکرائی۔

”ام! آپ جلدی سے سٹو دے دیں مجھے۔ تو توج رہے ہیں۔ میں تیاری کروں۔“ کشف نے ٹینکین سے ہاتھ پوچھتے ہوئے کہا اور مگڑی ہو گئی۔

”بابا! آپ اور میں اسٹو سے ٹینکین گے۔ مجھے ڈراما اب تک ڈرامپ کر دینے کا۔“ وہ ہنس رہی اور

کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے فائل اور پرس میز پر رکھے۔ پھر کپڑے

تبدیل کر کے۔ بالوں کی چوٹی کو ڈریپسٹ کر اسٹارف کے اندر لپٹا اور بڑا سا کلف دو دو پٹیشنوں

سلیٹ سے پھیلا لیا۔ ہونٹوں پر نیچرل پنگ لپ اسٹک کاچ دے کر اس نے جوتے پہنے۔ فائل اٹھا

اور پرس کندھے پر ڈالا۔ وہ پوری طرح تیار ہو کر اپنے راتے آئی۔ نیر کی مرضیاں کٹ کٹ کرئی ہو

جیسا سے وہاں محرم پھر رہی تھیں۔ نیر نے حسب معمول ابھی ان کو ان کے ڈرے سے آزاد کر

تھا تا کہ وہ پھل قہقی اور ہیٹ پوچھا ساتھ ساتھ کر گئیں۔

عارفین عادل بھی اپنی سفید جالی کی ٹوپی پہنے تھے جن میں ہی نظر آگئے۔ سفید کرتے، سفید ملو

میں بیٹیں سفید سٹو فکڑوں پر رکھے سفید ٹوپی سے سر ڈھکے وہ نیر سے کچھ بات کر رہے تھے

کشف نے انہیں ایک گہری نظر سے دیکھا۔ کمرے سے نکلے، چلتی ہوئی کندھی رنگت، شباب دل

ڈول اور درمیانی قد وہ حسرت۔ ان کی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سی آواز سی ہر وقت ٹھکرے کی

دانتی تھی۔ ان کے چہرے سے عجیب سی کشش اور ممانعت تھی۔ سفید دھن سے آراستہ چہرہ اس عمر میں

بابا نظر تھا۔

ان کو ٹھکانا ہوا دیکر عارفین عادل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”ا!..... میں سوچ رہی ہوں کہ کمرے کے اس حصے میں آپ پر نظر نہیں پڑی تو جب آپ کا دور

ہو گیا حال ہوتا ہوگا؟“ کچی گئی تھیں بابا! کچی فکری روز ہسپتال جاتی تھی؟“ وہ شرارت بھرے

ہاں کو کچھ پتہ نہ ہوئی پوچھنے لگی۔

لیکن عادل مسکرا دئے۔ ”بڑے باپ سے موصول کرتی ہو؟“ انہوں نے معنوی بارانسی

تم سے۔ بالکل ٹھیک۔ جو کچھ ہوتا ہے وہی میری نوک زبان پر ہوتا ہے۔ جانتے ہیں نا آپ؟“

ول۔

اور ایسا ہی ہمیشہ ہوتا بھی جانتے ہیں! کچھ کو کبھی قید میں نہیں رکھنا چاہئے۔ کیونکہ کچھ کو کوئی قید و

ان کا یہ نہیں سکتا۔ یہ اپنے کوئی کوئی روز ان، کوئی روز ڈھونڈ کر خود ہی آزاد ہو جاتا ہے۔“

عادل نے دو قسمی بات کی۔

”کچھ نہیں ام! بابا! کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ ماں کو دیکر خوشیاں اٹھوں میں بھرتے ہوئے ہوئی۔

لوپ جاتی ہوں ان کو اور ان کی دو قسمی باتوں کو۔ تیس سال ہونے کو ہیں ان کی سنگت میں

ہے۔ ابھی طرح سے ہر بات کو جان جاتی ہوں۔“ نیر نے بھی اسی کے سے انداز میں

اگر انہیں عارفین عادل کو گھور رہی تھیں۔

”ہاں مٹی..... ہمیں تو چاہیاز دو۔“ عارفین عادل توپ کا رخ فرنی جانب ہوتا دیکر جلدی

لائی طرف پڑے۔ ان کے پیچھے کشف بھی ماں کو خدا حافظ بھیجی چلی گئی۔

لہاں میرے پیچھے لگے تھے کچی بھی انہیں؟..... ابھی تحقیق کرنے بیٹھ جائیں۔“ عارفین عادل

دلی کی۔

وہ بابا! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ میری ماں کو غلط سمجھ رہے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”ہاں! ماں کو گزشتہ آئینتے سالوں میں تھک چکیں اور رنگ بھگ دو ہفتوں سے بھگت رہا ہوں! بیٹے!

اب رنگ سے واقف ہوں۔ نظروں کے ذریعے سے ہی بات کو جانچ لیتا ہوں۔“ وہ واقعی نیر کو

اب طرح سے پچھتاہے تھے۔ وہ ہنس پڑی۔

”کشف! نیر کی آواز پر وہ چلتی۔

”ام!“

”بات تو جی جانا۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی لسٹ کو لہرایا تو وہ تیزی سے چلی اور ان کے

پاؤں لے لی اور رقم بھی۔“

”ہاں۔“ بابا! کیا کہہ رہے تھے کہ تم ہنس رہی تھیں؟ کیا کسی ”پرانے“ قصے کو یاد کر رہے تھے؟“

”دھم سے پوچھا۔

تھی مگر ایک بھوک بچی کے پیٹ کا ایجن مہرنے کے لئے وہ دس بیس روپے بھی نہیں خرچ کر سکتی تھی۔ کاش دارانظر ہوں سے اسے دیکھا تھا اس کے بعد وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی تھی۔ تیور نے اپنی کال لاک کی اور اس طرف بڑھ گیا بعد کشف کی گئی تھی۔ لیے لیے ڈگ بھرا، لہو میں اس تک با پٹنا۔

"بہت تیز چلتی ہیں آپ۔ میرا مطلب ہے آپ کی رفتار بہت تیز ہے۔" تیور اس پریشان چلتے ہوئے بولا جیسے وہ دونوں پرانے شہسار ہوں۔ کشف نے گردن موڑ کر غامی کے ساتھ اسے دیکھا۔

"آپ کو میری رفتار سے کیا ہے؟" اس نے نکت کر کہا۔ "اور یہ آپ میرے پیچھے کیجے کہ آ رہے ہیں؟"

"نہیں لے لیجئے، میں آپ کے پیچھے پیچھے بالکل نہیں چل رہا ہوں۔ میں تو آپ کے سارے چل رہا ہوں۔" وہ بڑی بڑھتی کے ساتھ مصمم شکل بنا کے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مگر آپ میرے ساتھ ساتھ کیل چل رہے ہیں؟" وہ سے بولی۔

"آپ کو اعتراض ہے ساتھ چلنے پر تو ٹھیک ہے، میں آپ سے آگے چلنا شروع کر دیتا ہوں بڑی شرافت کے ساتھ اس سے ایک قدم آگے ہو گیا۔

"آپ آخر جا چنے کیا ہیں؟" وہ گنگ آگے رک گئی۔

"آپ آخر مجھ سے اتنی علی کیوں رہتی ہیں؟" وہ بھی رک گیا تھا۔

"اور آپ آخر میرا پیچھا کیوں نہیں دیتے؟" وہ اسی کے اعزاز میں بولی تھی۔

"سوال کے جواب میں سوال نہیں کرتے۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"اور اسے اسنو پچھو سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" وہ جھٹکے بولی۔

"طبیعی، تمہیں پتہ کہ آرام سے ہاتھ کرتے ہیں۔ آپ کے گرم دماغ کو خنڈا کر کے۔"

"میں آپ کو خنڈی خنڈی ڈرنگ چلاتا ہوں۔" اس نے بڑے دستارہ انداز میں آفر کی۔

"مسٹر تیور! میں پہلے بھی آپ کو یہ بات ذہن نشین کر چکی ہوں کہ ہم دونوں کا آپس کا رشتہ ہے نہ عشق کہ آپ مجھ سے اس قسم کی آزادانہ گفتگو کریں۔ ہمارے مابین حوالہ صرف وہ ذات سے ہے۔ آپ اس کے کرن ہیں اور میں دوست۔ بس۔ آپ فضول وقت ضائع کر رہے ہیں۔" وہ اس بار سے حد بندی کی سے بولی۔

"رشتہ اور عشق تو بتانے سے جتنا ہے جس کشف عارفین عادل!۔۔۔۔۔ رہا سوال حوالے کا وہ بعض اوقات رشتوں کی شروعات میں جاتا ہے۔" وہ ذوقی انداز میں بولا۔

"کشف کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ تیور کی بات پر کمر بھرا، بول رہی نہ تھی۔ اس نے لب بھٹک کر تیور کی بات کی تھی۔ تیور اس کی حالت سے لطف انداز

لا۔ جانے کیوں اسے ستا کے اسے جلا کے تیور کی ان کا ایک تنوع سی ملتی تھی۔ اس وقت بھی کشف کی حالت پر ایک غلطی کی اس کے اعزاز میں تھی۔

"مسٹر جیوٹی خان! آج تک میں صرف اور صرف اس وجہ سے آپ کا لحاظ کر رہی تھی کہ درمیان میں لٹک کا حوالہ تھا۔ مگر آج میں اس حوالے کو نہیں پشت ڈال رہی ہوں۔ آج کے بعد مجھ سے بات لانے وقت آپ پر زبردست سوجھے گا۔ کیونکہ آج کے بعد میں نہ آپ کا لحاظ کروں گی اور نہ ہی لا۔ کا خیال۔ بالفاظ۔" وہ بعد دوسرے دھڑکے میں تنبیہ کر رہی تھی۔

"آپ کی پروا ڈی کیوں ہیں؟ کچھ کچھ کا ضرور ہے آپ کو جو آپ کو بھٹکے نہیں دیتا؟" تیور نے اپنی گانہ کہا۔ اس نے بے اختیار سی جملہ ادا کر دیا تھا جسے وہ ادا کر نہیں جانتا تھا۔

"غور رہے مجھے میرے گردن کی مشق ہے۔ غور رہے مجھے میری پاک دامن ہے۔ غور رہے لو ایک نالی ہے۔ غور مجھے اس بات کا ہے کہ میری ٹانگی میں دوسرے جگہ ہے جس سے تیور علی دہم گرم ہے۔ غور ہوتا تو حق نہیں میرا۔" دل چلانے کی ہانسی اس کی تھی اور وہ بڑے خنڈے سے دہم زبان بھرے انداز میں تیور علی خان پر چوٹ کر رہی تھی۔

تیور کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کے گزر گیا تھا۔ اس کے چہرے کی بدلتی رجعت نے کشف کے دل پر بھوار کا کام کیا تھا۔

"اور۔۔۔۔۔ تو آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ فرشتہ ہیں جسے کوئی انسان نہ متاثر کر سکتا ہے نہ جھکا سکتا ہے۔ نہ ہی زیر کر سکتا ہے؟" تیور خطرے انداز میں بولا۔

"نہیں۔۔۔۔۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ میں عام انسان ہوں۔ مگر مجھے خود پر اعتبار حاصل ہے۔ اس لیے میرا حکم نہیں ہے بلکہ وہ میرا نظام ہے۔ میں کسی "انسان" کے زیر اثر نہیں آ سکتی ہوں اور نہ کوئی عام انسان مجھے زیر کر سکتا ہے۔" وہ مڑتی پر تکی بولی۔

"اتنا غور۔۔۔۔۔ اتنا گھنڈ۔۔۔۔۔ تیور علی خان کی ساری زندگی میں اتنی افسانہ کسی نے نہیں کی اور یہ مایوسی۔" تیور سبگ آغا۔ اس کے اندر خنڈے سے بلند ہونے لگے تھے۔

"میں نہیں مانتا۔ تم صرف دکھاؤ کہ رسی ہو کشف عارفین عادل!۔۔۔۔۔ کہنا تو آسان ہوتا ہے مگر عمل کرنا اتنی مشکل ہوتا ہے جتنا کسی پہاڑ کو سر کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی زندگی میں آج میں ایک نئی فرمایا ہے نہ ہو گا جو میں زیر کر سکے۔ اسی لئے تم یہ سب باتیں کر رہی ہو۔ کمزور اور مادی ہونے میں صرف ایک سی لمحہ دور ہوتا ہے۔ تم بھی کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آؤ گی تو جلیں کہ رسم بن جاؤ گی۔" تیور کا دل بچنے میں بولا۔

"یہ جھٹک رہا خیال ہے تیور علی خان! میں کشف ہوں۔ کشف عارفین عادل۔ مجھے کوئی اور لمحہ زیر نہیں کر سکتا۔ تمہارا واسطہ تک ایک دیکھو دیکھو لو کیوں سے پہاڑ ہو گا مگر مجھ جیسی لڑکی سے نہیں۔ مجھے جیتنا آسان نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ تو تمہیں ابھی طرح ہو گیا ہو گا۔" کشف نے اس کے اسے جھٹلایا۔

”مطلب یہ کہ اتنا حسین بندہ تم پر لائن مارتا رہتا ہے اور تم ہو کر اسے گھاس ہی نہیں ڈالتیں۔ یہ سبیلانی ہے اس کی۔ کیا لگتا ہے۔ کیا انداز ہے۔ کیا بات ہے تجھ پر ملی خان کی۔ لڑکیاں اس کے پاؤں میں اور وہ ہے کہ تہوار سے پیچھے ہے۔ اور کشف عارضین عادل صاحب ہیں کہ اسے ملی کی بنا سے باز ہی نہیں آئیں۔“ رابعہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”تہوار کی جگہ اگر میں ہوتی تو کبھی بھی اس کے ساتھ ایسا برا سلوک نہ کرتی۔“ رابعہ نے انہوں کے ساتھ کہا۔

”لہذا یہ طرف رابعہ! اگر تم ابھی طرح سے جانتی ہو کہ وہ کس قسم کا لڑکا ہے اور اس کا جس کی سے تعلق ہے وہ کبھی ہے۔ غلط کرنا اس کی پالی ہے۔ شراب نوشی اس کی عادت ہے۔ میں نے اُلٹا تو اس میں ہی ابھی طرح یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ ایک جھوٹا امیر زادہ ہے اس میں ہر قسم برائی موجود ہے۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اس کے طبقے میں یہ سب چیزیں جو تہوار نزدیک برائی گردانی جاتی ہیں ان کے لئے پیش ہوتا ہے۔ اور یہ جو تم کہہ رہی ہو کہ وہ مجھ پر مارا ہے تو وہ مجھ پر لائن نہیں مارتا وہ مجھے ”لائن پر لانا“ چاہتا ہے۔ اپنی ”لائن“ پر۔ وہ یہ جان گیا کہ مجھے کتنی کشف عارضین عادل کو تحیر کرنا آسان نہیں ہے۔ اسی لئے وہ مجھ پر مختلف حربے آزمایا مجھے جھکا چاہتا ہے تاکہ اس کی اتنی تسکین ہو جائے کہ وہ ابھی مجھے ٹھیک سے سمجھا نہیں ہے۔ کشف عارضین عادل ہوں، کوئی عام لڑکی نہیں جو اس کے بہکاوے میں آ جاؤں۔ کشف ایسے وہ ہوں کہ وہ کتنا تک گوارا نہیں کرتی۔“

کشف کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں مہوئی، بے نیازی، غرور تھا۔ تجھ کے بارے میں اس تجربہ حقیقت سے قریب تھا بلکہ کبھی تھا۔

”اچھا بابا! اچھا..... میں ہادی تم جتنی۔ واقعی تمہیں زیر کرنا آسان نہیں۔ معلوم نہیں کون کونز نصیب ہو گا جسے تہوار کی نظر کرم نصیب ہوگی۔“ رابعہ نے سکرا کے کہا۔

”ہو گا کوئی تو۔ خیر، اس وقت تو اس پر گر پر نظر کرم کرتے ہیں ورنہ بے چارہ کہیں دل برداشتہ نہ ہو جائے۔“ کشف نے ہرگز کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کیا جو ابھی ابھی وہڑے کر گیا تھا۔

”تجھ پر ملی خان کی طرح۔“ رابعہ نے شوشی سے کہا اور ہر گز اٹھالی۔ جبکہ کشف نے اسے صراحتاً گھورنے پر اکسایا کیا تھا۔



”تم اپنی روداد تو سب کیا گھر سدھار رہی ہو؟“ کشف نے موضوع بدلا۔

”ابھی سال بھر تک تو کوئی چانس نہیں ہے۔ کیا ابھی مال کسانے میں ممکن ہے۔“ رابعہ نے فزائے فراخ سے بھر پور انصاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ..... پھر تو شاید یہ تہوار شادی میں شرکت بھی نہ کر سکیں۔“ کشف نے انہوں سے ہر لہجے میں کہا۔

”تم اپنی روداد تو سب کیا گھر سدھار رہی ہو؟“ کشف نے موضوع بدلا۔

”ابھی سال بھر تک تو کوئی چانس نہیں ہے۔ کیا ابھی مال کسانے میں ممکن ہے۔“ رابعہ نے فزائے فراخ سے بھر پور انصاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ..... پھر تو شاید یہ تہوار شادی میں شرکت بھی نہ کر سکیں۔“ کشف نے انہوں سے ہر لہجے میں کہا۔

”ہوں..... جانتی ہوں۔ مگر تم میرے لئے دعا ضرور کرنا۔“ رابعہ نے اس کو دیکھا۔

”میں تہوار شادی میں نہیں ہوں گی۔ کس تو بہت کروں گی۔ مگر میری دعائیں ہمیشہ تہوار

"میں..... میں کیا جھوٹ بولتی ہوں؟" ماہور کی آواز لڑکھائی۔
 "تم اپنی کسی کھلی سے نکلنے چاہتی ہو..... لکھنے لکھنے اور جاتی ہو..... مجھے سر ہے۔" ولید بتایا۔

ماہور چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ مگر اس کے چہرے پر کسی قسم کے خوف یا اے تھے۔ وہ سہا پت چہرہ لئے کھڑی تھی۔

"سب یہ جملے ہیں تو پھر بیٹا سے کیوں ہو؟" ماہور نے بڑے اطمینان سے کہا۔
 ولید کا فشار خون تیز ہونے لگا تھا۔ "تم اسنے عرصے سے میری آنکھوں میں دھنک رہے..... مجھے انکو بھاری ہو، ماہور! تم نے مجھ سے جھوٹ بولا اپنے شوہر سے۔ تم مجھ کی کون ہے وہ جس سے ملنے بلا ناٹھ جاتی ہو..... نہ موسوں کی شدت کی پرواہ کرتی ہو..... کی..... تم مجھے آج صرف کچ بتاؤ گی..... صرف کچ؟" ولید نے اس کے شانوں سے تقریباً سمجھوڑ دیا۔

"نصف مسرور لید!..... تم مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کر سکتے۔" ماہور نے اس باتوں کو نیکفٹ جھکا۔ ولید چند لمحوں کے لئے دم بخود ساروہ گیا تھا۔

"ماہور!..... کیا تم مجھے کچ بتاؤ گی یا اس خودی اس کا بھی پتہ لگوں؟" ولید کو اس طرح سرد تھا۔ ماہور نے چند لمحوں تک اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کچھ بڑی خاصی تازہ تھیں۔ ولید کو اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر نظر آیا تھا۔

"کچ سننے..... اور کچ کو سمجھنے کا حوصلہ ہر کوئی نہیں رکھتا..... مگر..... کچ کہا بھی نا ہے..... کچ سننا بھی لازم۔" ماہور نے کب بٹے۔

"قفص تم جھاڑو۔ صرف دو ہی پوچھ بات کرو۔" ولید نے تکی سے کہا۔ اور پھر باہر کہا تھا وہ سن کر ولید بھر بیٹھا تھا۔

ولید بہت ناہور کی صورت دیکھ رہا تھا۔ ماہور دو دھڑ سے دھڑ سے کھڑی تھی۔

"دو سال پہلے جب ہم کراچی مجھے تھے تب میں اتنی ایک دوست کے ساتھ اس کے کڑ مگی تھی۔ میری دوست اور میں شاہنگ کرنے کے لئے مارکٹ مگی تھیں۔ راستے میں میرا کے کزن کا گھر ملا تھا۔ اسے وہاں اپنے کزن سے کچھ ضروری کام تھا اس لئے وہ اس راک مگی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ پہلے کے اندر چلی گئی تھی۔ میری پہلی کا کزن ایک راکس ڈیزائنر ہے۔ اس کا نام شیخ ہے۔" ماہور نے کچ جاری تھی اور اس کی آنکھوں سے تیسے پردے جیتے جا رہے تھے۔ وہ یکدم ہی نہیں اوجھڑ گئی تھی۔ ولید بچپنے ہی کی صورت چاہا رہا تھا۔



"میر بھئی تے مجھے اپنی مگنی کا لباس ڈیزائن کروانا تھا۔ انہوں نے ڈیزائن کا سیکل دیا نا

ہاں ہیں۔ اگر مجھے پسند آ گیا تو وہ اسی کو فائل کر دیں گے۔" انیتا، میرے گھر کے سامنے کار اے نا تار تھی۔ "میں دس منٹ لگیں گے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ تم بھی اپنا ڈیزائن گھالے ہی ڈیزائن کر دیتی۔ ان کا نمیت سے دھاتی ہے اور کام بھی غصب کا کرتے ڈیزائن کے کپڑوں کی فائل دیکھی ہی ہے۔" انیتا کا لڑکھائی کرتے ہوئے کھڑکی تھی۔

اپنے کسی تہارے کزن جو شوہر وغیرہ کروا تے ہیں میں اکثر ٹی وی پر اور بھی دیکھی۔ انیو ۱۰۰۰ مشورہ اچھا ہے۔ چلو، دیکھتے ہیں۔ اپنا ڈیزائن سو توب نہیں البتہ کسی اور موقع کو لائی ڈیزائن جواز کی اس سے۔" ماہور سرکرائی۔ اس وقت اس نے جھو اور سیلو لیس الٹی فرٹ مین دیکھی تھی جو بے حد خفگ والی تھی۔ اس کے دراز گیسو پٹ پر کھلے ہوئے الٹی ایک اپ اور ڈائمنڈ کی ہلکی پھلکی جیڑی کے ساتھ وہ بھی کبھی طرح سے شادی شدہ نظر لگتی۔ "میرے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے وہ دونوں باتوں میں مگن رہیں۔

ماہور کھڑکی نہیں ہیں۔ میں صاحب کا بلواتا ہوں۔ آپ لوگ ڈرائنگ روم کے بجائے اندر

آئیے۔" لازم کھڑا تھا۔

"کیا کوئی کیا ہوا ہے؟" انیتا نے پوچھا۔

صاحب کے کچھ مہمان ہیں" لازم نے بتایا۔

"انیتا نے پوچھا۔

"وہ عنایت بادشاہ تشریف لائے ہیں۔ صاحب انہی کے ساتھ بیٹھے ہیں۔" لازم

اچھا، زبردست..... بھی پہلے بتاتا تھا۔ اتنی اچھی خبر اور اسنے بہترین مہمان کے

بارے میں بتا رہے ہو۔ ہم وہیں بیٹھیں گے۔" انیتا یکدم جوش میں آ گئی۔

"واہ! کون ہیں جن کے نام سے ہی تہارے چہرے کی رنگت بدل گئی؟" ماہور نے حیرت

اگر وہاں تم کو بھی..... چلو آؤ۔" انیتا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

ماہور مادی طور پر ان میں بیٹھیں اس کا ہاتھ قامت شخص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ماہور نے دیکھا

میں کے اطراف پیسے روشنیوں کی پھوٹ رہی ہیں۔ ایک عجیب سی روحانیت ان کے چہرے

میں تھی۔ ان کے سیاہ لہانے بالوں والے سر پر سنہری پارکیشیوں والی ٹوپی رکھی تھی۔ وہ

سات پر بہت ہونے لگی تھے۔ ماہور کو ان کی مسکراہٹ ایسی محسوس ہوتی جیسے سیاہ

دور مہمان سے پکارا جاتی ہوگی۔ عیسوی دھماکہ کر چپ جاتا ہے۔

اس ٹیم بادشاہ مسکرا کر انیتا سے سر پر اپنے اس اسکارف کو اوڑھ لیا تھا جو اب اس کے

انال سے دھرا ہوا تھا۔ اس کی آواز پر میرا احترامات بادشاہ دونوں چونک گئے تھے۔

"السلام..... کبھی ہو بیٹھی؟" عنایت بادشاہ نے شیشی کی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”جی ٹھیک ہوں..... آپ کیسے ہیں؟ کراچی کب تشریف لائے؟“ انیتا ان کے سامنے پر جھکتی۔ مامو نور علی اس کے برابر بیٹھی تھی۔

”ابھی سیدنا حیات پورٹ سے ہی آ رہا ہوں۔ صبح کے ساتھ۔“ انہوں نے جواب دیا۔
 ”اوہ..... میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ان سے ملنے۔ یہ میری بہت بھاری سی تکلیف تھی۔“
 انیتا نے پاس بیٹھی ہوئی مامو نور کا تعارف کرایا۔ عیادت بادشاہ نے اس پر صرف ایک لگا، ادا نور نے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان کے انداز میں جی بھر کے بے نیازی تھی۔ اُسے کچھ جراتی، تک کہجی انہیں جیسا ہوا تھا کہ کسی نے اس کو ایک نظر دیکھا ہو اور پھر دیکھنے کے بعد فوراً غصہ اور وہ ایک نظر بھی پس سرسری ہی ہو۔

”میرے رب کو حسن کتابا ہوتا ہے..... اس نے دنیا بٹائی ہے..... دنیا کا کوڑ کوڑ فرمایا..... اس نے کائنات بٹائی..... کائنات کے ڈرے ڈرے میں حسن بکھیر دیا..... اشرف المخلوقات کو خلق کیا..... کتابا عمل..... کتابا حسین بنایا ہے آدمی کو..... انسان کو..... ان نے بخش کی۔“ مامو نور کو تعریف کا یہ ٹوکھا انداز بھا گیا۔

”میری تعریف کے لیے الفاظ تو آج تک کسی نے منتخب نہیں کئے۔ آپ کے“
 سراپے بغیر نہیں رہا پاسکتا۔“ مامو نور مغرور لہجے اور بے ساختہ پن سے بول اٹھی۔ عیادت بٹ کے چلی ایک ایک اس پر ڈالی۔

”ہم تصویروں کی تعریف نہیں کر رہے ہیں۔ ہم تو مصوروں کی قید کوئی کر رہے ہیں۔“ تعریف کیا کرنا؟..... مٹی سے بنایا ہوا اک پنجا..... اس ٹپلے کو بنانے والے ہاتھوں کی تو اصل تعریف ہے۔ شاہد کامل حق داد تو ”وہ“ ہے۔“ بہت ہی سادہ انداز تھا۔ مگر مامو نور کو الی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے دھڑاکنے سے وہ بین کے احساس سے جھٹکا اٹھے۔

”یہ تو سراپہ میری تو بین کر رہے ہیں۔“ وہ بے حد ناراضگی سے بولی تھی۔
 انیتا اور صوبہ بالکل خاموش تھے۔ وہ صرف سامعین بنے ہوئے تھے اس سے۔

”اس میں تو بین کیسی لی؟..... یہ تو تیرے لئے عزت کا مقام ہے۔“ اس نے جرح تخلیق کیا ہے۔ ہر پٹے کی تخلیق ”خاص“ نہیں ہوتی۔“ ان کے علم کے لیے اور مغرور انداز میں کچھ بات تھی۔ مامو نور کا غصہ جیسے عرف میں جتنے گا۔ بات کی نرم، غنڈھی پھواری طرح ان کے مونی ہی پر عیس رہے تھے۔ کچھ تو تھا ان کے انداز میں کہ مامو نور مجب و غریب احسا مکر نے کھی گئی۔

یکدم ہی اس کے احساسات مجب سے ہونے لگے تھے۔ وہ ایک دم سے گھبرا اٹھی تھی۔
 ”انیتا!..... اب چلو بیٹو۔“ وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔

”چلتے ہیں۔ جرح بیٹو۔“ انیتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے اٹھایا۔
 ”سراکار! آپ مامو نور کی باتوں کا برا مت مانے گا۔ یہ بہت اچھی ہے۔“ انیتا نے بہت

پہرہ ادب اپنے بندے کی باتوں کا برا نہیں مانتا تو ہماری اوقات ہی کیا ہے۔ بندہ تو داناں دانی کر ہی جاتا ہے۔“ اس کا انداز بدلتا تھا۔

”مجھے نیک، اللہ والے بندوں کی نظر کرم ہو تو ہم گنہگاروں کو نجات کے راستے کا دروازہ مل سگئے۔“ مٹی کی سرخیاں ہتھکھس میں صبر کیا تھا۔

”ہات کی باتوں پر چلانے والی ذات تو صرف میرے مالک کی ہے۔ میرا دادا چاہے تو دروازہ راز گنہگار کے در پر آجائے۔ بات تو ساری ”اس“ کی نظر کرم کی ہے۔ مٹی کے پتلوں کی کیا..... بشر کی روایت؟..... وہ چاہے تو مٹی کا آدم بنا کر اسے تیسرا کا درجہ دے دے۔ وہ

از سے تو اس گنہگار دنیا کو کئی حکرم حضرت محمد ﷺ کا قصہ عطا کر کے بخشا دے..... اس کا قصہ راز بھان مردود بنا دے۔“ وہ آنکھوں سے بولے۔ مامو نور ان کے لب و لہجے کے اسرار میں کھوئی تھی۔

”اب تو دیوں بھی باتیں کرتے ہیں۔“ وہ بے ساختہ کھاسی۔
 ”گنہگار بندے کو اور گنہگار نہ کر لی! ہم تو دیوں کے قدموں کی دھول ہیں۔ غوہیں ان کے سر

”اصل تو لی بھاری ہے۔“ وہ بے اختیار جھری جھری لیتے ہوئے بول پڑے۔ ”صبر! ہمیں کمرے دیا ہے۔ ہماری عیادت کا وقت ہو رہا ہے۔“ وہ بالکل اچانک ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”تعریف لائے سرکار میں آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دیتا ہوں۔“ صبر نے بہت احترام مانہ کہا اور ان کے پیچھے چل ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

”ایسا! کون ہیں یہ؟“ مامو نور کھٹے کھٹے سے انداز میں انیتا سے پوچھنے لگی۔
 ”صبر بھائی کے سرور مشہ ہیں۔ اسلام آباد کے ایک فوجی گاؤں سے تعلق ہے۔ وہ ہیں سے آئے

”ایسا سن رہی ہیں۔ ان کے والد بھی مجھ سے بڑے بزرگ ہیں۔ نہایت ہی محترم شخصیت عیادت بادشاہ تو پھر بھی بھائی شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کے والد صاحب سے تو آگے لگا کر بات کی بھی کوئی بات نہیں رکھتا۔“ لوگ گاؤں کے زمیندار بھی ہیں۔ رواجی حق کے زمیندار

”ہیں۔ بزرگ گھراٹے ہے۔ عام عیادت فقیروں کی طرح نڈر نڈار بالکل نہیں لیتے۔ لوگ۔ بلکہ اگر الی خوشی سے ان کو کچھ ذکر کریں تو یہ لوگ وہ چیزیں اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ جی جوں اور

”منہوں میں بابت دیتے ہیں۔“ انیتا بتا رہی تھی۔
 ”مگر ان کے انداز کو دیکھ کر تو لگا ہے کہ دنیا بھاری بھی بھاتے ہیں یہ۔“ مامو نور نے سوال کیا۔

”ہوں۔ دنیا کو ساتھ لے کر دین کے قصصوں کو پورا کرنا چاہی صراط پہلے کے حراف ہوتا ہے مامو نور والے ہی ہیں جو اس چلی صراط پہلے سے گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ دنیا بھاری بھی بھاتے

”الود، دیوی، والدین اور رشتہ دار بھی کے حقوق اور اپنے فرائض کی بخوبی ادائیگی کے ساتھ حقوق اپنا کر ماما اللہ کے دوستوں کا ہی حوصلہ و شعار ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ..... ہم عام لوگ کب اپنی

و اس وقت اپنے سر میں دین میں گھرے ہوئے تھے۔

اور ایک کونے میں چائے پیونگئی تھی اور ان پر نظریں جمائے ہوئے ان کی مصروفیات دیکھتی تھی وہ دیر گزر گئی..... کتنے کھینچے بیٹ گئے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی تعداد میں کمی آتی گئی۔ ماہِ رانی سے گوند پکڑے بیٹھی رہی۔ آخر جب آخری آدمی بھی چلا گیا تھا تب حیات بادشاہ کے دربار سے قریب آگے آ کر تھا۔

لی لی! آپ جھپٹے چار پانچ گھنٹوں سے یونہی بیٹھی ہوئی ہیں۔ آپ کو سرکار سے کیا کام ہے؟

اے اس سے تھا شاید میں چرے کو دیکھنے کو بے زنی سے پوچھا۔

مجھے..... کام تو کچھ نہیں ہے۔ وہ سوچے ہوئے بولی۔

تو میرا دلی سے یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟ وہ حیران ہوا۔

مجھے..... ان کو سلام کرنا ہے۔ وہ بنا سوچے کیسے بول پڑی۔

مہل سلام کرنے کے لئے یہ عورت گھنٹوں سے یہاں انتظار میں بیٹھی ہے۔ وہ واقعی حیران ہوا۔

اچانک آپ..... پھر سرکار کے عبادت کرنے کا وقت ہو جائے گا۔ اس نے کہا۔ ماہور ابھی..... وہ

ادب سے اٹھ کر بولی ہوئی حیات بادشاہ کے قریب آئی۔

مہل سلام عرض کرتی ہے میرے سرکار! اس نے قریب پہنچ کر بولے کہا تھا۔ نہایت ہی ادب تھا۔ بے حد اپنا بیٹ بھرا لہجہ تھا۔ وہ ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بگڑے ہوئے ہیں۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کے بھی آواز نہ تھی۔ نہ حیرت کے، نہ

نہ فیض یا گوارا کی۔ وہ اس سہاگت چہرہ لئے بیٹھے تھے۔

وہ سلام کیا۔ خدا تعالیٰ کی عمر عطا فرمائے۔ حیران سوچتا رہا شگاف رہے۔ دعا بھی یاد رکھ

لی لی! بارش..... جو اس کے تپ سے کھو گئی تھی۔ لی لی! اس کی سائیں میں غصہ کی آواز آتی تھی۔

اب نے مجھے پچھا؟ اس نے ان کے قدموں میں بیٹھے ہوئے پوچھا۔ جواب میں وہ صرف

بگڑا ہوا تھا۔

تو مجھے لوگ اپنی بیجان نہیں بنائے لی لی!..... میرا بڑی انہیں پہچان بنا کر بھیجتا ہے۔ بڑا

مہل جواب تھا۔ اس کے سر کے اوپر سے گزرا گیا۔ تو جا..... حیرا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ وہ

لڑے ہوئے۔ ماہور نے بیانی نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت

تھی۔ آہستہ آہستہ باہر کی طرف جا رہے تھے اور وہ انہیں انہیں نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کسی

لڑکھانے کا ڈھیر آجائے اور پھر ایک دم سے اس کے ہاتھوں سے نکل جائے اور وہ ہے

ادب کی عالم میں اسے دیکھ کر جائے۔

لی لی! مجھے..... اور ماہور غائب ہو گئی نظروں سے ان کے قدموں کے ہادیہ نشانات دیکھتی رہ

ہو گئی یہ کیفیت روز بروز بدتر ہو جاتی تھی۔ ماہور ایک اللہ والے کے مشق میں گرفتار ہو

زعمیوں میں اتنا بٹلس رکھ سکتے ہیں؟..... اگر ہم لوگ دنیا کو چھوڑ دیں تو دین کو بھی کچھ بھر

سکتے۔ اور دین کو بھی پشت ڈال کر دنیا کے پیچھے بھاگنا ہی تو ہم نے اپنا نصب العین بنالیا ہے۔ م

جس کا اس سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تو مذہب میں ایک غلط فہمی بن کر رہ گیا ہے۔ اپنا کبری

لیجے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ماہور خاموش بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بڑا

نور کی جلیلی کے مقابلے میں کچھ فیشن اصل ہے۔ وہ لوگ رمضان شریف میں روزے رکھتے تھے۔ لہا

بت باقاعدگی سے نہ کسی گھر پر بھی پڑتے تھے۔ اپنا کے والدین نے تو عمر وہی کر رکھا تھا۔ یہی

میر کا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی تھا مگر اب کچھ کا کہ وہ بھی کوئی بہت ہی مذہبی تھا۔ اس نے دنیا کو م

ترجیح ضرور دی تھی۔ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا تو اسلام کا اس میں صرف اسی حد تک پکڑنے کا

تھا جس حد تک اس کے دوسرے جلیلی میراں۔ حیات بادشاہ کا سر یہ وہ بہت پہلے سے تھا اور

میراں خاص میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ وہ ان کی بہت مست تھا۔ بہت ماننا تھا اور ان کے مشور

کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس پر ان کی دعاؤں کا گہرا اثر تھا۔ ماہور کو اپنا اور میر کی باتوں

کبھی کبھی حیات بادشاہ کی باتوں کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ایک حیرے کی بات بتاؤں کم کو؟ اپنی بے پروی رازداری سے قدرے آگے بڑھتے ہوئے کہا

”کیا.....“

”منابت بادشاہ پر کتنی ہی لڑائیاں مرتی ہیں۔ ایک سے ایک امیر، حسین، جہاں لڑائی ان کی م

ایک نگاہ کی تمنائی ہے۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ اپنی بیوی سے بے حد

کرتے ہیں۔ مگر آج انہوں نے تم سے جو باتیں کہی ہیں تو ان کو معمولی باتیں نہ سمجھنا۔ وہ ہر ایک

یونہی کچھ کہتی ہے۔ کچھ تو نظر آتا ہو گا انہیں۔“ اپنی بے سوچ انداز میں لی لی اور ماہور س

گئی۔ کیا.....

”اپنا حق تمہیں اسلام آباد میں ان کا لائبریرس دینا۔ میں ملوں گی وہاں جا کے ان سے۔“ ماہور

بے چینی سے کہا۔

”ضرور۔“ اپنا بولی۔

اس نے میں میرا وہاں آگیا اور موضوع گفتگو بدل گیا تھا۔

حیات بادشاہ سے یہ ماہور کی پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات کے بعد سے اس میں کچھ تبد

روا ہو گئی تھی۔ اس سے دوسری ملاقات اس نے ان کے آستانے پر جا کے کی تھی۔ اپنی بڑا

اور میر پر تیار کی کے ساتھ وہ ان کے آستانے پر ملاقات کے لئے گئی تھی۔ اس وقت آستانہ لوگوں

بھرا ہوا تھا۔ وہاں ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ فیشن اصل، امیر، جہاں، حسین عورتوں کا بھی

آکر تھا۔ درمیانے اور نیچے طبقے کے بھی لوگ موجود تھے۔ مگر ماہور ان میں سے مستزاد اور نمایاں

رہی تھی۔ اپنی بڑی فیشن شوں دیکھ کر وہاں موجود ہر آدمی رونے سے اپنا دل تمام لیا تھا۔ وہ اپنے نفس

الطاف تھی۔ مگر اس وقت وہ کسی کی طرف دیکھنے سے اپنی حیات بادشاہ کے پیچھے سے کمرے میں بڑ

لیکن نہیں رہی۔“

ماہور کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ولید کے چہرے کا رنگ پیکا ہو گیا تھا۔ وہ صرف دلی سے اپنی محبوب بیوی کے احوال سن کر رہا تھا۔ لیکن اب وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں خود کو نہیں کر رہا تھا۔

”نہ جانے کون سا بے چین لڑ
ہماری دھڑکنوں سے آگلا ہے“

ماہور کے لب خود بخود کی انداز میں جھٹک کر رہے تھے۔ ”میں جانتی ہوں کہ میں یہ ٹھیک نہیں کر
ا۔ مگر تم نے جان لو کہ یہ سب میں جان بوجھ کے نہیں کر رہی۔“ وہ ولید کے قدموں میں آ کے
لی۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

”میں تمہارے عرصے کی داد دیتی ہوں کہ تم نے یہ سب بہت دل سے ممبر سے ٹانہ۔ میں جانتی
کہ میں بھی شادی شدہ مرد کے لئے بیوی کے سہ سے یہ سب سخت آسان نہیں۔ مگر ولید!۔۔۔ خدا
میں نے بس ہوں۔ بے حد بے بس۔ تم سے مجھے محبت ہے۔ مگر اس محبت میں اک
غنا۔۔۔ اک کی کمی۔۔۔ سرکار سے مجھے عشق ہے۔ اس عشق کو دنیا والے کس نظر سے
من گھے، مجھے پرواہ نہیں۔ مگر عشق میں ”دوجو“ کی اہمیت نہیں ہوتی۔ عشق ”ذات“ سے بالاتر ہوتا
ہے۔ میرا عشق بھی ایسا ہے۔ مجھے ”ان“ کو حاصل کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ عشق کا نام ”حاصل“
نہیں ہے۔ میں تو بس ان کے تصور سے اپنے من کو سیراب کرتی ہوں۔ میں اپنی ان دو
سے ان کو دودھ دیتی ہوں مگر مجھے لگا ہے کہ میری یہ دو آنکھیں انہیں نہیں دیکھ رہیں۔
اور ان کو کہہ رہی ہے۔ ان کو محسوس کر رہی ہے۔ ولید! میں۔۔۔ میں اس طرح بے بس
ا۔ ایسی جبر سے قید پنچھی کیا ہو گا۔“ اس نے ولید کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد تنہید و تہ۔ وہ ماہ
زہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اس کی نگاہیں کسی فرسرتی نقطے پر مرکوز تھیں۔
”نہ کیا کروں ولید؟ میں کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے پوچھ رہی تھی۔

ماہ نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت ہی عجیب سی کیفیت تھی۔ اس نے
ماہور کو دیکھا، پھر نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو اس کے نازک ہاتھوں کے بوجھ
پاؤں اور کمر اور ہوا۔ ماہور کو اس کی خاموشی عجیب نہیں لگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایک خنڈے
ماہور کی سوچ رکھنے والا ”بزنس من“ ہے۔ وہ اپنی جلدی کوئی بھی رد عمل ظاہر نہیں کرے گا۔
ماہ نہایت خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا تھا اور ماہور بھی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ مگر اس کے
ہاتھوں کی خوف پریشانی نہ تھی بلکہ ایک حیرت انگیز اطمینان تھا جسے اس کے دل سے کوئی بہت بڑا
نہ کیا ہو۔ ایسا بوجھ کہ ان اس سے بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔
اپنی تیز یاد دہندگیوں میں۔ جو وہ نہ ہو گا، بہت جلد سامنے آ جائے گا۔ اس نے سوچا اور آنکھیں
لیں۔

جلی تھی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ یہ عشق کی معراج ہی تو تھی کہ وہ آہستہ آہستہ ان کے رنگ میں خود کا
باری تھی۔ اس کے مزاج اس کی عادات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔۔۔۔۔ اس کا
بدل گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کا معیار زندگی بدل گیا تھا۔ وہ یہ سب جان بوجھ کر نہیں کر رہی تھی۔ اس کا
اس سے یہ سب کردار ہوا تھا۔ وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہیں ایک ہی چہرہ دیکھ
ایک ہی چہرہ سے بارہ ہو گیا تھا۔ ایک ہی چہرے کی وہ دیوانی ہو گئی تھی۔ محبت جب
بڑھ جاتی ہے تو عشق دیوانگی کی وجہ سے جاتی ہے۔ مگر وہ محبت کے پر اس سے گزری ہی نہیں
اس نے تو سیدہ سے سیدہ آٹکھوں کے راستے عشق کی راہی میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی دیوانگی
کا جنون رجات پر محیط نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس نے تو ایک ہی جست میں تمام مراحل طے کر
لیے۔۔۔۔۔ مگر تو سب کچھ خود بخود ہی ہونے لگا تھا۔ وہ ایک طرف عشق میں جتنا ہو گی
عشق۔ جو بذات خود اک دیکھتا اور آتش گیر سمندر ہے۔ ایک ایسا سمندر جس کا کوئی ساحل
جس کا کوئی کنارہ نہیں، جس میں کوئی جزیرہ نہیں۔ عشق اک ایسا سمندر ہے جس میں قدم
لہروں کے ہمراہ ساحل سے دوری دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کسی ایسا سمندر نہیں جتنی ہو گی
اور کئی لہروں کی گشت میں اس کے آگے یہ سفر کرتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اسے کسی ساحل کی
تھی۔ نہ ہی کسی کنارے کی سمندر۔ نہ اسے جبر ہے کہ چاہو ہی تھی اور نہ ہی تھمتے
چاہتے تھا۔ بخیر عشق کے سمندر میں وہ بس اپنے ”دل“ کے ہمارے سفر کرتی چلی جا رہی تھی۔

”دل۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ یہ دل ہی تو ہے کہ جس کے آگے میں بے بس ولا چارو ہو،
ہوں۔ اس دل کو بہت سمجھا ہے میں نے۔ ایک سال۔۔۔۔۔ سال کے آٹھوں ہا
آٹھوں ہوں۔ دل کا ایک ایک لمحہ۔ ایک ایک لمبے میں نے اس دل کو صرف سمجھا ہے میں بتا
ماہور کے لیے میں شکایت تھی مگر مثال نہیں۔ ”ہر پر چل اپنے اس پاگل دل کو سمجھا رہی ہوں،
جتنا اسے سمجھا ہی ہوں، یہ اتنا ہی دشمن ہوا چاہتا ہے۔ میں ”ان“ کے در پر جا کے ہیکہ مش
طرح چڑی رہتی ہوں۔ صرف اس امید پر کہ۔۔۔۔۔

تیرے دل جانے کی امید توار سے مجھے
روز لے جا کے تری راہ پر بٹھا آتی ہے
میں دیوانی کی طرح ”ان“ کے در پر بیٹھی رہتی ہوں ولید!۔۔۔۔۔ میرا دل تیرے بس
ہے۔۔۔۔۔ وہ مجھے نظر آگاہ نہیں دیکھتے۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتے۔ اس روز
ان سے بات کرنے کی کوشش کی۔ ان کو اپنی کیفیت بتانے کی کوشش کی مگر۔۔۔۔۔ وہ در
سے میری کیفیت سے واقف تھے۔ وہ مجھے سمجھاتے رہے، جھڑک بھی دیا۔۔۔۔۔
دیا۔ شاید وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے برے رویے اور ذہانت سے چلت چاؤں گی۔
انکو کر رہی ہے تو میں دل برداشتہ ہو کر ان کے در پر آ چھڑ دوں گی۔۔۔۔۔ مگر یہ کہاں
ہے؟۔۔۔۔۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب میں بہت دور نکل آئی ہوں۔ اتنی دور۔ اتنی



وہ بے حد معصوم تھی۔ صبح کی گھنٹی ختم مبارک کر دیا گیا تھا۔ پورا دن مہمانوں کی آمد و آمد رہی تھی۔ وہ تنگ کے بنو رہی تھی۔ یہ تو بھلا وہ راہب کا جو اس کا ہاتھ ٹانے میں جی سے آگئی مہارک بھی بڑے پائے پر کر دیا گیا تھا۔ عزیز و احباب اور شہزادہ مکملے والے بھی آج ہوتے۔ کھانے کا انتظام بھی کر دیا گیا تھا۔ اس نے فلک کو بھی دھوکا دیا تھا۔ اس کے علاوہ چند قریبی بھی دھومیں۔ اس وقت سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ صرف اس کی سہیلیاں موجود تھیں جنہار نے خودی روک لیا تھا یہ کہہ کر ہنسنے لگا تھا تو اسے چلے جانا ہے اس نے وہ لوگ رک جائیں اس وقت سب سہیلیاں اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ راہب سب کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ اس نے آگئی تھی۔ وہ سب چائے کی چمکیوں کے حوالے لیتے ہوئے کپ شپ بھی لڑا رہی تھیں۔ سیکڑ، رانیہ اور ندا تو باری باری چائے کھانے کے کمرے آئیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی آتا گیا۔ آٹا فلک اور راہب ہی وہ تھیں۔ شب چائے کی کراہیوں کا روز والا دھوا تھا۔ سنا یا جب ہمارے تیرور کشف کی زبانی چل رہی تھی۔ فلک ساری بات بہت توجہ سے سنتی رہی۔

”اچھا..... تم نے مجھ سے تو کر نہیں کیا کشف؟“ فلک نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”سوچ رہی تھی۔ ارادہ بھی کر لیا تھا کہ تیرا کزن کی شکایت کروں تم سے۔ مگر موقع بھی نہ ملا اور وقت بھی۔ آج راہب نے بات چیمپریز تو مجھے یاد آگیا۔“ کشف نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔
 ”تم پلیز! اس کی حرکتوں اور باتوں کو دل پر مت لینا۔ وہ دراصل بے حد آزاد و بے باک ہیں۔ پروان چڑھا ہے۔ اس کی دہ..... آئی میں رکھ دے گی تو اس وقت ڈھب ہو گئی تھی جب وہ یہی چھو رہا تھا۔ اسے اس کی ملازمہ نے پالا ہے۔ اگلے کے پاس اس کے لئے وقت نہیں تھا۔ انہی دوسری شادی کر لی اور اس کے بعد تو بالکل ہی کنارہ کشا ہوا۔ اب تم خود سوچو کہ ایک ایسا بچہ جس پر اپنی ماں کا سایہ نہ ہو، باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ چیخیں کرے اور صرف ایک ملازمہ کے ہاتھ میں چلے کر جانا ہو، اس پر یہ تماشا دھوت دوت ہو، روک ٹوک والا کوئی نہ ہو، اچھا ہر کوئی نہ کہا اس نے تو پھر مجھ سے ہی نہ۔ ویسے وہ دل کا رانیہ ہے۔ اس کا ظاہری روپ یک طرفہ صرف اور گرد و پیش کے ماحول کا اثر ہے۔ اندر سے وہ بہت معصوم ہے۔ بہت اچھا ہے۔ تم اس کو انگو۔ پلیز! میں اسے سمجھاؤں گی کہ وہ آئندہ تمہارے ساتھ اشتباہ سے بچ جائے۔“ فلک نے کزن کی حیثیت سے تیرور کی حمایت بھی کی اور ایک کبلی ہونے کے لئے کشف سے معذرت بھی کر لی۔
 ”ہوں..... فلک ہے۔ مگر تم پھر بھی اسے سمجھا دینا۔ اب وہ بچہ نہیں ہے۔ ایک پشاور اور گھسا انسان ہے اور علم انسان کو سمجھ لگاؤ اور ایسے بے کفر نہ کر سکتا ہے۔ اسے بھی اس علم سے ہونا چاہیے جو اس نے حاصل کیا ہے۔“ کشف نے حیرت سے لہجہ بھی لیا۔
 ”رک گئی تھی کہ اس نے سوچا تھا کہ بات فلک کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ پس اتنا ہی کافی ہے آئندہ اگر تیرور سے ”خدا نخواستہ“ وہ بارہ ملاقات ہوئی تو وہ خود ہی اس سے شٹ لے گی۔

ابھی یہ بات وہ فلاحت کس ڈٹ کو ہے؟“ فلک نے موضوع بدلے ہوئے پوچھا۔
 ”کائنات کو۔ تم آؤ گی۔“ کشف نے پوچھا۔

”کو نہیں۔ میں جنہیں ایئر پورٹ سے آؤں گی۔ یہ بند رہا۔“ فلک نے وعدہ کر لیا۔
 ”اب وہ کچھ تکلف ہو گی۔ دے لیجی میری فلاحت رات کی ہی ہے۔“ کشف نے کہا۔
 ”میری تکلیف نہیں ہو گی۔ تم اتنے لمبے عرصے کے لئے جاری ہو اور میں تم کو کسی آف کرنے ایئر پورٹ بھی نہ دے سکتی تو لغت سے ایسی دقتی ہے۔“ فلک نے غلوں بھرے لہجے میں کہا۔
 ”مخلص!“ کشف نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”اس لئے؟“ فلک نے پوچھا۔
 ”اگر میت کے لئے..... حق سب کی محنتیں مجھے وہاں اکیلے ہیں کا احساس نہیں دلاؤں گی۔“ اس نے بولی۔

”اے..... محبت کبھی تمہیں رہنے دیتی ہے۔“ راہب نے اس کی تائید کی۔

”اے! اے! آئی فلک کا ڈرائیور نہیں لینے آیا ہے۔“ اس کی مدد کرنے والے اطلاع دی۔
 ”اے! اے! اب میں بھی چلوں۔“ کشف نے اسے کہا۔

”اب اسے چھوڑنے کیجئے چکے تھیں۔“
 ”تم آج رات روک ہی جاؤ۔“ کشف نے اسے کہا۔

”نہ..... دو تو مجھے اجازت دے دیں گی رہنے کی۔ ابھی تحقیق ہوں گی کسی کو۔“ راہب نے اسے کہا۔
 ”اچھا! دیکھو..... سامان ایک مہر چیک ضرور کر لینا۔ کچھ نہ چائے۔“ راہب نے اسے کہا۔

”اے!..... کل ایک مہر چیک کر لوں گی۔“ کشف نے سر ہلایا۔
 ”فل کیا کر رہی ہو؟“

”میں گھر نہیں..... بس ایک دو کام بازار کے ہیں۔ اور ہاں، کل تو اُم نے مجھے حمایت سے رکارڈ کرنے کے لئے بلایا ہے۔“

”کی؟“ میں بھی چلوں گی۔ بہت تعریف سنی ہے ان کی۔ کل کس وقت چلو گی؟“ راہب نے اسے کہا۔

”صبح ہی چلیں گے۔ بہت دور ہے رہائش گاہ ان کی۔ تم رک جاؤ تو آسانی سے چلی جانا ساتھ ہی۔“

”کہاں جاکتی ہوئی آؤ گی؟“ کشف نے کہا۔
 ”اے!..... اسی سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔ اگر مان گئیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میرا انتظار کرو۔“ راہب نے کہا۔

”فلک ہے..... تم فون کرو۔“ کشف نے سر ہلایا۔
 ”اب وہ بڑی بھینٹوں سے رہنے کی اجازت لیتی تھی۔ اس میں بڑا ہاتھ کشف کا تھا جس نے ان سے

اکلی صبح نیر۔ کشف اور رابندر سے یہاں ملاقات ہوا۔ شاہ کی خدمت میں موجود تھیں۔ کشف نے فل کے بہت حائر ہوئی تھی۔ وہ تو اپنے ذہن میں ان کا کوئی اور ہی خاکہ بنائے بیٹھی تھی مگر اسے بذات خود ملاقات کرنے کے بعد وہ جان پائی کہ اس کی ماں کیوں ان کی اتنی شیدائی تھی اسے وہ دوسرے ہیروں و قہیروں سے بہت مختلف لگے تھے۔ ان کے چہرے کے وقار، حرارت، اور اور ان کی آنکھوں کے غیر معمولی پن نے ایک ہی نظر میں اسے احساس دلایا کہ وہ کوئی عام انسان نہیں ہیں۔

”تیسری قسمت میں میرے رب نے کامیابیاں ہی کامیابیاں لکھی ہیں۔ بس..... کچھ بچوں کھدے، کھدے، کھدے آئیں گے۔ ان سے چٹنا اور احتیاط کرنا تیرا کام ہے۔ جاتی جس کا چہرہ چھایا“ وہ اس کو آفتاب کی تمازت کیا کہے گی۔ ”وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہے خبردار کر رہے تھے۔“ کچھ اور بھی بتائیے سرکار اس کی قسمت کے بارے میں۔“ ”نیر نے تبہم سا پوچھا۔“ قسمت کا حال بتانے والے ہم کوں ہوں یہ بی بی! قسمت تو ”اُس“ کی پائی ہے۔ فہم علم تو ”اسی“ ملیم کو ہے۔ ہم تو بس اٹھارے سمجھتے ہیں۔ اس بچی کے لئے قدرت نے بہت بڑا نو سنبال کر رکھا ہے۔ وقت آئے گا تو خود بھی نظر آ جائے گا۔ بس“ ”نظر“ کو حاضر کرنا بی بی!“ اور پھر وہ لوگ ان سے اجازت لے کر اٹھ گئی تھیں۔

”یہ کیسے تھے کی طرف اشارہ کر رہے تھے؟“ رابندر نے سرگوشی میں کشف سے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ کشف نے کندھے سے اشارہ کیا۔

”شاید تمہارے لائف پارٹنر کی طرف اشارہ ہو۔“ رابندر نے قیاس ظاہر کیا۔

”جیہیں ان باتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے؟“ کشف نے اسے گھورا۔

”سو بھتا ہے نا..... وہ دیکھو تمہارے تصور کی خان یہاں بھی تمہاری نو سمجھتے ہو سمجھتے چلے آ۔“

”جی۔“ رابندر نے مسکراتے کیٹ سے انداز داخل ہوتے ہوئے تیسور کی طرف اشارہ کیا تو کشف سا

بے اختیار اس طرف دیکھا۔

”اور نو..... اس نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو پھر شروع ہو جائے گا۔ اور آج تو ام ہی ساتھ ہیں مجھے ان کی خاطر برداشت کرنا پڑے گا۔“ کشف نے انکار سے کہا۔ ”ذرا روک۔“ اسے لگ جاتا ہے دوسری طرف۔ پھر ہم باہر نکلیں گے۔“ کشف کمرے کے اندر ہی کھڑی ہوئی۔ تیسور دوسری طرف سے گھر کے اندر دلی سے کی طرف بھاڑا تھا۔

”وہی ہے بڑا غضب کا خاتم۔“ رابندر اسے داد دے بغیر نہ بڑھی۔ تیسور اس وقت سفید رنگ کے کلف لگے لگتے اور شلوار میں جلیں تھا۔ جڑوں میں سیاہ پٹاوری جلیں چھپا رہی تھی۔ بائیں ہاتھ بوجھ انسان سے سجے ہوئے تھے۔ اس نے شاید وہ تازہ شیوہ بنائی تھی، جس کی بنیاد اس کی سفید اس سرخ رنگت میں مکمل کر حریز دیک رہی تھی۔

”جو ہمیں لے، راج چاہتا ہے اس پر۔“ رابندر ہوا اس کی تصدیق کوئی نہیں تھی۔

”کس بک بند کر اور چلو۔“ کشف نے اس کی باتوں پر کان دھرے بغیر کہا۔ اسے غلٹ اس کی تھی کیونکہ تیسور کے چنگیز میں نیر ان سے آگے نکل چکی تھیں اور انہیں نہ دیکھ کر وہ اب آ جاتیں۔ اس نیز حیرت قدم اٹھاتی ہوئی کیٹ سے باہر نکل گئیں۔ نیر واقعی ان سے پہلے باہر آ چکی تھیں اور ہی نہ پا کر واپس پلٹے تھیں۔

”کدھر رہ رہیں گے تم دونوں؟“ میں تو اگر پیچھے مڑ کر نہ دیکھتی تو تمہانے کتنی دور نکل جاتی۔“

”وہ..... ام! میں سیٹل کے اسٹیپ بند کر رہی تھی۔ اسی میں دیر ہو گئی۔“ کشف نے فوراً بیان کر دیا۔

”اجھا، اجھا۔“ اب ذرا جلدی جلدی قدم اٹھاؤ۔ یہاں سے سواری ملنا تو بہت ہی مشکل ہو رہی ہے۔“ انہوں نے لاہور سے اس کی بات سنی تو انہیں ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ دونوں سیٹیاں ہانکے پیچھے پیچھے چلی گئیں۔



”ہائے معذرت! تم نے اتنی دیر جنسی میں کیوں بولایا یا؟“ تیسور اس سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھ

اٹھا۔

”بتاتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے تمہاری تعریف تو کر دوں۔“ تم اس ڈرل میں بھی بے حد

بزم لگ رہے ہو۔ بالکل کوئی قافیہ سردار۔ بس نکو اور مار کو منجھوں کی کمی ہے۔“ معیو نے مسکراتے

ہوئے دل کوئی کہ اس کی تعریف کی۔

”صحتیں..... وہ منور اور انداز میں مسکرایا۔

”چلو، تم کو کسی سے ملوانا ہے۔“ معیو نے ان کوئی کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

”کس سے؟“ تیسور نے سرری سا پوچھا۔

”بہت ہی خاص شخصیت ہیں۔“

”اجھا۔“ کیا کوئی ڈاکٹر وغیرہ ہیں؟“ تیسور نے بے دلی سے پوچھا۔ ”مگر میں تو چند روز بعد

ہار ہا ہوں۔“ جنہیں معلوم تو ہے۔“ تیسور نے کندھے سے اشارہ کیا تو کہا۔

”ارے بڑا ڈاکٹر کثیرہ وغیرہ کوئی نہیں ہے۔“ معیو نے جلدی سے کہا۔

”تو پھر کون ہے؟“ اب تیسور کچھ الجھ رہا تھا۔

”اندرا آؤ۔“ معیو نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے مار دیا۔ معیو نے کمرے میں جانے سے پہلے اپنی لیدر کی چٹیلیں اتار دی تھیں۔ اس کی تھلی میں اندر کو بھی اپنے جوتے اتارنے پر نہ تھے۔ وہ اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ کمرہ اس نے ان سے لئی بھی دیکھا تھا مگر کمرے کے وسط میں رکھے صوفے پر بیٹھی اس شخصیت کو وہ آج تک نہیں

دیکھ رہا تھا..... لہجہ اڑاؤ جو، بے حد رعب دار اور بے پناہ ہر کشش چہرہ و ہر انگیزہ نصیبت..... چاہتے ہوئے بھی ان کے بے پناہ رعب سے سناڑ ہوا۔

”سرکار! یہ میرا بہت ہی اچھا دوست ہے، تیمور علی خان۔ میں اس کو آپ سے بطور خاص مل چاہتا تھا۔“ معیو بہت احترام سے مخاطب ہوا۔ ساتھ ہی اس نے تیمور کے کان میں سرگوشی کی۔ ”میرا سلام کرنا۔“ بطور بے مت کرنا۔“

انہوں نے جھکا ہوا چہرہ اٹھا کر لکھ بھر کر اسے دیکھا۔ تیمور ان کی بے حد ہر کشش آنکھوں کی تازہ لٹاتے ہوئے بے اختیار ہی اپنی آنکھیں جھکا بیٹھا۔

”اسلام علیکم!“ اس نے شاید زندگی میں چند ایک بار ہی کسی کو سلام کیا ہو گا اور حمایت بادشاہ انہی لوگوں میں سے ایک تھے۔

”ہنسیک اسلام..... اللہ کی رحمت تھو پر میرے۔“ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اسے دعا دی۔ ”تیمور! یہ حمایت بادشاہ ہیں۔“ معیو نے مختصر الفاظ میں ان کا پورا تعارف کرادیا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ دل سے صوفے پر براجمان ہو گئے۔

”اتنا بڑا چہرہ تو بادشاہ کا دوست بننے کا حق دار ہے۔“ تجھے تو ہمارے ساتھ ہونا چاہئے تھا! یہاں..... اس دھوکے میں کیوں بی رہا ہے؟“ وہ ہمہ سانس کرانے۔ تیمور کو ان کا انداز مخاطب و محکم عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اس سے وہ یہاں، اس کمرے سے اٹھ کر بھاگ چاہتا تھا۔ اس بلی وہ ان کے سامنے سے چلے جانا چاہتا تھا۔

”تیمور! یہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملک سے باہر جا رہا ہے سرکار! اس کی کامیابی کے لئے دعا کیجئے۔“ معیو نے کہا۔

”میرا بوردگراس کو“ اصل“ کامیابی سے نوازے گا..... دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔“ انہوں نے کہا۔ ”جیسا..... اس سے تیرا بھی یہاں نہیں لگے گا۔“ چاہے..... وہ تیمور کی طرف دیکھ کر بولے تو، فوراً کھڑا ہو گیا۔ معیو کے اشارہ کرنے پر اس نے ان سے مصافحہ کیا۔ ان کے نرم اور حرارت سے نہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے تیمور کیوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی دیکھا ہوا کونسل اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو۔ اس نے گھبرا کے جلدی سے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

معیو کے گھر سے نکلنے وقت اس کے دل کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اس کیفیت کو سمجھنا اس کے لیے سے باہر تھا۔ اس وقت اس کا ایکسپریٹیشنس مانڈ بھی اس کی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ عائب و دافنی کی کیفیت میں اپنے گھر کی طرف رواں تھا۔



اسے گھر سے نکلے پر اسے میں سمجھتے ہو چکے تھے۔ وہ بھی بتاتے اپنی اتنی در تک گھر سے نہیں ہوا تھا۔

اس کا دل ڈر رہا تھا۔ طرح طرح کے داپے ستارے تھے۔ خدا خواست کوئی حادثہ نہ ہو گیا کچھ ہونے لگا ہو..... ناراض تو تھا ہی، نہیں کچھ کر ہی نہ بیٹھا ہو..... اس نے اس کے ہر دست اور ہر اس جگہ پر فون کر کے اس کا معلوم کر لیا تھا جہاں جہاں اس کی رسائی تھی اور جس ایک کی اسے خبر تھی۔ اپنا سبیل تو وہ گھر ہی چھوڑ گیا تھا۔ نامعلوم بھول گیا تھا یا جان بوجھ کر چھوڑا تھا۔

وہ بیٹانی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ کچھ بھی کسی، وہ اس کا شوہر تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کا ہر ایک تھا اور اس بات کی اسے ابھی طرح خبر بھی تھی۔ ہر جگہ ہار کر وہ نا امید سی ہو کے بیٹھی کہ وہ چلا آئے۔ تھا نامعلوم کوٹ بازو پر لٹکا ہے۔ گریبان کے منہ کھلے ہوئے، ہڈی کی ٹاٹ آدمی لال، آدمی بند بھرے گھر سے بے پناہ۔

ہمارو اس کی اس حالت پر افسردہ سی ہو گئی تھی۔ آج پہلی مرتبہ ولید کو اس نے اس طرح بے ہوشی میں دیکھا تھا۔ وہ خود کو بہت نا ہوسا کے رکھنا پسند کرتا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“ بنا اطلاع دے؟“ بنا فون کے؟..... سب جگہ میں نے علم کر لیا تھا مگر تم کہیں نہیں تھے۔“ ہمارو اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”جس میں پریشانی کیوں ہوئی؟“ عجیب سوال تھا۔ ہمارو نمک کی۔

”کیا مطلب؟..... یہ کیا سوال ہے؟“ ہمارو نے الجھ کر چما۔

”بہت سیدھا سا سوال ہے۔“ جس میں میرے لئے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو مجھ سے وہی نہیں کرتیں۔ تو میرے دکھاؤ کیوں؟“ وہ سچ ہو گیا۔ ہمارو لہجہ بھر چپ سی ہوئی۔ ہر بہت

”کی بے ہوشی۔“

”محبت تو ہے۔ میں نے کب کہا کہ محبت تم سے نہیں ہے۔“ ہمارو۔

”اگر محبت مجھ سے ہے تو وہ سب کچھ اس کی جگہ میں اس وقت کی تھی؟“ وہ زنج ہو کے ہوا۔

”وہ بھی جھوٹ نہیں تھا ولید!..... وہ بھی ایک سچ تھا..... ایک حقیقت۔“ وہ آنکھیں سے بولی۔

”وہ شٹ اپ..... جھٹ شٹ اپ!.....“ ولید نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے

”جہاں سے کھائے کا وقت ہے تھوڑا..... اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہے ہو۔ رات کھاؤ گے؟“

”اوپر..... رات تو ابھی دور ہے اور آپ کو ابھی سے ڈنر کی فکر پڑ گئی۔“ وہ مخصوص سے بولا۔

”فاسٹے سننے میں دیر کب لگتی ہے؟..... ابھی وقت ہے۔ ابھی وقت تھا رہا منتظر ہے۔ جہاں ہے۔ اس کی قدر جان لو۔ اگر ریت کی طرح آفتوں سے بچ سکتا تو صرف بچتا۔ جانیں گے۔“ وہ سناٹا انداز میں سمجھانے لگیں۔

”پلیز لی ماں! ابھی تلفظ نہیں۔ یہ بھاری بھکم تلفظ کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ اور پیٹ بھرا ہوا ہے۔“ اس نے گرج کر گھڑا دارتوں سے کاتنے ہوئے جواب میں کہا۔ لی ماں ایک سانس لے کر اسے دیکھنے لگیں۔

”تمہارے پیٹا کھڑے تھے کہ فارغ ہو کر ان سے مل لینا۔“ انہوں نے خشکی سے اسے بتا دیا۔ ”اوکے..... جب فری ہوں گا جب ملوں گا۔ اس وقت تو جلدی میں ہوں۔“ وہ جا سے بولا۔

”ہر وقت جلدی میں ہی رہتے ہو..... کبھی اس بڑھی کے لئے وقت ہوتا ہے تیرے! وہ خشکی سے بولیں۔

”کئی سوہن لی ماں! آپ وقت کی بات کرتی ہیں، یہ چھوٹی بندہ ہمارے کا پورا آپ کا۔ محبت سے بولا۔

”جیل چل..... سب زبانی بیخ خرچ ہے۔“ وہ اسے گھورنے لگیں۔

”یہ اتنی مشکل آرزو نہ بولا کریں۔“ بھٹم کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔“ وہ روپائی صورت پر بولا۔

”ابھی آرزو تم بھی بولا کرو..... بہت مٹھی زبان ہے۔“ وہ بولیں۔

”مٹھی مٹھی آپ ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

کھانا ختم کر کے وہ اپنے ہاتھ نیچین کے ساتھ صاف کرنے کے بعد ہاتھوں کے کنارے کرنے لگا۔

”جا کھاں دیے ہو؟..... جہاں سے آنے جانے کا حساب کتاب رکھنے والا کوئی نہیں، لے آؤ اور مٹھی کی طرح مکلی گھنٹاؤں میں اڑتے پھرتے ہو۔ ماں ہوتی تو کام ڈال کے دیکھتی۔“

”ماں ہوتی.....“ وہ ڈرک سا گیا۔ ”آپ کون ہیں؟..... میرے لئے تو ماں بھی آ رہی ہے، لیکن بھی اور بھاری بھی۔“ وہ بچیدہ ہو گیا۔

”میرا بچھا! میں صدقہ جتاؤں۔“ لی ماں نے کرسی سے اٹھ کر بے اختیار اس کی پیمانی۔

ماں اب میں چلوں..... باقی جذباتی سن بعد کے لئے اٹھا رکھیں۔“ وہ مذاق کرنے لگا۔

”کس صحرے سے گا۔“ وہ مسکرا دیں۔ ”تیلانی نہیں، کہاں جا رہے ہو؟“ انہوں نے پھر سوال کیا۔

”خوش کے ساتھ جا رہا ہوں ڈرامہ آج کاں گا۔“ وہ کرسی بھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ جان بوجھ کر لی ماں کو ریس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ورنہ وہ تو سمجھ جانتے دیتیں۔ اس کے

ن کے بعد وہ ڈری کی گھیس اس کے کارڈرائیج کرنے سے۔

”لی ماں!“ اس نے ان کی پیشانی کو بوسہ کیا۔

”ماں! اللہ۔“ ان کے دل سے اس کے لئے دعا نکلی۔



رات ایک بہت بڑے میدان میں محفل رنگ گڑیاں عی گاڑیں کھڑی تھیں۔ ہر رنگ، ہر

کارہی۔ ان کاروں میں نوران لڑکے موجود تھے۔ جن لوگوں نے ریس میں حصہ لیتا تھا وہ

ہر رنگ کی سیٹوں پر موجود تھے۔ اور جو تماشا لڑکے تھے وہ ایک طرف ایک بڑے ٹیوم کی شکل

تھے۔ ریس ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ حصہ لینے والی کاروں کی تعداد پندرہ سولہ تھی۔

لی ماں ایک کار میں بیٹھ لی تھی۔ وہ بہت اطمینان کے ساتھ ڈرائیجنگ سیٹ سنبھالے

تھے۔ اس کا انداز حد درجہ اور وہ اطمینان کے ساتھ خود غم جہاں تھا۔ تھوڑے کے لئے

ہاتھ تھا۔ موت اور زندگی کے اس خطرناک کھیل کو وہ جب سے کھیلتا تھا اور تھا جب وہ پندرہ

اتھا۔ اسے ایسے رنگی اور خطرناک کھیل پسند تھے۔ اسے ایسے کاموں کو کرنے میں مزہ آتا تھا

”ایڈیٹر“ کا کوئی بھی پہلو نہ تھا۔ وہ نہ صرف ایسے کاموں اور کھیلوں میں ہاتھ ڈالتا تھا بلکہ

میں رکھتا تھا۔ اس کا بے حد جیٹس ہانڈ ہوتا ہے اسے ایسا کرنے پر آسکتا تھا۔ اس ریس

وہ جب حصہ لیتا تھا، جیت اس کا مقدر بن جاتی تھی۔

لی شروع ہونے والا تھا۔ ایک لمبا ترنگ سا لڑکا جس نے ہاتھ میں سرخ جمنڈی پکڑی ہوئی

نہ بڑھا اور اس نے جمنڈی لہرا کر ریس کے شروع ہونے کا اعلان کر دیا۔ جمنڈی کے لہراتے

ہانے کے لئے تیار کھڑی گاڑیاں زن زن کر کے بھاگنا شروع ہو گئیں۔ تھوڑی جھان سے حد

کے ساتھ گھر بھاگ رہا تھا۔ اس کی کار نے چند منٹوں کے اندر ہی دوسری کاروں کو بہت پیچھے

اتھا۔ ان لوگوں کو گول پکڑنے کے اس مقام پر آتا تھا جہاں سے انہوں نے ریس کا آغاز کیا

وہ بہت جوش کے ساتھ کار ڈرائیج کر رہا تھا کہ کیا ایک اسے لگا کہ جیسے اس کی کار کے سامنے کوئی

..... اس نے پوری طاقت کے ساتھ پکڑیں لگیں۔ کار اپنی بھرپور اسپید میں تھی۔ ایک دم

پہن گئے پھر پھر طرح پر چڑھ گئے اور ان کی آواز کروڑوں میں گونج اٹھی۔ ساتھ ہی کار پر

لیا جاتے کار پوری کی پوری گول گول گھومتی گئی۔ تھوڑے کے لئے اس نے کار کو سنبھالنا بہت مشکل

..... اسے محسوس ہوا کہ کار اب اتنی کب آئی۔ اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے کار کو

لیا۔ جب بھی کار فٹ پاتھ کے ساتھ ٹکرا عی گوری اور اس کے ساتھ ہی ایک بھٹکے سے رک گئی۔

بڑا دم ہو گا یاد!..... بعض دفعہ وہم کو بھی اسی حقیقت بھٹتا ہے۔ "خرم نے لاہ واقعہ کو نہیں قہارم!..... مجھے وہم کب نہیں ہونے۔ یہ بیمار لوگوں کی بیماری ہے اور میں بالکل ہوں۔" وہ بڑے بولا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ خرم اس کی بات کا یقین کیوں نہیں کر رہا؟

..... تم یہ بیوقوفیوں سے ملنا چھوڑ دو۔ خواہ وہ کیوں بولے مجھے اس حضرت سے ملنے؟ کیا نام بتا رہے تھے، بادشاہ! شہنشاہ!..... تم حاکم تھے! اپنی دے۔ "خرم نے اسے مشورہ دینے کے ساتھ کہا۔

ایک بادشاہ!..... تیرے نورائے درست نام بتایا۔

..... نہیں!..... آخر تم کو پڑی کئی کئی گستاخانے کیل دیئے صبر کے بلانے پر اس کے گھر؟

..... مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھے کسی مقصد کے لئے اپنے گھر لے رہا ہے۔ تیرو نے جھنجھلا کر کہا۔

..... کیا رکھتے ہو؟

..... قلمکٹ لٹ آل!..... تم کو اپنی سناؤ۔ "خرم نے موضوع سے ہر ہو کر کہا۔

..... کیا پوچھ رہا ہے؟ آج چلنا ہے؟" اس نے اس کے کھینچنے سے سرگوشی میں معنی خیز انداز میں کہا۔

..... آج نہیں یاد! آج کا تو دن ہی خراب ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

..... یہاں خراب دن کو اچھا بنانے کی تو کوشش کر رہا ہوں میری جان!..... آج ایک نئے تم کو لائوڈ سپیکر لگا دیا جاتا ہوں۔ "خرم نے آنکھ داتے ہوئے سرکار کے کہا۔

..... کون ہے؟" ویسے تمہارے "نئے آئٹم" "انداز" سے بالکل ہی پرانے ہوتے اور نئے دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ بھی کڑواں۔

..... میں یہ والا آئٹم زیادہ "مہمان" نہیں ہے۔ "خرم نے اسی کے انداز میں جواب دیا تو اس نے دیکھ کر دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

..... کیا ہے..... دیکھو!..... وہ کپڑے سے کانی کے آخری کونٹہ مطلق میں اڑھٹنے ہوئے بولا۔



..... اتنے دن گھر میں داخل ہوا تھا، اس وقت شام کے دھندلے رات کے گھبراہٹ میں

..... چلے گئے۔ اسلام آباد کی نسبت یہاں سردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے جسم پر کوئی گرم

..... نہ تھا۔ وہ انہی کپڑوں میں جیس تھا جن کو پہنے وہ گھر سے روانہ ہوا تھا۔

..... اب!..... چھوٹی نیگما صاحبہ نے تحریف لگائی؟ "لازم اس کے بے ترتیب طبع سے تشویش و

..... میں ہو گیا تھا۔ پھر نہ اس کے پاس کچھ سامان تھا اور نہ ہی ماہر اس کے ہرماں تھی۔ ولید کی

..... نہ ہونے سے پہلا موقع تھا جب ماہر اس کے ہرماں نہیں تھی۔ وہ کیا لگا رہی آیا تھا۔

..... ہاں!..... باقی سب کہاں ہیں؟" ولید نے سچی سچ سے حد تک سفاکی میں جواب دینے

تجربہ کے دونوں ہاتھ اسٹریک پر مضبوطی کے ساتھ جیسے ہوئے تھے۔ وہ قدرے آگے کو بڑھا

اس کے خوب صورت چہرے پر اس سے خوف و دہشت کے آثار بہت نمایاں تھے۔ اس کی

خوف کی شدت سے چٹنی ہوئی تھی..... آج سے کل کی مرتبہ اس نے چھوٹے بڑے

مارے تھے۔ کتنی بار جب وہ نئے سے دھت ہو کر کار پر سے کنٹرول کو یقین تھا جب بھی

محسوس نہ ہوتا تھا۔ مگر آج..... آج کیا ہوا تھا؟..... یہ کیفیت..... یہ خوف.....

کیوں؟..... وہ تو نہیں کبھی ڈرتا تھا..... کبھی بھی چیز سے خوف زدہ نہیں ہوتا تھا..... پھر

ہو رہا تھا؟..... کیوں اس کے ساتھ عجیب عجیب سے واقعات ہو رہے تھے؟..... اس نے

ترجیب سانسوں کو درست کیا۔ پھر بیک مر کی طرف دیکھا..... کون تھا جو یکدم سا

تھا؟..... اسے لگا تھا کہ کوئی مرد ہے..... پھر خیال آیا کہ شاید کوئی عورت تھی۔ اس نے نیند

پچھنے دیکھا، مگر پوری سڑک سنسان نظر آئی..... دور دور تک کسی آدم زاد یا انسان کی ہوا بھی

رکھیں لگنے والی گاڑیاں تھیں، وہ بھی کب کی آگے نکل گئی تھیں!..... ایک بے ہوشی سے

تھلائی کا احساس ہوا..... اسے لگا جیسے پوری فضا نے چپ سا دھلی ہو..... جیسے پوری کا

خاموشی کا لبادہ پہن لیا ہو..... سنا اس قدر تھا کہ اسے اپنے سانس لینے کی آواز بھی

دے رہی تھی..... وہ تجاہل سے یہ کہ اسی کیفیت میں رہا تھا اور جانے کب تک اسی کیفیت میں

اس کے موبائل کی گھنٹی نہ بجتی..... موبائل کی حشر گھنٹی نے اسے ایک ہی لمحے میں تھلائی اور

اس سر سے ہاتھ لگا دیا تھا..... اس نے جب سے موبائل نکالا اور دھن دیا تو

"ہیلو!....." اس نے سر سے مرنے لگے کہا۔

"کونسا ہو یا خرم؟..... ماری کار میں اپنے..... کھل" تک پہنچ چکی ہیں..... وہ دیکھ کر

منہ (the Winner) کا ٹائٹل سے گیا ہے اور تم کدے سے سر

طرح قہر ہو ہو کہاں تم؟..... "خرم کی تھلائی کی آواز اس کی سانسوں سے نکلی۔

"میں..... میں آ رہا ہوں بس....." اس نے تنگ لبوں پر زبان پھیری اور پھر بند کر

و اپنی سابقہ کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے کار پھر سے اسٹارٹ کی مگر کار چالنے

نے ایک بار اچھی طرح اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھ کر تلی کر لی کہ کوئی ہے یا نہیں۔ مگر

طرح سنسان تھی..... اس نے کار ایک جھکے سے آگے بڑھا دی..... مگر اس مرتبہ کار کی اپنی

نہیں تھی..... تیرو کار ڈرائیو کرنے کے دوران کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔



"میں کچھ رہا ہوں..... وہاں میرے سوا کوئی نہ تھا۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے

رہا تھا۔

وہ اور خرم اس وقت ایک کافی شاپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے خرم کو کچھ دیر لگ

والے واقعے کے متعلق بتایا تھا۔

کے نور اربعہ پہ چھا تھا۔

”سب لوگ ڈانٹک ہال میں کھانا کھا رہے ہیں۔ تیمور صاحب اور ان کے گھر والے بھی“
ہوئے ہیں۔ ”خلازم نے اطلاع بھیج بیٹھائی۔

”اچھا..... دو لوگ آج یہاں کیسے؟“ اس نے چلتے چلتے سرسری سا پوچھا۔
”تیمور صاحب لندن چار پہرے میں آئی۔ اسی لئے بڑے صاحب لاہری کی تنگم صاحب نے وہ دعوت کی ہے۔“ خلازم نے اسے معلومات فراہم کیں۔

”اچھا! اچھا! میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم اپنی اہل میرے آنے کی اطلاع مت کرتے۔“ وہ گریڈر سے گزر کر میزبان چڑھنے لگا۔

”صاحب! کھانا آپ کے کمرے میں ہی لے آؤں؟“ خلازم نے پوچھا۔
”نہیں۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ ٹیلیمن میں کھالیا تھا۔“ ولید اپنے کمرے کے دروازہ کھ
ہوئے بولا۔

”دودھ لا دو؟“ خلازم نے پوچھنا اصرار نہیں سمجھا۔
”کچھ نہیں۔“ اس نے تم چاؤ۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب ریٹ کروں گا۔ مجھے صبح سے
کوئی ڈسٹر نہیں چاہیے۔ مجھے سمجھے؟“ اب کے ولید تپتی انداز میں بولا۔
”جی ہاں۔“ زم نے سر ہلادیا۔

ولید کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا کمرہ آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ موجود ہو یا غیر
دونوں ہی صورتوں میں اس کا کمرہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ وہ اپنی مال کی عادت کو بخوبی جانتا تھا
خلازموں نے اپنی گہرائی میں کام کرنا ہی کی مادی تھیں۔ اس میں کچھ تو ان کی اپنی فطرت اور
پسند عادت کا نتیجہ تھا اور کچھ شہری کی صحیحہ کا اثر تھا۔

ولید نے کمرے میں آنے کے بعد دروازہ بند کیا اور سیدھا دروازہ کی طرف چلا
داروزب میں اس کے اور مامور کے چند جوڑے کپڑوں کے موجود رہتے تھے۔ اس کے علاوہ
دو ہی کی ضرورتیات کی بنیاد یہاں موجود رہتی تھیں۔ ولید کو ای لے کر بیٹھائی گئی تھی جس اٹھائی ہوئی
اُس نے داروزب بھیجے ہی تھی، اس کی نگاہ اپنے بندہ کپڑوں کے ساتھ ساتھ مامور کے
شدہ کپڑوں پر بھی پڑی تھی۔ ان کپڑوں پر نظر پڑتے ہی اس کے کانوں میں مامور کی آواز گونگی۔
”مجھے ان سے حق ہے۔“

اور ولید کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے کانوں میں کسی نے ہنسا ہوا سیدھا ڈال دیا ہو..... اُس
اپنا تانت سوت ڈالا اور ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ وہ ہنسنے کے بعد سیدھا حلیہ پر آیا۔
نے بیڑ کی سائیکل پر اُٹھ کر گلوب کی بیچ والے سکرینے کیس میں سے ایک گھرنے لگا اور
کی دروازہ میں سے لائٹر نکال کر مگر نہ چلایا۔ وہ بے توجہ تھا کہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ چھپکے کی گم
سے ایک خطاب مسلسل میں کر رہا تھا۔ اس کا جسم تو تھا تو تھا وہی تھا جس کے نوٹے ہوئے

اے اس سے حلال کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے مگر بے پھونک جا رہا تھا۔ دھوکے سے سرفو لے تا
رہا۔ اس کے پیچھے کے گرد آتا دھواں تھا کہ اس میں اس کا چہرہ دھندلا سا گیا تھا۔ اس کی
اُس کی سرخی باقی ہی جا رہی تھی۔ اس کا تھکاوٹ سے برا حال تھا مگر فینڈ اس کی آنکھوں سے
اُن اور تھی۔

وہ ہانپنے لگی سی ہی دیر سے بیٹھا مگر بے پھونک رہا تھا۔ اس حالت میں وہ کوئی دھواں چھوڑنے والا
باٹھین لگ رہا تھا۔ سوچ کے محسوس میں جھٹکا ایک تھا سا مگر رہا تھا۔ مامور کے اعتراف
رے اب سے عجیب و غریب حالات میں ٹھہر رہا تھا۔ سوچتے سوچتے کب اس کی آنکھ مل گئی تھی۔
برہی نہ ہوئی۔



آج کی رات فینڈس کو آتی تھی؟..... آج کی رات کا تو اب ایک لمحہ بھاری تھا۔ آج کی
مہ کو ہل ہل انگوروں کی دھن بنا ہوا تھا۔ آج کی رات کی جگہ کس قدر دور تھی۔

وہ کمرے کی بائیں میں کھڑی ہوئی تھی۔ نفا میں تنگ سر دی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا بھی خاصی بریلی
لم تھی۔ شاید سری وغیرہ میں کہیں بارش ہوئی تھی یا ساتھ ساتھ برف پاری بھی ہوئی تھی، بھی
وہ آہاں میں بھی موسم معمول سے زیادہ ٹھنڈا تھا۔

آخری راتوں کا چاند سیاہ و بھرے بھرے بادلوں کی اوٹ میں چھو چھپا ہے بیٹھا تھا۔ رات بے حد
تھی۔ پائلٹ کسی اندھے کوئیں کی مانند۔ آسمان کی دستوں پر بے انتہا سا اور خاموشی
تھی۔ اسے آسمان بھی کسی قدر تھکا اور اکیلے رہا تھا۔ پورے عالم پر کوئی محمود طاری
کوئی کھڑی جس نے اپنی لیٹ میں ہر شے کو لے رکھا تھا۔ ہر ستارے کا عالم تھا۔
کے تھمن کیجئے اس قدر وہ اپنی اور سناٹا ہی تو تھا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ کمراس کے اندر ایک خام چھا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ تھی۔ کمراس کی آنکھوں
اُن سلطان کا تھا۔ کیا ہوگا؟..... ولید کی فیصلہ کرے گا؟..... سارے خاندان میں یہ بات
بھانپنے کی۔ اگر ولید نے اس کے خلاف فیصلہ کر دیا، پھر کیا ہوگا؟..... لوگوں کا رد عمل کیا ہو
..... لوگ اسے کچھ سمجھیں گے یا غلط؟..... یا وہ اپنی؟..... نہیں..... لوگ اسے بے وقاف سمجھیں
لوگ اسے پاگل کہیں گے۔ ایک انجیل میں شادی شدہ لائف گزارنے والی عسکری عورت سمجھیں
اس کے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ مگر کوئی اس کی حالت نہیں سمجھے گا..... کوئی یہ نہیں جان
کا کہ وہ کس درجے پر آج پہنچی ہے؟ اس کو سمجھنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا۔ وہ تہوارہ جائے گی.....
اٹھا.....

مامور سے جا رہی تھی۔ اُسے اس بات کا پچھتاوا ہرگز بھی نہیں تھا کہ وہ ولید کو سب کچھ بتا چکی
تھی۔ اس بات پر تو وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ اسے اب سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ کم از کم ولید یہ تو
مجھے گا کہ اس نے اسے دھوکا دیا ہے یا کسی دھوکے میں رکھا ہے۔ اب ولید کب واپس آئے گا؟

”جب اُس نے مجھ سے یہ سب کہات میں شادی دینی دیکھ کر ہوا تھا۔ میں مگر سے گیا تھا۔ پھر میں یہ مقدمہ اصرار پھر رہا تھا۔ اس کے بعد جب میں اگلے روز مگر بنایا میں نے صرف اسے یہ بتایا تھا کہ میں کراچی جا رہا ہوں۔ جب تک وہ بھی سوچ لے اور مجھے بھی اور فیصلہ کرنے کے لئے وقت اور ماحول دقتاً ہو جائے گا۔ سو میں یہاں چلا آیا تھا۔ میں نے تک اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا ہے۔ میرا دماغ خوف ہو چکا ہے۔ میں مجھ کو سونے بجھنے کی کڑنا نہیں کرتا۔ میں نہیں ہوں۔ مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ سب کس سے شیئر کروں؟ کس کو انکو میں نے کرتا ہوں؟ آپ لوگوں کو یا یا انور کے بیٹے کو؟ پھر جب آپ سامنے آئیں تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پہلے آپ لوگوں کو سب تک بتاؤں گا۔ آپ لوگ اس وقت لڑکی کو سمجھائیں۔“ ولید نے شلٹہ لہجے میں کہا۔

”اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شادی شدہ عورت ہو کے اُس نے ایسا سو کیسے؟ آخر کیا کسی یہ تم میں؟ خوب صورت ہو، دولت مند ہو، گھبراہٹ ایک نام ہے زمانہ ایک مقام ہے۔ اور سب سے زیادہ کہ انور کو بت چاہئے ہو۔ تم اسے تم دونوں کی مثالیں دے گا۔ پھر میں دلی جاتی ہیں۔ کوئی عیب، کوئی قصص بھی تو ہے۔“ نیرہہ شے اور دکھ کے احساس سے لہجے میں بولیں۔

”یہ نہیں مئی! شاید کہیں مجھ کی روٹی ہو۔ مگر میری کچھ میں نہیں آتا کہ اس آخر“ ان میں ایسا یاد دیکھ لیا کہ وہ ان کے عشق میں گرفت ہو گئی؟ اگر کوئی مجھ سے بجز فلم جس کا مثالیں مجھ سے زیادہ بلند ہوتا جس کا مثالیں اور پرانی میں مجھ سے ڈبل ہوتی وہ کسی اور مجھ سے بجز ہوتا تو مجھے بات سمجھ میں بھی آ جاتی۔ مگر ایک ایسا شخص، جو صرف ”اللہ والوں“ لست میں شامل ہو اس سے وہ۔ میری تو کچھ میں سمجھ نہیں آ رہا۔“ ولید نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”میں تم سے کتنی جتنی کا کیا کہ چلے آؤ۔ مگر تم نے میری بات نہیں مائی کوئی اپنا چھ سال پہلے تو میں بچے کے بارے میں سوچ رہا بھی نہیں۔ مجھے بچوں کی ریس رہی، میں نہیں پسند نہیں اسے میں کہتی ہوں کہ آج اگر اس کے بیوی میں بچوں کی زنجیر ہوتی تو وہ کسی اور طرف جاتی؟ قصور تھا یا بھی ہے ولید! کوئی اتنے بڑے باپ نہیں جتنے یہ دن تو ہر شادی شدہ زندگی میں آتا ہے۔ اولاد دہشت ہماری بڑی ہوتی ہے جتنا!۔“ گود میں بچہ آ جائے تو سب کچھ بھول کر صرف اسی بچے کی ہو کہ رہ جاتی ہے۔ اُس کی گود میں بھی بچہ ہوتا تو وہ اور مصروفیات میں مگن رہتی۔ فطرتی تو گھبراہٹ بھی ہے۔“ نیرہہ اسے غلامت کرنے لگیں۔ ولید سر ہر ان کی ڈانٹ سنتا رہا۔ طفیل اللہ اب تک خاموش تھے۔ انہوں نے فی الحال محنت میں حصہ نہیں لیا۔

”میں ماننا ہوں! اگر میرا کلامی حق ہے۔ مگر کیا اس دنیا میں ایسی عورتیں نہیں ہیں جن کو نے اولاد کی دولت سے ہی غم کو رکھا ہو ہے؟ کیا وہ عورتیں اسی طرح شو بہوں سے بے وفائی ہیں؟“ ولید نے اپنا ہاتھ ہلکا ہلکا ہاتھ ہونے لگیں دیکھا۔

”تم نے بتایا ہے کہ یہ سلسلہ کچھ دنوں سے چلا ہوا ہے۔ تم نے اسے روکنے کی کوشش کیوں کی؟“ طفیل اللہ نے مکمل بار محنت میں حصہ لیا تھا۔

”مجھے خبر ہی کہاں تھی؟ اپنے بیٹے میں اتنا مصروف تھا کہ۔“ ولید نے جملہ اور اچھوڑ دیا۔

”مجھے عجب ہے کہ انور بھی لڑکی اسی طرح کیسے کر سکتی ہے؟“ طفیل اللہ نے اپنی عیثیٰ سلی۔

”ای اسی اسلام آباد جاؤں گے اور انور سے بات کریں گے۔ اُسے سمجھائیں گے۔“ انہوں نے فیصلہ کر لیا۔

”انور! کہہ دو مائی تو؟“ ولید نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اسے ماننا پڑے گا۔ یہ وہی عزت و ناموس کا معاملہ ہے۔ اور عزت و ناموس کوئی مکمل مذاق نہیں ہوتا۔“ وہ ہلکا سے بولے۔

”لیکن اگر پھر بھی وہ مائی تو؟“ پھر کیا کریں گے؟“ نیرہہ نے پوچھا۔

”ہم اپنی امانت کو کوشش کریں گے کہ اسے رات پر لے آئیں۔“ نیرہہ نے مائی تو اس کے مگر اس کو ساری صورت حال بیان کرنی پڑے گی۔“ انہوں نے کہا۔ ”ولید! تم آج کی غلامت سے مل جاؤ گے اور اسے اسی طرح سمجھاؤ گے۔ چارے، ڈانٹ کر۔“ اور ضرورت پڑے تو چاہہ لے لے بھی کر بزم کرنا۔“ انہوں نے ٹھکانا انداز میں کہا۔ ان کی آخری بات پر نیرہہ اور ولید نے بے اختیار انہیں دیکھا۔ ان دونوں کی نظروں کا منہ مگر وہ ابھی طرح کچھ گئے تھے۔

”یہ ضروری ہو جاتا ہے کبھی بھی۔ گھوڑی آکر قابو میں نہ آری ہو تو اسے سوجھانے اور قابو کرنے کے چابک کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔“ انہوں نے سمجھایا۔ ولید نے نظریں جھکا لیں۔ نیرہہ اپنے لڑکائی لہجے میں۔

”لی! اب اس بات کو اس کر کے کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتا چاہئے۔ مجھے گئے آپ لوگ؟“ ان نے یقین کی۔

”مئی۔“ ولید اور نیرہہ دونوں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”میں سات پر جا رہا ہوں۔ رات تک وہاں ہی ہوگی۔ ولید! تم نے کچھ کیا؟“ انہوں نے واپس بندھی گھڑی کی طرف دیکھا اور کمرے سے ہوتے ہوئے بیٹے سے پوچھا۔

”نہیں ڈیڈی!۔“ ولید نے جواب دیا۔

”نیرہہ! تم اسے کچھ کھلاؤ۔ اور میں شیئر سے کہہ کر گھبراہٹ میں نہ کروانا ہوں۔ اگر وہ بہر کی ل ڈوب لیا گئے۔ اور اسے تم اپنی تیار کی مکمل گھنا گئے۔“ انہوں نے شخصی اعزاز میں فرمان ادا کرتے ہوئے اس سے چاہہ لیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ ولید میں ان کو دیکھ کر دیا۔

”مئی! ڈیڈی! بھی ایک روایت لگتے ہیں۔ ایک ایسا روایت جو اس لیتا ہے جس میں ہے۔ آپ نے ایک روایت کے سرورہ ڈیڈی کے اسے سال کیسے گزار دیے؟“ ولید نے ماں کی ادا دیکھا۔ وہ بیٹے کی حالت سے خوشی و اکتاہٹ تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اس وقت اس بیٹے کو اپنے

ایک طرف کھڑا ہو گیا جبکہ میو، حمایت، بادشاہ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ ان کی حفاظت میں بھر رہا تھا۔

ادنی خان اقم بھی آتا ہمارے گاؤں..... ہمارے غریب خانے پر۔ ہمیں مسرت ہو گئی۔" انہا نے اسے دعوت دی۔

اے میں ضرور آتا۔ مگر میں چند روز بعد یہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" تیمور کا لہجہ نہ جانے کیا ادب کیا تھا۔

ایک چھوڑ کر جا رہا ہے۔ مگر یہ مٹی تجھے چھوڑنے والی نہیں۔ تو تو ہمیں کا شاہ ہے۔ ہمیں آنے والی کو ایک لگاؤ دیکھتے ہوئے بولے۔

"اے آپ نے تیمور کو کچھ کچھ کا بادشاہ بنانا ہے؟ تخت و تاج والا؟" میو مسکرایا۔

ادنی کیا اوقات؟..... ہماری کیا بساط؟..... اسے بادشاہ بنانے والے سے بتایا ہے۔ تخت والا نہیں۔ یہ تو مٹ جانے والی چیزیں ہیں۔ یہ تو کتاب کو چھوئے گا..... کاش کی ہوتے گا۔" وہ انہیں مخصوص اعزاز میں کمرہ رہتے تھے۔ تیمور کو پھر ایک عجیب سی باتیں ہونے لگی۔

ادنی عشق میں سا کھڑا تھا۔

اے اے اللہ..... بس سرفراستیم پر چل پڑ..... ازل وابد کی کامیابیاں تیری قسمت میں آئی۔ انہوں نے تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دباؤ ڈالا۔ تیمور کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

بادشاہ آگے بڑھ گئے تھے۔ میوان کے ساتھ تھا۔ مگر تیمور وہیں کھڑے گا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس عجیب سی ہونے لگی تھی۔

ہماری دونوں کے اس اذہم سے اس کا دم اٹھنے لگا۔ اس کو لگا جیسے اس نے ایک سیکڑ بھی ہاتھ کرنا تو اس کا دم گھٹ جائے گا، اس کی سانس رک جائے گی۔ وہ یکدم ہی پڑا اور میو کی

انکار کے بغیر لیے لیے ڈگ بھڑا ہوا اس سے باہر نکل گیا۔

ایک تک وہ تقریباً ہکا بکا ہوا آیا تھا۔ ادنی کا دل دروازہ کھول کر کے اندر گرنے سے انکار نہ کیا۔ بیٹ پر بیٹنے کے بعد اس نے اپنا سر بیٹ کی پشت سے لگایا۔ اس شوش کی سر دی میں

سایہ پڑا۔ بیٹ کی ہوس میں چمک رہی تھی۔ اس نے چار پانچ کمرے کمرے سانس لے کر اور

ال کیا۔

ہا، اہم ہے؟..... آخر ان کے سامنے میری کنڈیشن ایسی کیوں ہو جاتی ہے؟..... کیا کمر ہے اندر؟ کیا چادر ہے جو میں، تیمور جی خان ان کے سامنے ایسا بن جاتا جیسے میری کوئی

دی نہیں کوئی اوقات ہی نہیں۔" وہ اب جھپٹا رہا تھا۔

اے جانے لائیں میں ڈال کر کھڑی اور ایک کھینکے کے ساتھ کا اشارت کر کے دیو بس لی اور

ازن کر کے آگے بڑھا۔ مگر قہقہوں کی دیر ہو جانے کے بعد اس نے تھوڑے سے بریکس پر

..... مگر انہیں میں کا بھی وقت ہوتا تو سامنے کھڑی اس لڑکی پر گاڑی چڑھ گیا ہوتی۔

باپ کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ اپنے باپ کے منہ سے تلی کے، ہور دی کے چند بول سننے کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا باپ اسے گلے سے لگا کر تلی دیکھ سکے۔ ازم آج..... یہ سب جان لینے۔ وہ اسے چھوڑ کر "سانٹ" پر نہ جاتے۔ مگر ان کے لئے پہلے خبر پر اپنا کارڈ اور آقا۔ باقی سر کے بعد۔ اور ادا دہی "بانی سٹ" میں ہی ٹائر ہوئی تھی۔ ولید کے سوال کا کوئی جواب ان کے نہیں تھا۔ وہ صرف سر ہکا کے رہ گئے۔

"بیٹا! میں جہوں تمہارے پاس..... وہ مانتا ہے مجھ کو کراس کے پاس بیٹھ گئے۔ ولید کی گود میں رکھ کر انہیں موند گئے۔ ساتھی کی آغوش میں کتنی بڑی قیمت ہوتی ہے۔ وادی پر غور تو ہے کہ اتنا بڑا آدمی اپنی ماں کی گود میں رکھ کر سکون محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک ہی بڑے اور سخت آزمائی دور سے گزر رہا تھا اور اس وقت اسے اپنی ماں کی آغوش ہی ایک بڑا طرح لگ رہی تھی۔ ایک ایسا بڑا گاہ..... جس میں آنے کے بعد وہ کسی حد تک قہقہے کاٹتا ہے۔ تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ماں ہوا تو کون کھینک لے گی۔



"میری خواہش ہے سرکار کہ اس بار میرا آپ ہمارے ساتھ منائیں۔" وہ بڑے ہی احترام ساتھ اپنی خواہش ان کے گوش گزار کر رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ رمضان کے پورے مہینے میں ہم عام لوگوں سے پردہ کرتے ہیں۔ وہ مہینہ ہمارے اللہ کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ میو! پھر میرے منوں میں ہم پورے مہینے کے ان کا۔

دیکھتے ہیں جو ہم رمضان المبارک میں نہیں مٹا سکتے۔ اور پھر ہمارے گھر والے، ہمارے ماں اور ہمارے اہل و عیال، رشتہ دار وغیرہ بھی ہمارے منتظر ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کیسے ہمیں کر

چیتا؟..... تم اپنا کمرہ میرے دوسرے، تیرے روز کو نکال کر آ جاؤ۔ اس بار میرا ہمارے ہمارے گاؤں میں بناؤ۔ دیکھو کہ گاؤں کی سادہ فضا میں عید منانے کا لطف کیسا ہے؟ اپنی تالی

مشورہ کر لو اور اپنی حکومت کے مطابق پروگرام بنائے کہ ہمارے مہمان ہیں۔ مہمان تو یوں بھی رہ

اگئی ہوتے ہیں۔" انہوں نے نری اور محبت سے اسے اس طرح انکار کیا کہ وہ عارضی بھی نہ ہوا۔

کادل بھی نہ ٹوٹے۔

میو کے قریب کھڑے تیمور کو ان کے اعزاز و لہجے میں عجیب سی کشش نظر آرہی تھی۔ اس دن

تینوں کو اپنی ایئر پورٹ پر کھڑے تھے۔ میو اس بار تیمور کو بڑی دینی نہیں لایا تھا۔ یہ شخص اسحاق بن

جس وقت میو، حمایت، بادشاہ کو ایئر پورٹ پر چھوڑے آیا تھا۔ تیمور جی اپنے کسی دوست کوئی آف کر

سیناں ہو رہا تھا۔ اس بار بھی میو کی نگاہ تیمور پر پڑی تو اس نے دور سے اسے دیکھ کر ہاتھ پا پا

تیمور اسے دیکھ چکا تھا اور زیادہ خاصگی اس لوگوں کے درمیان نہیں تھا۔ اس نے حمایت بادشاہ

دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ ہلکا نہیں سکتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اسے کہ جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اسے

بادشاہ کی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف چلا آیا تھا۔ یہ ایک سلیک

ف..... "تجور کو فلی آگئی۔ اُس نے اپنا آنو گراف دینے کے بعد دونوں چیزیں اس کی ہاں پر حادیں۔

ف! آپ میری فہن ہیں؟ مجھے پسند کرتی ہیں؟ "تجور نے اس کی طرف دیکھا۔
ا..... "صرف پسند نہیں کرتی، مرنے والی ہوں آپ پر۔" لڑکی نے گھبراہٹ سے کہا۔
ہما..... "ابھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ مجھ پر کتنا مرنے والی ہیں اور کیا کیا بھلا اور کتنی
"خیر، اپنا اعزاز میں پسند۔" اس نے کہا۔ آپ کو ابھی اپنے ساتھ چلنے کی آفر کرو تو؟ "اس نے مسکرا

دہمیا بنا چنگا پات اس آفر کو قبول کر لوں گی۔ لڑکی نے بے باکی سے کہا۔
زہرا! انتظار کس بات کا ہے؟ "تجور نے فرٹ ڈور کھول دیا۔ کشف پرانے دوستوں کی طرح
اس سے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو کہاں لے کر جاؤں گا؟" "تجور نے اس کی طرف
کشف دیکھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو کہاں لے کر جاؤں گا؟" "تجور نے اس کی طرف
لے ہوئے پوچھا۔
آپ کہیں بھی لے جائیں، مجھے قطعاً اعتراض نہ ہوگا۔" کشف مسکرائی۔

ا..... "سوچ لیں۔ میں آپ کو کسی ایسی جگہ بھی لے جا سکتا ہوں جہاں ہم دونوں کے
راکٹی فیس ہوگا۔ اور جہاں کی تمہاری مجھے بیکھا بھی سکتی ہے۔" اس نے کشف کی آنکھوں میں
ا..... "میں آپ کو اتنا پسند کرتی ہوں کہ اگر آپ بہک بھی جائیں گے تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو
وکی مجھے خود ہر دلی کے لئے ذہنی طور پر آمادہ تھی۔

ا..... "سوچ لیں۔ یہ بیکھا نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے آپ کے لئے۔"
آپ کے کس کی طلب کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس موقع کو نوٹا دیا تو اس نے زیادہ نقصان کس
ا..... "آپ؟" کشف نے گھبراہٹ سے کہا۔ "تجور نے سر ہلاتے ہوئے کاراٹارٹ کی۔ کچھ دیر
ا..... "ایک بے حد اہم بات اور دیرمان کی سرگ پر کھڑی تھی۔ یہ سڑک غیر آباد تھی۔ اور اس وقت تو یہاں
کاڑی تو درکنار سائیکل تک نہیں آ رہی تھی۔ تجور نے کارمرک کے کنارے پر روک دی تھی۔
ا..... "کار کے ڈرائیور مجھ سے ایک کین نکالا اور اسے نکولا۔ کشف اسے غاصی نظروں سے دیکھ
ا..... "میں تجور سے دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے کین کھول کر اسے پینے کی آفر کی۔
ا..... "میں نے کشف سے اس وقت نہیں جتنی۔" اس نے مسکرا کر اپنے کانٹا نکال دیا۔
تجور نے کشف سے اپنا کین منہ سے لگایا اور چار پانچ گھونٹ بھرنے کے بعد کین منہ سے

"واٹ دی بیل آف؟" وہ بری طرح بھلا گیا۔ "مس! اگر خوشی کرنے کا اتنا شوق
ہے تو کسی اور گاڑی کا انتخاب کیا ہوتا۔" وہ کھڑکی میں سے سر ہار نکالتے ہوئے بولا۔ وہ لڑکی کو
چنے اس کی طرف تھی اور جسے شاید احساس بھی نہ ہوا تھا کہ اگر تجور ہمارے سے کار نہ روک دیتا تو
کے بے رحم بائرب تک اسے کھل کر گزر دیتے ہوتے۔ وہ لڑکی اس کی آواز پر حیران حیران ہی
تھی۔ ڈیٹی ٹی، ڈاکٹر کی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ گہرا تھا۔ اس نے شانوں پر پلٹتے سے دوپٹہ ہا
ا..... "اگر وہاں تھا اور اس کے سر پر بیک اسٹارف تھا جس نے اس کے سر کو حاد ہاں رکھا تھا۔

تجور علی خان نے اُس باکل ایبلی اور انبان لڑکی کو دیکھا اور کھلکی کی طرح اُس کے ذہن کی،
پر کسی کی شبیہ۔ ابھری۔ یہ شبیہ جسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بھلا نہیں سکتا تھا، یہ شبیہ کشف کی تھی
کشف عارضین جو ہر ملاقات کے ساتھ اسے پہنچنے کی تھی۔ وہ کشف عارضین جو نہ اس سے
تھی، نہ حشر ہوتی تھی اور نہ ہی اسے اہمیت دیتی تھی۔ وہ کشف عارضین جو نہ اس سے
کی ضد جتنی جاری تھی۔ اس سے اس ایبلی لڑکی کو دیکھ کر اسے کشف عارضین یاد آگئی تھی۔ اس لڑکی
سر پر اوڑھا ہوا سیاہ اسٹارف، اس کا دوپٹہ لینے کا اسٹائل، اس کی رنگت کشف کی تھی۔ تجور اور
بھلا گیا۔

"تجور! بازار میں ایک بہت ہی اچھی کتاب دستیاب ہے۔ نام میں یاد آتا ہے، خرید
زحمت آپ کر لیجئے گا۔" خوشی کرنے کے ایک سو ایک طریقے۔ وہ کتاب پڑھ کر آپ اپنی مرن
کوئی بھی طریقہ چن کر اپنی زندگی سے بھلا کر حاصل کر سکتی ہیں۔ اب پلیز میری کار کے سامنے
ہٹ جائیں تاکہ میں اسے کھل سکوں۔" وہ بولے چار ہاتھ لڑکی حیران و پریشان کھڑی اس کی
دیکھے جاری تھی۔

"آ..... آپ..... تجور ملی خان ہیں؟" لڑکی شاید اسے پہچان گئی تھی۔
"ابھی تک تو ہوں۔" وہ بولے کھن سے بولا۔

"نہو ہائی گاڈا! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں اپنے موٹ لٹورٹ مائل کو دیکھ
ہوں۔" لڑکی خوشی سے چلائی اور اس کے قریب آگئی۔ "پلیز تجور صاحب! مجھے آپ کا آنو گراف
چاہئے۔ ایک منٹ، میں جین لٹائی ہوں۔" لڑکی نے پوچھا کہ کیا۔ اس کے چہرے پر اور اندر
صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس سے مل کر خوش بھی ہے اور ترس بھی۔ لڑکی نے جگت میں اپنے
میں سے جین نکالا۔ ساتھ ہی آنو گراف بگ بھی تھی۔

"میں یہ بیک بیٹھ اپنے پاس رکھتی ہوں کہ کسی اگر جو آپ سے ملاقات ہو جائے تو میں آپ
آنو گراف لے سکوں۔" لڑکی نے دونوں چیزیں اس کی ست پر حادیں۔ تجور نے ایک گہری د
لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" اس نے جین اور کھم لیتے ہوئے پوچھا۔
"کشف۔" لڑکی نے بتایا۔

ا..... "تم جانتی ہو..... ایک لڑکی ہے۔ اُس کا نام بھی کشف ہے۔ یہاں سے مغرور اور خود
وکی ہے۔" تجور نے کہا شروع کیا۔ "وہ خود کو فلا دیکھتی ہے۔" کشف دیکھنے میں تمہارے جیسی

پان تھا۔ اس مادور کے چہرے پر ولید کو کچھ کر کوئی تاثر نہیں اُجھڑا تھا۔ وہ ساٹھ چہرے کے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس علیہ اس کے گھر میں کام کرنے والی ملازم زیادہ سادہ و عام تھا۔

”کب آئے کرانی سے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”تم گاؤں کی تھیں؟“ ولید نے اس کی بات کے جواب میں سوال کیا۔

”ہاں.....“ وہ ہانچا، باخوف اقرار کر رہی تھی۔

”ذرا تیر کو باہر کھڑا ہے۔ اس نے بتایا کہ تم گاؤں میں نہیں گئیں۔“ وہ سرد لہجے کر رہی تھی۔

”میں وین سے گئی تھی۔“ مادور نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔

”کیوں؟“ ولید نے پوچھا۔

”میں زندگی کی ان آسائشوں کے ساتھ اپنی منزل بھی نہیں پاسکتی۔ میرا جنون کوئی اور۔ میرے جنون کی راہ دوسری ہے۔ اور یہ سب چیزیں تیریاں ہیں جو میرے جنون کی طرف مائل تھیں روکتی ہیں۔ یہ سب دل ہیں جو میری راہ میں چتر بچاتے ہیں۔ میں ان سب کو کم ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی ولید کو لگا کہ وہ مادور جو اس وقت اس کے سامنے بیٹھی ہے، اس زبان تک انہی ہے۔

”تم نے مجھے میری غیر موجودگی میں کس نہیں کیا تھا؟“ تم پر میری غیر موجودگی نے نہیں کیا؟“ ولید نے دھکی لہجے میں شکوہ کیا۔ مادور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس چپ چاپ کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ولید کو کچھ عجیب سا تاثر نظر آیا تھا۔ کوئی غیر واضح تاثر تھا۔

”تم نے میری غیر موجودگی میں سوچا کیا؟“ ولید نے تنبیہ کی سے سوال ادا کر چھوڑ دیا۔ ”ولید! میں نے تمہاری غیر موجودگی میں سوچا تھا۔ بہت سوچا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں غلط کر رہی ہوں؟ کیا مجھے ایسا کرنا چاہئے؟ میں شادی شدہ عورت ہوں میں کسی دوسرے مرد کے لئے ایسا کیوں سوچ رہی ہوں؟ مگر میرا دل میرے اختیار ہے۔ میری سوچوں پر میرا زور نہیں رہا۔ میں نہیں بتاؤں، میں نے اللہ کے ایک بندے سے ہے۔ عشق..... جانتے ہو عشق کیا ہوتا ہے؟“ مادور جیسے کہیں کھڑی تھی۔ ”عشق روح کا باز ہے۔ عشق اللہ کا دوسرا روپ ہوتا ہے۔ عشق میں انسان سب کچھ ناکارہ کر دیتا ہے، سب دیتا ہے۔ دولت، دنیا، آتشیں، رنگ، روپ، پورا جہاں..... ساری کائنات..... مجھے..... میں بھی عشق کر رہی تھی۔ ایک اللہ کے پیار سے بندے سے۔“ مگر ولید اسرار کا تھے۔ بندہ جب کسی سے عشق کرتا ہے تو وہ عشق اسے آگے کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ راستہ اسے ”اصل“ تک لے جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے اصل محبوب سے ملتا ہے۔ اور وہ اصل محبوب وہ ”اللہ“..... ہاں ولید اسرار کے عشق نے مجھے میرے اللہ سے ملوایا ہے۔ تم سے محبت۔

”اللہ“ سے دور کر دیا تھا۔ مجھے میرا اصل مل گیا ہے ولید!..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور چلے دو۔ مجھے تمہاری محبت نہیں چاہئے ولید!..... مجھے میرا ”اصل“ چاہئے۔ تمہاری دنیا، مجھے نہیں نہیں ملے گا۔ راحت تو اب مجھے میرے ”اصل“ میں ملے گی۔ نا تو مجھے اب وہیں..... میں اب تمہارے کام کی نہیں رہی۔ تمہاری اور میری دنیا الگ الگ ہو گئی ہے۔ میں اب تو تمہاری دنیا میں نہیں آسکتی۔ اور اگر آج بھی جاؤں تو بس نہیں سکتی۔ اور تم چاہ کر بھی میری اپنی نہیں بن سکتے۔ لہذا عافیت اسی میں ہے کہ تم اپنی دوسری دنیا بسا لو مجھے میری اسی دنیا بڑا دو۔“ وہ بہت غہر غہر کر بول رہی تھی۔ ولید خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا۔

تم ایسے دوسرا باقی ہو؟“ ولید نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔ ”تم دوسری شادی اتنی ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

نہیں ولید!..... تم تو مجھے سمجھے ہی نہیں۔“ اس نے جگوں کی ہمارا اٹھا کر اسے دیکھا۔ میں تم کی نہیں چاہتی۔ مجھے دوسری شادی نہیں کرنی ہے ولید!..... بس میری بات کو سمجھنے کی کوشش..... دیکھو دیکھو!.....

پانچ ہو گئی ہو..... چاہتی ہو کہ ایسا کرنے سے سب تمہارا پایا نکالت کر دیں گے؟“ ولید نے لہجے میں اس کی بات پر مادور کے لبوں پر مسکان اُجھڑا۔

”میں چھوڑ دیں سب مجھے محل جہاں نہ پوچھے

مجھے میرا وہی ہے کافی مجھے کوئی ہاں نہ پوچھے“

ن کے لبوں سے جنہیں کی۔ ولید چپ سا ہو گیا۔

اپنی دنیا بسا لو ولید!..... تم میرے تنگ نہیں چل پاؤ گے۔ میرا راستہ بہت مشکل ہے۔“ اس نے کہا تھا۔

ادور!..... کیوں خود کو بری یاد کرنے پر تکی ہو؟“ وہ بے جا چارے بولا۔

”دل نحو محبت سے اسے کچھ نہیں پرواہ

آباد کرے کوئی کہ بر باد کرے ہے“

انے دھیرے سے شعر پڑھا۔

ادور! سنبھل جاؤ۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں تم کو اپنی بے دقتی کرنے کی اپنی دے سکتا۔ چلیز!..... تم سوچ لو۔“ وہ تنگ کر رہا تھا۔ ”ادور! کیا ہے ان میں میرا ساتھ ٹھکانے کا فیصلہ کر لیا؟“ کیا تم کو میرے ساتھ گزارے وقت میں کسی بھی مل ”اپنی جی مجھ سے؟“ اگر ہاں تو وہی محبت کا واسطہ دے ہوں۔ لوٹ آؤ مادور! لوٹ آؤ۔“ اس نے کہا تھا۔

مات لگے نہیں لگتی ہوں ولید!..... اب وہاں ممکن نہیں رہی۔ تم اپنا جہاں بسا لو۔ آباد کر لو اپنا

ہاں! کسی دوسری مادور سے۔“ وہ ساٹھ لہجے میں بولی۔

”شٹ اپ..... تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم مجھے پاگل کر دو گی۔“ ولید نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ مگر یہ کائنات جلاخرازا جس کے کیوں میں دبا ہوا تھا وہ اس پر دے مارا۔ مامو نور پٹا چہرہ کے نیچے تھی۔

”مجھے سیدھے سیدھے جواب دو مامو نور!..... پاگل ہوئی یا نہ ہو بات کرو۔ غلط طور پر زبان مت بولو۔ وہ بات کہو جو سیدھی مجھے سمجھ میں آئے۔“ ضعیف دہکات سے پاک۔ لفظوں کا ہر کے اپنا موقف مت بیان کرو۔“ وہ چلا اٹھا۔

”جی کو غلط سمجھ رہے ہو۔ دل کی باتیں اگر شعروں میں دھل جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟“ رعبی ہوں تم سے سیدھی اور جی بات کرتے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور خود دوسری شادی کر دو۔ مجھے صرف اسی گھر کے ایک کھمبے میں بڑا رہنے دو۔ بس اسی اپنی دنیا میں خوش ہوں۔ اگر نہیں بھی کرنا چاہو کہ تو میں تم سے کھو نہ نہیں کروں گی۔ نہ ہی لڑوں گی۔ مجھے بس کئی دے۔“ تمہاری دنیا میں اب میں سانس نہیں لے سکتی۔ میرا دم کھٹکتا ہے جھوٹ کی بنی اس دنیا میں۔ مجہ اصل منزل کا نشان مل گیا ہے لہذا اب مجھے اسی طرف چلنا ہے۔“ مامو نے دھیرے دھیرے۔ “مامو نور! تم کیا کہہ رہی ہو؟..... تم جانتی ہو اس کا انجام؟..... ہر کوئی تم سے ناراض ہو گا۔ سب رشتے تم سے جھوٹ جائیں گے۔“ ولید نے اسے ڈرایا۔

”ہر رشتہ عارضی ہوتا ہے۔ اصل رشتہ تو “اسی“ سے جڑا ہوا ہے ولید! اس بات کا احساس دہرے ہوا ہے مجھے۔ مگر کسر ہے کہ ہو گیا ہے۔“ وہ ہولے سے بولی۔ اس کی آنکھوں میں لگی تھی۔

”تم عبادت کرو۔ نماز پڑھو۔ مگر یوں دنیا چھوڑ کر کنارہ کشی اختیار کر لینا ضروری ہے۔“ اب تمک کر بولا۔

”عبادت..... نماز..... ہاں، دنیا داری کے ساتھ یہ سب فرائض بھی انجام دینے پر مگر میں..... میں کیا کروں؟ تمہاری دنیا میں اب میرا دم کھٹکتا ہے۔ تمہاری دنیا میں جھوٹ، مبالغہ، دھوکا سب کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ مجھے منافقت کے سونے ٹھکڑ نہیں۔“ رکھائی سے کہا۔

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مامو نور! بلکہ تم میری محبت کی خاطر یہ سب چھوڑ دو۔“ اب چٹائی کی۔

”میں نے “سراکار“ کے عشق میں اپنی دنیا چھوڑ دی ہے۔ ان کے عشق نے مجھے عشق منہل دکھائی..... اب مجھے اس راہ پر چل کر اپنی منزل کو حاصل کرنا ہے۔ کیا تم میری محبت میں یہ سہ کر میرے ساتھ ساتھ اس راہ پر چل سکتے ہو؟“ مامو نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ولید کوئی جواب نہ تھا جو وہ مامو نور کو دیتا۔ سو اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ مامو نے اپنی نظروں ا بدل لیا۔ اب وہ قاتلین کو دیکھ رہی تھی۔

میرے تم سے کوئی شکوہ ہے نہ تم سے کچھ طلب کرنا ہے۔ تم اپنے نزدیک مجھ ہو۔ میں جو سوچ رہی میرے نزدیک مجھ ہے۔ زندگی گزارنے کے بجائے ہر ایک کے جدا ہوتے ہیں۔ میرے زندگی بہترین ہے جو اب گزارنے کا فیصلہ میں نے کیا ہے اور تمہارے نزدیک وہ زندگی نہ جو تم گزار رہے ہو..... میں تم کو مجبور نہیں کروں گی کہ مجھ سے زبردستی کا بندھن رکھو۔ فیصلہ تم کو کرنا ہے۔ میں اپنا فیصلہ تم کو سنا چکی ہوں۔“ مامو نے پٹا انداز میں اپنی لگی۔

”جی، ڈیڈی آر ہے جیس..... میں نے ان سے بات کی تھی۔ وہ تم کو سمجھانے آر ہے ہیں۔“ لٹایا۔

اب اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ اگر وہ اس مقصد کے لئے بطور خاص آر ہے ہیں مانع کر دو۔ مامو نور اب مجھے اور سمجھانے کی حد سے نکل چکی ہے۔“ مامو نے کہا اور وہاں سے لڑے سے باہر نکل گئی۔ ولید کی خالی نظریں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔



اٹھ چلا ہونے میں ہے۔ نماز پڑھی اور رمضان کے روزے رکھ لئے، استطاعت اور وقت لایا، بیچ کر لیا۔ بس یہی تو ہے اسلام۔ تم یہ سب کر کر پوری دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لینا جس مندی ہے؟ یہ آجائیں چھوڑ دو زعمی گزارنا آسان کام نہیں ہے۔ ”فضل اللہ“ کہتے۔

”اٹھ اپنا نظریہ ہے..... اپنا اپنا سوچنے کا طریقہ ہے۔ میں آپ کی بات سے اتفاق نہ کر سکتا ہوں۔ مگر میرا دل اس بات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ مجھے یہ آجائیں۔ زیادہ جھپٹی ہیں۔ یہ زبورات، یہ جتنی لمبوسات، یہ بیش قیمت اشیاء مجھے سانپ جھوکی ہیں..... مجھے یہ نرم ہنسوں کیلئے چھروں کی طرح چبھتا ہے۔ یہ مینکے رنگا رنگ پکوان مجھے گتے ہیں..... مجھے تو ان چیزوں میں راحت ملتی ہے۔ ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ

ہمارا میں جاکے عبادت کرتے تھے؟ اس کی لا بھگ مجھے اب سمجھ میں آئی ہے، کیوں نہیں چھروں سے بنے احمد سے اور خوف ناک راتے والے سورج میں گھٹنوں بسر کر کے اب معلوم ہوا ہے..... مجھے دنیا کے شغ و شغسان نہ سمجھائیں..... میں نفع و نقصان سے گزر چکی..... رہے اب کے عشق میں ڈوب کر مجھے جو سرور و راحت ملی ہے وہ مجھے قانون کے خزانے کا لالہ مل گئی..... اگر مجھے کسی نے قبول کرتا ہے تو اسی حالت میں کر لے اور اگر مجھ سے قطع آپ تب بھی مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا..... مگر مجھے اب نہ کسی کی شغی ہے اور نہ ہی کوئی مجھ پر مشورع پر بحث کرے..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے..... مجھے اللہ ملا ہے..... زعمی سال گزارنے کے بعد مجھے اللہ ملا ہے..... میں اسے کیسے چھوڑ دوں؟ اور جس کی بدولت ملا اس کا احسان کیجنا اور پاؤں کی؟ مجھے انہوں تو بس اسی ایک چیز کا ہے کہ مجھے اللہ آتی اور ملا..... سنا سنا سالوں تک میں غفلت میں رہی..... اور آج جب مجھے غفلت سے بگایا گیا تب اور صرف اسی ایک ذات سے رشہ رکھنا چاہتی ہوں..... ”ناور کبر ری“ جی اور انک مولوی کی اس کے رخساروں سے لڑھک کر اس کا گریبان مجھ پر ہے..... کمرے میں موجود باقی وہ ہم سارے اس کو کن رہے تھے..... مگر مجھ میں کسی کی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی کچھ بولے تو کیا وہیں خاموش بیٹھے تھے اور ناور دو زانو بیٹھی ایک عسات بیاہری تھی..... عداوت اس بات کی ایک ہی اعراض اس نے غفلت اور نا بھگی میں بسر کیا تھا۔

آج روم میں کھانے کی میز چکی ہوئی تھی..... فضل اللہ، نوریہ اور ولید تینوں ہی وہاں موجود تھے۔ مگر ناور موجود نہیں تھی..... میز پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے مگر کسی کا بھی ان کا تھک چکی کانے کا نہیں چھوڑا تھا..... ولید نیچے نیچے چھوڑے اور کوئی کوئی آنکھوں کے ساتھ مری قلعے کو گھور رہا تھا..... فضل اللہ پانی کے گلاس پر انہیں بجائے کسی شمع سوچ میں گم تھے۔ ولید خاموشی سے مگر آنکھوں کی نمی کو وہ پار بارش کے کنارے سے صاف کر رہی تھی..... عجیب

”ولید سے ہم نے جو کچھ سنا ہے اس میں کس حد تک سچائی ہے؟ کیا واقعی تم.....“
فضل اللہ اس سے کثرت اعجاز میں پوچھ رہے تھے..... ”میرہ خاموش بیٹھی بیٹھی ہو اور شہر کو دیکھیں..... جبکہ ولید ایک طرف کھڑا ہونے کا تہا رہا۔

”جی..... سب سچ ہے..... ایک ایک حرف.....“ وہ اعتراف کر رہی تھی.....
”تمہیں شرم آتی چاہئے..... اتنی بے جا..... اتنی بے خبری.....“ میرہ بکھڑے تھے.....
”فضل اللہ نے آٹھ کے اشارے سے انہیں خاموش کر دیا..... میرہ ہونٹ چباتے ہوئے گھٹنیں..... وہ دونوں آج ہی کی غلاٹ سے اسلام آباد پہنچے تھے.....
”تم ہمیں بتاؤ کہ اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ فضل اللہ نے پوچھا.....
”میں اپنا جواب ولید کو دے چکی ہوں.....“ وہ اطمینان سے بولی.....
”ہم تمہارے منہ سے سنا چاہتے ہیں..... ولید سے ہماری بات چیت کچھ دیر قبل ہو چکی.....

فصیحہ کہتے ہوئے بولے.....
”جب سب جان چکے ہیں تو پھر میرے دوہرانے سے کیا فائدہ؟“ اس نے کہا.....
”ناور! تم ہمارے گھر کی عزت ہو..... ہماری بہو..... تمہارا کوئی بھی چڑھائی اور اونٹ

ہمارے پورے خاندان کے لئے یک جہتی کا سبب بن سکتا ہے.....“ انہوں نے سمجھنا چاہا.....
”ڈاؤنی پلیز!..... میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا رہی کہ جو آپ کی یا باقیوں کی عزت.....
یک جہتی کا سبب بنے.....“ اس نے ہنسنے میں جواب دیا.....
”تم جو قدم اٹھانے جا رہی ہو اس میں فائدہ کچھ ہے اور نقصان زیادہ..... تم باقیوں کی راہ

سب برادری والے تمہارا بائیکاٹ کر دیں گے..... تمہارے والدین تک ابھی معاملہ نہیں پہنچا.....
شیرینی ہے کہ وہ بھی تم سے قطع تعلق کر لیں گے..... کیا فائدہ اس راہ پر چلنے کا جس میں سراسر نا
امید ہے..... کھانے کا سودا کرنے سے بہتر ہے کہ تم ایک بار پھر سوچ لو..... تمہارا فیصلہ جہاں جاتی
کچھ مشکل ہو..... وہاں ہو..... یہ زندگی جو تم نے بنائی ہے یہ صرف اور صرف خاندان بھائیوں پر
رست ہے..... اس پر چلنے سے تم لاپرواہ ہو جاؤ گی..... تنگ جاؤ گی..... کسی کیڑے کی طرح
سبک کر گئی ہوئی زندگی بیٹھے سے بہتر ہے کہ تم وہاں پلٹ آؤ..... دین کی عزت ہم لوگ بھی
ہیں..... مسلمان ہم لوگ بھی ہیں..... ہم ہم دنیا اور دین کو ساتھ لے کر چلنے ہیں کہ یہ ضروری ہے.....
کہ دور میں کون اتنا پکا دیکھ رہا ہے؟..... زعمہ رہنے کے لئے جو اصول بنائے گئے ہیں وہ

ماہم کدہ بٹھا ہوا تھا ماحول۔ ولیدہ بالکل گم سم سا کانٹے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ پار پار دیکھ کر اس کی ہنسی پھیلنے پر زور سے ملتا اور پھر ہلکتا۔ "نیرہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ تو اسے ٹوک دیا۔

"تجھہ دیکھ کر بیٹھو گے اپنا۔"

اس نے ماں کے ٹوکے پر کوئی توجہ نہ دی۔

"ولیدہ! میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" انہوں نے قدموں کی آواز میں کہا۔

"تجھہ کے زخمی ہو جانے سے کیا ہو گا کی؟..... اس نے وہ تکلیف دہ کھیل روک دیکھا۔

"تکلیف ہو گی بیٹا! خون بھی نکل سکتا ہے۔" انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔

"یہ تکلیف اس تکلیف سے زیادہ ہرگز نہیں جو اس وقت میرے دل میں ولیدہ نے دھکم پور کر رکھا ہے۔"

"ہم اسے سمجھا رہے ہیں۔ اس کے پیسے سے بات کریں گے۔ وہ ضرور پہلے ہی سہو جا جائے گی۔" انہوں نے دلا سربا۔ ولیدہ گھٹ خورہ سانس پڑا۔

"سب دل بھلاوے کے دلا ہے ہیں۔ اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ میں اسے آپ طرح جانتا ہوں۔ اور پھر اگر وہ چلت بھی آئے تب بھی میں اسے پہلے جیسا مقام نہیں اس نے میرے جذبات کو کھینچ پھینکی ہے۔" ولیدہ نے ہنسی سے کہا۔

"دنیا صرف ہمارے ہاتھوں پر آکے ختم نہیں ہوتی ہے۔ اس سے آگے اور بھی جہاں باقی ہے روک رکھا ہے پیسے روکے؟ تنہا بیٹا آسان کا نہیں ہوتا۔" نیرہ نے سمجھا۔

"نی! اللہ! تو میں اس پاپک پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی میں اندر سے بہت ڈنڈر چلیز پھر نی! اللہ! اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ کرسی ٹھیک کر کھڑا ہو گیا۔

"کھانا تو کھاؤ۔" نیرہہ بولیں۔

"نہیں تھی!..... بھوک نہیں ہے۔" وہ بیڑ لاری سے بولا۔

"جینو ولیدہ!..... فطیل صاحب انکی دیر میں پہلی مرتبہ بولے۔

"مجھے بھوک..... اس نے کہنا چاہا۔

"میں نے کہا ہے۔ جینو۔ بھوک نہ ہو جب بھی دو چار ٹوالے کھانے ضروری ہیں! آرڈر کیا تو وہ ناچار بیٹھ گیا۔

"نیرہہ! اسے کھانا سرور کرو۔" ان کا دوسرا حکم یہی تھی کہ لے لے گا۔ نیرہہ نے پلاؤ کی پک تھوڑے سے چاول اس کی خالی پلینٹ میں نکالے۔ وہ پاؤں تو اسے کھانے لگا انہوں۔

اشارہ کیا اور خود بھی کھانا لگا لے گئے۔

"میں نے سوچا ہے کہ تم ہمارے کو لے کر سونڈر لینڈ چلے جاؤ۔ وہاں سے کچھ

اٹ مارا اے (Stay) تقریباً مہینہ بھر کا ہو گا۔ میں نے سارا انتظام کر دیا ہے۔ تم آ جاؤ۔ کرواؤ ہر سون کی کلائنٹ سے تمہاری روٹا گیا ہے۔ وہ خود ہی سارا پلان ترتیب دے گا۔ بناؤ بدل کے رہ گیا۔

"اور یہی تو حق نہیں ہوتی۔ نہ ہی ضرورت کہ کسی سے مشورہ ہی کر لیں۔ بس حکم صادر کر دو۔ غلط رہا تھا۔ کڑھ رہا تھا۔

"میں نہیں جانتی ہوتی ہے اور آپ گھوٹے پھرنے کی بات کر رہے ہیں۔" نیرہہ نے

اس پلینٹ میں جلی ہے جیسی تو گھوٹے پھرنے کی بات کر رہا ہوں۔ یہ سیرے تو فرنگ کریں اہل، آب و ہوا بدلے گی تو ہمارے بھی اچھا اثر پڑے گا۔ اس کی سوچ میں تبدیلی آئے

لے لے گئے کی دور ہو گی۔ ان دونوں کو مکمل تھپائی اور ایک دوسرے کے لئے وقت ملے گا تو اہل بے ڈھنگی کا احساس ہو گا۔

"نہ آپ کی درست ہے۔ یہاں تو ولیدہ کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا ہے۔" شوہر کی بات

پر بھی آنکلی گئی تھی۔ اس کا دل ہوا اس سے عشق ہو گئی تھی۔

"آپ..... آپ لوگ خود ہی سب کچھ ڈن کر رہے ہیں۔ پہلے مجھ سے تو پوچھ لیں کہ میں

اہل۔" ولیدہ جیسا تک صرف ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اب جھنجھکا کے بولا۔

"یہ کیا پوچھتا ہے۔ ہم تم کو کھڑے ہیں۔" فطیل صاحب نے اطمینان سے کہا۔

ای کی آپ پر فیصلہ، بات بالائی کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ پلیز! آپ اس وقت

میں بیٹھتے کریں۔ میں اور ہمارے گھر میں نہیں جا رہے ہیں۔ اس کے لئے کچھ ہے۔ اس کا

دو نہیں ہو گا۔" ولیدہ نے ہنسی سے بولا۔ اس کے انداز میں کسی قدر کجی کا بھی مضمر تھا۔ فطیل

نہ بعد بیٹھنے کے بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔ نیرہہ بھی خاموشی سے جینو میاں اور بیٹے کو باری

پر لگیں۔ ولیدہ ان کی ساری اولادوں میں سب سے زیادہ خوشے دلہن اور خوشی زبان کا

لہا اس کے حراج میں تھری دینی نہ تھی۔ اس نے بھی اپنے والدین سے اونچی آواز میں بات

کی تھی۔ مگر آج اس کے اس سچو دکائی لہجے سے یہ کادای تھی کہ وہ مافی طور پر کس قدر ڈرا ہوا

ہو رہا تھا۔ اس کے قدموں پر ہوا ہے۔

واپس آ کر اس کے لئے..... "نیرہہ نے اسے ٹوکنا چاہا مگر فطیل صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے

کرا دیا۔

ایلی آگئی تو ہر دیر دی وین..... جگہ و ماحول کی تبدیلی اس اب پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ پلیز

لوڈر اسٹینڈر ڈرئی ٹو اوڈر اسٹینڈر ہی ایڈر..... "ولیدہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں قما لیا۔

زادہ بیٹے ایک کو کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟..... فی الحال دل سے امید کی اس کجی سی

ہاوت سمجھنے دو۔ مگر بچانے کی کوششوں میں سے ایک کوشش یہ بھی ہے۔ تم اپنے دل کے ساتھ

شوخی سے کہا۔

”نہیں..... بلکہ اس لئے کہ تم واقعی ایک ذہین بچے ہو۔ اور ذہین لوگ مجھے بہت پسند ہیں۔“ تیمور نے ہنستے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

”خیر آپ مجھے بار بار پچھیں کہیں۔ میں جڑا ہوں۔ آئی ایم ٹین ایئر ز اولٹ..... اے اے اے کڈ۔“ وہ منہ ہٹا کے بولا اور اس کے اعتراض کرنے کا یہ انداز تیمور کو بھاجھا۔

”لو کے..... آئی ایم سوری..... سوسنر تیور! آپ ہم سے دوستی کریں گے؟“۔ جیہ۔
ہوڑا تھ آگے بڑھا۔

”یہ میں اتنی جلدی کسی سے دوستی کرتا نہیں۔ مگر آپ مجھے اچھے لگے ہیں۔“ بچہ اس سے ہاتھ ملاتا۔ کشف دل، عداوت، دشمنی اور کج فطرت ختم ہو گئی تھی۔

خدا۔ اُس نے گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالی۔ ابھی بھی پندرہ منٹ باقی تھے۔

”ہم لوگ لندن جا رہے ہیں۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ بچہ اس کے پاس ہی بیٹھا۔
مجھے لگا۔

”ہم بھی لندن ہی جا رہے ہیں۔“ تیمور بولا۔

یہ کہ آپ سے ساتھ جا رہی ہیں؟ بچے کے لٹک کی طرف اشارہ کیا تو تیمور نے غصے سے دیکھا جو بظاہر لائق سے بیٹھی تھی۔

اب دیتا ہوا بولا۔ کشف نے اس کو نظر انداز کرنے کا پورا پورا ارادہ کر رکھا تھا اور اس وقت

دے پر عمل کر رہی تھی۔ جانتی تھی کہ اگر اس کی وہابیات باتوں کے جواب میں تملکائی توہمات مزے لگے اور اس وقت وہ انامہ و خفا نہیں کر سکتی تھی۔

”یہ آپ کی وائف ہیں؟“ خاتون نے تیور سے پوچھا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی ہلکا سا مسکراہٹ پھیلی۔

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں انداز میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہی ہوں۔“

”کشف نے فوراً سے مشتر وضاحت کر دی۔

میرے چریٹڈ پاکستانی بھائی ہیں۔ اس سے قبل ہم لوگ کیلیفورنیا میں رہا کر رہے تھے۔

میل کا ٹرانسفر لندن میں ہو گیا تو ساری میلی کو بھی اس وجہ سے لندن شفٹ ہونا پڑا۔ "خاتون خاصہ" باتوں کی خاتون لگ رہی تھیں۔

”یہ میری چھوٹی بہن ہے مریم۔ ہم بیارے اسے موم کہتے ہیں۔ اس کی شادی بھی لندن میں ہے۔“ مریم اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

ہے۔ اس کی رہائش ہم سے خاصی دور ہے۔ کراچی میں قمار امیہ ہے۔ اس سال، کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم اکتھئی کراچی آ گئے تھے۔ اوہ..... میں نے اپنا نام تو بتایا ہی ہے۔

...لی کہتے ہیں۔ اور آپ؟“

”میرا نام کشف عارفین ہے۔“ کشف نے بتایا۔

”بہت خوب صورت نام ہے۔ لیکن آپ اپنے نام سے زیادہ حسین ہیں۔“ بڑی بے باکی اور بے اُسل روی نے اس کی تعریف کی۔ وہ جمیپ گئی۔

ای پل ان کی فضاء کی انوائس منف ہو گئی۔ وہ سب اپنا اپنا پنڈ کیری (دقی سامان) لئے غلت

”ایک لمبی اور تھکا دینے والی فلاسٹ ہوتی ہے یہ بھی۔ آپ پہلی مرتبہ جا رہی ہیں؟“ روبی نے

”جی ہاں۔“ کشف نے سر ہلایا تو روپی نے اپنا سر ہلا دیا۔

”ارے سنی!..... ادھر آؤ۔ ساتھ رہو سنی!“ سنی لوگوں کی بھیڑ میں آگے نکل گیا تھا۔ روہی اسے روکا کرتی اس کے پیچھے تفریبا بھاگی تھی۔

”خاصی انٹرنٹنگ خاتون ہیں۔ ہے؟“ تیمور جو اس کے پیچھے ہی تھا، بولا۔

"آپ کو تو ہر خانوں ہی انٹرنگ ملتی ہے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نظر نہ رہی۔
 "مجھے تو آپ کی بات سے بھرپور اتفاق ہے۔" تیمور نے مسکرا کے اس کی جان جلائی۔ وہ ہنسنا

”اے دادو، میرا آپ دادو، انا مثل میں رہیں گی؟“ اس نے ایک سوال دیا۔

”میں چاہے جہنم میں رہوں، یہ میرا دوسرا ہے۔ آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔“

”ہائیں..... جہاں رہیں، خوش رہیں۔“ تیمور نے بڑے دل سے دعا دی۔ کشف نے غصیل

اُس سے مزکر اسے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر آگے دیکھنے لگی۔ جبکہ تیور کے ہاتھوں پر دل جلانے کا لہجہ تھا۔

[illegible]

اس کی بد قسمتی تھی کہ تیور کی سیٹ اس کے بالکل برابر تھی۔ وہ خون کے ٹھونٹ بچتی ہوئی صبر سے

ای۔ی۔ روی، ان کی بہن اور دونوں بچے کی اسی روی سسوں پر مبنی ہیں۔
 کی ہشتیں ہیں۔

اس کا ہوائی جہاز میں یہ پہلا سفر تھا۔ کچھ تجربہ اہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ طرہ برابر میں بیٹھے، یورو

۱۸ مارے نے دن وے پر تیزی سے بھاگنے کے بعد ایک آف کیا تو اس کا دل اچھل کر مطلق تک آ

۱۰۔ ایک بہت چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ لڑچی ایئر پورٹ کی روشنیاں اب نئے نئے چمکوں کا روپ

تیرے کشف اس کے ساتھ جیسے بھاگ رہی تھی۔

یعنی ایلنے..... ذرا اپنی اسپینڈ کم کر دی؟“ کشف ہانپ سی گئی۔

”بولنے کی بجائے کی؟“ یعنی نے شرارت سے کہا۔

”دووں کی۔“ کشف نے بے اختیار کہا۔

”اوکے۔“ اور پھر اس نے اپنی چٹکی کے رنڈا کر کم دی۔ ”وراصل یہاں کی زندگی ہے۔

ہے۔ بس اپنی تیزی کے عادی ہیں ہم۔ تم بھی یوزو ہو جاؤ گی۔“ یعنی نے نارمل سے ان کا

”اچھا..... اگلے کیسے ہیں؟ میری ان سے فون پر بات ہو گئی تھی۔ تم ان کی موٹ فلورٹ

رہ چکی ہو۔ انہوں نے بتایا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ تمہارا خیال رکھوں۔“

”سربستہ ہی باتیں ہیں۔“

”یہ فراموشی ہے کہ تم یہاں رکھ کر آتی ہو۔ پارکنگ میں روکی ہے۔ اور

اپنی کہہ کر اس کی سنے بغیر تیرے قدم اٹھائی چلی گئی اور وہ وہیں کھڑی ہو کر اس کے

سوچنے لگی۔

”آپ یہاں آگئی کیوں کھڑی ہیں؟“ تھوڑی کر آواز پر وہ اچھل پڑی۔

”آپ کو اسٹارٹل ہے کیا؟“ وہ تھیں گھبرائیں اس سے دیکھنے لگی۔

”ہاں..... مجھے آپ کو تنہا دیکھ کر اچھا نہیں لگ رہا۔ میں آپ کو کتنی دے سکتا ہوں۔“

سے بولا۔

”آپ کی کتنی سے لاکھ روپے بھڑے اکیلے رہتا۔“ وہ دلچاسی سے بولی۔

”ہائے داوے، آپ کہاں اسے کر رہی ہیں؟“ بتایا نہیں آپ نے۔ ”وہ اس کی با

کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”آپ میرا اچھا نہیں چھوڑ سکتے؟“ آخر کیا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ تنگ آ گئی۔

”میں آپ کو چاہتا ہوں کشف!“ جانے کیسے اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ کشف کے ہر

رنگ بدتر بدل رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ اس قسم کا جواب دے چکا تھا اور آج

وہی بات کی تھی۔ وہ کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اس طرح بحث شروع ہو جائی۔

”میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ نہ ہی آپ مجھ سے آئندہ بات کرنے کی کرا

گے۔ اغڑ سٹینڈ!“ وہ بے درجنہا سرد دلچسپی سے بولی۔

”مجھے آرڈر دینے کا حق تو میرے فادر کو بھی نہیں ہے۔ آپ مجھے آرڈر دے رہی ہیں؟“

نیرمی کھڑا تھا۔

کشف نے کمری سانس لے کر اُسے دیکھا۔ ”فو..... وہ اس از جنت اے ریکوئسٹ۔

لیوی الون۔“ وہ جتنی اعزاز میں بولا۔

”وشن رائٹ۔“ مجھے ایسا ہی اعزاز پسند ہے۔ اوکے، پھر ملیں گے۔“ ہائے۔ ”وہ ال

اور اُتر آئے ہوئے آگے بڑھ گیا اور کشف سوچنے لگی کہ اس لوٹے کی لیس سے کیسے چپٹا

ہائے۔

”ام کشف!“ یعنی کی آواز نے اسے پرکٹایا۔ اس نے یعنی کے ساتھ مل کر اپنا سامان کار کی

اور کما اور پھر اس کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اور لوکاں کو تھا جو تم سے باتیں کر رہا تھا؟“ ایئر پورٹ کے اماٹے سے نکلے ہوئے یعنی نے

اما۔

ہوئی ایک فرینڈ کا کزن ہے۔ یہاں پڑھنے آیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

ناسا پیڑس ہے۔ جہاں فرینڈ ہے؟“ یعنی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ کشف نے مختصر جواب دیا۔

”میں “نارغ“ ہے وہ؟“ یعنی منکرلی۔ کشف خاموش رہی۔ ”اب اگر ملے تو میری دوستی کروا

میں آج کل میں جوزف سے چمکھارا پانے والی ہوں۔“ وہ مونڈ کاتے ہوئے بولی۔

”جوزف؟“ کشف نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں فرینڈ..... مگر اب میں اس سے بیز ہو گئی ہوں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ مجھے بیز

لگا ہے۔“ ہائی داوے جہاں فرینڈ کے کزن کا نام کیا ہے؟“

”بوز۔“ کشف نے کمری سانس لیتے ہوئے بتایا۔

”کزن ہم۔“ اچھا کشف! تمہارا ایک بک ٹیم ہے؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”نہیں۔“ یعنی بک ٹیم پسند نہیں۔ اپنا نام ہی اچھا لگتا ہے۔“ کشف نے جواب دیا۔

”اوکے۔“ ویسے تمہارا نام آسان سا ہے۔ کشف..... چھوٹا سا بھی ہے۔“ یعنی نے رائے

بڑھائی کا اظہار کیا۔

”میں..... سر نے بتایا تھا کہ تم کسی ٹیم میں جراثعت سسٹم کے تحت رہتی ہو۔ پہلے ہاسٹل میں

میں۔“ ہاسٹل کیوں چھوڑ دیا؟“ کشف نے موضوع بدلا۔

”اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجوہات یہ کہ ہاسٹل بہت ہی میکانج پڑتا ہے۔ اسی لئے یہاں پر

جراثعت اور خشک سسٹم ہے۔ دوسری وجوہات یہ کہ ہاسٹل میں پابندی بہت ہوتی ہیں۔ ہر چیز

کی ایک فزڈری دائر میں قید کر رکھنا پڑتا ہے۔ جبکہ پارٹمنٹ میں ایسا نہیں ہوتا۔ اپنی مرضی پختی

”اور اسے تفصیل سے بتانے لگی۔“ اسے ہاں ہاں۔ ”تم نے اچھا یاد دلایا۔ ایک بہت ضروری بات بتائی

اور۔“ یعنی کو اپنا بک ٹیم یاد آ گیا۔

”اوکیا؟“ کشف اس کو دیکھنے لگی۔

”میں جس ٹیم میں رہتی ہوں اس کے تین پارٹنرز ہیں۔ میری۔“ سارا تھا رائٹل۔ میری آج

فریڈ تھی ہے۔ وہاں کے ایک گاؤں سے متعلق ہے اس کا اور آج کل وہ وہیں گئی ہے۔ میری

کرتی ہے۔ سارا تھا فرانس سے آئی ہے اور یہاں کی مقامی بیٹھ رشتی سے آئی آر کر رہی ہے۔ انٹل

ہاں..... اگلے تارے تھے کہ تم کو داکن بہت اچھا بناتا آتا ہے۔"

"ہاں..... میرا عشق ہے۔"

"نکد..... تو داکن والی جاب تو کی کبھی۔ ایک بچہ کو داکن سکھاتا ہے۔ سکھاؤ گی؟"

"نہرہ..... کشف پر ہوش ہو گی۔"

"خدا وہ اچھی دین گے وہ لوگ۔ امیر ہیں۔ تم ایک گھنٹہ داکن سکھانے کے لئے رکھو۔ آج تم اگر داکن اتار دو۔ کل پندرہ تیرے چا کے وہاں کے کام نہ لائیں۔ میری کلاس تو تین بیٹے تک ختم ہوئی۔ میں وہیں سے اس ڈیپارٹمنٹل اسٹوڈنٹ بنی جاتی ہوں جہاں پر میں کام کرتی ہوں۔" لے کے بھی پات کر رکھی ہے۔ تم نے کل اسٹور کی دکان سے ٹی لیا۔ بھڑکی کرواں ہے۔ ہوتی ہے۔ دھنکی بہت ہے۔ تم میں نظر میں جھکا کر سختی رہتا۔ بہت کم لفظوں میں جواب دیتا۔" وہ اسے مختلف دایات و سرے تھی۔

"..... یہ راقبت۔ ایک چالی میرے پاس رات ہی اس کی اور ایک اس پائیناں کے بچے۔" لے پائیناں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اکثر رات کو لیت آؤر دوں لوفٹی ہوں اس لئے یہ چالی نے انگ سے دیکھ کر میرے ساتھیوں کو پریشان کیا تھا کہ اسے اپنے پاس میں ہالی ٹال کر دروازے کا لاک کھولا۔

"آج ساتھ آؤر آئیل کی ڈیٹ ہے۔ دونوں دیر سے گھر لوٹیں گے۔" یعنی نے اندر آ کے بتیاں پائیں۔ "یہ راجا چھوٹا سالیٹ۔"

"کشف نے ایک کھا کھلیٹ پر ڈالی۔ بے حد مختصر سالیٹ تھا۔ داخل دروازے سے اندر آ کر آٹا تھا جس کے اندر ہی ایک کونے میں بے حد مختصر سا بچن تھا۔ ایک اسٹوڈنٹ جس کے بارہ دوڑ کر کھا گیا تھا۔ لاؤنج فور سٹیک کی تھی۔ ایک چھوٹا سا بیوی بھی موجود تھا ڈرائی کے اوپر۔ جگہ چھوٹی تھی مگر بے حد اچھی تھی۔ اسے قدرے اطمینان ہوا۔

"باب میری جگہ ہوئی تھی جس کے اوپر بے حد کھڑکیاں اور چند قلم رکھے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا بیٹی بیس تھا جو آدھا بندہ، آدھا کھانا تھا۔ اس میں سے چند مردانہ کپڑے نظر آ رہے تھے۔

"یہ آئیل کا سامان ہے۔ وہ یہاں سوتا ہے۔ پچھلے روز اس طرف ہے۔" یعنی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹا۔ کشف اس کے پیچھے اندر چلی آئی۔ لاؤنج جس قدر صاف تھا، کمرہ اسی قدر گھرا ہوا تھا۔ یہاں بھی قلم سٹیک تھی۔ ایک کپڑوں کا اسٹینڈ بھی نظر آ رہا تھا جس پر زینہ نہ کپڑوں کی بھرمار کر کے میں ایک بڑی سی دیوار گارڈری بھی تھی جس کے تین خانے تھے۔

"اس الماری میں میرے، میری اور ساتھ کے کپڑوں اور دوسرے سامان کے بعد اب تمہارے کی کچھ کپڑیں ہیں۔" اسٹنڈ پر کمرے کی جگہ بھری ہے۔" یعنی نے نکد سے اچکا کر اس کے بیگ کی اسٹارٹ کیا۔

اٹریں ہے۔ وہ بھی پڑھنے آیا ہوا ہے اغلیا۔ میری تقریباً ایک مہینے کے لئے اپنے گھر کی ہے۔ اس نے اس کی جگہ خالی ہے۔ دراصل میں جس اپارٹمنٹ میں رات ہی ہوں وہاں صرف ایک کمرہ ہے۔ ایک کمرہ، ایک لاؤنج اور ایک ہی باتھ روم ہے۔ باری باری ہم چار لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بچن ہے جس میں سب اپنے اپنے کمرے کے لئے کچھ کچھ چیز بناتے ہیں۔ ہم تین لڑکیاں کمرے میں سوتی ہیں۔ سب آئیل کا بیڈ روم لاؤنج ہے جسے وہ بطور اسٹڈی استعمال کرتی ہیں۔ اب اس کے استعمال کے لئے اب آئیل کے کمرے پر میں جھیں صرف بنگ اپنے ساتھ ہوں جب تک کہ میری وہاں نہیں آ جاتی۔ اس کے آنے کے بعد ہمیں وہ ٹیلیٹ چھوڑنا ہو گا۔

"مگر میں رہوں گی کہاں؟" وہ یکدم بہت پریشان ہو گئی۔

"ڈونٹ وری۔ ابھی پورا مہینہ باقی ہے۔ مل جائے گا کوئی نہ کوئی کمرہ۔ اور تمہاری جا بندوبست بھی کر لیں گے۔ لیکن یہ لندن ہے۔ یہاں صرف ایک جاب سے کام نہیں چلے گا۔ یہ اپارٹمنٹ سسٹم میں ہر چیز کے خرچے کو آدھا آدھا بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر اخراجات، وغیرہ وغیرہ۔ خیر میں جھیں سب چیزوں کے متعلق خاص خاص باتوں کی ڈیٹیل بتا دیتی ہوں۔" اس کے بعد باقی تمام راستے میں وہ کشف کو بہت کچھ بتاتی اور بھینتی رہی تھی۔ کشف باتوں کو غور سے نہ رہی تھی۔

"کافی دیر بعد یعنی نے کہا ایک قدرے پرانی اور ٹھیک سی عمارت کے باہر پارکنگ میں روکی۔" آج آؤ..... یہاں سب اپنا اپنا چھ چھوٹا خانے ہیں۔ مہمان نوازی کا روانہ نہیں ہے پاکستان کی طرح۔ مگر میں پاکستانی ہوں۔ یہ ثابت کرنے کے لئے تمہاری ویلپ کر رہی ہوں۔ گھول کر کشف کا سامان نکالے ہوئے وہ کمرہ ہی تھی۔

"ٹیکس اس کے کشف نے اس کا گھر یہ ادا کیا۔

"اس لوگے یار..... چلاؤ۔" یعنی نے ایک بنگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ دوسرا بنگ نکال دیا تھا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی عمارت کے اندر داخل ہو گئیں۔

"تو رات کو یہ ہے۔ راقبت۔ اور لوفٹ آئی کل خراب ہے۔" وہ خیر حیاں پر جتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔" کشف مردانہ ہوئی۔

"لوفٹ یہاں اکثر خراب ہی رہتی ہے۔ اب تو خیر حیاں پر جتے آئے کی اتنی عمارت ہوئی کہ لوفٹ بھی بچ ہو تو اسے استعمال کرنے کا خیال ہی نہیں آتا۔" وہ فس کے بولی۔

"خیر حیاں خاصی ٹھیک سی تھیں۔ عمارت بھی قدرے تاریک اور پرانی لگ رہی تھی۔" یہ عمارت تو ہندوؤں کے قدیم گھروں جیسی لگ رہی ہے۔" وہ بولی۔

"ہوں۔ یہاں سسٹم کے کام اپارٹمنٹس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پرانی عمارت کی طرح۔" یعنی "تم بھی جاب کرتی ہو؟" کشف نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہاں رہنے والا ہر شخص نوکری کرتا ہے۔ پاکستان کی طرح ٹھیک نہیں ہیں۔" یعنی

”نہیں نہیں..... سناؤ کرنے کی کیا بات ہے۔ میرا سامان ویسے بھی مختصر ہی ہے۔“
جلدی سے بولی۔

”تم یہاں سوتے ہیں۔ البتہ سارھا اکثر لاؤنج میں ہی سوجاتی ہے۔“ معنی خیز انداز
مسکرائی تو وہ ہلش ہو گئی۔ اُس کی بات کے معنی وہ ابھی طرح سمجھ کر بھی تھی۔

”سارھا تو اندر ہی لڑکی ہے۔ البتہ میری اچھی ہے۔ شہار ہے۔ تہارے آنے کی خبر پر
نے ان لوگوں کو ہی تو سب سے زیادہ اعتراض اسی کو تھا۔“ اپنی سب سے کوئی خاص اعتراض
تھا۔ ”میں اپنی اونچی نیلی کی سینڈل اتارتے ہوئے بولی۔ ”تم کچھ کھاؤ گی؟“ معنی نے پوچھا۔
”نہیں۔“ نیلین میں کھا لیا تھا۔ میں نہانا چاہتی ہوں۔“ کشف نے کہا۔

”اوکے..... ہاتھ روم باہر ہے۔ تم نہاؤ، میں اپنے لئے کافی تیار ہی ہوں۔ کافی تو چہرہ
میں نے باہر جاتے جاتے دک کر پوچھا۔
”شیر۔“ وہ مسکرائی۔

”اوکے۔“ معنی باہر چلی گئی اور کشف بیک میں سے اپنے کپڑے نکال کر لاؤنج میں
پھونے سے غسل خانے کی طرف چلی گئی جو اندر سے بھی خامسا چھوٹا تھا مگر صاف سترہ تھا۔
کشف نے کچھ لنگی جب وہ صوفی رہی تھی۔

”نہن میں موسم ہفتے کے چوں تو لاؤنج باہر آکر دھو رہا ہے۔“ معنی آتش دان میں آگ جلا
کے جب اس کے قریب رہے تبھی معنی۔ کشف وہیں آ کے بیٹھی۔
”جھینکس!..... اس وقت یہ کافی اور یہ آگ ٹوٹ لگ رہی ہیں۔“ وہ مگر مارم کافی کا
بھرتے ہوئے بولی۔

”مراچی میں تو موسم اس آتش دان..... ایسی کافی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ معنی بولی۔
”ہاں..... وہاں کا موسم ہی ایسا ہے۔“ کشف نے اپنے گیلے بالوں کو تھپے کی قید سے آزاد
”نئی گڈنس۔“ تہارے بال ہیں یا بنگال کا کالا جاوہر؟..... جس قدر حسین ہیں۔ کیا گالی
میں نے حیرت اور حسرت سے اس کے بالوں کو دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں..... قدرتی ہی ایسے ہیں۔ میری ام نے کبھی میرے بالوں کو گلیا
دکھائی۔“ وہ ہنسی۔
”اچھا..... صبح چہرے اٹھاتا ہوگا۔ اوکے۔ میں روز چائنگ کرنے جاتی ہوں۔“ چلو گی
نے کہا۔

”خیر..... ابھی عادت ہوتی ہے یہ تو..... اچھا معنی! قبلہ کس طرف ہے؟“ کوا۔
پوچھا۔

”قبلہ..... پتہ نہیں۔ کیوں؟“ معنی نے شرمندہ ہوئے بغیر کندھے اچکا کئے۔
”نماز پڑھتی ہے کیا تم نہیں پڑھتی نماز؟“ کشف نے ہلوس سے اسے دیکھا۔ یہ ایک

ہی تھے اپنی جائے رہائش پر قبلیہ کی ست کا عی پتہ نہیں تھا۔
”ہم نہیں ملنا۔“ وہ بے دلی سے بولی۔

”حیرت ہے..... مسلمان کو اپنے سب سے ملاقات کرنے کا وقت حاصل نہیں۔“ ایک گھبر آواز
ایں ساتوں سے نکلی۔

”اس بلڈنگ میں مسلم بھی رہتے ہیں..... میں کل جہیں پوچھ کر بتا دوں گی وراثت۔“
ابھی وہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ بیرونی دروازہ کھلا۔ کشف نے بے اختیار ہی دوپٹے سے سر کو
پر طرح ڈھانپ لیا۔ ایک گندی رنگت والا قول صورت نوجوان اور ایک نیلی آنکھوں اور گوری
دال لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اندر داخل ہوئے۔

”کشف! یہ اینٹل اور اسار تھا ہیں..... اور یہ ہماری نئی ساتھی ہے، کشف۔“ معنی نے ان کا
لہ لہایا۔

”ہیلو؟“ کشف نے پھل کی۔ اینٹل اس سے ابھی طرح ملا تھا جبکہ سارھا کا انداز لئے ویسے تھا۔
کشف نے زیادہ پوچھا نہیں کی تھی۔ اس کو یہاں لوگوں کے موڈ کی نہیں، اپنے مقصد کے حصول کی
ہی۔

رات کو جب وہ سونے کے لئے لیٹی تب اس کے ذہن میں جو آخری بات تھی وہ یہ تھی کہ کل اس
نچوڑی میں جا کے ڈیپارٹمنٹ کے جیٹر میں سے ملتا ہے۔



ہی ہوں کہ زندگی کیا ہے۔ تم میری باتوں کو قلمبند کیے ہو۔ قلمبند کیجئے ہو..... مگر میری باتیں قلمبند ہیں۔ میری باتوں میں جو گہرائی چھپی ہے اسے کبھی سننے ہو تو کچھ جاؤ..... وہ ابھٹکی سے ہو لی۔
 وہ پب رہا۔ اس کی ہر کوشش بے کار جا رہی تھی۔ سوئزر لینڈ آئے آج تیرا روز تھا اور ان نئی
 انسان کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ اسی قسم کی تھی۔ ولید کچھ بھی کہتا، مادھور کا جواب اسی قسم کا
 تھا۔ اور اب ولید سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ایک دن بعد لندن غلطی کر جائے۔ وہاں اس کی ایک
 اینڈنگ بھی تھی جسے اس نے باپ سے چھپا کر رکھا تھا۔ اس اینڈنگ کو وہ کسی بھی صورت منسلک
 نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ اسے کروڑوں کا نقصان پہنانا پڑا اور وہ یہیں چلا جاتا تھا۔

اس کی کلاس شروع ہو گئی تھی۔ یعنی کے ڈریسے اس کو اسٹور پر ملازمت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ وہ
 نہیں سمجھتے کہ کام کئی قسم کی ہیں۔ یہاں وہ سٹور گرل کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ اس کے اور بھی
 کام ایک لڑکی اور دو لڑکے بھی کام کرتے تھے۔ یعنی یہاں کیسٹرن کی ذمہ داری بھائی تھی۔
 لی کے فارغ ہو کر دو سیدھی بیٹیاں چلی آتی تھیں۔

یہاں کام کرتے ہوئے دو روز ہو چکے تھے اور ان دو دنوں میں جو سب سے زیادہ تکلیف وہ
 اس کے سامنے آئی تھی وہ کسی لباس کی تکلیف۔ یہاں پر کام کرنے والے ملازموں کا یہ نظام ہوتا
 تھا کہ کسی اسی دن کو فالو کرتے ہوئے چنٹ شرٹ پہنتی پر رہی تھی۔ البتہ اس نے سر کو اسٹارف
 ماسک نہیں پہنچوا تھا اور ننگے میں چڑھا سا نظری ڈالے رکھتی تھی۔ مگر اسٹارف کے لئے اس
 پر تنگدستی سے اجازت حاصل کی تھی۔ اس میں بھی نے اس کی بہت مدد کی تھی۔

تو شروع شروع میں ابھین ہو گی۔ بعد میں عادت ہو جائے گی۔ ڈونٹ دہی۔ اگر اتنی اچھی
 اور چھوڑ دی اور وہ بھی کھل لیاں کی وجہ سے تو اپنے اعتراضات کیسے پورے کر دی؟..... اور پھر
 کہہ کر یہ نظام میں چنٹ شرٹ ہے۔ یہاں تو اکثر کچھوں پر مٹی اسٹارٹ والے یہ نظام ہوتے
 ہیں۔ اسے سمجھا بھیجا کہ رخصتی کر رہی تھی۔ مجبوری تھی، لہذا اسے اپنے جینٹ کرنا ہی تھا۔ وہ بھی
 اس میں اس کا جسم نمایاں نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ شرٹ کے اوپر اس نے مونتا سا نیکی سویٹر پہنا ہوا

تھو سوچ رہی تھی کہ گڑھا لٹنے ہی اپنے کے کچھ گرم کپڑے اور ضروری اشیاء خریدے گی۔
 "مٹی اقم نے دوسری جگہ جاب کا ہاتھ کیا تھا۔ ایک ہفتے بعد تم نے کہا تھا ہمیں گے۔ ایک ہفتے
 سے دیا ہے۔" اسی روز اسٹور سے چھٹی ہونے کے بعد دونوں بس اسٹاپ کی طرف چلتے ہوئے
 رہی تھیں جب کشف نے اس سے تذکرہ کیا۔

"اور لیکن کسکے والی جاب..... اسے یاد ہے یا رکھو تو بھی چلتے ہیں۔ تم لو....." مٹی نے
 ادا پھر اُتارتے ہوئے کہا۔

"لیک ہے۔" وہ فوراً راضی ہو گئی۔
 "لیکن میرا گریہ ایک طرف کا کام دو گی۔ کیونکہ تمہاری خاطر میں اپنی ذیت کو ایک محض لیت کر

"سوئزر لینڈ کو خواہ اس کی سر زمین کہا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں کہتے..... یہ دنیا میں:
 ہے۔" ولید کوٹ کی سیوں میں ہاتھ ڈالے گہرا ہوا تھا۔

"پتہ نہیں، جنت کے کہتے ہیں۔ جنہیں معلوم ہے ولید! جنت کے کہتے ہیں؟" مادھور نے کہ
 کھوئے انداز میں پوچھا۔

"جنت..... جنت ایک خوب صورت مقام ہے۔ جہاں سب مسلمانوں کو مرنے کے بعد
 ہے۔" ولید نے سوچتے ہوئے کہا۔ اسے بھی جواب سوچنا تھا۔

"مرنے کے بعد..... ہنہ..... کون جانے ولید! مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ کیا بھی تم نے
 مرنے کے بعد کیا ہو گا؟" اس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔

"مک آہن..... تم پر پھر وہ پڑ گیا ہے۔ جنت کیو وہں چاک۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔"
 حلال گیا۔

"مرنے کی بات کرنے سے کیوں ڈرتے ہو ولید؟..... موت تو نجات ہے..... ہر مشکل
 اٹھان سے نجات۔ موت تو وہ راہ ہے جو میں ہمارے رب کے اور زیادہ نزدیک کر دیتی ہے
 تم کو خواہش نہیں ہے اپنے رب کے نزدیک جانے کی؟" اس کا انداز پر اسرار تھا۔ ولید اس کے
 پر تذنب کا شکار ہو گیا۔

"ہے..... مگر میں ابھی جینا چاہتا ہوں۔ ابھی مرنے کی عمر توڑی ہے۔" اس نے جواب دیا
 "وہ صحیح کہتے تھے، یہ سب وہاں ہے۔ ایسا وہاں جو جان کو جھک کی مانند چنٹ جائے۔ یہی
 ہے جو ہمیں "اس" سے لٹنے سے روکتا ہے۔ یہی ہے جس کی وجہ سے ہم نے اپنی ذات اور "از
 کے درمیان ایک دیوار حاصل کر رکھی ہے۔ ہم اس دیوال سے پھٹکارا نہیں پڑا چاہتے اور اس سے ہذا
 حاصل کے باہم "اسے" ہمیں حاصل کر سکتے۔" وہ باتیں کرتے کرتے پھر سے ہمیں کھو گئی تھی۔
 نے ابھی ابھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مادھور! کیا تم نابل نہیں ہو سکتیں؟..... کیا تم قلمبند ہونے کی بجائے عام فہم لفظوں میں
 چیت کرنا نہیں چاہتیں؟" ولید بے چارگی سے پوچھنے لگا۔

"نابل؟" مادھور نے اسے دیکھا۔ تجا نے کیا تھا اس کی آنکھوں میں کہ ولید نے نظریں جھکا کر
 "میں پہلے نابل نہیں تھی ولید!..... اب ہوں۔ کیونکہ اب میں زندگی کی حقیقت کچھ بھیجی ہوں۔"

جائے گا۔" وہ زری سے انکار کرتی ہوئی بولی۔

"تمہیک ہے..... میں تمہیں زیادہ دوس نہیں کروں گی۔ مگر میری آخر صرف رسا کا نکاح نہیں ہے۔" روٹی غلوں سے بولی۔

"میں کس..... کشف نے مسکرا کے کہا۔

"میں تیمور کو بلاتی ہوں۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا اور تیمور کو پکارتی ہوئی لاؤنج سے آگئیں۔ چند لمحوں بعد جب وہ واپس آئیں تو تیمور ان کے صراہ تھا۔ سلیڈ ٹیکر اور نیلی شرٹ میں تیمور میں جراثیم اور جان کر چڑھ جائے، ہاتھ میں ریکٹ پکڑے اور بے ہوش منہ جاتا جا رہا۔

"مام! مجھے کھیل سے کیوں بلایا؟..... آخر کس سے ملنا ہے مجھے؟" وہ انگریزی میں بولتا ہوا تھا۔

"تجارتی غنی انٹرکسز۔ جو کس سے تمہیں واکس بچانا سکھائی گی۔" کشف۔ "وہ" طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ تیمور نے ان کی آنکھوں کے اشارے پر مگردانہ سوز کمرہ ٹھہری ہوئی کشف کو دیکھا۔

"ارے..... آپ تو لیٹن والی آئی ہیں؟" آپ کے ساتھ تیمور ملی خان بھی ایک لمبے میں اسے پہچان گیا تھا اور نہ صرف اسے پہچان چکا تھا بلکہ اسے تیمور ملی خان بھی کشف اس کی بہترین یادداشت اور بہترین حافظے کے متعلق پہلے ہی سے آگاہ نہ ہوئی۔

تجربہ ہوئی۔

"آپ مجھے پہچان گئے۔ گنڈ۔" کشف مسکرائی۔ "آپ کو واکس بچانا کیوں پسند ہے، جو، کی انتہا کرپ کے پتے تو جس قسم کے انٹرڈنشن پسند نہیں کرتے۔" اس نے سوال کیا۔

"میرے بہت سے ایسے شوق ہیں اور بہت سی ایسی پسند جن کو جان کر آپ حیران ہوں گے۔" میں آپ کو بتاؤں کہ میں کبھی نہیں ہوں۔ اسی لئے مجھے بچوں والے کوئی کام بھی پسند نہیں ہے۔ بڑی تنبیہ کی سے رواں انگریزی میں اسے جواب دے رہا تھا۔

"میں! آپ کا بیٹا واقعی اپنے منہ صوفوں سے ہٹ کر ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اسے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ بہت جلد اور بہت ہی اچھا سیکھ جائے گا۔" کشف نے روٹی سے کہا۔

"اور مجھے خوشی ہوگی کہ تم مجھے میڈم کی بجائے روٹی بلائی ہو۔" وہ اپنا نیت سے بولیں۔

"جی ضرور۔"

"تم کھل سے جہان کر لیتا۔ باقی معاملات بھی کھلے کر لیتے ہیں۔" منڈا۔

"آپ جراثیمی خوشی سے دیں، مجھے قبول ہوگا۔" وہ ان کے اسے غلوں اور محبت کے اٹھائی کہہ گئی تھی۔

روٹی نے اسے جیسی بیٹی تھی وہ اس کے لئے کافی بے کشش تھی۔ بس وہ تیمور کا کراہم سے نکل آتا۔ وہ خوش تھی کہ یہ مسئلہ قتل ہوا۔ اب بس ایک مسئلہ تھا اور وہ تھا اس کی رہائی

لے جلدی ہی مل کر تھا۔

لے پورہ تیمور میں آتے ہی اپنے جلوسے دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ اس کی مراد نہ خوب سے پہلے وہ شہریت تھی۔ اس کے بعد اس کی غیر معمولی ذہانت۔ پہلے ہی دن اس نے اسے خود کو اس کا اور گلاس ٹیلور کی نظر میں Supperior ثابت کر دیا تھا۔ پھر جوں کر کہا، اس کی ذہانت کے چرے پوری پورہ تیمور میں ہونے لگے۔ لڑکوں کی نظر میں اس ایک وحش امیر کے لگا تھا اور لڑکوں اسے دیکھ کر وحشی سا نہیں بھرتے تھیں۔ مگر وہ سب انہماں بننے کی ایکلنگ کر تھا۔ یہی اپنی دلیلیو بن جانے کی ایک ادا ہوتی ہے۔

مارٹین عادل سے وہ بے خبر نہیں تھا۔ اپنی چھائی کو نشانے کے ساتھ ساتھ مختلف انٹیرز ساتھ ساتھ اس نے کشف کی بھی پوری پوری جانکاری پاس رکھی ہوئی تھی۔ کشف اس کے انہماقی اور اسے اس پنجنگ میں مفید کامیاب ہونا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ لاکھ عمل ترتیب دے

کشف اسٹور پر اپنی ڈیوٹی دے رہی تھی۔ ڈیوٹی ختم ہونے میں چند ہی منٹ رہتے تھے لیکن اسٹور میں داخل ہوا۔ اس وقت کشف قاری کھڑی تھی جب تیمور ملی خان پر اس کی

..... یہ کہاں سے آن دکھا؟" کشف پوچھا گی۔ وہ جانتی تھی کہ اب تیمور اپنی فضول کی اس کر دے گا اور اسے ٹانگہ سے ڈانٹ پڑ جائے گی۔ مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا تیمور اسے صاف طور پر نظر انداز کرتا ہوا رہیں میں بھی اسیانے غور دینی کی طرف بڑھ گیا۔

لے بجا اختیار حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ یہ تو ممکن تھا ہی نہیں کہ اس نے کشف کو دیکھا۔ وہ اس کے بالکل قریب سے ٹرائی لے کر گزرا تھا۔ کشف نے خاموشی جراثیمی کے ساتھ لہو کیا تھا۔ مگر وہ اب بے خبر سامنے اسیانے ضروریات کو ٹرائی میں ڈال جا رہا تھا۔

وہ نے میری سن لی۔ اس نے میری جان پھوڑ دی۔ وہ بے حد مسرور سی سوچ رہی تھی۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے کام کو کوئی مل کر رہی اور اس کے چرے پر ہنسرے لہو تیمور ملی خان دل میں ہنسنے لگا تھا۔

ای کیلی کا کزن آج آیا تھا اسٹور پر..... ملاقات ہوئی تم سے؟" یعنی واپس پر اس سے

..... میرا اس سے کیا واسطہ؟ میں ہر بار سے غیرتے جوتے نہیں لگاتی بھرتی۔" کشف جواب دیا۔

مئے ہیں۔ اس کے آنے کے بعد بہت پر اہم ہو جائے گی۔" یعنی نے کہا۔

"اوکے..... آپ کہتی ہیں تو میں کچھ کہتا ہوں۔ سوچتا ہوں کچھ۔ مگر اس وقت تو میرے آپ کے بارے میں سوچنا چاہتا ہوں۔ کہیں، کہاں چلیں گی؟ کافی شاپ یا بیئر بار؟" پینٹر ادا۔

"اس ملاقات کو دوستی کی شکل دینے کے لئے کون سی جگہ بہتر سمجھتے ہیں آپ؟" وہ بے پوچھے ہوئے۔

"یہاں ایک بہت اچھی کافی شاپ ہے۔ مگر میں اس کافی شاپ والے سے بھی اچھی کہوں۔" تیمور نے مسیخہ خیر اعزاز میں اسے کہا۔ یعنی نے سر ہٹا کر اسے دیکھا۔

"اچھا، چلیں۔ تو پھر آج آزما لیتے ہیں۔" یعنی نے کبیرہ لیے کھیا۔

"موسٹ ویلکم۔" تیمور نے سر ہٹا کر کہا اور پھر تیمور کے اپارٹمنٹ پہنچے پہنچے وہ دوسرے سے بے حد بے تکلف ہو چکے تھے۔



"تیمور! یہ جگہ اس شہر کا ہر کج ترین علاقہ ہے..... تم تیار رہو کہ یہ قلیق تمہارا ذاتی کسی ہیرو کریمٹ کے بیچے ہو؟" یعنی اپنا فخر والا کونٹا اٹارتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس دونوں تیمور کے قلیق پر موجود تھے۔

"نہیں..... میرے قادر بہت بڑے برنس انگلیوں ہیں۔" تیمور نے بھی اپنی جیکٹ ہوتے بتایا۔

"تمہارا قلیق بہت اچھا ہے۔ تم یہاں اکیسے رہتے ہو؟" یعنی نے توصیفی نظروں اطراف میں دیکھا۔

"فی الحال تو میرے ساتھ ایک ہی ہے۔ جس نے میری تمہائی کو یہاں آکے آباد کر تیمور نے اس کے قریب آتے ہوئے غور کیے۔

"جائے بہت ہوتی۔" یعنی نے شمار آؤدنگز میں پر ہمارا۔

"تم کو تو خدا نے بنا سوار کے بیجا ہے۔" تیمور نے اپنی شہادت کی آگلی سے یعنی کے اسٹک گئے ہونٹوں کو چھوا۔ یعنی نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ تیمور خامی دیر اس پر بھگدڑ سیدھا ہوا۔

"کیا تمہیں اب بھی کافی کی طلب ہے؟" تیمور کے اعزاز میں بہت کچھ چھپا تھا۔

"آج ہماری مکمل ملاقات ہے۔ مکمل ملاقات میں صرف "کافی" کی ہی "طلب" ہے۔

یعنی نے اسی سے اعزاز میں جواب دیا۔

"بہت افریقہ کی ہیں مجھے ذہین لڑکیاں۔ تم حسین بھی ہو اور ذہین بھی۔" وہ مسکرا

میں کافی بناتا ہوں۔" اس نے کہا اور خود کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے لیوں پر قاتلانہ

جو پتا پچکا قاتلہ کا وہ کمرہ ہوا تھا۔ اب آگے کی بازی بھی اسی کی فتح تھی۔



یہاں اور کتنے روز رہتا ہے؟..... میں پور ہو رہی ہوں۔ دل نہیں لگتا ہے میرا۔ مجھے اداس

"دوست بنجاری کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھری ہوئی تھیں۔

ہواریاں ایک دو روز کا کام باقی ہے۔ وہ نشتا ہی چلیں گے۔ میں تمہیں اکیلے بھی بھروسہ

ان۔ مگر وہاں می ڈیٹی کی ہوں گے تمہارا اکیلے جانے کا مطلب وہ کچھ جائیں گے۔ ولیدہ لپ

لک لک کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ سنا تھا۔

وہاں دکھاوے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" وہ سچا ہوئی۔

قرمٹ کرو۔ اس End کا بھی آنے والا ہے۔" ولیدہ نے بولا۔

نہیں کہیں، سب میرے پیچھے بڑے گئے ہیں۔ یہ میری زندگی ہے اور میں ہی اسے اپنی مرضی

ناکرار کرتی۔" وہ دھڑلے پائو ہو رہی تھی۔ ایک بے چینی کی تھی جو اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو

تمہاری زندگی صرف تمہاری نہیں ہے۔ اس پر بہت سے لوگوں کا حق ہے۔ اور سب سے زیادہ

نہیں کہیں تمہارا شوہر ہوں۔" ولیدہ نے سنگ کر لپٹ پاب بند کیا۔

نہیں کہیں کس اعزاز سے کچھ چاہتا ہوں۔ پیار سے، مٹاتی سے، تمہارا شے۔ مگر تمہاری دہی رٹ

میں نے فیملی کر لیا ہے کہ وہاں میں ہی میں تمہارے ماں باپ سے سب کچھ کہوں گا۔" وہ

بے کھڑا ہوا تھا۔

کیا کہیں گے ان سے؟" وہ مانور نے چکر کر چھا۔

کیا سب جو تم میرے ساتھ کر رہی ہو۔ تمہاری بے وقافی کے قصے سناؤں گا نہیں۔" ولیدہ نے

سچ کر کہا۔

نہیں بے وقاف نہیں ہوں ولیدہ!..... بخدا میں بے وقاف نہیں ہوں۔" وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر

لگی۔

ا..... جنت گو توئی۔ تم نے میرا بیٹا دو بھر کر دیا ہے۔" ولیدہ یکدم ہی اس کے رونے پر

آکڑ گیا۔ اس نے "کی ہولڈ" پر سے اپنی کار کی چابی اٹھائی اور جس طبلے میں تھا اس میں

بہر لکل گیا۔ مانور پوچھ رہی تھی۔ معلوم نہیں کتنی دیر وہ رو رہی تھی۔ پھر جیسے آسوا خود

اٹھی۔ اس نے اپنا چہرہ دوپٹے سے صاف کیا اور کچھ پیر مگر کے آنگھن میں آگئی۔

ات کے اندر میرے نے ہر شے کو اپنی لپٹ میں لے رکھا تھا۔ آسمان سے سفید سفید برف کا

حال کھڑوں کی طرح آسمان سے اتاری تھی۔ وہی ہو رہی تھی اور زندگی کے گاموں کی طرح زمین کو

ہی تھی۔

سب کچھ آسمان ہے۔ سب کچھ آسمان ہو کر بھی مشکل ہے۔ زندگی میں کیا حاصل کیا

وصول ہوا؟..... یہ کیا؟" مادھو نے نے اپنی پھٹی پھیلا دی۔ برف کے نختے سے،
گالوں جیسے گلوے اس کی پھٹی پر آئے گئے اور کچھ پر بعد اپنی پانی گئے۔ مادھو نے اپنے
جوتوں سے آزاد کیا ہوا تھا۔ جی بستی گزرتی رہی اس کے گورے نرم گلابی ہرے تھے اور
سر کی احساس گئے بس کسی بت کی طرح کھڑی تھی۔

"کشف کیا تھی، اس گھر کی تو جیسے روئیں ہے جان ہو گئیں۔ اللہ اے زندگی دے۔
روشنی دیتی تھی اس کے دم سے۔ ملاحظہ بہت کم ہوتی تھی۔ اپنی ہی مصروفیات میں سکن۔ مگر ہرگز
جیسے اس کی ذات سے شکست گئی ہے۔" فیملی پانی سرخیزوں کو داند ڈالنے کے دوران کہہ رہی تھی
"کیوں ام! کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں جو آپ اس طرح کہہ رہی ہیں؟" منہ
شکایت کی۔

"ابھی نہیں ہے میرے لال! مگر ہوتے ہیں، کچھ لوگ جن کی ذات جمع پر ہماری ہوتی
ایسی ہی ہے میری کشف۔" لیر نے اسے چکارا، کچھ فاصلے پر بیٹھے مراد نے دل ہی دل میں
اس بات سے اتفاق کیا تھا۔

"نوں یاخوہ ویرہ آکشف کا؟" ذکیر نے پوچھا۔
"نوں کچھ کرانیک ہی بارون کیا تھا اس نے۔ کبھی ہے مگر کبھی بہت زیادہ ہے۔ نوں کا
زیادہ ہو جی گزرتی ہے۔ خط البتہ دو آئے ہیں۔ کشتی سے سلام بھیجیں گی۔ کشتی ہے ام! آپ کی
کبھی ہیں؟ اب تو قری پنڈ کھنچتی ہوں گی پورے گھر میں۔ ان کو روکے تو کتنے والی ہو
ہے..... کشتی ہے کسر دی ہے بعد پڑتی ہے وہاں۔ اکثر برف باری ہوتی ہے۔ صرف
سر دی نہیں ہوتی۔ اوپر ایک موٹا سا کونٹ بھی پہننا پڑتا ہے۔" فیملی غم آنکھوں کے کناروں
سے صاف کرتی ہوئی بتا رہی تھیں۔

"ابھی تو صرف مینٹ مری ہے آپ کی گھٹے ہوئے اور آپ کا ابھی سے یہ حال ہے۔
کیسے گزاریں گی؟" معیدہ اس کی تھالی کو کھینچا تھا۔

"شروع کے دن زیادہ ہماری گھٹتے ہیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ عادت ہو جاتی ہے۔" عافی
"ہاں..... ابھی تو شروع کے دن ہیں۔ دل کو سنبھالنے میں وقت لگ ہی جاتا ہے۔
گہری سانس لینے سے کہا۔ مراد چپ چاپ بیٹھا جانے لگا رہا تھا۔

"رمضان بھی آنے والا ہے۔ آپ نے تیاری شروع کر دی؟" ذکیر نے موضوع بدلا۔
"ابھی کہاں۔ پس چند ایک دنوں تک تیاری شروع کر دوں گی۔ ایک تو رمضان آئے گا،
تہوار، ہمارے لوگ سال بھر کی کمانی کا کوڑا اٹھائی دوں میں پورا کرتے ہیں۔ ابھی رمضان
چھوٹ گیا کا یہ عالم ہے کہ سن اور سبزی تک سونے کے بھاد ایک دے ہے۔ کوئی پرسان مال
بس سب کھارے ہیں ملک کو۔ عوام کے چارے پس رہے ہیں۔" فیملی بولیں۔

بہ کہہ رہی ہیں آپ۔ ذخیرہ امدادوں نے تو ابھی سے اشیاء کی ذخیرہ امداد شروع کر دی
رمضان میں یہی چیزیں ذخیرہ کتنی چیزوں میں فروخت ہوں گی۔" ذکیر نے ان کی بات سے

بے اثر اور قوس کی بات ہے۔ کہنے کو ہمارا ملک اسلامی ملک ہے۔ مگر ہر کام اسلام کے مطابق
ہاں۔" مراد نے گفتگو میں صبر کیا۔ "نہ ہمارے سرکار انہیں میں نہ لوگ۔ جو کس پر بیٹھا
اسے کو خالی ہی کرتا جاتا ہے۔ ہر بار ذخیرہ پہلے سے زیادہ خالی ہوتا ہے۔ عوام کا لہو چس
لہ رہے ہیں یہ سرکار۔ اور لوگ..... لوگوں پر ہے کسی عطاری ہوئی چلی جا رہی ہے۔ ہر کوئی
نہ چننا ہے۔ اپنی ذات سب کے لئے مقدم بنی جا رہی ہے۔ عجیب نفسا کی کا دور ہے امی!
نہ کھنچتی محسوس ہوتی ہے۔" مراد نے افسردگی سے کہا۔

بہ کہاں بیٹے!..... اس وقت ضرورت ہم سب کو اس بات کی ہے کہ ہم سب پہلے خود کو صحیح
بعد میں دوسروں کی اصلاح کریں۔ جب تک ہم اپنی اپنی اصلاح آپ نہیں کریں گے، خواہ اپنی
اور کڑی بیروں کو چکر کرائیں دور نہیں کریں گے تب تک یہ معاشرہ صحیح ہو سکتا ہے اور نہ ہمارے
ہل سکتے ہیں۔" مارٹین عادل نے جانے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا مگر ان کے
پہلے ہی رافیل نے جلدی سے کپ پکڑ کر میز پر رکھ دیا۔

وقت کون کی گئی تھی۔ معیدہ نے آٹھ کرے بیورو آٹھ کے کان سے لگا لیا۔
دل کی عمر ہے آپ کی..... ابھی امی آپ کا ذکیر ہو رہا تھا۔ "معیدہ سلام کرنے کے فوراً
بہ لگا۔

"ف کا فون ہے؟" فیملی تیری سے اٹھیں۔
ہیں..... انہیں..... انہیں گفتگوں میں ہی رہا ہے۔ کچھ پوچھ آئی ہیں۔ مراد بھائی، عافیہ، رافیلہ باقی
نہ ہیں..... لیکن، ام آگئی ہیں۔ اب میری بات کہاں ہو جائے گی؟ او کہ اللہ حافظ۔"

لہر بیورو ماں کو پکڑا دیا۔
بہ، وٹیکم سلام!..... کبھی ہو جی؟..... خط لگے تھے تمہارے..... اپنا خیال رکھا
اس..... بابا ہے رہے تمہارے۔" فیملی نے کھینچ آنکھوں کے ساتھ شوہر کو دیکھا اور سر کے
سے جلا۔ "مارٹین عادل فوراً اٹھ کر چلے آئے اور بیورو فیملی سے لے لیا۔
کام کر رہی تھی آپ سب کو۔" فیملی ابھی آکر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

بہکم سلام..... ٹھیک تھی جی؟" ذکیر نے پوچھا۔
ہیں..... اللہ..... فیملی بولیں۔ "کیا کر رہی تھی؟" فیملی نے شوہر سے پوچھا جو فون بند کر
ہاں پلٹے تھے۔
بہ خاص نہیں۔ جس خبر خیر ہے۔ اب کافی دنوں بعد فون کرنے کو کہہ رہی تھی۔ "مارٹین عادل
اندازاً لگتے والا تھا۔

”ہاں..... پیسے بھی تو کتنے لگ جاتے ہیں۔“ تیسرے بھائے ہوئے پولیس۔
 ”اچھا، میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ چلو میں! تم بھی آٹھو۔“ عارفین عادل نے معیہ
 اشارہ کیا۔ وہ دونوں بھی ساتھ ہی اٹھ گئے۔



تیسرے علی خان کا جادو جتنی کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ اسے پوری طرح ششے میں آنا
 کشف کے حقیقی جو چکھو اس نے جانا تھا وہ چاہا تھا۔
 میری دواہی آچکی تھی اور اب اس کے آنے کے بعد اس کمرے میں جو کچھ پیش پینی تھی وہ
 چکی تھی۔ میری اور سارا صاف صاف جتنی کو کہہ چکی تھی کہ وہ کشف سے کہے کہ وہ کہیں
 بندوبست کر لے۔ جتنی نے یہ بات کشف سے کہی تھی۔

”مگر ابھی تک رہنے کا کوئی مکان نہیں مل رہا۔ میں کیا کروں؟..... میرے پاس اتنی
 کمریں چند روز کے لیے بھی داخل میں رہنا فوراً کتنی ضرور دینا پڑتی۔“ وہ بے اختیار پتا
 ”تمہارے مسئلہ کا ٹھہری ہوئی میں نے وضوح لیا ہے۔“ جتنی نے اطمینان سے کہا۔
 ”ج؟“ بندوبست ہوا کیا؟“ وہ خوش ہو گئی۔

”ہوں۔ تم اپنا سامان بیک کرو۔ میں تمہیں بندے سے ملوا دیتی ہوں۔“ جتنی نے کہا۔
 ”اوکے..... کیا ہمیں آج ہی چلنا ہے؟“ وہ بڑھ چڑھ انداز میں بولی۔

”نہیں..... ابھی۔ وہ صبر دینا اور سارا مکان تمہارا سامان اٹھا کر باہر بیچ دینا ہے۔
 میں صبر نہیں ہوتی۔ یہ بڑا شرم صرف ہم پاکستانیوں میں پائے جاتے ہیں۔“ جتنی نے صاف
 سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی بیچ لگ کرتی ہوں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور امان
 سینے لگی۔ جبکہ جتنی کسی سوچ میں سم ہو گئی۔

کشف خوشی کی آواز سے اسے بندھ رہے سے نہایت مل رہی تھی جہاں میری اور سارا مکان
 دھوئیں پھیلائی رہی تھی۔ کبھی جتنی بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ یہاں شراب کی بوتلیں
 اسے نماز اور قرآن پاک پڑھنے میں بے حد مدد دے رہی تھیں۔ اہل اس وقت اس کی
 دیکھ کر اسے لاؤنج میں عبادت کرنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ مگر اس عبادت کرتے وقت
 نہ ہوتی تھی۔ وہ کافروں کے ساتھ رہ رہی جی بھلا اور حرام میں تیز نہیں رکھتے تھے۔ اس
 برتن بھی الگ کر کے تھے۔ کیونکہ جتنی کو بھوکہ دو تینوں ہر قسم کا گوشت استعمال کر لینے تھے
 پرک (سور کا گوشت) بھی شامل ہوتا۔ جتنی ہنسی خورجی شاید ہی دے وہ اس حرام چیز سے
 تھی۔ ورنہ وہ سگرنے نوشی، شراب نوشی، حرام کاری برہہ حرکت بہت آرام سے کر دیتی تھی
 تین غیر مسلم کرتے تھے۔ وہ ایک بستی تھی کہ ان جیسے تمام نہاد مسلمانوں نے یہ مسلمانوں
 پر دھبہ لگایا ہوا تھا۔ وہ سوچتی کہ پرفیسر کرمانی کی جتنی ہو کر جتنی ابھی ہے۔ اگر پرفیسر کرمانی

کر تو اس کے حقیقی خبر ہو جائے تو وہ کس قدر شرمندہ ہو جائیں۔ وہ اپنی جلد بازی اور جوش میں
 اس نے جتنی سے لپٹی تھی کہ کاش کے حقیقی کوئی سوال ہی نہ کیا تھا۔ وہ تو بس جلد از جلد اس جگہ
 نہ لوگوں کے درمیان سے نکل چاہا تھا تھی۔

ماہان بیک کرنے کے بعد اس نے جتنی سے کہا کہ وہ تیار ہے۔ جتنی نے اٹھیں میں دے
 مگر ایک لپٹا کر کاش ٹرے میں سلا اور کھڑی ہو گئی۔



میں وقت جتنی اسے لے کر تیسرے کے قلیف پر گئی تھی اس وقت قلیف لاکھ تھا۔ جتنی نے ڈور بتل
 آیا اور دروازہ کھلے کا انتظار کرنے لگی۔

”جتنی!..... یہ سارا تیرا بیک بھگ لگا ہے۔ کرایہ بھی زیادہ دینا پڑے گا۔“ اس نے خدشہ کا ہر کیا۔
 ”نہیں..... جتنا مجھے دینی تھی بس اتنا ہی یہاں دے دیتا۔ بس کھانا دینا اپنا کرنا پڑے گا جیسے
 لگتی تھی۔ یہاں سے تمہارے لئے یہ آسانی ہو گی کہ یہ نیوٹرل قریب پڑ جائے گی اور روٹی آتی
 اور کھجور۔ بس اسٹور رو رہا ہے گا۔“ اس نے کہا۔

”ہوں۔“ کشف نے سر ہلایا۔
 اسی وقت دروازہ کھل گیا اور دروازہ کھولنے والے پر نظر پڑتے ہی کشف کے چہرے کا رنگ
 لگا گیا۔

”یہ تمہارا قلیف ہے؟“ اس کے منہ سے نکلا۔
 ”آف کورس۔“ تیسرے کمرے سے آچکا ہے ہوئے بے نیاز سے بولا۔

”جتنی!..... میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ اس نے بے حد غصے سے کہا اور اپنا سامان
 لے کر سوئی کی چور سے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جتنی بیک پاس کی شکل دیکھنے لگی۔
 ”کشف!..... بس ٹوٹی۔“ سناپ!..... ہوا کیا آخڑ؟“ وہ تیسرے کی شکل دیکھنے لگی۔

”خود ہی چلو۔“ تیسرے نے تنبیہ کی ہے کہا۔
 ”میں دیکھتی ہوں۔“ جتنی کشف کی طرف لگی چو لٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تیسرے دروازہ بند
 نہ ہوا وہاں لوٹ گیا تھا۔ اس کے اعزاز میں الہ دہائی تھی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں کشف! ہوا کیا؟“ جتنی نے بھاگ کر اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور
 اتنی سے سوال کیا۔

”جتنی! تم چاہتی ہو کہ یہ شخص تیسرے علی خان کس قدر رک پٹ اور ناقابل اعتماد شخص ہے؟ اور تم مجھے
 اس کے ساتھ رہنے کو کہہ رہی ہو۔“ وہ پتے کے بولی۔

”مجھے تو یہ باطل معقول انسان لگتا ہے۔ اور پھر یہ تمہاری کبلی کا کزن.....“
 ”چاہتی ہوں..... یہی میری سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ میری کبلی کا کزن لگا۔“ جتنی قائم ہو۔
 اپنی اپنی کوزر کر کھڑی آدی ہے۔ اس کے ساتھ بھرے جتنی میں کھڑے ہوئے ایک عزت دار اور شریف لڑکی

”ہوں.....“ تیسور نے کشف کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔
 ”اوکے، پائے۔“ اس نے دونوں کو ایک ہی ”پائے“ میں غنٹایا اور چلی گئی۔
 ”کرہ اس طرف ہے۔ یہ میرا بیڑہ ہے۔ گرم پاپو تو استعمال کر سکتی ہو۔“ تیسور نے دل
 ۱۰ دلی سکر اہٹ کے ساتھ ایک طرف اشارہ کیا۔

کشف نے بنا کچھ کہے اس کی طرف قدم بڑھا دیے جو تیسور نے اشارہ کیا تھا۔ قلیٹ خامسا
 لڑائی تھا۔ کسے بھی زیادہ تھے۔ وہ بیڑہ دم، ایک ڈانگ دم، بکن، لاؤنج، انیچر ہاتھ، ٹیکری۔
 فٹ کو پنا کر وہ اچھا لگا تھا۔ یہاں پر ایک سنگل بیڑہ موجود تھا۔ بیڑے کے سر ہانے دھڑکی میز پر چند
 انہیں، ایک اٹلی ٹرے اور ایک خالی گلاس رکھا ہوا تھا۔ اٹلی ٹرے میں مٹلے ہوئے سگریٹ کے
 ۱۱ لمبے موجود تھے اور گلاس کی تہ میں ایک آدھ کھنٹ کے برابر سیاحی مائل مشروب بچا ہوا تھا۔
 ۱۲ لڑے کی دیواروں پر مختلف غیر ملکی اداکاروں کی نم عریاں تصاویر موجود تھیں۔ کرہ صاف سٹرا اور
 ان تھا۔

کشف نے اپنا سامان کار پینٹ پر رکھتے ہوئے بڑی ناگوار سی دیکھو اور ہلکی تصاویر کو دیکھا۔
 ۱۳ ایک تک دروازے میں ہی ایستادہ تھی۔

”میں یہاں اکلیا ہوتا ہوں تو کبھی کبھی یہ کرہ بھی استعمال میں لے آتا ہوں۔“ تیسور کی آواز اس
 ۱۴ لاربت کی طرف سے اور خامس نزدیک سے آئی تو وہ تقریباً اچھل سی پڑی۔ اس نے پورے کا پورا
 ۱۵ ٹھوم کر خامس ٹھیکس لگا ہوں سے تیسور کو دیکھا۔

”کل رات یہ کرہ میرے تعریف میں تھا۔ میں یہ چیز ہی بتا لیتا ہوں۔“ وہ میز کے پاس آیا اور
 ۱۶ گراں گراں اٹلی ٹرے سے اٹھائے۔

”یہ تصاویر بھی برائے صحرائی لے جائیں۔ جب تک میں یہاں ہوں انہیں یہاں سے اتار کر کہیں
 ۱۷ دیکھ دوں۔“ وہ دروازے کی چوکت پر ہی کھڑے کھڑے بولی۔

”ان میں کیا خرابی ہے؟ اتنی خوب صورت تو ہیں۔ کیا آپ کو خوب صورتی سے اترتی ہے؟“ وہ
 ۱۸ سمجھتے سے بولا۔

”مجھے اس قسم کی خوب صورتی سے اترتی ہے۔ بالکل!“ وہ قصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔
 ۱۹ ”تھو، اوکے۔“ آپ ہماری گیسٹ ہیں۔ ہم آپ کی بات کا احترام ضرور کریں گے۔

۲۰ رازہ منہ پر ٹیکس ماریں گے۔“ اس نے طرے انداز میں کہا اور کشف صرف اسے ٹھوکر دے کر گئی۔ تیسور
 ۲۱ بہت دل چاہنے کا بدلہ آج کیا تھا۔

”تو اپنے اتنی ٹیک، اتنی پارا ہیں۔ مجھے بھی کرپٹ اور نا قابل اعتماد آدمی کے ساتھ رہنے
 ۲۲ نے ڈر لگے گا آپ کو۔“ وہ کہہ دیکرے فریوں کو اتارتے ہوئے ہوا تو کشف نے گہری
 ۲۳ ہاس لی۔ وہ بھی جرات نہ کر تیسور جیسے نہ پٹ بندے نے اس کی تک اسے کچھ کہیں نہیں۔

”ایک کام کیجئے گا، اپنے پاس ایک چمری، چاقو یا کلہاڑی وغیرہ رکھ لیجئے گا اپنی حفاظت کے
 ۲۴

کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ کر میں اس کے ساتھ دن رات ایک قلیٹ میں گزاروں۔ پھر
 ۲۵ کر سکتی ہو تم ایک ساپ پر؟ جو یہ خبری میں دس لینے کی خصلت رکھتا ہو؟“ وہ واقعی بے حد مضے
 ۲۶ تھی۔ اس پن ڈراپ سائنکس میں اس کی آواز ہتھوڑے کی طرح تیسور کے دماغ پر ضربیں ا
 ۲۷ ری تھی۔

”تو رہو گی کہاں؟“ قلیٹ میں وہ لوگ رکھنے پر رضی نہیں ہیں۔ ہاسٹل تم انورڈ نہیں کر سکتے
 ۲۸ روٹی آئی وغیرہ ایک مینے کے لئے کیلیفورنیا تے ہیں۔ کر کی کیا تم؟“ کیا سڑکوں پر رہو گی
 ۲۹ مینی نے بھجایا کر اس کو سنا دیں۔ ”اس چار دیواری میں تم ازم حفاظت سے تو رہو گی۔ باہر کی
 ۳۰ ہتے چڑھ گئیں تو تمہارے ہتس پانی کی عمر چھ ماہی صورت دیکھنے کو ترس گئے اور تم ان کی آواز
 ۳۱ کہ سمجھ گئے؟“ یہ پاکستان نہیں، انڈین ہے۔ دیوار غیر میں کہاں اور کس کو صدامیں دیتی
 ۳۲ گی؟“ انہیک یہ تیسور بے حد آواز خیالی لڑکا ہے مگر وہ تمہارا روپ نہیں کرے گا، کبھی۔“
 ۳۳ نے اسے بری طرح لڑاؤ۔ وہ میز پر بکے ہوئے تھے۔ ”مگر تم سبائیش تم کو یہاں رہنا ہو گا؟ ساتھ ما
 ۳۴ ڈھونڈ رہا۔ جیسے ہی کوئی قابل اعتماد اور اچھی جگہ ملے، تم وہاں کشف ہو جائا۔ اوکے؟“ مینی ا
 ۳۵ سمجھانے لگی۔

کشف نے ٹھوکر رک کر سوچا۔ وہ فہمک کہہ رہی تھی۔ اس چار دیواری میں وہ اپنی حفاظت
 ۳۶ لئے کوئی تدبیر کر سکتی تھی۔ مگر باہر ملکی خدایاں، بیٹریوں کی کمی تھی۔ کس کس سے سپلائی کرتی۔
 ۳۷ ”فہمک ہے۔ مگر بات اس سے تم کو کی۔“ وہ مان گئی۔

”اوکے..... اب چلو۔ پہلے یہ چارے کی اتنی اسٹل کر چکی ہو۔“ مینی نے ناراضگی
 ۳۸ کہا۔ پھر وہ مینی کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ دونوں کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئیں۔

تیسور فرنگ سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ اس نے ایک کھدو دوں پر ڈالی۔
 ۳۹ ”تیسور! کشف تمہاری بے انگ گیسٹ ہو گی..... گراہے جو تم بولو۔“ مینی نے بات شروع کی۔

”یہ میری ہم وطن ہیں۔ میری کرن کی دوست ہیں۔ ان سے کراہے لینا اچھا لگے گا کیا؟“ وہ
 ۴۰ کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔ بات اس نے عام لیجے میں کی تھی مگر کشف کو لگا تھا کہ وہ بگ
 ۴۱ رہا ہے۔

”نہیں..... مجھے منت کی عادت نہیں ہے۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
 ۴۲ ”جو تم مناسب سمجھو..... مجھے کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”جو کراہے یہ چکی جگہ پر دے رہی گی، وہی مناسب رہے گا۔“ مینی جھٹ بولی۔ تیسور نے کنہ
 ۴۳

اچکا دیئے۔
 ”ٹیک ہے پھر۔ تم اپنا کردہ دیکھو کشف!..... اوکے تیسور! میں چلتی ہوں۔ شام کو مل رہا۔“
 ۴۴

کلب میں!.....“ وہ اس سے قاطب تھی۔
 ۴۵ کشف نے ناگوار سی دیکھو اور گئی۔

لے۔" اس نے بڑے دوستانہ انداز میں مشورہ دیا۔ وہ چپ کھڑی رہی۔

"لوہیے آپ نے ایک سانپ پر احمق کر کیسے لیا؟" وہ ہلکا کھاس بخشے والا تھا۔ "یا پھر نہ پڑنے پر کہ مجھے کو باپ بتایا ہے۔ سوری..... سانپ کو لینا لاؤ۔" اس نے حسب عادہ غلیظ لہجی کے غڑکایا۔

"مجھ فرمایا ہے آپ نے۔ اب آپ پلیز یہاں سے تشریف لے جائیں۔" وہ اب مزید نہیں رو سکی۔

"کوہہ بیٹور۔ پلیز انجوائے دی روم۔" وہ کمال ڈھٹائی سے سکرٹا اور پھر تصاویر اٹھا کر باہر نکلا۔

"یہ بھی لے جائیں۔" اس نے گھاس اور اٹلیں ڈرے کی طرف اشارہ کیا۔

"اب یہ قہیت آپ کا بھی ہے۔ کچھ تھو تھو اتھ آپ بھی چاہیں۔" وہ بد لہجی سے بولا اور دوسرے روم میں چلا گیا۔ وہ راس اندہ بتاتی ہوئی کمرے سے دونوں چیزیں لے کر باہر گئی۔ لیکن کاؤنٹر پر دونوں چیزیں ڈھٹے والے انداز میں رکھیں۔ اس نے دیکھا کہ قہیت کشادہ تھا، صورت بھی تھا اور یہاں ضروریات زندگی کی تقریباً ہر چیز موجود تھی۔ مگر یہ ترشہ تھی۔ اسے ہونے لگی۔

"تم یہ کچن اور فریج وغیرہ آرام سے استعمال کر سکتی ہو۔" وہ کمرے سے نکلا ہوا کہہ رہا تھا۔ "مسٹر تھو ملر خان! ہمارے دور میاں میں ایسا کوئی صلہ نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ مجھے کہہ کر قابض کریں۔" وہ اسے جانتے لگا۔

"اوکے..... نہیں کہوں گا۔ مگر کیا برا ہے جو یہ فیصلہ قائم کر لیا جائے۔" وہ اسے چرانے سے بولا۔

"اس سے برا تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ مل کے بد لہجی سے بولی۔

"واقعی بہت بڑی چیز ہیں آپ۔ بالکل کوئین کی گولی کی طرح۔" وہ دھڑکتے ہوئے تھرا، لگا۔ کشف کچھ نہیں بولی۔ "میرے اور آپ کے آنے جانے کے مواقع مختلف ہیں۔ سوئیٹ کی چابی آپ رکھ لیں۔" اس نے ایک جاس پی کی طرف بڑھا دیا۔ "آپ چاہیں تو فون استعمال ہیں۔ اس کے چارج نہیں ہوں گے۔" وہ لانا میں رکھے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہوا۔ "ٹھیکس۔" مگر میں جب بھی فون پر ڈکروں گی، اس کے چارج ڈون کی۔" وہ بولی۔

"اس کی ضرورت نہیں....."

"مجھے ہے۔" وہ اس کی بات کا تھوٹے ہوئے تیزی سے بولی۔

"اوکے..... ایز یو ڈش۔" تبور نے لاہواری سے شانے اڑکا دیے۔ "ایک بات اور۔ میری مہمان آتی جاتی رہتی ہیں۔ اگر آپ کے مہمان بھی آئیں تو مجھے اعزاز نہیں ہوگا۔" اس بات جان بوجھ کر اسے چرانے کی خاطر کی تھی۔

"میرے کوئی مہمان نہیں ہیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولی اور تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔

ذہن پر سکرپٹ چمک رہی تھی۔

میں تو ابتداء ہے کس کشف عارفین عادل..... آگے آگے دیکھئے زمانہ تھا۔

انکا کتا ہوا جگن میں چلا آیا۔

ای، دفعہ وہ جب تک واپس نہیں آتے تھے جب تک اسے کوئی دوسری جاب ڈھونڈنی تھی۔ یہاں کے بعد اسے صحیح معنوں میں اعزاز ہو رہا تھا کہ لندن میں زندگی گزارنا کس قدر مشکل ہے۔

مگر ہر گز کی نواز سے شراب ہو جاتی تھی۔ نواز اور عبادت سے فراغت کے بعد وہ جلدی جلدی باتیں، بریڈ کا ایک ٹیس ساتھ میں لیتی اور مطلق سے نیچے آتا رہی۔ ساتھ ہی یونیورسٹی جانے کی بھی کرتی۔

اس روز اس کی کلاس جلدی ہوئی تھی اس دن اس کو تاشہ کرنے کا بھی وقت نہیں ملا تھا۔ بس کے ساتھ ہی چائے کے طے سے نیچے آتا رہی اور اسٹاپ کی طرف بھاگتی۔ یونیورسٹی کا پوائنٹ اسے یہی مل جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں کلاس فرسٹ ہونے کے بعد وہ سٹینٹین چلی جاتی۔ وہاں سے کچھ نہ مانگی اور پھر لاہوری میں چھ کر اپنے اسائنمنٹس مکمل کرتی۔ وہ بہت ذہین اور تامل تھی۔ لیکن ات وہ جس یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی وہاں اس سے سو گنا زیادہ پچترین دماغ موجود تھے۔ اسے اپنی پہچان کروانی تھی۔ وہ اپنے تپا محنت کرتی تھی۔ اس کے اسائنمنٹس بہترین ہوتے تھے۔

پھر اس سے بھی بہترین اسائنمنٹ اس کے ایک کلاس فیلو ارمان کے ہوتے تھے۔ ارمان بھی اہل تھا اور کلاس کا بہترین طالب علم تھا۔ اس کی شرافت دیکھ کر کشف نے اس سے بات چیت میں کچھ حرج محسوس نہ کیا تھا۔ اس نے نوٹ کیا تھا کہ ارمان کی کوئی کرل فریڈ نہ تھی۔ لڑکیوں سے وہ کبھی نہیں ملے۔ لڑکوں سے بھی اس کی ریلو ہائے محدود تھی۔ وہ بہت سنجیدہ مزاج کا لڑکا اپنے کام سے کام نہ لے والا۔ کشف اکثر اس سے کام کے مسئلے میں مدد لینے لگی تھی۔

اندیشی سے فادر ہو کر وہ اسٹور پر چلی جاتی تھی۔ اور آج کل اس نے اسی اسٹور پر اپنے اہل اور بڑھاپا لے تھے جب تک کوئی دوسری ملازمت اسے نہیں ملتی، جب تک۔

وہاں سے وہ واپس آتی۔ "کوئی کنگ کوک" پر عمل کرتے ہوئے کچھ بھی نہ مانگی جس سے بہت بھر پور اس کے بعد پڑنے بیٹھ جاتی۔ اپنی ڈیوٹیوں اور مصروفیات میں وہ ایک چیز بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ اور قرأت۔ اس کا عقیدہ تھا کہ یہ وہ چیزیں اس کو ثابت قدم اور مضبوط رکھتی ہیں۔ اسی لئے وہ اہل خانہ کے ساتھ ایک صحت کے نیچے رات اور دن کے کئی کھٹے بالکل تنہا گزار دیتی تھی۔ اس کے ساتھ کلاس کی حفاظت یہ وہ چیزیں کر رہی ہیں۔

رات کا پہرہ آہستہ آہستہ ٹھک رہا تھا۔ کشف کے لئے یہ مشکل زندگی اور دوسری تھی۔ کیونکہ وہ اہل کلاس کی منزل اب اس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لئے اسے حرج عمت کی ضرورت تھی۔ اہل خانہ سے اس کی نوک جھوک چلتی رہتی تھی۔ ہرگز نہ ان سے یونیورسٹی میں جتنی اہل خانہ سے جتنی ہی کرتا

ہا تھا۔ اس عرصے میں ایک دو مرتبہ تبور کے ساتھ اس کی کرل فریڈ رات گزارنے اس کے

قلیت پر آئی تھی۔ مگر وہاں سرتہ مختلف لڑکیاں تھیں۔ کشف کی نظروں میں تیسروں کا مقام اُک
گندے پاگل تھے سے بھی زیادہ گرا ہوا تھا۔ وہ مسلسل کوشش میں تھی کہ کسی طرح اسے رو
مل جائے تاکہ وہ تیسروں کا قلیت چھوڑ دے۔ مگر مطلوبہ جگہ نہ ملتی۔ کبھی کراٹے کا مسئلہ آ جاتا تو
کا۔ لندن میں لڑکے لڑکیاں گود سے گودوں کی طرح ایک ہی قلیت کے کمرؤں میں اکٹھے ہوتے
تھے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ فی الحال تیسروں کا قلیت اس کے لئے نوبت تھا۔ ویسے بھی اس
کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے کشف کو کسی قسم کا فخر و باؤ محسوس ہوتا۔ وہ صرف زبانی و
چھڑکتا تھا۔



اُس رات وہ ٹائٹ کلب سے "پلی" کر آ رہا تھا۔

'نا بہت دنوں کے بعد اُسی عجیب سی بے چینی اور کیفیت نے اسے گھبرے میں لے لیا تھا۔ وہ
اُس بے چین سا پیشامد نہیں باپ رہا تھا۔ ابھی وہ گھر سے خاصے قافلے پر تھا کہ موڑنوتے ہی
اُسی اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ مگر اس نے کھلی کی سی سرعت کے ساتھ بریکیں نہ لگائی
اور وہ گھر اس کی گاڑی کے پیلوں کے نیچے آ کے کھلا ہوتا۔

ابمذول..... اندھے کو گھرنے کے لئے میری ہی گاڑی ملی تھی۔" وہ نفرت سے بڑبڑایا اور کار
اُسی کے چہرہ پر اٹھالا۔ مگر پھر ایک ایک چوٹک گیا۔ وہ کوئی عورت تھی۔ کھلے بالوں والی۔ اس
دست کی سردی میں وہ ہاتھی کرم کپڑے کے نیچے پیر کھڑی تھی۔ عورت کے بال بے حد دراز
اس کی پشت تیسروں کی چائیں تھی۔ ہار گھپ اندھیرا تھا اور اس دیران سستان روڈ پر صرف کاری
اُس کی روشنیوں میں جنہوں نے تھوڑا بہت اچالا کر رکھا تھا۔ تیسروں کو شب ہوا کہ عورت اُس کی
بھالی ہے۔

اُن دن ہوتم؟" اُس نے انگریزی میں پوچھا۔ اور پھر جب عورت نے اس کی طرف اپنا چہرہ کیا تو
اُن حیرت سے کھلے کاٹھارہ گیا۔

اُس.....؟" اُس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا تھا۔ سارا اندر بل بھر میں بھرن ہو گیا تھا۔
اُنہوں کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ جسے دیکھ رہا ہے۔ یہ وہی ہے یا اس کی نظر کا دھوکا..... وہ اس
اُسی تھا کہ چند لمحوں تک تو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا وہ اصل ظاہر کرے۔ ہوتا ہے نا کبھی کبھی کہ
حیرت کی اس آستین پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے کسی قسم کا رد عمل ظاہر کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔
اُنہوں نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور نیچے اتر آیا۔

دلوہ بھالی! آپ..... آپ کیا؟..... اس حال میں؟" اُس نے عورت کو اپنا کرم اور
اُسی کر پتایا۔ "جیسا، اندھ کار میں بیٹھیں۔" اُس نے کار کا انگا دروازہ کھول کر کہا۔ مگر وہ
اُسی کے پس کھڑی رہی۔ آخر تیسروں نے اسے شانوں سے پکڑ کر سیٹ پر بٹھایا۔ اس نے دروازہ بند
اور لٹوڑا نیچے سیٹ پر آ کے بیٹھ گیا۔

بھالی اولیہ کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا۔
"نہیں۔" دلوہور کے منہ سے آگے نکلی ہے لگا۔

”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے بھر سوال کیا۔ وہ خاموش رہی۔

”بھالی! کیا ٹھہرے ہوئے ہیں آپ؟“ دوسرے سوال پر بھی وہ ہنوز چپ رہی۔

”کچھ تو بولے بھالی!.....“ چلیے.....“ وہ ہنستا گیا۔ مگر ماہوور کی چپ نشوونما آخر پر

سمجھ میں آیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے قیث پر لے جائے۔ پہلا کام یہی کرنا تھا کہ کسی طرح

کی چپ کا قفل کھولے اور اس کی حالت کی وجہ کا پتہ چلے۔ تیمور ہارے راستے خاموش رہا۔

ابھی ہوئی نظر وہ ماہوور پر ڈال دیتا۔ مگر وہ جیسے ہمسہ بنی بیٹھی تھی۔ ماہوور کی حالت دیکھ کر

کے خیالات اسے پریشان کر رہے تھے۔ کہیں کوئی برا حادثہ اس کے ساتھ نہ پیش آ گیا ہو۔

کسی نے اس کے ساتھ کوئی بدچیز کی نہ کی ہو۔ کہیں ولید کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔

اس وقت اس میں کس قسم کا اور کتنی کتنی باتیں تھیں۔ اس وقت چتر کا منت بنی بیٹھی تھی۔

کار پارکنگ میں کھڑی کر کے بعد اس نے ماہوور کو کھانے کے پکڑ کر چلے پر مجبور کیا تو

میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام اس نے یہ کیا کہ ماہوور کو لاؤنج کے صوفے پر بٹھایا اور

کے روم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کشف اس وقت پڑھ رہی تھی۔ دستک سن کر دروازہ کھٹکھٹائی۔

”کون؟“ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”تیمور! کشف! چلیے تمہاری دیر کے لئے میری بات سنو۔ ایک امیر جنسی ہو گئی ہے۔“

تو اس نے اس کے اعصاب تھاپے۔

”امیر جنسی؟“ اس وقت کیا ہو سکتا ہے؟..... کہیں یہ جیسو بول کر دروازہ کھٹکا

چاہتا؟..... اس کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے سوچا۔

”کیا امیر جنسی ہو گئی ہے؟..... میں اس وقت قلعہ دروازہ نہیں کھول سکتی۔“ اس نے صاف

کر دیا۔

”آئی سوڑ کشف! امیر کو کوئی غلا ارادہ نہیں ہے۔ مجھے واقعی مدد کی ضرورت ہے۔“ اس

میں کچھ تو ایسا تھا کہ کشف نے سمجھتے ہوئے کر کے کی چٹائی کرادی۔

”کیا ہے؟“ اس نے پراداروازہ کھولنے کی بجائے ڈرائی بھری سے دیکھتے ہوئے

”میرے ساتھ لاؤنج میں آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور تھوڑے بک کا شکار کشف سوچنے لگی

بات کا بھرا کر رہے یا نہ کرے۔

”کشف! چلیے، مدد کی آؤ۔“ تیمور کی آواز میں اتنی تھی۔

اس نے خود کو اٹھ کے سپرد کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور باہر آگئی۔ لاؤنج میں اس نے

تیمور کو کراہے اور اس کا اور گوت پہنچے کوئی عورت صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ صرف اس عورت

تھی دیکھ پائی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے عورت پر نظریں جمائے جمائے تیمور سے سوال کیا۔

”میری بھالی ہیں..... مجھے یہ اس وقت گھر آتے ہوئے روڈ پر ملیں۔“ اس نے ا

ایکایا۔

مگر کم کر آگے آئی تو اسے دھچکا سا لگا۔ اس نے ماہوور کو حیران نظروں سے دیکھا۔

ولید بھالی کی سسر ہیں۔ کیا وہاں نہیں؟“ وہ بے اختیار پوچھ گئی۔

ابلیں..... میں وہاں آ رہا تھا جب یہ اپنا بک میری کار کے سامنے آ گئیں۔ میں بھی پہلے

انہیں سنا تھا۔ ان کی حالت یہی اٹکا ہے۔ تم خود کچھ دیکھو۔“ اس نے بتایا۔

بھالی کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

ابلیں..... اس نے کھمبے سے لپکتے۔

وہ نے کچھ نہیں بتایا؟“ کشف نے ماہوور کو ہر دلی سے دیکھا۔

اس نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر انہیں معلوم معلوم نہیں۔ یا پھر یہ اس کنڈیشن میں ہیں کہ بتا

ہیں۔“ اس نے کہا۔

والہ!.....“ کشف بے اختیار اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے قفل کی مٹکی پر جس ماہوور کو

اس میں اور اس ماہوور میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ماہوور زندگی سے بھر پر ایک نورنگی

وہ ماہوور تو کوئی اجڑی ہوئی راہی یا کوئی اڑاں غزل تھی۔

والہ!..... آپ کو کیا ہوا ہے؟..... ولید بھالی کہاں ہیں؟“ کشف نے اسے کندھوں سے

اپنا بیچوڑ دیا۔ مگر ماہوور جس ایک ایسے نظر دیکھ کر رہ گئی۔

ایلیں کیا؟“ اس نے خزی سے پوچھا۔ ماہوور نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب اٹھی اور پانی گھاس میں نکال کر لائی۔

ابلیں..... دیکھیں ہونٹ کتنے خشک ہوئے ہیں۔“ کشف بولی۔ ماہوور نے خاموشی سے گھاس

نہ لے لے لایا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے گھاس کشف کو واپس کر دیا۔

کی تھک گئی ہوں..... بہت تھک گئی ہوں۔ دیکھو..... میرے پیوں میں آبلے پڑ گئے

ماہوورچوں کی طرح اس سے مخاطب تھی۔ ماہوور نے اپنے پر ہندوؤں کی طرف اشارہ کیا۔

ہر تیمور دونوں کی نظریں بے اختیار اس کے بے حد حسین پیوں کی طرف اٹھیں۔ وہاں وہاں

تھکے تھکے جسم سے خون رسیں رہا تھا۔

والہ!.....“ کشف کے منہ سے نکلا۔ ”فرسٹ ایڈ یا کس ہے؟“ اس نے تیمور سے پوچھا۔ وہ

لاؤنج میں رہے دیکھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر فرسٹ ایڈ یا کس نکالا۔

وہ کرے میں لے آئیں۔“ اس نے تیمور سے کہا اور خود سہارے سے کشف کو اٹھایا۔

.....

اور کسی معصوم بچے کی طرح آٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ تیمور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اس میں آکر کشف نے اسے پیڈ پر بٹھایا اور خود باہر نکل گئی۔ تیمور خاموشی سے کمر اس کی

پٹا بند چھوٹوں بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں بڑا ایک مٹ ب ہن ہن تھا جس

میں چلی گئی اور اندازہ ہوتا ہے اس نے ہاتھ دلا کر کہا۔

”عدہ سے گزر چکا ہے یہ شخص۔“ اس نے دروازہ بند کر کے پیچھے ہی روٹ بیٹھ کر کہا۔ اس کا دماغ گرم ہو گیا۔ جہاں رہ کر ہوتا اس کے سین پیچھے دلی دلی ہوا پر کسی آنکھ پر مال بہہ بہہ چھڑا ساز تصدیق و یقین اس کی۔ شریف خانات اور کوٹ سے اس کا دوست خراب ہوا، نے کمرے کے اطراف پر نظر ڈالنے پر لاشیں آف کیوں اور بیٹے پر آ کے لیت گئی اور اس ہوئے جسم کو کچھ دیر بعد ہی سینہ لے لے اپنی انوش میں سپت لیا تھا۔

تقریباً پندرہ میں منٹوں کے بعد اذان بلی گئی تھی۔ تیور نے دی نور آف کیا اور اٹھ کھڑا۔ اس کے سامنے ہی ولید کھڑا تھا۔ اس کے کمرے ہوئے بالے اور چہرے کی موہ پریشانی کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ اپنی پیشانی پر مسل رہا تھا۔

”بیٹو ولید!..... اندازہ چاہا..... تجھ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
”کہاں ہے ماہ نور؟..... کدھر ہائیں؟“ ولید نے انداز آتے ہی اور اصرار چلائی کہ ڈھوڑتے ہوئے بچہ تھا۔

”سوری ہیں اچھر۔“ تیور نے کف والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ولید بھا کر کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ دھا کر کمرے کا سوچا پور ڈھانسی اور لاشیں اُن کے نور پر غور فرمائی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مکمل کے اندر پیچھے تھے لہذا وہ انکس نہیں دیکھ لائے تھے جیسا تھا۔ وہ جان بوجھ کر کمرے میں نہیں گیا تھا۔ ولید چنگوں بلند دیکھ ا گیا۔
”تیور!..... تم نے میرے سر سے پیشانی کا پھانکھٹا دیا ہے۔“ دند اس اور ماہ میرا بریں کی بھرپور کرانے میں کوئی کمر نہیں چھوڑی تھی۔ ولید بے حد تنہے تھے انداز میں گیا۔

”آپ دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا کیا؟..... بھائی کو جس حال میں، میں نے دیکھ

مجیب تھا۔“ تیور نے بلا توجہ بات شروع کی۔
”جھگڑی ہی تو نہیں ہے۔“ کچھ کہہ بھی نہیں ہے۔ تمہارے ہماری خوشیوں کو کسی کی نظر سب کچھ بھرت کی طرح مٹھی سے نکل رہا ہے۔“ ولید نے اپنی انگلیوں کو بالوں میں پھنسا کر
”مسئلہ زیادہ خراب ہے تو آپ انکل وغیرہ سے دس کر لیں۔“ اس نے شور مچا کر

کاٹی کا بچہ تھا۔
”نہیں ہارا اس وقت کچھ نہیں لیا ہوتا۔“ اس نے انکار کر دیا۔
”آخر مسئلہ کیا ہے؟..... اگر کتاب تمہیں تو بتا دیتی۔ شاید میں کچھ شور مچا دے۔“
”نہا۔“ اسے اس سارے معاملے میں بھروسہ دے زیادہ جیس ہو رہا تھا۔
ولید اور ماہ نور کی مثالیں پورے خاندان میں دی جاتی تھیں۔ دونوں کی میرزا خانہ لائف تھی۔ اب بالکل اپنا کچھ جو کچھ تیور نے دیکھا تھا اور جواب وہ ولید سے

اور تھیں کر دیا تھا۔ ولید کو اس وقت شاید کسی بھروسہ کی ضرورت تھی۔ وہ بے حد اکیلا پن تھا۔ اس نے مختصر لفظوں میں تیور کو ساری بات بتا دی۔

اگرچہ..... ایک شادی شدہ عورت کسی اللہ والے کے عشق میں گرفتار ہو کر خود بھی اللہ ہو جاتی ہے۔ پلاؤ اسٹیج..... پلاؤ!..... اس کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے ہنسنے لگے مگر ولید کی ہنسی کی کہ وہ اس وقت مسکرا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کو خود پر بھی آری تھی کہ نہا نے وہ ماہ نور کچھ دیر کر کیا کیا سوچا تھا۔ مگر یہ تو جب ہی بات سامنے آئی تھی۔

اب اس کی ساری فرسٹ کو دکھائیں..... مجھے یہ کیس سا رنگ لگتا ہے۔“ اس نے شور مچا دیا۔
اگر اس کی تیور بارے لگا۔ ماہ نور کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ”ولید کو اس کا شورہ زیادہ پسند نہیں آتا۔“ جب میں سینک کے لئے کمرے سے نکلا تو یہ نابل لگ رہی تھی۔ لیکن جب تقریباً ماہ نور بیٹھ گیا مگر اس کی آواز نہ تھی۔ جب سے رات ہوئے تک میں اس سے صاف بات نہ کر سکا۔ ماہ نور فون نہ آتا تو میں پوچس کی حد لے دلا تھا۔“ وہ

لو لہا نہیں آپ؟“ اس نے رسوا بچھا۔
”بس اب تو کمر جاؤں گا۔“
کی بات؟..... نہیں سوچا میں بھائی کے ساتھ کمرے میں۔ صبح چلے جائے گا۔“
ماہ نور لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ماہ نور کمرے سے نفی نظر آئی۔ ولید اور تیور دونوں کی اسٹیج پلاؤ تھی۔

”ارادہ کیا بات ہے؟“ طبیعت کیسی ہے؟“ ولید بے چین سا تھا کہ اس کے پاس آگیا۔
”میں یہاں کیسے آگئی؟“ وہ پریشان ہو کر ولید اور تیور کی صورت دیکھنے لگی۔ ”اور یہ ہاں پر پڑی کیسی ہے؟“ وہ اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ولید کی نظر اس کے پاؤں پر پڑی تو اس نے سوالیہ نظروں سے تیور کو دیکھا۔

”کے پاؤں دھجی تھے۔ اس نے دوا لگا کے جینز کر دی تھی۔“ اس نے جان بوجھ کر فٹ کر نہیں کیا تھا۔
”اچھا اب اب ماہ نور بھی جاگ گئی ہے۔ میں اسے لے کر جا رہا ہوں۔“ تھیکس آگین
”اس کا کمرہ بیا داکا۔“

ایازت والی بات پر غل غل شور مچنے لگا۔ ”اس نے چلنے پلنے ولید کے کان میں کہا۔
ایازت والی بات چل جانے کی ضرورت لگ رہی ہے۔“ ولید نے سر ہلایا۔ وہ ماہ نور کو کھاتے اور زور سے آواز دے کر فون پر آ۔
”کیسے لوگ کہیں ہیں اس دنیا میں بھی۔“ وہ کھف والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
”ہاں جلی گئیں۔“ خواہ مخواہ میری بھی رات اور آرام خراب ہوا۔ وہ بیٹھ کر گرنے سے اعزاز

میں لیٹا۔ اونٹ سے چلے لینے اس نے آنکھیں موندیں اور ہانور کے بارے میں سوچے سوچتے،
آنکھوں میں چاہا گیا۔

صبح کشف کی آنکھ کھلی تو چرخ تھا ہوا چکی تھی۔ اسے بہت افسوس ہوا تھا۔ وہ آنکھی اور ہانور کا
آتے ہی کرے سے نکلی۔ اس نے لاؤنج میں دیکھا، لاؤنج خالی پڑا تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ
کمرے میں آگئی۔ مگر یہاں ہانور کی بجائے خواب خرگوش کے سرے لیے تھوڑے بھر نظر پڑے اور
چمک گئی۔

”بھائی کہاں گئیں؟“ اس نے سوچا۔ بھر وال کاک پر نظر پڑی۔ کوہ..... اسے دیر ہوئی
وہ الماری سے ایک اسڑی شدہ جوار نکال کر سیدھی پاؤتھروم میں گھس گئی۔

جس وقت وہ تو لہر پر چلنے پھرنے لگی تھی، اس نے تھوڑے کون انکھیں سے دیکھا۔ وہ ابھی تک
تھا۔ وہ مطمئن سی ہو کر اپنی تیاریوں میں لگ گئی۔ کیلے دراز کھینچوں کو وہ جھٹک جھٹک کر سلخا۔
اس کے کیلے بالوں سے چند یونیس آڈر کی تھوڑے چہرے پر آکے چڑیں تو اس نے کسماکس
کو کہیں۔ ”آنکھیں کھلتے ہی بڑا دلنشین منظر اس کے سامنے آیا تھا۔ کشف بالکل سفید گلف ڈاؤ
قبض میں بڑا سانسید بے دماغ روپہ پھینکے سے کندھوں پر ڈالے اپنی بے حد دراز زانوؤں کو قلم
میں گھرن گئی۔ تھوڑے لمبے منظر پر ابھی دلکش تھا۔ وہ صبح کے نور کا حصہ تھی اس کے سامنے کوئی
بے خبر سی۔ گھنسی۔ لندن کی آب و ہوا نے اس کی رنگت کو بے حد دلکش بنا دیا تھا۔ تازہ گل
چہرے پر ایک چمک پیدا کر دی تھی۔ وہ صبح سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ شاید یہ اس کی نگاہوں
دلکش تھی کہ وہ چمکی تھی۔ اس نے بے اختیار تھوڑی طرف دیکھا تھا۔ مگر اسے آنکھیں بند کر
دیکھ کر پھر اپنی تیاریوں میں گھس گئی۔

بال سلخانے کے بعد اس نے انہیں خشک کیا اور اسکارف بالوں میں لپیٹا، جاگڑا پیٹنے پر
ہانور کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”راتوں رات کہاں گئیں؟ شاید ان کے بڑ بیٹے لے گئے ہوں سے انہیں۔“ چائے بنا کر
سوچ رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد اس نے کپ دھو کر رکھا اور کتابیں اٹھا کر باہر نکل گئی۔
تھوڑے لمبے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار ایک چہرہ آرہا تھا۔ آج اس
کو بہت مشکلوں سے دوکا تھا۔ وہ نہ دیتی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس کا گلابی چہرہ اپنے ہاتھوں میں
اس کے سرخ سرخ لبوں پر لپٹا، احتفاظ جمادیتا۔ اس کے دراز کیلے کیسوں کو اپنی انگلیوں
گھسوں کرتا۔

بہت دیر تک وہ کیل میں منہ چھپائے کشف کی خوشبو کو محسوس کرتا رہا تھا۔ پھر آخر انوکھی
نے کیل کو آنکھیں سے ایک طرف ہٹایا اور ایک بھر پور نگاہی لیے ہوئے اٹھ گیا۔ تازہ غسل
ہو کر اس نے بیچ کیا اور پھر درودہ میں گارن فیکس ڈال کر کھانے لگا۔ آج اس کی کلاس دی

لہاؤ اور اطمینان سے جانا چاہ رہا تھا۔ یوں بھی وہ چمک کو بیس استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے پاس
ایک گاڑی موجود تھی۔ اسے تو کوری کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اسکارف لپٹے کے علاوہ بھی اس
ایک اکاؤنٹ میں خاصی کثیر رقم موجود تھی۔ اس کے علاوہ روف صاحب بھی ہر ماہ انہیں خاصی رقم
کی اکاؤنٹ میں جمع کرواتے رہتے تھے۔ وہ شاہوں کی طرح زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ وہ
ابھی رہتا مگر اس کے بچنے کے ڈھنگ میں کوئی بدلہ نہیں آتا تھا۔ لندن ہو یا پاکستان، اسے کوئی
بہن نہ پڑتا تھا۔ اس نے ناشتہ ختم کرنے کے بعد کار کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

اپنے فیاریٹ میں پہنچ کر سب سے پہلے جس شخصیت سے اس کا سامنا ہوا تھا وہ سوزی تھی۔
اس کی کلاس فیلو کی، غامی حسین اور طرح دار تھی۔ تھوڑے لمبے خاتون سے پہلے روزی اپنی شخصیت
مذہ سے گاڑ دیتے تھے نہ صرف اپنے فیاریٹ میں بلکہ پوری یونیورسٹی میں اس کو پہچانا جانے لگا
اس جیسے غیر معمولی افراد دنیا میں بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اس کی ذہانت، اس کی قابلیت، اس کی
بہادری، اس کی دولت کی چمک، دکھ، اس کی شاندار پریشانی سب نے اس کو اسے مشہور کیا تھا۔
ایک طرح یہاں بھی لوگ اس سے دوستی کرنے کی خواہش میں آگے بڑھی تھیں اور اس نے اپنے
دل میں اس سے دوستی نہیں کی۔ ہار کے بعد سوزی دوسری لڑکی تھی جس سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔
”ہائے تھوڑا..... پاؤ آ رہا ہے؟“ سوزی نے اس سے ہاتھ ملانے کی بجائے اس کے گلے میں
ن اہل دیں۔

”تمہیں کیا لگ رہا ہے؟“ وہ مسکرایا۔
”بیشک طرح پریشان ہے۔“ سوزی مسکرائی۔
”اگر تم اپنی کلاس کی لڑکیوں کی مسکراہٹ میں عجیب سا جا رہا ہوتا ہے۔ آدمی بس دیکھا رہ جاتا ہے۔“
نے مسکرا کر کہا۔

”تمہارا تعریف کرنے کا اسٹائل بھی سب سے الگ ہے۔“ سوزی نے اس کی آنکھوں میں
ن اہل دیں۔ تھوڑے لمبے میں سوزی کو ہاتھ سے ایک طرف کیا اور جیکٹ کی
بے موٹائی دکھائی۔ اسکرین پر حیدر کی تصویر روشن تھی۔

”ہلو ہار!..... ساری رات جاگتے رہے کیا؟“ اس نے ”ہی“ کا شن پہلی کرتے ہوئے کہا۔
”تم نے ٹینشن ہی ایسی دی تھی۔ بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔“ ہوا کیا تھا کیا؟“ حیدر کی آواز میں
رہا تھا۔

”ہار! تم ولید سے بات کر ڈی ٹیل پوچھو۔ تم تو خود بھی جھیں کثیر نہیں تا سکتا۔ شاید ولید
مہابی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔“ اس نے ٹالنے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا لگتا تھا؟“ حیدر نے پوچھا۔
”مجھے تو یہی لگتا تھا جو تم سے کہا ہے۔ اس وقت میں یونیورسٹی میں ہوں اور میری کلاس شروع
ہوئی۔ میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ میں مگر کچھ کرتی سے بات کرتا ہوں۔“ حیدر نے ٹھٹھکی پر گاہ

ڈالتے ہوئے کہا۔

”لو کے..... مگروں ضرور کر لیتا۔“ حیدر نے تاکید کی۔

”ہاں، ہاں..... نور بی لہاں کی طرف پکڑ لگاتے ہو؟..... میرے بعد تم کو ان کا خیال ہے۔“ اس نے تاکید کی۔

”کہنے کی ضرورت ہے کیا؟“ حیدر نے راما سے ہوتے کہا۔

”نہیں، بس یونہی کہہ رہا تھا۔“ تیور نے جلدی سے کہا۔ ”اچھا، تو پھر بعد میں بات کرتے جائے۔“ تیور نے فون بند کر دیا۔

”کس کا فون تھا؟“ سوزی نے پوچھا۔

”میرا کزن تھا۔ چلو کار میں چلتے ہیں۔“ اس نے فون جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”رات کو کیا پروگرام ہے؟“ سوزی نے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”تو ذرا کھٹے کریں؟“

”شیر..... کہاں چلنا ہے؟“

”تمہارے قلیٹ پر۔“ سوزی نے بے تکلفی سے کہا۔

”ٹھیک ہے..... کھانا آرڈر کر دیں گے۔“ اس نے معمول کے انداز میں کہا۔

”میں تھیک آنھ بجے پہنچا جاؤں گی۔“ سوزی نے کہا اور تیمور نے سر ہلادیا۔



کلاس ختم ہونے کے بعد وہ ضروری نوٹس بنانے لایبیری میں آگیا۔ مطلوبہ کتابیں لینے کے لیے اس نے یونی بے نیاز اور سرسری ہی نگاہ اپنے اطراف میں ڈالی۔ اس کی نظر ایک طرف یقینی کوا

بڑھ گئی۔ وہ کسی لڑکے کے ساتھ جھگڑی تھی۔ اس کے سامنے چند کتابیں

نور وہ چین منہ میں دبائے بڑی توجہ کے ساتھ کھلی ہوئی

میڈا لڑکا بھی کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ مگر کبھی کبھی وہ ایک اونچنی سی فکرفکشف پر ڈال دیتا تھا۔ سیدھا وہیں آگیا اور کشف کے بالکل ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”ہائے.....“ تیمور نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

کشف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر کچھ بولا

یکہا۔

”نوس بیماری ہو؟“ وہ بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔
 ”نہیں.....“ وہیں بیماری نہیں ہوں۔“ وہ جمل کے بولی۔

وہب کیا۔

کون ہے، اور؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لڑکے نے کتاب پر نشان لگاتے ہوئے اسے بکلف اٹھاک سے اسے بڑھنے لگی۔

رات کو میں تہارے پیڈ روم میں سو گیا تھا، جہیں استراحت تو تھیں ہوا تھا؟ ” وہ جان بوجھ کر
میں کرنے کی غرض سے ہوا۔ لڑکے نے ایک جھٹکے سے اس را کے پیلے اسے پھر کشف کو دیکھا۔

نے بات اس انداز میں اور اتنی اچانک کہی تھی کہ وہ لفظ بھر کو گڑبڑا گئی مگر اس نے فوراً خود پر قابو کر لیا۔

”آپ نے مجھ سے اجازت نہیں لی تھی۔ برا تو مجھے بہت لگا تھا۔ مگر میری بھجھ میں نہیں آیا کہ وہ بال میرے ہندروم میں سو رہی تھیں۔ وہ اتنی صبح اٹھ کر کہاں چلی گئی؟“ اس نے بے حد

ابن ابی احماد سے جواب دیا تھا۔ لڑکے کی آنکھوں میں اب شک کی بجائے اطمینان تھی۔

”صبح صبح نہیں گئیں، رات کو ہی چلی گئی تھی۔ ولید انہیں لے گیا تھا۔“ تیمور نے جواب دیا۔
 ”اے صاحب..... چلو، تو انہیں بات ہوئی۔ اب پلیز آپ خاموش ہو جائیں۔ مجھے اپنے نوٹس کاپیٹ

۱۰ ہیں۔ "اس نے اطمینان سے کہا۔ "ہاں تو رہا میں! کہاں تھے ہم؟" اس نے لوگ کو مخاطب کیا۔

میرا نانا کام بھول کر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ارمان کے

”حیران دوست ہے؟“ اس نے چند لمحوں بعد دوبارہ پوچھا۔

”ہوں۔“ کشف نے اس پر توجہ دے بغیر کہا۔

یہاں ہر ماہ کے بارے میں ایک نیا نمبر آئے گا۔ ہر ماہ کے نمبر کے ساتھ ساتھ ہر ماہ کے بارے میں ایک نیا نمبر آئے گا۔ ہر ماہ کے نمبر کے ساتھ ساتھ ہر ماہ کے بارے میں ایک نیا نمبر آئے گا۔

آپ کو تعارف کی ضرورت نہیں..... بہت شہرت ہے آپ کی یونیورسٹی میں۔ "ارمان بولا۔
"اُمان۔ "تھوہر نہ نازی اسے بولا۔ کشف بالکل جب تھی اور اپنے کام میں مگن تھی مگر اس

"بھئی! بچہ دیکھو، میں نے وہاں سے تم میرے ساتھ لے کر آکر ابرمان اتنے بھی ہمارے ساتھ چلنا

۱۰۔ لے جان بوجھ کر اپنا لہجہ و انداز ایسا رکھا تھا جیسے وہ اور کشف بہت اچھے دوست ہوں اور اکثر

”الطبع ذی..... پلیز سشف! مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ تم تینوں کے ساتھ بیٹھو، لو،
میں تینوں کو لکچر کر رہا ہوں۔“

”اے بانی“ دو اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کشف ہونے کی طرح اس کو دیکھ رہی تھی۔

”میرا دوستک۔ تم نے کچھ دلی باتوں کیوں کی؟ کیا پہلے بھی ہم نے ایسے کئے؟“ وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

”نہیں کیا تو آج کر لیتے ہیں۔ ہر کام بھی نہ کسی پہلی مرتبہ سے ہی شروع کیا جاتا ہے۔ اب رنج کر کے دوسرے لے رہا تھا۔

”تجور! تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔ تم ارمان کے سامنے کیا شوکرنا چاہتے تھے کہ ہم ابھی فریڈ نہ ہیں؟“ وہ غصے میں تھی۔

”بچنے میں کیا حرج ہے۔ تمہارے اس ”مولانا“ سے تو میں ہزار درجے بہتر ہی ہوں۔ مسکرایا اس کا اشارہ ارمان کی بجلی جگنی راہمی کی طرف تھا۔

”تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔ دوبارہ بھی میرے سامنے مت آنا۔“ وہ اپنی چیزیں ہونے پوئی۔

”حق۔۔۔۔۔۔ سائنس۔۔۔۔۔۔“ لائبریرین اس کی قد سے نیچر آواز سن کر چائے ب اس کے کر سارا ہو گئی تھی۔

وہ ٹیکو چپ ہو گئی۔ تجور کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ جبکہ کشف کے چہرے پر غصہ تھا۔ اس نے باض نظر سے تجور کو دیکھا اور کہا میں اور کتا میں قابل اٹھا کر کرسی سے اٹھ گئی۔

چین کا کپ داخوں میں وہ اپنے سے جاتا دیکھ رہا۔



”ارمان! ارمان! میری بات تو سنتو۔ کب سے پکار رہی ہوں۔“ کشف تقریبا ہوا اس کے پاس پہنچی تھی۔

”تم یہاں کیوں آگئیں؟“ اپنے فریڈ کے ساتھ کچھ۔۔۔۔۔۔ ارمان خطرے اعزاز میں ہوا۔

”وہ میرا فریڈ نہیں ہے۔“ کشف نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”مسکراس کا اعزاز تو بھی ظاہر کر رہا تھا۔“ اس نے طنز کیا۔

”بکبا۔ وہ۔۔۔۔۔۔ جان کے ٹنگ کرتا ہے۔ میں اسے گھاس جھینس ڈالتی۔ اسی لئے میری توجہ ما کرنے کے لئے اسے سیدھے ترے آگے آتا ہے۔ مگر تمہارے رویے سے بہت تکلیف پہنچی۔

جس میں میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہتے تھا۔“ اس نے فکھو کیا۔

”آئی ایم سوری!۔۔۔۔۔۔ مسکراس کی باتیں سن کر کوئی بھی بدگمان ہو سکتا ہے۔ یوں بھی اس کی ہوا بھی نہیں ہے۔ اور پھر وہ بیحد دم دلی بات۔ تم دونوں اٹھتے رہتے ہو؟“ ارمان نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔ مجبور ہی ہے۔ میں نے قلیت میں ہے، آگ گیسٹ ہوں۔ کل رات اس کی ہوا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو دوسرے کمرے میں سو گئی تھیں جبکہ میں دوسرے کمرے میں تھی اور لاؤنج میں۔ رات کو بھائی اپنے ہر پڑنے کے ساتھ گھوم پھرتی ہوں کی تو تجور میرے کمرے میں ہوا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ تم مجھ پر شک کر رہے تھے۔“ کشف نے ہاتھ دے ہوئے فکھو کر کے۔

”میرا ساری صورت حال بیان کر دی۔“

”لو۔۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ میری وجہ سے تم ہرٹ ہوئی ہو تو آئی ایم سوری۔ مگر تم اپنے لئے کوئی لگانہ کیوں نہیں دھڑکتی؟“ تجور جیسے بے برائے کے ساتھ اکیلے قلیت میں رہتے ہوئے

اس ارمان کی گفتگو؟ وہ بندہ کسی صورت قابل مجبور نہیں ہے۔ جیسے کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکا۔ ارمان نے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔ مگر بے حد مجبور ہے۔ مجھے کوئی دوسرا مناسب لگانہ نہیں ہے ی لے گا، میں پہلی میں تجور کا قلیت چھوڑ دوں گی۔ اور باقی رہی بات ڈکی تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔ کیونکہ تجور جیسے

کے ہاتھوں مجھے خدا ڈروا سواں کرے گا۔ یہ میرا یقین ہے۔“ وہ اطمینان سے مسکرائی۔

”لو کہ۔ میں بھی تمہارے لئے کچھ کرنا ہوں۔ اگر میرے قلیت میں تمہیں کچھ ہوتی تو میں جیسے ساتھ رکھ لیتا۔ مگر ہم کچھ لے کر پہلے ہی وہاں موجود ہیں۔“ ارمان نے کہا۔

”اللہ مالک ہے۔۔۔۔۔۔“ اس نے جانے گا کوئی نہ کوئی بچھ لگانا وہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ اچھا تم لو کچھ یہاں کرنا ہے یا بار؟“ کشف نے موضوع بدلا۔

”نہیں کر لیتے ہیں۔ کوئی بھی بتانے ہیں۔ باہر کی ناگن ویت ہو جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”لہجہ ہے۔ تو پہلے کچھ کھاتے ہیں۔ میں نے بیج سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بیٹ میں چوہے

ا رہے ہیں۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پونہ دس کے کینے نمبر ۱۰

لے کر کی طرف بدھنے لگے۔

”تم نے بھی اپنے بارے میں بتایا نہیں۔“ ارمان نے چلتے چلتے پوچھا۔

”تم نے بھی پوچھا ہی نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”قواب پوچھ رہا ہوں۔ کچھ اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاؤ۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”انٹرو لے رہے ہو؟“ اس نے ارمان کو دیکھا۔

”نہیں مجھ کو۔“ وہ مسکرائی۔

”میرے پاس تانے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہم بارہا نہیں بھائی ہیں۔ دو بیٹیں مجھ سے بڑی ہیں اور

۱۔ ایک بھائی ہے جو ہم سب سے چھوٹا ہے۔ انٹر سائنس کر رہا ہے۔ ام سے ڈاکٹر بنانا چاہتی

۲۔ بہت پیارا ہے۔ مگر ہمیں سب سے زیادہ دوستی مجھ سے ہے۔ ہمارا گھر نا متوسط ہے۔ نہ بہت

۳۔ نہ غریب۔ بابا نے اپنی ساری زندگی ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے گزار دی۔ ایمان،

۴۔ اور ای اور حق طلال کی کمال۔ وہ میں بھی انہی اصولوں پر عمل کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ہمارا گھر

۵۔ ۱۰ سا ہے۔ ہم نے سادگی کے تحت زندگی بسر کرنا چاہی ہے۔ ہمارے تربیت میں کھوت نہیں ہے۔

۶۔ اچھا جانتے ہو میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہوں جو یہاں لندن میں علم کے حصول کے لئے آئی

۷۔ اور یہ سب ہمارے بابا کی بدولت ہے۔ آج میں یہاں اس مقام تک ہوں تو صرف اپنے بابا

۸۔ اور ہے۔ رات کو تو آکسٹو نو پونہ لڑکی کے خواب ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔“ وہ ڈرامہ کو سانس

لینے کو رکی۔

”ارمان! میں کچھ جتنا چاہتی ہوں۔ میرے خواب، میرے ہمنشین کچھ اور ہیں۔ میری اُمیر سے ہلکا سا رنج و گدگد کی محنت کی ہے۔ ساری زندگی انہیں نے آرام کے بغیر گزار دی۔ صبر و جوش کی خاطر۔ اب ہماری باری ہے ان کے لئے کچھ کرنے کی۔ اور اللہ میں ضرور ان کے روشن کروں گی۔“ وہ بے حد عزم مٹی۔

”میں تمہاری بیوقوفی کو دیکھتا ہوں اور خدا سے تمہاری کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔“ ارمان غلغلی سے کہا۔

”اچھا ارمان! تم اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتاؤ۔ تم کہاں رہتے ہو؟ کتنے بہن بھائی وغیرہ وغیرہ۔“ وہ لوگ کیلئے تھرا کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک خالی میز کی طرف بڑھے۔

”ہم چار بھائی ہیں اور تین بہنیں۔ ہم لاہور میں رہتے ہیں۔ میرا تعلق زمیندار خاندان سے میرے ابو کی بہت ساری دشمنیں ہیں جن سے ابھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ میرے بھائی بڑے پڑھنے کا لڑکا اور شوق نہیں ہے۔ لڑائی باپ سے آگے کوئی نہ پڑھ سکا۔ میں شروع ہی سے پڑھائی اچھا تھا۔ برکاس میں اول آتا تھا۔ میرا یہ شوق ہی مجھے اسکورمورٹک لایا ہے۔ اب نے بھی پڑھنے پڑھنے کیلئے سے من نہیں کیا۔“ وہ تانے لگا۔

”اچھا، تمہارا گھر انڈیا ہے یا تم ایسے ہو؟“ کشف نے پوچھا۔

”اس کا جواب میں تمہیں آگے دیتا ہوں۔ پہلے کچھ کھانے کے لئے آؤں۔“ وہ منہ ہوائے اٹھا اور کشف سے سلام دیا۔

ارمان کا ڈاکٹر کی طرف بڑھ گیا اور وہ اسے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ عامی قد و قامت کا نڈل لڑکا تھا۔ چہرے پر راز و مخفی۔ وہ جب بھی کشف سے بات کرتا تھا تو نظریں جھکا لیتا تھا۔ بعد اس کی طرف دیکھتا تھا۔ مگر جب بھی دیکھتا تھا، اس کی آنکھوں میں نہیں جھانکتا تھا۔ کلاس میں بھی کی رپہ نہیں اٹھتی تھی۔ وہ جب بھی پوچھتی تھی میں ہوتا تھا، قمار کے وقت بڑی بات باندھتی۔ پڑھتا تھا۔ جبکہ اس نے اپنی کلاس کے کسی دوسرے مسلمان کے کوئی بات باندھتی کے ساتھ لڑتا تھا۔ کشف دیکھا تھا۔ وہ جب بھی گفتگو کرتا تھا، اس میں احادیث اور آیات کے منہمک اور حوالے بھی کرتا تھا۔ کشف کو وہ آہستہ آہستہ اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اس پر اعتبار کرنے لگی تھی۔ اس کا سامنا اچھا لگنے لگا تھا۔

”بیٹو! کس سوچ میں تم ہو؟“ ارمان نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہتھکی بجائی۔

”تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ وہ ہرگز کی ہنست اس کے ہاتھ سے لینے ہوئے ہوا

”اچھا۔ کیا سوچ رہی تھی؟“ اچھا بابر؟“ وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

”کیسوی لٹی اچھا۔“ وہ ہرگز کا ہنست لینے ہوئے ہوئی۔

اچھا۔ ذرا میں تو سنوں۔“ وہ بولا۔

تم اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔ اس نے ارمان کی بات دہرائے ہوئے پوچھا۔

آں۔ ہاں۔ پہلے تم مجھے بتاؤ، کیا سوچ رہی تھی میرے متعلق؟“ وہ اصرار نہ کرے گا۔

میں سوچ رہی تھی.....“ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔“ تم میں اور دوسرے لڑکوں میں

فی ہے۔“

کیا میرے سر پر سینگ ہیں؟“ اس نے مذاق کیا۔

نہیں۔ تم دوسرے لڑکوں کی طرح غلط نہیں ہو۔ اپنے وطن، اپنے گھر والوں کی نظروں

اور گردنوں میں تم نے خود کو سنبھال ہوا ہے۔ ورنہ یہاں کی آزاد نفسیاتی بات سے پہلے بندے کو کوئی کی

اپنے چال چل میں قید کر لیتی ہیں۔ تمہاری آنکھوں میں، میں نے عموؤں کے لئے احترام دیکھا

تم یہاں رہ کر بھی قمار اور کرنا نہیں چھوڑ پائے۔ تمہاری کوئی کرل فریڈ نہیں ہے۔“ وہ کبہری

”اور ایک وجہ یہ ہے۔ شرافت نام کی کوئی چیز اس میں نہیں ہے۔ بات کرتے وقت نظریں

لہا تو اسے آتی ہیں۔ عموؤں کا احترام کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی

آپ کی اچھے سے بات دہرائے۔ نہایت بے دردمند اور بے زبان لڑکا ہے۔ اور تم..... تم میں اور اس میں

آسان کا فرق ہے ارمان!“ وہ بہت اچانکیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں بس۔“ تم تو مجھے ساتویں آسمان پر بٹھارہ رہی ہو۔“ ارمان نے اسے ہاتھ کے اشارے

لگا۔

”آئی سوئز..... یہ کج ہے۔“ کشف نے اپنی بات پر زور دیا۔

”نہیں کشف! میں تو ایک ادنیٰ سا نظام ہوں اپنے خیر و شر معنی پہنچے گا۔ اور ایک گنہگار سا بندہ

اپنے رب کا۔ خطا کا پتلا۔ ہمارے رب کے ہم پر بڑے احسان ہیں۔ اس نے ہمیں دنیا کی ہر

بخت سے توڑا ہے جس سے دنیا میں بہت سے لوگ محروم ہیں۔ بس یہ قیاز ہے یہاں ہمارے صرف

کے شکر اور کرنے کے طریقے ہیں۔ باقی بات یہ شرافت کی تو میرے گھر والوں نے مجھے یہاں

میں خرچ کر کے ان کے بارے میں معرفت میں پڑ کر وقت پر بارگاہ نہیں بھیجا۔ انہوں نے مجھ پر

اس کے مجھے یہاں جس متعدد کے حصول کے لئے بھیجا ہے مجھے اس میں کامیابی حاصل کرنا

مجھے میرے والدین کا مان اور محروم نہیں توڑا ہے کوئی ایسی دیکھی حرکت کرے۔ انہوں نے مجھ پر

میری روزنامہ کر رہی پاک پہنچنے کی تعلیمات بھی ہیں جو میرے قدموں کو خلاصت جانتے سے

تی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ کشف کو اس کی آنکھوں میں ہلکی سی غمی نظر آئی تھی جسے اس نے پلٹیں

اب جبکہ کر اپنے اندر اتار لیا تھا۔

کشف غصہ کی کوئی گھائی پہنچا رہا تھا اسے غور سے سن رہی تھی۔ اس کے خیالات سن کر، اس

انہیں سن کر کشف نے دل میں اس کا مقام اور بلند ہو گیا تھا۔

”مجھے تمہاری دوستی پر فخر محسوس ہوتا ہے ارمان!..... تم پر میرا غور بڑھ رہا ہے۔“ اس نے

مسکرائے کیا۔

”تم جیسی لڑکی نے مجھ کو اس قابل سمجھا، یہ میری خوش قسمتی ہے۔“ ارمان نے گہری نظر اور اسے دیکھا۔

”لطف ختم کرو۔ ابھی بہت کام رکھا ہے۔“ اس کی نگاہوں کی گری سے گھبرا کر کشف نے سے کہا اور ارمان مسکراتے ہوئے ہرگز کھانے لگا۔



ت کو وہ گھر واپس لوٹی تو تیمور لاؤنج میں ٹی وی کھول کر بیٹھا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی ہم کی طرف بڑھ گئی۔

W.W.F کی ریسٹلنگ دیکھنے میں مگن تھا اور خاصاً پُر جوش ہو رہا تھا۔ کشف کا موڈ آج اُٹھا۔ ارمان کے ساتھ اس کا وقت بہت سارا اور بہت اچھا لگتا تھا۔

بل ہو کر کمرے سے نکلی تاکہ کچھ کھانے کو پالے۔ کل چھٹی تھی لہذا وہ بہت اطمینان سے اچھٹی والے روز ہی اس کو کسی حد تک اطمینان نصیب ہوتا تھا۔ وہ آرام کے ساتھ اپنے بہت ام بھی بننا لیتی تھی۔ اس روز وہ کچھ اچھا سا پکا بھی لیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ فریٹس فریٹس ہی بے باہر نکلی تو لاؤنج میں تیمور کور ریسٹلنگ دیکھتے ہوئے پایا۔

”وہ اسے ہر وقت ہنگامہ اچھا لگتا ہے..... پڑ نہیں یہ لڑکا کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بڑھتی ہوئی بولی۔“ پلیئر والیم کم کرویں۔“

نے شاید سنا نہیں تھا یا پھر جان کر سنی ان ہی کر گیا تھا۔

گہری ہوں کہ والیم کم کریں۔“ اس نے تقریباً چلا کر کہا۔

لمحہ سے کچھ کہہ رہی ہو؟“ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

ا..... اور یہاں ہے ہی کون۔ ٹی وی کی آواز کم کرنے کو کہہ رہی ہوں۔“ اس نے بل

نے ریوٹ سے آواز کم کر دی۔

”ا.....“ وہ پلٹ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تیمور نے دستِ داچ پر نظر ڈالی۔ اات بچ چکے تھے۔ سوزی نے اُٹھ بیٹے آئے کا کہا تھا۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں تیار

ہوا۔ نے اپنے لئے آلو کی بججیا اور چچا تیاں بنالی تھیں۔ اس نے ٹرے میں اپنا کھانا رکھا اور کی طرف چل پڑی۔ ابھی وہ کمرے کے دروازے میں ہی تھی کہ ڈور بیل کی آواز سنائی

نے لاؤنج کی طرف دیکھا۔ وہ خالی پڑا تھا۔ پھر تیمور کے کمرے کی طرف دیکھا، اس کا تھا۔ اس نے ٹرے بیڈ پر رکھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

انہوں ہے؟“ وہ سوچنے لگی۔ پھر مزاجاً ماہ نور کی طرف چلا گیا۔ اس نے دروازہ پوچھتے بنا

”ہائے..... کبھی لگ رہی ہوں میں؟“ سوزی نے آنکھیں بند کر کے یہ بات کہی تھی۔ وہ کشف کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

کشف نے سر سے جھک کر ایک نظر اس پر ڈالی۔ باپ نہیں، بے حد گھرے گلے والے۔ بلاؤ دار سوزی اسکرٹ میں وہ اسے بے انتہا دراپائیت لگی تھی۔
”آپ آپ اس سے پوچھتے گھس گھس نے آپ کو یہاں بلایا ہے۔ میرے کسٹمس کن کراؤم نہیں ہوئی۔“ اس نے رو کھتے سے لپچے میں کہا اور اندر پلٹی آئی۔ سوزی نے اس کی آواز کھول دی۔

”تم کون ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ کشف نے اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔
”تجور کا کردہ ہے۔“ اس نے اشارے سے بتایا۔ ”اور وہاں، باہر کا دروازہ بند کر دینا۔“ وہ دکھائی سے آرزو کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ سوزی نے پوری نگاہی جاتے دیکھا تھا۔ پھر وہ تجور کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازے پر دستک نہیں سمجھا۔ بلکہ پوچھی دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔ اندر تجور بغیر بنیان اور کھینچ کے مرال کھڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر چٹا۔

”اوہ..... تم آگئیں۔ محروقت سے پہلے آگئی ہو۔ ابھی پورے پندرہ منٹ باقی ہیں۔“ وہ مسکرایا۔
”یہ پندرہ منٹ بھی گزر جائیں گے۔“ وہ اس کے سر کی اور خوب صورت جسم کو کہہ دیکھتی ہوئی بولی۔

”دروازہ کشف نے کھولا تھا؟“ تجور نے پوچھا۔
”کشف ہونو؟“ اوہ وہ دلیر لڑکی۔ ”سوزی نے ہاک سکوز کر براسات ما کیا وہ تجوری کی اس نے؟“ تجور بنیان پیٹتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”اسے بات کرنے کی تیر نہیں۔“ ہانگل جانی ہے۔ کون ہے وہ؟ اور کیا تمہارے ساتھ ہے؟“ سوزی نے پوچھا۔

”میرے ساتھ نہیں رہتی۔ اس کا کردہ دوسرا ہے۔ میرا کردہ یہ ہے۔“ وہ شرٹ افلاطینان سے بولا۔ وہ بھگہ گیا تھا کہ سوزی کشف سے ”سن“ بھگتی ہے۔

”مگر وہ اس قیثت میں کیوں ہے؟“ سوزی نے تک کہ پوچھا۔
”وہ یہاں ہے ایک گیٹ ہے۔“ تجور نے وضاحت کی۔
”صرف بے ایک گیٹ یا پچھو اور؟“ سوزی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
”نہم اس سوزی؟..... یہ دیویوں کی طرح پوچھ چکے تھو۔ پور کوئی تو ہیں۔“

یکدم خراب ہونے لگا۔
”اوکے، اوکے..... تم تو بچی ہو پھر دی تھی۔ خیر دفع کرو، تم نے پہنچ کر لیا۔“

اس نے کہا۔

”کیا؟..... تم تو گھر پر ڈز کرنے کا کہہ رہی تھیں۔“ تجور نے لٹک کر پوچھا۔
”یہاں اس بے ایک گیٹ کے ہوتے ہوئے کیا خاک خرہ آئے گا؟“ وہ نگاہی سے بولی۔ اپنے کمرے میں ہوگی۔ جہیں اس سے کیا؟“ تجور لاہر واپسی سے بولا۔
”اور تو اسی قیثت میں رہے گی نا۔“

”مے کمرے قیثت نہیں پڑتا۔ اور پوچھی اب میں آرزو کرے ہوں گا۔ کھانا بھی پیچھے والا ہو اے اطمینان سے کہا۔“ چلو، لاؤ غم میں چلتے ہیں۔“ تجور بولا۔
”مال سینگ پیچھے ہیں۔ جب کھانا کھانا ہوگا جب باہر چلیں گے۔ ویسے آج میں کبھی لگ رہی داری نے ایک ادا سے پوچھا۔

”ات۔“ تجور نے بڑی بے پائی سے قیثت لگا دیا اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ زور سے فس اے کہ کمرے میں کھانا کھاتی ہوئی کشف کے کالوں میں یہ آواز پھیلے ہوئے سسپے کی طرح۔ وہ تجوری ان حرکتوں سے عاجز آ چکی تھی کہ تجوری یہ بھی کہہ دے اس انڑکیوں کو کھر بلانے کی نہیں سکتی تھی۔ لیکن یہ اس کا گھر تھا۔ روٹی وغیرہ بھی انک تک ہوا پس نہیں آئے تھے۔
”اس کی سکن مریم کے گھر ہے۔“ روٹی اور اس کا شوہر دوسرے شہر گئے تھے۔ اس کے شوہر داری سینکڑوں جہیں انڈینڈ کرنا بے حد ضروری تھا۔ دونوں بچے سکول کی وجہ سے مریم کے ہانے پڑے تھے۔ کشف سوچ رہی تھی کہ کیوینٹل انڈینڈ میں لپٹائی کرے۔

”مے سے فارغ ہو کر اس نے برتق ایک طرف رکھے کہ بعد میں جا کر کچن میں رکھ آئے گی۔“
”ابن عادل کے مہم خط لکھتے ہیں جس میں اس نے ذکر کیا تھا کہ اس نے اس ماہ پانچ سو ڈالر بہر بہت کر دی حنت کے بعد اس نے جمع کئے تھے۔“ ابی خیریت لکھتے کے ساتھ اس نے ابی کے متعلق تفصیلات بھی لکھی تھیں۔ خط میں اس نے آم کی مریفوں کی خیریت بھی پوچھی۔ اس نے کافی طویل اور مفصل خط لکھا تھا۔ آج اسے گھر والے بہت یاد آ رہے تھے۔ چند روز لی باگرہ آئے والی تھی کہ وہ اس برس اس کی ساگرہ میں سو جو نہیں تھی۔ اس نے معیہ کو کون اوہ بھی کیا تھا۔

”مے کے اس نے لفافے میں بند کیا اور ایڈریس وغیرہ لکھ کر خط کو سائیکل پھر رکھ دیا۔ آج ابی بھانے کو بہت چاہ رہا تھا۔ اس نے الماری سے لے لیا وہ ابی اٹھایا جو کہ پاکستان سے لے آئی تھی اور گریلی کا دارو ڈاکھول کر کھڑی ہوئی۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔ رات کے اور اس گھپ انورجیرے میں دوسری بلڈ گھول کی روشنیاں نیچے سے دیوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ شال اپنے گرد اسی طرح پھٹی اور وہ ابی سنہال لیا۔ بے حد بے سوزی و صمن اس نے

”کی مگر مٹی ہو کر وہاں بجاری تھی۔ اس زوٹی بھی برف، اس خانے لہر اس رات کے

انہیں میری اپنی ذات کے لئے ہیں۔ صرف اور صرف میری اپنی ذات کے لئے۔ میں یہ ماننے کے لئے نہیں جہاں بھی جھپٹے۔ ”وہ مرد بچے میں بولی۔

”لو کھڑے۔ تیرا تہہ پاری پرانگ گیسٹ تو بہت ہی دلیر اور روڈ ہے۔ تم اسے کیسے برداشت دے؟“ سوزی نے نخوت سے تہور سے کہا۔

”شٹ اپ ہر ماڈھ پلینز۔ تم اس کی مہمان ہو، میری نہیں کہ میں تہہ پاری فضول بکواس کو براؤں۔“ کشف نے سوزی کو لڑائی دیا۔

”ہمارے میری انسٹل کر رہی ہے۔ تم دیر ہے ہو۔ ٹال باہر کرنا اسے۔ رات کو اندر جے میں اپنی بھرے گی تو پھر چلے گا۔“ سوزی بگڑے بولی۔

”یہاں سے نکلتا ہے والی تم کون ہوتی ہو؟“ کشف کو مزید فضا مل گیا۔

”تم کمرل فرینڈ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتی ہو۔ مگر فار ہر کا سٹنڈ انڈر مشن، میں اس میں اپنے آپ کو ”تہہ پاری“ سمجھتا ہوں۔ اور یہ چاہئے کہ مجھے یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

اندھیرے میں اسے اک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دیکھن بھاگے بھاگے آئے۔ اسے اس پورے چاند کو دیکھنے کی جگہ کی پانڈی نے مائل میں ایک عمارت کا چاند سا پتہ دیا۔ اس کے کھنکھے ہوئے اعضاء پر چھائی ٹھکان آہستہ آہستہ گونے لگی اور اس نے بے حد مائل آنکھیں موند لیں۔ آج بہت دیر بعد اسے اپنی حادثات دور کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ

دھنوں میں گھوم رہی تھی۔

”یہ دیکھن کو بھار ہا ہے؟“ بہت اچھی دھن ہے۔“ سوزی نے مسکراتے ہوئے

چمک کر تہور سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ آواز تو بے حد قریب سے آ رہی ہے۔ شاید کوئی ہماری بلڈنگ میں ہے۔“ تہور کو خود بھی موسیقی سے لگاؤ تھا اور یہ دھن تو جیسے دل کو چھو رہی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”دیکھنا ہوں۔“ تہور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سوزی اس کے پیچھے پیچھے

تہور کے کمرے کا دروازہ بھی کھول کر گلی میں نکلتا تھا۔ گلی کی طرف سے آ رہی تھی۔ سوزی نے

اس کی رنگ کی مثال کو اپنے منہ سے نکال دیا۔ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”یہاں سے باہر نہیں کر دینا۔“ کشف نے سوزی کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے سوزی اگر تمہاری یہی ضد ہے تو ٹھیک ہے۔“ تیمور نے چند لمحوں کے وقفہ کہا۔ سوزی کا چہرہ مکمل اظہارِ کشف نے خاموشی سے اندر جانے کے قدم اٹھا لئے۔
 ”سوزی! تم جا سکتی ہو۔“ تیمور کی آواز نے کشف کو حیرت کا ایک جھلکا دیا۔ سوزی ہم اسے دیکھنے لگی تھی۔

”تم مجھے جانے کے لئے کہہ رہے ہو تیمور؟ مجھے؟“ سوزی بے چینی سے بولی۔
 ”ہاں۔“ تیمور نے اطمینان سے جواب دیا۔ کشف خاموش مگر مڑی تھی۔
 ”اوہ..... سبھی..... یہ صرف تمہاری بے انگ گیسٹ ہی نہیں ہے۔ بلکہ تمہاری بیڑا“ ہے۔ جسکی تم اسے باہر نہیں نکال رہے ہو۔“ سوزی نے نفرت و حقیر سے کہا۔ کشف کے دلوں سے زمین جیسے ٹھک پٹی تھی۔ وہ ستر کے بل زمین پر جا گری تھی۔ تیمور نے گڑ بڑا کر کشف اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کشف نے یکدم آگے بڑھ کر سوزی کے کال پر زوردار مہا چپڑہ سوزی کے ساتھ ساتھ تیمور جیسے ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس قدر رشہ رو ٹپل کی اسے توقع ہی نہیں تھی مگر یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اسے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔
 ”ووہ! ووہ! ووہ! پو پو پو..... تم نے مجھے پھنسا مارنے کی ہمت کیسے کی۔“ سوزی یکدم طرح کشف پر بھینکی۔

”تم جیسی گھٹیا لڑکی کی گھٹیا بات کا جواب اس سے بہتر میرے پاس تھا بھی نہیں۔“ نفرت سے کہا۔ تیمور نے سوزی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ خود کو اس کی گچھڑا لے کر کوشش کر رہی تھی۔ کشف نے ایک طعنے پر نظر سوزی پر ڈالی اور سر جھٹک کر اپنے طرف بڑھ گئی اور اندر جانے کے بعد دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔
 ”لڑکی تیمور!..... آئی دل دیتے ہو۔“ سوزی ہانگوں کی طرح چلا رہی تھی۔
 ”جسٹ کول ڈاؤن سوزی!“ تیمور اسے لٹکا پکڑے پکڑے کمرے کے اندر لے آیا۔
 ”کول ڈاؤن..... تم مجھے کہہ رہے ہو تیمور؟..... اُس نے میرے ستر پر طمانچہ کیا ہے جانے سے مار دوں گی۔“ وہ تیمور پر ہل پڑی۔
 ”دھلتی اس کی نہیں، تمہاری تھی۔ تم نے اس کے ساتھ بدچیزی کی تھی۔“ تیمور نے ا

دیکھا۔

”تم اس کی طرف داری کر رہے ہو تیمور!..... اُس قدر ڈاکاں لڑکی کی طرف داری نچا دکھا رہے ہو۔“ سوزی نے ناراضگی کے ساتھ اسے دیکھا۔
 ”سوزی! بات کو ختم کرو۔ میرا مؤمت خراب کرو۔ چلو ڈر کرے ہیں۔“ تیمور نے ا بڑاری کے ساتھ کہا۔
 ”جہنم میں جاتے تمہارا ڈر اور تمہارا مؤمت۔ میری جو بے عزتی ہوئی ہے اس کا رونا“ جنہیں۔“ سوزی چلائی۔

بڑائی تم نے کشف کی کی ہے۔ تم نے اس سے فضول بکواس کی ہے۔“ اُسے بھی اب غصہ آ رہا تھا۔ کشف کی تیش گرنے کا عادی تھا۔
 ”تو مسٹر جو ٹپل خان! اب میں جا رہی ہوں۔ اور تم ڈنر بھی اپنی اسی کشف کے ساتھ اسے بھی اسی کے ساتھ لے کر گئے۔“ سوزی پکڑ کے بولی اور اپنا فریوٹا کوٹ اٹھا لیا۔
 ”نہ گنو ٹپل۔“ تیمور نے پیش میں آ کر کہا۔

ناگت کشف کی وہاں سے چلی گئی تھی اور تیمور بے حد خراب موڈ کے ساتھ اپنی کار کی جانب اپن سے باہر نکل گیا۔ اپنے کمرے میں موجود کشف ان دونوں کے درمیان ہونے والی باتوں پر تیش تھی۔ سوزی کی بکواس اور فراخ تریشی نے اسے سنوٹ مٹی تلے دفن کر دیا تھا۔ وہ اس بات کو دقت دے گا کہ وہ کبھی اس نے وضو کیا اور مٹی پر کھڑی ہو گئی۔ غصا کی گھڑ سے اس وقت وہ دھاکہ دے رہی تھی کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے تھے۔ بہت دیر سے ناکال ہلکا ہوا تھا۔ وہ یکدم مسکون اور ٹپل ہو گئی تھی۔

”یہیں لٹاؤ کی جھل میں کتنا اچھا محسوس دیا ہے۔ بڑے سے بڑا فٹ ہو گیا تو یہ بیٹانی، بے چینی ہے۔ یہیں یہاں دھوکہ کر کے اللہ کے حضور کھڑے ہوئے، وہ ہیں دل سے ہر دم کا پوجہ کر گیا۔ صرف اتنی سی ہے کہ ہم دل سے اور کفن کے ساتھ اسے یاد کریں۔ اس کے آگے سر جھکا تے ہیں، صرف اس کی برتری و عظمت کا خیال ہونا چاہئے۔ اپنی ذات کی بے بسی کا اقرار اس بارنا چاہئے۔ اس سے بچے دل سے مدد و حمایت مانگی جائے۔“

نظر اُٹ کے بعد وہ ہنسنے پر لپٹی۔ اس کا موڈ سوزی کی بدچیزی کی وجہ سے بہت خراب ہوا کہ وہ کبھی کبھی جلد سے جلد اسے کوئی اور ٹھکانہ مل جائے تو وہ تیمور کے اس غلیٹ سے اب تو اس کے لئے یہ اور بھی ناکار ہو چکا تھا کہ بات اب اس کے کردار پر آ گئی تھی۔



بہت دیر گزرتے ہوئے موڈ کے ساتھ ڈسکو چلا گیا تھا۔ آج اس نے بہت زیادہ ڈنس کر لی۔ اور وہ کشف پر غصہ آ رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی رات خراب ہو گئی تھی۔ بے تحاشا ملنے کی وجہ سے اس کو کشف پر بہت زیادہ چڑھنے لگا تھا۔ وہ لڑکھاتے قدموں سے وہاں سے



اندے سے اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے مل گئی تھی۔ پہلے پہل تو وہ بند دماغ کے ساتھ لپٹی رہی مگر پھر وہاں وہاں بڑبڑا کے اٹھ گئی۔ کوئی ڈور تپل بجا رہا تھا اور اس طرح کا اٹھنا جین پر رکھ کر تھا۔

”م سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹپل لپ آ کر لیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ کھڑی پر دقت دیکھا، چار رنج رہے تھے اس نے اپنی شان اٹھائی اور جسم کے گرد گھومتی

ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے تیمور کے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ لاشیں تھیں۔ ڈانٹک بھیل بھی جوں کی توں تھی۔ ہوائی تھری کمرے کے کونے چھپے چھپا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ تیمور ہو گا۔ شاید وہ اپنی پانی لے جا رہا ہو گا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ تیمور آئیں گے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں، بگھرے بالوں اور منہ سے اٹھنے والے دھواں سے ظاہر کرنے کو کافی تھی۔ وہ بھول رہا تھا۔ کشف نے دروازہ کھولنے کے بعد مناسب نہ سمجھا۔ وہ تیزی سے پلٹے گئی تو تیمور نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور خود اندر آ کر حزام سے بند کر دیا۔ کشف کی جان سے کانپ گئی تھی۔

"کیا بے تیزی ہے؟" تیمور دہرایا تھا۔ "کشف نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے ہے تم۔" تیمور نے اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔ "جب سے تم میری زندگی ہو۔۔۔۔۔۔ جب سے میرے لئے دوسری بات ہو۔" وہ اپنی سرخ سرخ آنکھیں اس پر بھالے اور کشف نے اس کے خوب صورت چہرے کو خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔

"تیمور میرا ہاتھ۔" اس نے پوری طاقت کے ساتھ اپنا ہاتھ چمڑانے کی کوشش کی۔ وہ بھیسے کی آہنی قینچے میں پکڑا ہوا تھا۔

"تم۔ تم میری زندگی سے نکل کیوں نہیں جانتے؟۔۔۔۔۔۔ کیوں میرے سر پر سوار ہو؟" کشف نے کہا۔ "تم۔ تم ہوش میں نہیں ہو۔" کشف نے بگھڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں تو جب سے ہی ہوش میں نہیں ہوں جب سے تم سے ملا ہوں۔" عارفین عادل؟ تم چٹان کیوں ہو؟۔۔۔۔۔۔ موم کیوں نہیں جانتے؟ اس نے ایک جھٹکے خود سے نزدیک کر لیا۔ کشف ٹوٹی ہوئی شائع کی طرح اس کے مضبوط بازوؤں کے گہرے اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے وہ میسکے فیر متوازن ہو کر تیمور کے کشادہ سینے سے جا بجا قربت آتی تھی کی تیمور کی گرم ہاتھوں کی گرمی اس کے چہرے کو چمکاتا رہی تھی۔ وہ اس کی میں چل رہی تھی۔ قربت اور رجمت اور شامندی کی گرمی سے گھٹی ہوئی اس کی گرد،

تقریباً دیتی ہے۔ اور اگر زبردستی اور نفرت سے رہتی ہو تو جیسوں کو کھٹکنا ہوتی ہے۔ وقت تیمور کے بازوؤں سے دھکی پائیں لگ رہے تھے جو اس کے وجود کو داغدار کر رہے تھے۔ تیمور دیکھنے۔ کشف نے اپنے آپ کو آواز دہرائے کے لئے اپنی چیخ کا زور لگا کر نازک سی لڑکی اس پر ہر محنت مندر کے سامنے کیا مشیت رکھتی تھی۔ کشف کی آنکھ اندر چھپا گیا تھا۔ اس کے سامنے پار بار اپنے باپ کا سفید ریشم چہرہ آ جاتا تھا۔ اس کے لئے دعا گو نظر آتا تھا۔ کشف کو کبھی آیات یاد نہیں اس نے اس وقت اس سب اس میں کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ایک زانی کے ہاتھوں خوار ہوں گی۔ نہیں، میرے اندر نہیں۔" اس نے چکر کا ہاتھ دے۔ اس کا دل کانپ کر دھکا رہا تھا۔

ہر دو گھنٹے ذلیل آدمی۔۔۔۔۔۔ ہٹا اپنے کندے ہاتھ۔ تم نے کچھ کیا رکھا ہے؟ میں سواری نہیں میں کشف ہوں۔ تم جیسے زانی اور بد کردار انسان کے ہاتھوں خدا مجھے ذلیل نہیں کے گا۔ اتنا یقین ہے مجھے۔ اس نے اپنے دانت تیمور کی کانٹا میں گاڑ دئے۔ تیمور ہلایا۔

مانے اپنی گرفت ذلیل نہیں کی تھی۔

لی زانی، بد کردار ہوں۔ تمہیں اپنے کردار پر، اپنے آپ پر بہت بھروسہ ہے۔ بہت مان زور ہے اس کے سر کے بالوں کو کھینچ میں پکڑ لیا۔ کشف کی چیخ نکل گئی۔

ہر دو تیمور!۔۔۔۔۔۔ خدا کے لئے چھوڑ دو۔ یہ غلط ہے۔ وہ رو دی۔ تیمور نے اس کے دواں کو دیکھا تو جھپک جھپک کر رہا۔

ف عارفین عادل رو رہی ہے۔۔۔۔۔۔ تیمور نے ایک جھٹکے سے اسے تالین پر لڑ کر مار دیا۔ "تم رو رہی ہو، مگر زانی تو ابھی لگی ہو مجھے۔ تم مجھے بہت برا انسان سمجھتی ہو اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کشف نے ڈر کر اپنے گٹھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ "میری طرف

اب عارفین عادل؟" تیمور نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے قلم کر رہا۔ وہ رو رہا۔

نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ "آنکھیں کھولو مجھے دیکھو۔" وہ گرجا۔

اب نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے قریب تھا۔ بہت قریب۔ کشف کا وجود

پہلی طرح کانپ رہا تھا۔

تم مجھے بہت برا سمجھتی ہو۔ نفرت کرتی ہو مجھ سے۔ مگر جانتی ہو، میں تم سے سختی نفرت کرتا

تم میری مردانہ کے لئے ایک چٹخنی بن گئی ہو۔ تم اتنی مضبوط ہو، اتنی مکمل کر تمہارے

میرا دروازہ، میری ذات چٹخنی کے برابر لگتا ہے۔ تم ٹوٹی نہیں ہو۔ تم جھپکی نہیں

لہاری مضبوطی میرے لئے چٹخنی بنی جا رہی ہے۔ تم نے پار میری مردانگی کا مذاق اڑایا

اور ایک کے سامنے مجھے بے اعتبار بد کردار ظاہر کر لی ہو۔ تمہارے نزدیک میری ذات گئی کے

نے بہتر نہیں بلکہ تم ہی ہے۔ وہ بڑی سفاکی کے ساتھ اور کھلے گٹھوں میں وہ سب بیان

ہو رہا تھا۔ ہر محسوس کرتا تھا۔ کشف کھٹی سٹائی کھٹی سی رہی تھی۔

لم کر ڈراما سبک جانتی ہو شاید میری خبر میری دیوانگی نہ تھی۔ مگر تمہاری آنکھ نے مجھے جھپکی

ہر کر دیا۔ اس وقت اس جگہ پر میرے اور تمہارے علاوہ تیسرا کوئی نہیں ہے۔ میں اگر

تمہارے غرور، تمہاری عزت کی دھجیاں بکھیر دوں اور ایسا کرنے میں مجھے صرف پانچ منٹ

لہاری نہیں سننے دلا کوئی نہیں ہے۔ تم مرد کے لئے پار کو دیکھتی ہو یہاں کوئی نہیں آئے

میں جنگی میں مکمل کر دیکھا ہوں۔ تیمور کہتے تھے اس کے اور نزدیک آ گیا۔

لہاری آنکھوں میں میرے لئے سختی تھیر ہوتی ہے۔ سختی حکارت سے تم مجھے دیکھتی ہو۔ سوچو،

لہاری عزت کے کلچر کے گرد تو تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہو جائے گا؟۔۔۔۔۔۔ لوگ بھی تم پر

لہاری کے کہتے ہو ٹی خان نے تم سے زبردستی کی ہے۔ بلکہ لوگ بھی نہیں کے کہ تم ہی

خان کی شخصیت، اس کی دولت دیکھ کر اس پر ہنسنے لگی اور اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دیا۔
کشف خوف زدہ غمزدوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ لب تو جیسے منہ سے نکلتے تھے۔ صرف ہاتھیں۔
بہت کا دامن چپے سے چماتا تھا مگر اہرام کی زمیں میں وہی آئے تھے۔ اس پر بھی اگر
جب بھی حضور اور وحی ظہور لائی جاتی۔ وہ درست کبر ہوا تھا۔ اس نے بھی اس بارے میں سوچا ہی
”تم نے مجھے کتنا ذلیل کیا اور کتنا ذلیل سمجھا۔ آج آج آج سے پہلے کتنی بار میرے باز
تھے کہ تم سے اپنی ذلیل کا انتقام لے لیتا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔“ وہ ابھرتی سے
”یاد ہے کشف! تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ مجھے میرے کردار کی معیوبی پر غور
ناہی پر غور ہے اور مجھے غور اس بات کا ہے کہ میری محنت میں وہ سب کچھ ہے جس سے مجھ
محروم ہے۔“ حضور اس کے پاس دوڑا اور بیٹھا تھا۔ اسے اپنی پرانی ذات حرف یاد تھی۔
”سو..... سو کشف! تو آج آپ میری محنت میں ہیں۔ میں چاہوں تو ہلی بھر میں
آپ کا غرور آپ کا فخر مجھ پر آپ کو بھی دامن بنا سکتا ہوں۔ تو کیا خیال ہے پھر؟“ حضور
کے اس کے جیسے رخسار پر اپنی شہادت کی اگلی پیمبری۔ وہ تڑپ کے یوں چپے ہوئی گویا
چالیس واٹ کا کرنٹ لگا ہو۔

”گمراہ افغان! حضور کی خان کتا بھی بچ سکی، کمینہ سکی۔ محروم ہوئی کسی کے ساتھ ذہنی
سلک۔ کیونکہ میں زہد کی قائل ہی نہیں ہوں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چاہو سناؤ۔“
بھی کسی کو تاج نہ سمجھتا کہ وہ خود اپنی ہی غمزدوں سے گرجائے۔ شاید تمہارا خدا بھی یہی تو
حضور لاکھڑے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے دکھا اور کشف کھنوں میں چر
پھوٹ کر روئے گی۔



صبح اس کی آنکھ غامی ہو کر ملتی تھی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھتی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ اس کی
کلاس میں ہوئی تھی۔ دیر سے اٹھنے اور رات کو روئے رہنے کی وجہ سے اس کا سر بھاری
اسے رات والی ایک ایک بات یاد رہی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے بچاؤ
اس نے سستی سے سبز چھوڑ دیا۔ آج کمرے سے باہر نکلتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی۔
رہی تھی کہ حضور سے سامنا نہ ہو۔ خدا نے اس کی سن لی تھی۔ حضور کے کمرے کا دروازہ بند تھا
ابھی تک سو رہا تھا۔

اس نے اپنے لئے صرف چائے بنائی اور وہیں کاؤنٹر پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ کر کے
ناشہ کرنے کو اس کا پی نہیں چاہ رہا تھا۔ کشف رات والی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ حضور کی
سوچتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ حضور ابھی برائیاں نہیں سے بھتا اس نے سوچ رکھا تھا
چاہتا تو اس کیسے کمر میں وہ اس کے ساتھ کسی بھی نادار سلوک کر سکتا تھا۔ جبکہ اس نے اپنا
کیا تھا۔ وہ اس سے چڑھا تو اور اسی وجہ سے اسے زچ تھا تھا۔ کشف کو اب یہ بات کچھ

”بیلو پاپا! کیسے ہیں؟..... ام اور مرعید کیسے ہیں؟..... میں آپ سب کو بہت یاد کرتی ہوں
اور یہی سیرکان سے لگے کہ کبرہ رہی تھی۔“
اس کی ہلی حضور اپنے بیلو دم سے نکل کر لاؤنج میں آگیا۔ وہ شاید ابھی ابھی اٹھا تھا۔ چھوڑ اور
اپنی پیٹنے ہوئے تو لیے سے بال رگڑ رہا تھا۔ ایک ہل کو دھون کی نظریں میں۔ آج پھر سے پانچ روز
ان دونوں کا آتنا سامنا ہوا تھا۔ کشف نے فوراً ہی نظریں چلا لیں۔ حضور سے نظر اٹھا کر بھا
لیں میں چلا آئی۔ اس نے ایلیز کھیل میں پانی ڈال کر سوچا کہ آن کر دیا اور کافی کوگ میں ٹال کر
لا۔ ابھی اتنی شاید سردی میں اسے صرف جہان پہنچے کہ کشف نے بے اختیار جھرجھری لی تھی۔
”پاپا! جو تم میں جھپتی ہوں وہ آپ لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ اسے صبح مت کریں۔ معید کی
مائل اور دوسرے جو بھی اخراجات اس سے نکل سکتے ہیں، ٹال لیا کریں۔ میں بالکل ٹھیک
ہوں۔ صحت بھی ابھی ہے۔ جی۔ جی ہاں۔ آپ کی دعاؤں کا سایہ سر پر ہے، مجھے کیا ہو
ا ہے؟“ وہ ابھرتی سے بولی۔ ”جی پاپا! معید کو بلائیے۔ آج اس کا بڑھ ڈے ہے۔“ وہ درست واقع
رات دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پپی بڑھ ڈے چٹا!..... تمہارا کفٹ اڑھا رہا ہوں تم خوب محنت
..... تمہیں آگے بڑھتا ہے۔ منزل ابھی بہت دور ہے۔..... اچھا، ام آئیں تو سلام کہنا ان کو۔
اس میں فون بند کر رہی ہوں..... ہاں بھئی، میں جی رہا ہے۔“ وہ دس بیڑی اور فون بند کر دیا۔
”چومٹ کی کال ہے۔“ اس نے چومٹ کی کال کے حساب سے فون کے پاس رکھ حساب کی
اور اڑی میں لکھا جس میں وہ برفوں کے بعد وقت ضرور لکھا کرتی تھی تاکہ جب مل آئے تو وہ اپنے
مداخلت حضور کو دے۔ حضور اس اثناء میں کافی پکا چکا تھا۔ کشف نے اسے دیکھا۔ وہ اس سے

"ابنی وے..... اب تو ہماری دوستی ہوگئی ہے یا؟" تیمور نے سگرا کے کہا۔

"تم سے دوستی..... تیمور" کشف نے سناٹکی سے کہا کیا۔

"کیوں؟..... کیا اب بھی تم مجھے برا سمجھتی ہو؟" تیمور نے اسے گھورا۔

"تیمور! ہم دونوں کے حراج میں اور سوچنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہماری دوستی نہیں ہو
نہ اور اگر ٹھٹھی سے ایسا ہو بھی گیا تو تب بھی ہم صرف لڑتے اور روٹھتے ہی رہیں گے۔" کشف نے
اسے کہا۔ "چھاپا یا نہیں چھوڑا اور یہ پیسے رکھو۔" کشف نے چند کرنسی نوٹ اس کی سمت بڑھائے۔

"قارواٹ؟" تیمور نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

"کراپے۔" کشف نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے..... میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔" تیمور نے کافی کا لمبا سا

ٹوٹ بھرا۔

"مجھے مفت کی عادت نہیں ہے۔ میں تمہاری پراگمٹ گیٹ ہوں۔" وہ اپنے لفتوں پر زور دیتے

تھے۔ بولی۔

"تم نہیں بدلتی۔" تیمور نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور نوٹ اس سے لے لے۔



"کشف!..... میں چاہتا ہوں کہ تم آج میرے ساتھ ڈنکرہ۔" ارمان نے خواہش ظاہر کی تو وہ

برے سے اسے دیکھنے لگی۔

"ارمان! تم جانے ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" تو فحک ہے۔ مگر ڈنر نہیں۔" کشف نے تنبیہ کی

کہا۔

"مگر اس میں حرج ہی کیا ہے؟" ارمان نے ہصرار کیا۔

"حرج ہے۔ اس لئے کہ ڈنر رات میں ہوتا ہے اور میں رات کو کہیں نہیں جاتی۔" اس نے

اب دیا۔

"فحک ہے۔" بھی تیمہاری مرضی۔" ارمان نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "رضان آنے

میں محض چند روز باقی ہیں۔" جھیں ٹانگ کر رہی تو میرے ساتھ چل کے لیا۔ اس طرح میں بھی

اپنی ٹانگ مکمل کرلوں گا۔" ارمان نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

"ضرور۔ اس میں حرج نہیں۔ تاکہ بیکس؟" وہ مان گئی۔

"جب تم کہو۔"

"فحک ہے۔ میں ایک دو روز میں شیڈول سینٹر کے ہٹم نکالتی ہوں۔ یوں بھی ابھی تو ہفتہ بھر

نہر رہا ہے؟" اس نے سب لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" تم سارے روزے رکھتی ہو؟"

"ہاں۔ میں جب چھ سال کی تھی تب ام سے ضد کی تھی کہ میں بھی روزہ رکھوں گی۔ وہ روزہ مجھے

بات کرتا چاہا اور ہی تھی مگر اس کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ مگر آج اسے سامنے دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ
بات کرتی ہے تو پھر انتظار کس چیز کا۔ تیمور اپنے کمرے میں واپس جانے لگا تو اس نے اسے اڑ

دے کر روکا۔

"تو! اجنٹ اے منٹ بلین۔" مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

تیمور فحک کر دکھا۔ اس کی سیاہ خوب صورت آنکھوں میں چکا سناختر تیر رہا تھا مگر وہ خاموش کا
تھا۔ چہرے پر بھی کوئی خاص نہیں تھا۔ کشف اپنی جگہ سے اٹھی اور دو قدم آگے بڑھی۔ چند لمبے خاں!

کی نظر ہو گئے۔ کشف کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس سے معافی کیسے مانگے۔ بلکہ تیمور ابھی تک جو
تھا کہ کشف نے آج پہلی بار اسے یوں مخاطب کیا تھا اور کیوں؟..... اس "کیوں" کا جواب ا

کشف کو ہی دینا تھا۔

"اب بول بھی نہیں کسی کشف فارغین عادل!..... یا سوچ رہی ہیں کہ کیا بولا جائے؟ کون
طعنہ دیا جائے؟ کون کی گالی سوٹ اہل ہوگی وغیرہ وغیرہ۔" تیمور نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہو

ٹھکر کا تیر چلایا۔

"آئی ایم سوری!" کشف نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"واٹ؟..... میں نے واضح نہیں سنا۔" کیا کیا آپ نے؟" وہ ٹھکر کر رہا تھا۔

"میں نے کہا ہے آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ آپ نے ہم
کہا تھا کہ کسی کے کردار کے متعلق کوئی حتمی رائے دینے سے قبل انسان کو سنجیدہ لیتا جانے کو کہی گئی، اور

مکمل نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور خامیاں تو سبھی میں ہوتی ہیں۔ آپ میں خامیوں اور برائیوں کے ساتھ

ساتھ کچھ اچھائیاں بھی ہیں۔ جو مجھے نہیں آتی تھیں۔" کشف نے تنبیہ کی۔

تیمور نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اور جھ دانت کھر کے لباس میں سر کو اسلاف سے ا

وہ بڑے اعتماد سے اور کسی قدر شرمندگی کا تاثر لے اس سے معذرت کر رہی تھی۔ اس کی معذرت۔

جیسے تیمور کے جہن جہن کرتے۔ سیکھنے سن پڑی کا کام تھا۔

"لوہ۔" تو آپ کو آپ کی ٹھٹھی کا احساس ہو گیا۔ خیر۔ اس اڑکے۔ دیر آجے درست آہ۔

تیمور نے کندھے اچکاتے ہوئے لاہ راہی سے کہا۔

"مگر میری جگہ اور کوئی بھی لڑکی ہوتی تو وہ مجھیں ایسا ہی سمجھتی۔ تمہارے انداز تیمہاری حرکتیں

ایسی ہیں۔" کشف نے کہا۔

"یہ سب میرا لائف اسٹائل ہے اور میں سمجھتی ہے یہ ان سب کا عادی ہوں۔ میں جس مارا
میں پڑھا ہوں یہ سب وہاں کا خاصہ ہے۔ تم مکمل نکاس لوگوں کے لئے یہ سب ناقابل قبول ہ

انہونی باتیں ہوں گی مگر ہمارے لئے یہ سب "معمول" میں شمار ہوتا ہے۔" تیمور نے حسب عادی

صاف گوئی سے جواب دیا۔ کشف باقی بھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے۔ اس لئے اس نے تیمور

بکشت نہیں کی۔

ہائے یہ ہر کام بے وقت کیوں کرتا ہے۔ اب یہ بھلا سونے کا وقت ہے؟ وہ جھنجھلا رہی تھی کہ تیرے فضل پر یاد ہو رہا تھا۔

ہری..... طیفٹ ٹھیک نہیں ہے..... اُسے کہہ دو میں کال بیک کروں گا۔" تیور نے ہلکی سی ن کہا۔

ایز تھوڑا تیز بولو۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔" کشف نے ٹک آنکھ کہا۔

اُسے کہو میں کال بیک کروں گا۔" تیور نے مکمل بلند آواز میں کہا۔

وے۔" کشف وہیں سے پلٹ گئی۔

بلکہ..... جی وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ کال بیک کر دیں گے۔" کشف نے اتنا کہہ کر کھٹ سے اُٹھ کر آیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چار گھنٹے کے بار بڑھنے کی وجہ سے اس کی گردن آواز گئی

اس نے کمرے سے ہو کر باغ میں چلی گئی۔ اپنی دھنسی گردن کو مسلا اور پھر آنکھوں پر اپنی غصہ کی

دھڑک دھڑکیں سکون دلایا۔ پھر اس نے وال کاک پر نگہ ڈالی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے

ہائے کے ارادے سے چن کار کیا۔ لیکن میں چاہنے سے بڑا وقت اس کی نگاہوں کی تیور کے

کی طرف اٹھی۔ دروازہ دیباہی اودھ کھلا تھا جیسے اس نے صبح کے وقت چھوڑا تھا۔ کمرے کے

بغیر خاموشی تھی۔ نہ ہی میڈک کا شور اٹھ رہا تھا نہ ہی وہ مٹکتا ہوا بے سانی دے رہا تھا نہ

خاموشی نہ ہی کوئی نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں لے کر اس کے کمرے کی طرف بیٹھی۔ اس

لگا کہ وہ بے سادہ بڑا تھا۔ بالکل دیباہی جیسا وہ اس وقت چھوڑ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں سے

ڈال دی۔ مگر وہاں گھبراہٹ نہ تھی۔ اس نے سمجھتے ہوئے کمرے کے اندر قدم رکھا اور بیٹھ کے

آئی۔ تیور پر نگہ پڑتے ہی وہ چونک گئی۔ اس کا چہرہ تھکادی اناری طرح سرخ ہو رہا تھا اور

کل رنگ ہو رہے تھے۔ اُس نے بے اختیار اس کا ہاتھ چھوا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس نے

اپنے ہاتھ سے کو چھوا لیا ہو۔

آج بھی یاد ہے۔ انتظار کے وقت تک میں ٹیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ بابا نے مجھے گود میں اٹھا کر وہ

انتظار کروایا تھا۔ بس تب سے آج تک الحمد للہ سارے روزے رکھتی آ رہی ہوں۔" وہ پرانے دلوں

یاد کر کے مسکرا دی۔

"گھر والے یاد آ رہے ہیں؟" ارمان نے پوچھا۔

"وہ لوگ بھولتے ہی کب ہیں؟" وہ اُداسی سے مسکرائی۔ "آج سے میری داکٹر کا سر بھی شرا

ہو رہی ہیں۔ جن کے بیٹے کو داکٹر سکھائی تھی، وہ لوگ آگئے ہیں۔ اب تو مصروفیات بھی گئی ہیں

ہیں۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"تو تین تین جگہ جاب کیوں کرتی ہو؟ اس طرح تو تھک جاتا جی ہے۔" ارمان نے کہا۔

"ضرورت ہے ارمان!..... یہاں کا خرچہ لٹانے کے علاوہ مگر میری بیٹی ضروری ہوتی ہیں

اس نے آنکھیں سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ ارمان کو کسی قسم کا سماجی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کو بغیر نوکری

بھی اپنے اخراجات کے لئے رقم گھر والوں سے ملتی رہتی ہے۔ مگر کشف کے ساتھ دوسرا مسئلہ تھا۔

فون کی بجائے مسلسل بج رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اپنا قمیض کھل کرٹے میں گھس گئی۔ مگر وہ

کی مسلسل بجتی ہوئی قمیض نے اس کی کیسٹوں کی شکل ڈال دیا تھا۔ اُس نے تھکا کر چین ٹاکل کے کام

پیدا اور فون کے پاس چلی آئی۔ تیور مگر یہی تھا کہ خجائے فون کیوں نہیں اُٹھا رہا تھا۔ اُس

رہیور اٹھا لیا۔

"تھوڑا..... میں پاکستان سے تیور کا کزن حیدر بات کر رہا ہوں۔ پلیز اسے بلا دیجئے۔" وہ

طرف سے حیدر نے شش انگڑی میں ہی کہا تھا۔

"تھوڑا آج پلیز؟" اس نے اپنا تعارف کرائے بغیر کہا اور رہیور میز پر رکھ کر خود تیور کے کمرے

کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

"ٹھک، ٹھک، ٹھک۔" ایک بار..... دو بار..... تین بار..... ٹھک آ کر اس نے دروازہ

ہی ڈال کر اندر سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے حکیم دروازہ دھک دیا۔ وہ جانتی تھی کہ تیور صبح سے

نہیں گیا تھا۔ وہ بھی تھی کہ شاید وہ ہاتھ روم میں سے بھی اس نے تھکا کر دروازہ کھولا تھا۔ اندر

ہوئے بغیر ہی اس نے کمرے پر نگہ ڈالی۔ وہ تھلائی نظروں سے تیور کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کبلی نگاہ

کی ہاتھ روم کے دروازے پر ہی پڑی تھی مگر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر خاموشی تھی جس کا مطلب یہ

وہ اندر نہیں ہے۔ پھر اس نے کمرے میں جھانک کر وہ مکمل گردن تک اوڑھے آنکھیں موند۔ نا

آیا۔ کشف نے وہیں سے اسے نکالا۔

"تیور! آپ کا فون ہے۔" مگر تھوڑی سی مس نہ ہوا۔ کشف نے اس کا قدم سے بلند آواز

اسے اطلاع دی۔ "حیدر کا فون ہے پاکستان سے۔" بولتے ہیں۔" اس بار تیور نے ڈراما کسمسا

نہی نہی آنکھوں کے ساتھ اُسے دیکھا۔

اس نے سائینج بھیل پر رکھے اور خود اس کے منہ سے قمر بھیل نکال کر ٹیپر چپک کرنے لگی۔
 ”اوہ خدا!..... ایک سو چار.....“ اس کے منہ سے نکلا۔ اس نے پانی گلاس میں اظہار کیا۔
 ”مگر تیور پر شدت نہایت سوار تھی۔ مجبوراً کشف کو اسے سہارا دے کر پانی پلانا پڑا۔
 ”موصوف کو اتنی سخت سردی میں جو بغیر قمیض کے گھومنے کا شوق چرایا تھا، نتیجہ تو ایسی بھاری لگتا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

اس نے سب سے پہلے تو تیور کے پیروں پر سے مکمل ہٹایا پھر اس نے بھاری کی دو گولیاں اسے نکھائیں۔ اس کے بعد اس نے ایک برتن میں پانی لے کر اس میں پٹیاں بھونکو کر تیور کی روشنی شروع کر دیں۔ اتنی شدت کی سردی میں بھی تیور کا پورا جسم آگ ہو گیا تھا۔ وہ کانپ کشف نے اس کے کمرے کے آتش دان میں آگ جلا دی۔ اس وقت اسے یہی سب سمجھ گیا تھا۔
 ”نہ تو اسے یہاں کے ہسپتال کے ماتھے معلوم تھے نہ ہی پانچویں ڈاکٹر کے کیلک سے آئی تھی تب سے اسے ڈاکٹر دھرمہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ ایک ہی گرمی ہوئی تھی، جب اس نے پاس رکھی میڈیسن ہی استعمال کی تھیں اور وہ انہی ٹھیک ہو گئی تھی۔ وہ دوا کر رہی تھی کہ اس کی ٹریسٹ سے تیور کا بخار اتر گیا پورا نہیں اترے تو کم از کم ضرور ہو جائے کہ وہ خود ڈاکٹر کے پاس اکیلا ہی جا سکے۔ پٹیاں بدلتے بدلتے اسے چند روزہ ملے۔ اس نے تیور کے بازوؤں، اس کی دونوں ہتھیلیوں اور پنڈلیوں کو بھی کیلے تو لیے سے ما تھا تا کہ بخار کا زور ٹوٹ جائے۔ پٹیاں بدلتے بدلتے اسے خیال آیا کہ ایک مرتبہ میڈی کو بھی بخار ہوا تھا جب ام سے سورہ قاف کو ایک مرتبہ پانی پر دم کر کے اسے پلایا تھا۔ ساتھ ہی ہم لڑا ماریم کی شمع کر کے اس پر دم کیا تھا۔ تب صرف اُسے سمجھنے کے اندر اندر معیہ کا بخار بنا گیا، اس کے ہی 100 پر آ گیا تھا۔ کشف نے تب اس سے پوچھا تھا کہ یہ آپ کو کس نے بتایا۔
 ”میں نے نہایت بادشاہ کا نام لیا تھا۔“

”اللہ کے کلام میں بے حد اثر ہوتا ہے۔ نبی! ابھی بہت پہلے بادشاہ مکران نے یہ شمع بتائی تھی اور اس مقدس کلام کی تاثیر و طاقت تھی نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔“
 ”آج اسے سالوں بعد وہ اسی شمع کو تیور کے لئے پڑھ رہی تھی۔ دم کیا ہوا پانی وہ دھوا تھا تو اس منہ میں شمع کے ذریعہ ذاتی جاتی جا رہی تھی۔ کتنی ہی درد وہ اس کے سر پرانے بیٹھی رہی تھی۔ پھر تیور کا بخار چپک گیا تو وہ جری انگریز طور پر 99 تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا دل اپنے رب کی بے اختیار ہلک گیا۔

”بے شک میرے رب کے کلام کی تاثیر بے مثل ہے۔ بس ضرورت صرف اس کو مل عقیدت کے ساتھ پڑھنے کی ہے۔ اس نے سوچا۔
 ”تیور اب نہ نہ کوئی انداز میں سو رہا تھا۔ وہ قدرے مطمئن سی ہو کر اٹھ کر اپنے کمرے آئی۔ اس وقت رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ وہ بستر پر لیٹی تو صبح ہانے کے اچھنے کے

ابیں بھولی تھی۔ بستر پر لیٹنے ہی اس کا تھا کہ وہاں ہم نیند کی آنکھ میں چلا گیا تھا۔



خلاف معمول بہت ہی جلد تیور کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کو بخار اب نہیں تھا مگر تھکتا بہت خاصی ہو وہ ابھی سے اٹھا تو میز پر رکھے قمر بھیل پر نظر پڑے ہی اسے کشف کا خیال آ گیا۔ اسے وہ نصف رات تک اس کے سر پرانے بیٹھی رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے بخار چپک کرنے اسے اپنے ہاتھوں سے میڈیسن کھائی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھی اسے یاد تھا کہ اس نے اس کے بازوؤں، ہتھیلیوں اور پنڈلیوں پر کیلا تو لے رکھا تھا۔ اسے یہ بھی اس نے اسے مکمل لوز علیا تھا مگر تیور کی کٹھن ڈھکا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے کمرے کے اس میں آگ جلائی تھی۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ اس کے سر پرانے بیٹھی شمع پر کچھ پڑا کر کہ ہر طرف رہی تھی اور بار بار کشف سے پانی اس کے منہ میں اظہار کرتی۔ کشف پڑتے وقت وہ اسے لہا لہاں اور سی تھی۔ مفید نہ ہو کر اور پورے دو چور پر بڑی اونچی طر سے اوڑھے ہوئے وہ بے حد اپنا کڑی کی رہی تھی۔ تیور کو کمرے کے گوشے میں بھی سب کچھ اتر گیا تھا۔ اس کے بعد جب اس نے کشف کو دیکھ کر وہ دم ہوا تو اسے برنگون سی نیند آئی تھی اور جب کا سوادہ کھا جائے اٹھا تھا۔
 ”جو کس کھوں ہو رہی تھی اور تھکتا بھی۔ وہ صبح کے اٹھا تو اس کا سر پکڑا گیا۔ وہ چند دنوں میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا تھوڑے دم میں آ گیا۔ منہ دھوتے وقت اپنے منہ میں اپنی چٹائی رکھی۔ ایک ہی رات میں اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اس نے بچن کا رخ لیا اس لیے ہی سے کشف کو سوچو دیکھ کر وہ ڈانٹنگ بھیل کی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”ڈانٹنگ!“ وہ مکر گیا۔

اسلام بیکرم، ”کشف نے جواب میں کہا۔

”ایک سلام“ اس نے بڑے گرم سے جواب دیا۔ اسے لوبہ کر کے لئے خود پر جرت ہوئی۔ وہ کسی کے سلام کا جواب دیا کہ تھا۔ کچھ دن مل تو کشف نے اسے ٹوکا بھی تھا۔
 ”سلام کا جواب دینا واجب ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی کو سلام نہیں کرتے تو کم از کم جواب ہی دے“

اس پر مطلق اثر نہ ہوا تھا اور آج بھی بے ساختگی میں اس کے منہ سے ”وہم اسلام“ نکلا۔ اس نے ایک لٹکے کو اسے دیکھا۔

”میں جانے نہ رہی ہوں۔ آپ بتئیں کہ؟“ اس نے رسوا پچھا کر اس کی طبیعت کا احوال انداز میں نہ پوچھا۔

”اکرمیت نہ ہو تو دو دو دے دو ایک گلاس۔“ ویکس دودھ ہی بہت۔“ اس نے آہستگی سے صاف لے کچھ جواب نہ دیا۔ بس ایک گلاس میں گرم دودھ لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ پھر خود کپاس میں مصروف ہو گئی۔

لیں آ جاؤ کشف! میں بھی تو بندہ خدا جا رہا ہوں۔ جنہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔" وہ کوئی لہر ہوا تھا۔

"اچھا تو ڈھیت کیوں ہو؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"انہی خدای کیوں ہو؟ ان کیوں نہیں جانتیں؟" وہ اسی کے سے اعجاز میں بولا۔

"بیس جاہا تمہارے ساتھ۔" وہ تنگ آ کے بولی۔

"نہی ہوجھ سے؟" وہ مسکرایا۔ بڑی کمری مسکراہٹ تھی اس کی۔

"نہی۔" وہ زچ ہوئی۔

"اؤ۔" تیمور نے فرخت ڈور کھول دیا۔ کشف نے سوچا کہ یہ ڈھیت اس طرح جان نہیں لے۔ وہ بھر پختی ہوئی انداز کے بیٹھے اور دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔ تیمور نے مسکراتے لپٹا ایسٹ بڑھا دی۔

"ناراضی سے ایسے ڈھیت ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تیمور نے اچھے بھائیوں سے جواب دیا۔

"اے گھر والے جنہیں کس طرح برداشت کرتے ہیں؟"

"گھر والے..... پاپا۔" وہ سن پڑا۔ بڑی کھوکھلی ہنسی تھی۔ "میرے گھر والے مجھے

"ہی تو کر رہے ہیں۔" وہ عجیب سے اعجاز میں بولا۔

"اے! میں نے اگر بچپن ہی میں جنہیں دو لگائی ہو تیں تو تم آج سحر سے ہوئے ہوتے۔" وہ

"کیلیات سے بے خبر کھڑی تھی۔

"..... اس کے دل سے نکلا۔ "میں تو نہیں البتہ" نام۔" اس نے ضرور لگائی تھیں۔" وہ بے

لے سے ہنسا۔

"اسطلب؟" کشف نے اُلجھ کر اس کی شکل دیکھی۔

"نہی کل میری بہت کینری تھی۔ میں اس کے لئے ٹھیکس کہنا چاہتا ہوں۔" اس نے بات

کی ضرورت جنہیں واقعی ہے۔" کشف نے اس کی سوچ کے برعکس جواب دیا۔ تیمور نے

لہ دیکھا۔

"یہ جملہ ایک کٹ نہیں کر رہا تھا۔" وہ منہ ہٹا کے بولا۔

"نہارے لئے یہی جملہ تھا۔" وہ اچھا بھلا تھا۔

"بہ پڑا کہ کچھ پر پھونک رہی تھی۔ کیا کوئی جاہا تھا.....؟" وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔" ذرا سوچ بچھ کر بولا۔ "میں سورہ نفاذ اور کھڑک طبع کی تسبیح کر کے تم پر دم کر رہی تھی

"وہاں جنہیں پاؤں بھی رہی تھی۔ یہ اسی مقدس کلام کی برکت ہے جو تم آج اس وقت کام میں

لجھ سے باتیں کر رہے ہو اور کارکنی ڈراپ کر رہے ہو۔" وہ منہ لٹکایا ایک سوچا ہوا بخار میں تنگ

تیمور نے "وہ کی چٹکیاں بھرتے ہوئے اسے گہری نگہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس

فیروزی رنگ کی شلوار میں مگن رہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹا سا سوٹر مگن رکھا تو

کے دروازہ بال سیاہ اسکارف میں پیچھے ہوئے تھے۔ چہرے پر مسکے کے نور کی لالی اور عبادت کی ایک

روشنی سی بھری ہوئی تھی۔ تنگ اسے ہمارے چہرہ سیدھی و ستانت لئے ہوئے تھا۔ کھنکھناتے

گلابی خاموسہ پر بھی ہوئی تھیں۔ نرم ہونٹ بالکل خاموسہ تھے۔ اس کے اعجاز میں بے حد

تھی۔ بے حد وقار تھا۔ اسے تیمور کی نگاہوں کی تپش واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی اور اسے اس کا

بہت کھل بھی رہا تھا اسی لئے وہ دانستہ اس کی چاہت دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

چاہتے بنانے کے بعد اس نے کپ میں انگریزی۔ بریڈ کے دو تین اٹھائے اور سرے ہٹا کے

کمرے میں جانے لگی تو تیمور نے اسے بولا۔

"میںیں جینر کر شہر کرو..... میں بھی یہیں بیٹھا ہوں۔ اکیلے کھانے سے بھر نہیں ہے کر ل

کھا جاے؟"

تیمور کی بات پر وہ رکی۔ "مجھے ساتھ ساتھ تیاری بھی کرنی ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

"کر لینا تیمور! تم بیٹھو یہاں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" تیمور بولا۔

"سو رہی۔ میرے پاس بالکل نام نہیں ہے۔ میری بس مس ہو جائے گی۔" اس نے ا

سے انکار کر دیا۔

"میں ڈراپ کر دوں گا۔ ویسے بھی تمہاری کاس آج آٹھ بجے شروع ہو گی۔" اس نے فارل

اعجاز میں کہا۔

"جنہیں کیسے پڑ میری کاس آٹھ بجے کا؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہاری محل خبردار رکھا ہوں میں۔" وہ مسکرایا تو کشف نے اسے گھورا۔ "اے! پارا

بھی چاہتہ بہت۔" یہی "ناک ہے تمہاری۔"

"یہ کیسے زلی۔ آٹھ بجے اس قسم کے دایات ناموں سے مت پکارا۔" کشف نے ا

سے ٹوکا۔

"لوکے، لوکے..... مگر بیٹو چاہا۔"

"نہیں..... مجھے چلنی ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ مجھے نہیں جانا۔" کشف نے بے

سے کہا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ تیمور اس کے اس اعجاز پر چل ہی تو گیا تھا۔

نہ..... لپڈی ڈیانا جتنی ہے خود کہ میرا نام بھی تیمور کی خان میں جو اسے لینے نہ کرنا

سنگ گیا تھا۔

کشف جس وقت تیار ہو کے نیچے اتری تھی اس وقت گیٹ کے سامنے ہی اسے تیمور گاڑی

بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تیمور کی گاڑی پر چھنے کی رفتار۔

کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

رہے تھے۔ صرف میڈیسن پر انحصار ہوتا تو آج تک ہستر سے مل بھی نہیں سکتے تھے۔ ”وہ
میں ہوئی۔

”تم تو جی رہی ہو۔ اچھا انکشاف ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ساتھ ہی ایک چرواہا سے قسم
آیا۔ سیاہ پائیل پاؤں کا زور چرواہا اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”نہیں..... میں صرف اللہ کے کام کو صبح استعمال کر رہی تھی۔“ وہ بولی۔
”پتہ ہے۔ بھی کسی تم مجھے لی اماں جیسی لگتی ہو۔ انہی جیسی نمازی، اسلامی۔“ وہ ا

ہوئے بولا۔
”بی اماں؟..... وہ بزرگ خاتون جو اس روز پچھل میں تھیں؟“ اس کی یادداشت

دن تازہ ہو گیا۔
”ہاں۔“

”کون ہیں وہ؟ کیا تمہاری دادی ہیں یا پھر بانی؟“ اس نے پوچھا۔
”دادی بھی، بانی بھی، اماں بھی، دوست بھی اور باپ بھی۔“

”مطلب؟“ کشف نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
”مطلب یہ کہ کئی کتو وہ میری آیا ہیں مگر کچھ نہیں سے انہوں نے ہی مجھے پالا ہے۔ مجھے

بھی دی، باپ کی شفقت بھی، دوستوں کا اعتبار بھی۔ میری لی اماں میری ماں سے بھی م
ہیں۔“ اس نے بتایا۔ لی اماں کا تذکرہ کرتے وقت اس کے لیے میں جو پیار اور احترام

کشف نے بہت واضح محسوس کیا تھا۔
”اوہ..... اچھا۔“ اس نے سر ہلایا۔

یونینرٹی کی پارٹنگ میں جیور کے کشف کو تار دیا۔
”کشف! اس نے کہا اور پھر کے بغیر چلی گئی۔ وہ اسٹرک پر دووں بازو بٹانے

رہا۔ پھر کارمانڈٹ کی اسی پلی اس کی نگاہ و مان پر پڑی جو کشف کے نزدیک آکر سنا
تائیں کر رہا تھا۔ شاید وہ اسے سلام کر رہا تھا۔ پھر دووں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بام

جیور کو بٹانے کیوں جہن می محسوس ہوئی۔ وہ لڑکی جو اس کے لئے کاٹل تغیر بن گئی تھی، وہ
سے معمولی آدمی نے کیسے بیت کیا تھا؟ اس نے ایک ہنگلے کے ساتھ کارموزی اور ڈرائی

پارک سے باہر نکل گیا۔ اس نے ابھی واپس فلیٹ پر جانا تھا۔ اس کا ارادہ بعد میں ڈا
جانے کا تھا۔



”تم جیور کے ساتھ آئی ہو؟“ ارمان کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔
”ہاں۔ میں تو بس سے ہی آ رہی تھی معمول کے مطابق۔ مگر یہ شخص تو سخت ذہین

پڑ گیا کہ میں ڈراپ کروں گا۔ جیور اس کے ہمراہ آنا پڑا۔“ وہ سادگی سے بتانے لگی۔

کیوں پڑ گیا؟..... تم جھاڑو نہیں..... ارمان کو برا لگا تھا۔
’اچھے ہو میں نہیں جھاڑو؟‘..... ارے کیلے کیلے کی طرح جھاڑو ہوں اسے۔ مگر یہ

ایک نمبر کا۔ کہنے کا مجھے بات کرنی ہے، کار میں جنمو۔ میں نے بھی راستے میں تماشا
بابیت کار میں چننا جانا بھڑ بھڑا۔

ات کرنی تھی اسے؟“ وہ کھجوتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
رات اسے ایک سو چار بھارتا تھا۔ میں نے اس کو دواد فیروہ دی تھی تو اسی کا کشف

نے بتایا۔
’دو سے اتنا تیز بھارتا کیسے اتر گیا؟‘ ارمان نے بظاہر عام سے لہجے میں پوچھا۔

’میں نے آدھی رات تک اس کے سر ہانے بیٹر کر پٹیاں بھی دہی گھسی۔“
’آئی کسی بھرتو واقعی اسے کشف کتنا چاہتے تھا۔‘ ارمان مسکرایا۔

’چھوڑو اس قصے کو۔ تم یہ بتاؤ کہ کشف کیسے کر گیا؟‘ کشف نے موضوع بدل دیا۔

’وہاں آکر قہقہہ لگایا اور پھر اپنے لئے ناشتہ بنائے۔ وہاں اغوا اور ایک گھاس دودھ کا
نے آکر سبک دینا۔ ان کی اور ناشتہ ڈانگ ٹھیل پر رکھ کر خود ہی دی آن کر کے واپس اپنی

’ای۔ آکر سبک دینا پر اسے حیدر کا بیج ملا تھا۔ شاید اس نے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا۔ وہ سخت
’ہا تھا اور اسے گالیاں دے رہا تھا۔ جیور مسکرایا۔ پھر اس نے لی اماں کی آواز سنی۔ وہ بھی

ار رہی تھیں کہ ایک بیٹے سے اس نے انہیں فون نہیں کیا۔
’ناشتہ ختم کیا اور دودھ کے ساتھ بھاری ٹیبلٹ کے کرد فون کی طرف بڑھا۔ سب سے

’لی لی اماں کا ٹیبلٹ پر کیا۔ وہ مگر سب سے پہلے لی اماں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق
’ماں سے ہی اٹھایا۔

’لی اماں! کیسی ہیں؟“ اس نے ان کی آواز پہنچانے ہی کہا۔
’لی آگیا اس بچی کا شرو تو نہیں آتی نا۔ یہاں میں روز حیرے فون کا انتظار کرتی ہوں اور

’لی ہی نہیں ہوتی کہ فون ہی کر لیں۔“ وہ ڈانگی کے ساتھ ہو لیں۔
’لی لی اماں! میں بہت ہی بدی۔ مگر کج میری طبیعت بھی خراب تھی۔ پتہ ہے، ایک سو چار

’وہاں بوجھ کر دردناک لہجے میں بولا۔
’حیرے اللہ..... اتنا تیز بخار..... دووا؟..... ڈاکٹر کو دکھایا؟..... اب کیسی طبیعت

’بد دم پریشان ہو گئیں۔ جیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمک لگی۔
’کوڑھلے کرنے سے ہی خدمت نہیں۔ میں کیوں بتاؤں۔“ وہ اب انہیں ہنگ کر رہا تھا۔

’اچھے کیا خبر تھی کہ میرا بیٹا بد ہے۔ میں تو تمہارے اسٹے دوں سے فون نہ کرنے کی وجہ
’ناجی۔ فلیٹ پر بھی تم نے یہ میویشن لگا کر رکھی ہوتی ہے۔ وہاں بھی اکثر مصروف ہوتا

ہے۔ حیدر تاربا تھا کرتم نے اسے فون نہیں کیا۔ ہو کہاں تم؟" لی اماں نے پوچھا۔
"میں بڑی قمار دار۔"

"اچھا ڈاکٹر کے پاس گئے تھے؟ دو الی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں..... اتنی ہمت ہی کہاں تھی؟ میں تو بے سوجھ تھا۔ وہ تو ایک فرشتے نے میری
کی جی رات بھر۔" وہ بولا۔

"فرشتہ؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" لی اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو وہ لڑکی یاد ہے جس نے مجھے ایکسینٹ کے بعد ڈاچل پہنچایا تھا اور اپنا فون
دیا تھا؟"

"ہاں، ہاں..... اسے بھلا کیسے بھول سکتی ہوں؟ اس کی وجہ سے تو تم نکلتے گئے۔
احسان تو ہمارے کندھوں پر بوجھ کی طرح رکھا ہے۔ وہ تو واقعی رحمت کا فرشتہ بن کر آئی
وقت۔" انہوں نے کہا۔

"میں تو اسی فرشتے نے کل آپ کے بچے کی حیدر داری کی تھی۔ رات بھر وہ میرے پاؤں
ری تھی۔ اور ایک اور بات بتاؤں، اس نے میڈیسن کے ساتھ ساتھ مجھے سورہ فاتحہ کے
بھی پڑھایا تھا اور کھطیبہ کی تصحیح کر کے میرے اوپر پھونگی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ میڈیسن سے
ٹھیک کرنے میں ان چیزوں کا ہاتھ ہے۔" وہ جفا۔ "پاؤں لی اماں! وہ میڈیسن سے لیا وہ"
پر بھروسہ کرتی ہے۔" وہ فحش رہا تھا۔

"وہ ٹھیک کہتی ہے..... اللہ کے پاک کلام میں جو طاقت و شفا ہے وہ دنیا کی کسی چیز
لی اماں نے کہا۔

"وہ آپ جیسی ہی باتیں کرتی ہے۔ مجھے تو وہ بھی آپ جیسی ہی لگتی ہے۔" تیمور بولا۔
"وہ بچی بہت نیک اور شریف ہے۔ میں نے ہسپتال میں اسے دیکھ کر اعزازہ لگا لیا
جہادری قلیت پر کیا کر رہی گی؟" انہیں خیال آیا۔

"وہ یہاں ہے انک گیسٹ کے کھور پر رہتی ہے۔ لندن میں رہائش کا مسئلہ ہوتا ہے
اس نے بتایا۔

"مگر وہاں کیا کرنا گئی ہے؟ کیا نوکری کرتی ہے؟"

"وہ یہاں پر رہنے آئی ہے، اس کو پندرہ دس مہینے جہاں میں پڑھتا ہوں۔ اپنا خرچہ پورا
لے دوسرے سٹوڈنٹس کی طرح وہ بھی باپ کرتی ہے۔"

"اچھا، اچھا..... بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ میری طرف سے اس کا شریعہ ادا کر
پاکستان کب آؤ گے؟ بہت یاد آتی ہے تمہاری۔" وہ بولیں۔

"پہنچوں میں آؤں گا۔" اس نے بتایا۔

"ہسپتال کب ملیں گی؟"

بھی کافی دن پڑے ہیں۔"

اجھا اپنے باپ سے بات کرو گے؟" انہوں نے پوچھا۔

اپنا گھر پر ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ہوں۔ لو بات کرلو۔" انہوں نے ریسپورڈ صاحب کو کھما دیا جو اسی ملی آئے تھے۔

کون؟" انہوں نے ریسپورڈ لینے ہوئے پوچھا۔

نور ہے۔" لی اماں نے بتایا۔

بلو۔ ہاں یک مہینہ پاؤ آ رہے؟..... اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟"

ہاں پاپا! اسٹڈی بھی ٹھیک چل رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

وہ..... مجھے یقین ہے کہ تم اپنی اپنی کام کے جھنڈے کاڑو گے۔ تم اپنی اسٹڈی
کر اور پھر جلد از جلد ہمارے بڑے کو کھانا۔ اب ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔" وہ بولے۔
اپنا ضرورت آپ کو ہے یا آپ کے بڑے کو؟" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

ماں کو۔"

وہ کے چنا! ایک کیکر۔ مجھے ایک ضروری منگ میں پہنچتا ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" رؤف
نے ٹھکری دیکھتے ہوئے کہا۔

پ کو کب نہیں ہو رہی ہوتی پاپا! اس نے سوچا۔

لی اماں کو فون دیجئے۔" وہ آنکھیں سے بولا۔

اب صاحب نے لی اماں کو ریسپورڈ دیا اور خود چلے گئے۔

اپنا پاپا بولو۔" لی اماں نے ریسپورڈ کان سے لگا دیا۔

لی اماں! ہو سکتا ہے میں کچھ نمونے کے لئے آپ کو اپنے پاس لندن بلوا لوں۔" اس نے کہا۔

میں وہاں کیا کروں گی؟"
وہ سن کر ہنس دی آپ کیجئے گا۔ ویسے آپ پور نہیں ہوں گی۔ کشف بھی آپ جیسی ہے۔ اس
وقت کو گرا لیجئے گا۔" وہ بے اختیار بولا۔

پاپا اچھا..... دیکھی جائے گی۔"

پاپا لی اماں! فون بند کر رہا ہوں۔ ہائے۔" تیمور نے ریسپورڈ نیچے رکھا۔

بتو یہ لڑکا تمہارے خدا حافظہ اور سلام کرنا کب تکے گا؟" لی اماں نے ہنگامی سے ریسپورڈ
پر رکھا۔



کہا لیں۔

بہنو! فوراً تم جذباتی ہو رہی ہو۔ تمہاری عمر میں اکثر لڑکیاں اور لڑکے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ تم خٹلے سے دل و دماغ کے ساتھ دو چور ہو کر سو کر دو۔ جس راہ کا انتخاب تم نے کیا ہے اس راہ میں چلو ہیں۔ کانٹے ہیں۔ آج کا زمانہ پرکینکلیں کا دور ہے، وہ خواہوں میں رہنے کا نہیں۔ مجھے جبرانی تمہیں لڑکا ملا لڑکی کے ذہن سے ان سب باتوں کو کیسے قبول کر لیا۔ "ماہ نور کے خٹلے بھائی عمر لگا۔

انہوں میں تو میں پہلے زندگی گزار رہی تھی۔ اب تو حقیقت میں آنکھیں کھولی ہیں۔ اب تو بات سامنے آئی ہے۔ مجھے میری زندگی کا اصل مقصد کیا ہے۔" وہ ابھی سے بولی۔ حیدر نے اسے اسے دیکھ کر ہنسا۔ بعد عام اور سادہ سے کپڑوں میں ملیں وہ چاروں نما دوپٹے سے اپنے سر کو اچھی طرح ڈھانچے ہوئے کسی خٹلے روپے کے خوب گھرانے کی لڑکی لگ رہی تھی۔

بھائی! دنیا میں ایسے بے شمار مسلمان ہیں اور ہم بھی ان میں شامل ہیں جو مذہب اور دنیا داری کو بے فکر خٹلے ہیں۔ بی بی زینب! ایسا کرنے میں حرج کیا ہے؟ آپ صوم و صلوات کریں مگر ساتھ اپنے انیشی کو بھی پیشین رکھیں۔ "حیدر نے تجویز پیش کی۔

"مناقت کرو؟" اس نے حیدر کی طرف دیکھا۔ "آج تک مناقت ہی تو کرتی آئی تھی۔ انہم تمام مسلمان تھی۔ اب تو اصل مسلمان ہونے کا مطلب سمجھا ہے۔ اب تو جان پائی ہوں کہ ان کا مفہوم کیا ہے؟..... تم کہتے ہو کہ میں پھر سے کھانے کا سودا کر لوں؟" وہ خٹلے سے لہجے لہا۔

چار خاموش ہو گیا۔ وہ اسے کیا سمجھا۔ دو تو خود اسی مسلم کا حصہ تھا۔

کرمیں اس طرح اپنے گھر کو کسمپیش بنا سکا۔ مجھے ایسے لافانی باپ بزرگ کی ضرورت ہے جو میرے قدم ہمارے کھانے، ایک مدرسے کی استانی کی ٹیکس جو ہر وقت بیچے ہاتھ میں لیے اللہ اللہ کرے ان دینی پھرے۔ "ولید کا بی بی بعد بولا تھا۔ "فیصلہ آج، ابھی اور اسی وقت ہونا ہے۔ ماہ نور! مجھے

ہاتھوں کے سامنے تیار ہوا جواب چاہیے۔" ولید نے فیصلہ کن اعزاز کیا تھا۔ "لوگوں کا کلنگ صاف ہے۔ تم جیسے نہیں چھوڑنا چاہتی۔ مگر جس تیار سے لے اپنے اٹھ کر پھرتی ہو۔" اس نے فیصلہ بنا دیا۔

تو ٹھیک ہے۔ پھر میں آج ان سب لوگوں کے سامنے تم کو خطاب دیتا ہوں۔" ولید نے پیش میں کہا اور اس سے پہلے کوئی اسے روکا اس نے سب لوگوں کے سامنے ماہ نور کو غصے میں جھٹکا۔ "ای اور پھر وہاں رکنا نہیں بلکہ لیے لیے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ کمرے میں موجود نفوس پر بھڑکائی ہو گیا تھا۔ ماہ نور چپ بیٹھی تھی۔ پھر یکدم سے ماہ نور کی میٹھی دنا شروع کر دیا۔ "اس لڑکی نے ہماری ہاک کھڑائی۔ ارے کاش! تم جرجا میں ماہ نور یا یہ کلا کلا ہادی چٹائی پر نہ بہر تھا کہ تم جرجا میں۔ ارے اب ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ کتنی بدنامی ہو گی دنیا

ہال کمرہ بہت سے نفوس سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں چھوٹے صفوں پر ماہ نور کے بڑے۔ بھائی بیٹھے تھے۔ بڑے صفوں پر ماہ نور کے والدین بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں سے بے شمار زندگی بہت واضح جھلک رہی تھی۔

نمبر اور فٹیل اللہ بھی دوسرے صفوں پر بیٹھے تھے۔ حیدر اور فلک دونوں ایک طرف کھڑے۔ ولید ہاتھ بیٹے پر لیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ ان سب کے درمیان ماہ نور ایک کونے میں خاموش کھڑی۔ انہیں لندن سے آئے ایک ماہ ہونے کو تھا۔ ولید نے ہر طرح سے کوشش کر لی تھی کہ کسی

نور بدل جائے۔ دو پارہ بھیجی ہوئے ہو جائے۔ مگر اس کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ ماہ نور اب اس کی کھڑی تھی۔ فلک اگر ولید نے اپنے والدین کو اطلاع دیے بغیر ماہ نور کے دونوں بڑے بھائی والدین کو کراچی والے گھر میں بلوایا تھا۔ حیدر اور فلک بھی موجود تھے۔ اس نے ان سب کو، گھر کے سامنے سارا مسئلہ بیان کر دیا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص نے ماہ نور کو بھانسنے کی بعد کوشش

مگر وہ کسی سے کم نہ ہو رہی تھی۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟..... کیوں ہماری عزت کو نیا م کرنے کے روپے ہو رہی ہو؟ جو اسے تو سوسائٹی میں ہمارا کیا فخر ہوگا، باقی ہو؟ لوگ مذاق اڑائیں گے۔ تمہیں گے ہم پر۔" ماہ نور والد نے غصے سے کہا۔

"آپ لوگوں کو میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھ سے اسے دیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"پانچ لڑکی! یوں کہہ دینے سے رشتے ٹاٹے ختم نہیں ہوتے۔" ماہ نور کے سب سے بڑے بیٹے سے کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں بڑے بیٹا؟..... جو آپ لوگ چاہتے ہیں وہ کمرہ میرے اختیار ہے..... اور جہیں چاہو رہیں ہوں وہ آپ لوگ مجھے دے نہیں سکتے۔" وہ بے کسی سے بولی۔ "تو تم خود کوئی کرلو۔" دہرکا کلو۔ تاکہ ایک ہی سرجہ میرے کمرہ لیں۔ اس طرح کر کے ڈرنا نہ بھر میں بدنام کرادوں گی۔" ماہ نور کی میٹھی میں آکے کہا۔ ماہ نور نے نظروں اٹھا کر اٹھ، بڑی خاموش لگاؤ تھی۔ زندگی شکایت تھی نہ فخر۔

"آپ کسی بات کر رہی ہیں؟..... سمجھ جائے گی۔" ماہ نور کا جھٹلا بھائی نور اہلا۔

میں ہماری بھارت کی ہیلڈ انڈس میں مجھے گا کہ مشہور اعظم سلیٹ سلیمان بیگ کی اکلوتی بیٹی ہو گئی۔ اور بھڑے طلاق سامنے آنے کی تو لوگ ہماری ہنسی اڑا دیں گے۔ ہائے سلیمان! کتنی مری جاؤ۔

ماہو نور کی کہن کر دی تھیں۔ باقی سب لوگ سر ہکا سے کھڑے تھے۔ ماہو نور نے ایک نا پر ڈالی۔ میں ان کو کہہ دیا کہ یہ وہ کیا ہے۔ ایسا گناہ کہ جس کی معافی ممکن ہی نہیں۔ کام ان کو گلوکار درمیان کھینچنے لگا تھا۔ وہ بھائی ہوئی کرے سے باہر نکل گئی تھی۔

”مائی گارلڈ! کیا تم جی کہہ رہے ہو؟“ آئی کانٹ بیوی۔ ”تجور اپنے بیگ کی حالت! کشف سب سے اعتبار دیکھا۔ وہ دوسرے مکان سے لگے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے انتہا حیران کن نہایت تھے۔

”تمہیں میرا مطلب تمہیں سمجھو کہ نہیں تھا۔“ مگر..... بات ہی اتنی جرب تجور کہہ رہا تھا۔

کشف ہائے کہن میں کمانا بنا رہی تھی۔

”اب وہ کہاں ہیں؟“ اچھا تم خود انہیں چھوڑنے سے متھے؟ اور..... مگر انہیں یہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ویسے جب وہ یہاں ہی تھیں تب ہی مجھے عجیب سی صورتی میں نے جھپٹا تھا۔ ”تجور کہہ رہا تھا۔ کشف کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ یقیناً ماہو نور کی بات کر رہا تھا۔ کہ کجس ہوا تھا مگر اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ تجور نے کہہ پائیں کہ اسے فونڈ کر دیا۔ وہ بے چینی اٹھ کر فریج کے پاس آیا۔ اس نے فریج کھول کر کھانسی لگی اور پتیلی کا ٹکڑا نکالا اور وہیں بیٹھ گیا۔ وہ بہت اُلجھا ہوا تھا۔ کشف نے اسے نظر اٹھا ہونے لپٹا گاں پام رکھا۔

”کیون یو بیٹا اکلوتی کی مذہب کی خاطر دولت، شوہر، والدین ہر چیز کو ٹھوکر مار سکتے ہیں اس سے مقابلہ ہو۔“

”کس کی یاد رکھ رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ماہو نور بھائی!..... ولیہ نے انہیں دیوس کر دیا ہے اور ریزن پتہ ہے کیا ہے؟“ اڑ سٹیس پھیلا۔ کشف کو خبر سے بہت دکھ پہنچا تھا۔

”کیا؟“ اس نے جاولوں کے نیچے چہلہ دھما کیا۔

”وہ جتنی تمہارا اٹلیٹکس منافقوں کی دنیا ہے جہاں وہ نہیں دیکھتیں۔ یا تو ولیہ ان کی تہہ پٹی کے ساتھ ان کے جواب ان میں آئی ہے یا مجھ وہ ان سے قطع تعلق کر لے۔“

تھا کہ وہ دیوس کچھ پائتی تھیں مگر ولیہ ان کو اس طرح اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ لے کر دوسری جا رہی تھیں۔ لہذا اس نے بھائی کو اڈیوس دے دی۔ پڑا سٹرا!..... پڑا سٹرا!

یہاں آ رہے ہیں بات۔“ وہ واقعی اُلجھا ہوا تھا۔ کشف نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ واقعی یہ بات نہیں سمجھ سکتے تجور! وہ واقعی کرے ہیں۔ اب کہاں ہیں وہ؟“ اس نے گہری باتے ہوئے پوچھا۔

وہی گاؤں چل گئی ہیں جہاں ان کی برادری کے ذمہ دار رہتے ہیں۔“ وہ سہانے کا بولا۔

س کی بات کر رہے ہو؟“ وہ چنگی۔

رے حمایت بادشاہ کی۔“ تجور نے بتایا۔ وہ چنگی۔ ”میدر خود انہیں وہاں ان کے کہنے پر چھوڑا۔ اب وہ وہاں ایک مدرسے میں راتنی ہیں اور بچوں کو دینی تعلیم اور قرآن وغیرہ سکھاتی ہیں۔“

بیکے پھٹکے لیے کھیا۔

تم اپنے الفاظ کی طرح تجور حمایت بادشاہ ایک بہت محرم انسان ہیں۔ وہ کسی کو ٹھوکر مار نہیں دیتا۔ ماہو نور بھائی نے ان کے درس سے اپنی زندگی کا مکمل مستعد پایا ہوگا۔ انہیں راجہ نجات لگی تھی کتنی ہوں کہ انہوں نے سب کچھ کھو کر بھی کچھ پایا ہے۔“ وہ اٹھنگی سے بولی۔

راجہ نجات..... یہ کیا ہوتی ہے؟“ تجور نے اشتیاق سے پوچھا۔

راجہ نجات وہ ہے جس میں دنیا کی کامیابی، آخرت کی فلاح ہوتی ہے۔ جہالت کا راستہ۔ مگر تم کو سمجھے۔“ اس نے سر ہکا کر دیا اپنا کام شروع کر دیا۔

”جہالت کا راستہ کیا ہوتا ہے؟“ وہ کھول کے کسی نادان بچے کی طرح سوال کر رہا تھا۔ ”اور یہ ہدایت ہو، دنیا کی کامیابی..... تو بھائی نے اپنے لیے خدائی دیو خدائی کا راستہ چنا ہے۔ کیا تمہیں اس سے پچھترے مدرسے میں گندے مندرے سے بچوں کو دینی تعلیم اور قرآن کی تعلیم دے کر اپنی اہل اور مومن گھڑی لائف کولائٹ مار کر وہ کسی کامیابی کے حصول کے لیے اس دیہات میں جا رہے ہیں؟ وہاں انہیں کھانے کو کیا ملتا؟ روکھی سوچی، پیٹنے کو کچھ ترے رہنے کے لیے ٹوٹنے لے چنگ یا شاید چربی زین کا فرش۔ کس طرح کامیاب ہویں؟ کیا حاصل کیا انہوں نے؟“

رہو ہو کر بولا۔

”تم نے کیا نام یہ چیز نہیں سمجھو گے۔ تجواری نظر میں وہ خوار ہو رہی ہیں۔ مگر یہی نظر سے زندگی کے دنیا کی کامیابی اور آخرت کی فلاح حاصل کر لی۔ اپنی آئینہ مل اور مومن گھڑی کے دھوکے سے باہر نکلے کے بعد ہی ان کو زندگی کی اصل حقیقت نظر آئی تھی۔ یہی تو انہوں نے

خوں ہماری زندگی کو ٹھوکر مار کر عام زندگی کو اپنا لیا۔ اگر وہ وہی سوچی کھاتی ہوں کی تو انہیں ذرا

اس کا انہیں نہیں ہوتا ہوگا۔ اگر وہ پچھترے پھٹتے ہوں کی تو وہ انہیں اس لباس سے زیادہ آرام دہ

ہوں گے جس کی نایت جہازوں میں ہوگی۔ تجور تم ان باتوں کی گہری کو اس وقت سمجھو گے

تم خود کسی ایسے تجربے سے گزر دو گے۔ جب تمہیں تجواری یہ عیاضی کی زندگی زیر گئے۔ لگی۔

ای، ماہو نور بھائی کی نظر سے دیکھو تو تجواری ہماری دنیا تو اسے قید خانہ لگے گی۔“

”مگر ولیہ وغیرہ تو جتا رہے تھے کہ انہیں حمایت بادشاہ سے عشق ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے

یہ راہ نکالی۔ اب تو ولید نے انہیں ڈیور بھی دے دی ہے۔ اب تو ان کے لئے دوسری ٹہ اور بھی آسان ہو جائے گی۔" وہ دھڑپے لہجے میں بولا۔

"میرا دل تہماری اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ انہوں نے اس وجہ سے طلاق لی کشف نے اس کی بات کائی۔

"طلاق لی نہیں، ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ ولید کو طلاق دینی پڑی۔" تیور نے بات کو کاٹتے ہوئے طنز پر انداز میں ہنسی کی۔

"مجھے انہیں نہیں لگتا ہے تیور اور کراچ تو وہ خود ہی بتا سکتی ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے ایک بند عشق میں مبتلا ہو کر بھی اپنے لئے اسلام کی راہ چنی تو بھی میرے نزدیک یہ برا تو نہیں۔ ان کا قابل احترام ہے کہ انہوں نے اپنی پڑاؤ آسائش زندگی چھوڑ کر ایسی مشکل زندگی اپنائی۔ دین کی پٹنے والوں کے خیروں میں بھول کر غم اور نوکیلے پتھر اور خار زیادہ ہوتے ہیں۔ اس راہ پر چل کر تک پہنچتا ہے حد مشکل ہے۔" اس نے اپنے خیالات پیش کئے۔

"مگر میرے نزدیک یہ تہامت کبواس ہے۔ بھی آپ کو کیا ضرورت ہے ایسی حفاظت کرنا۔ وہ سر جھک کر منہ ہٹا کے بولا۔

"میں نے کہا تھا کہ یہ سب باتیں تہماری کچھ میں نہیں آنے والیں۔ تم نے بھی ایک وقت تو انہیں خدا کے دربار میں۔ تم ان باتوں کی گہرائی تک کہاں پہنچتے تھے؟" وہ طنز پر لہجے میں اس کی بات پر توجہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"میری تم پر بڑھ چکی ہو نماز۔ کافی ہے۔" اس نے جیسے اس کا مذاق اڑایا۔ کشف نے اسے مگر "میری نماز صرف میرا پتہ دے کر کی۔" اس نے گویا بتلایا۔

"تم بہت نماز ہی پڑھتی ہو۔ میری بھی سٹافز کر دینا خدا سے۔" اس نے تہجد لگایا۔

ناگوار سے اسے دیکھا۔

"خدا سب کا مذاق اڑاتے ہوئے۔" وہ برا مان گئی۔

"اے نہیں، نہیں، یارا" وہ جلدی سے بولا۔ "اچھا..... تم کیا پکاری ہو؟" تیور نے موضوع، "چلاؤ۔"

"کیا تم مجھے آخر نہیں کر گئی؟" تیور نے پوچھا۔

"ابھی دم پر ہے۔ جب بتا جانے کا تب کہا لیتا۔" وہ بولی اور پھر ان اشارے لگی۔

"کل تہارا وہ دوست تھا مجھے کب کب میں۔ کیا نام ہے اس کا، ہاں..... ارمان..... جو سرسری لہجے میں بتا تھا۔ کشف جو سبک میں ہاتھ دھو رہی تھی، یکدم جھٹکا کھائی۔ تیور دل و دماغ اس کے چمکنے پر غصہ چڑھا۔

"بہت نیک بھٹی ہے اسے۔ اب بتاؤ گا اس کی حقیقت اسے۔" اس نے سوچا۔

"ارمان کب میں؟..... وہ کب کب میں؟" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے۔ وہ ڈسکو میں تھا اپنی کی گول فرینڈ کے ساتھ۔ ڈسکو بھی کر رہی تھی ابھی۔"

اسے دیکھا تو تھا کمر اس سے نیلو ہانے کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔" تیور نے سادہ سے لہجے میں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ارمان بھی ڈسکو نہیں جاتا۔ وہ کلب نہیں جاتا۔ اس کی کوئی گول فرینڈ

ہے۔ تم غلط جانی کر رہے ہو۔" وہ غصے سے بولی۔

یہ کیوں غلط جانی کر رہی گا؟..... اور اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ ویسے تہماری اطلاع کے لئے کہ ارمان کی بیٹی مرتبہ ڈسکو نہیں گیا۔ سنگھڑوں بارے دیکھ چکا ہوں اور ہر بار اس کا حلف لڑتی ہوتی ہے۔" وہ منہ ہٹا کے گویا اس اطلاع سے رو ہوا تھا۔ کشف کی آنکھوں سے

چھانچا گیا۔

یہ نہیں مانتی۔" وہ بولی۔

"نا۔ مگر ایسا نہیں کر رہی تو میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

ارمان ایسا لگا نہیں ہے۔" وہ بولی۔

وہ کیا لڑکا ہے یہ تم سے زیادہ مجھے پتا ہے۔ تم کو سوائے خود نشی اور اپنی چاب کے دوسری

پر چاہتی کہاں ہوتا ہے۔" وہ جستجو انداز میں سرگرایا۔ "اچھا..... جب ملاؤ دن چاہتے تو

ایک پیٹ دے دینا۔ میں اپنے روم میں ہوں۔" وہ بڑے نارمل سے انداز میں چلتا ہوا اپنے

کے طرف بڑھ گیا۔" اور ہاں..... ایک بات بتانا تو میں بھولی ہی گیا تھا۔" وہ کمرے کی دہلیز

پر رکھا اور پلٹ کر بولا۔ "مگر میری کشف نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔" اس کے قیبت

لڑکی رات ہی سے آج کل اسی کے ساتھ وہ کلب میں بھی نظر آ رہا ہے۔" وہ اطمینان سے اسے

"ع" دے کر خود اندر چلا گیا اور کشف یقین دے بیٹھنے کے گرداب میں گھر کے دہلیز پر چھپے

کی باتوں پر آگے بند کر کے ہراسہ کرنا کشف بھی لڑکی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ مگر وہ اس کی

سے زیادہ اس کے انداز پر شویش کر رہی تھی۔ تیور کا انداز ہے حد ہند اور اطمینان بخش تھا۔

لے چھ سے تک سے جھوٹ کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود اپنے طور پر

لے گی کہ تیور کی باتوں میں کتنا سچ ہے۔ اور کیا سچ ہے بھی یا نہیں۔ وہ وہیں کاؤنٹر پر بیٹھے

وہوں میں غلط فہمی اور اندر کمرے سے کنارہ دھڑکن کے ساتھ تیور کے گانے کی آواز

اسے رسی لگی۔

"دھکا ہے دھکا ہے

دینا دھکا ہے"

لطف نے بے زاری ایک گھر کے کھلے دروازے پر ڈالی۔ پھر اندر چلا ہند کر دیا۔

وقت سے اس نے آج بچاؤ لایا مگر تیور کے اطمینان سے اس کی بھوک ہی ختم کر دی تھی۔

کشف اچھا دین گیا کیا؟" تیور کنا سمیت کمرے سے جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ کشف نے

یہ پکڑا نہیں سمجھ کر دیوار پر مارا اور پھر چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تیور نے کندھے

اچکا کر گتار پر ڈھن تہیل کر دی۔

”تم کو آتا ہے بیار ؟ غصہ
ہم کو غصے ؟ بیار آتا ہے“

کھٹنے کے کمرے کے دروازے کو گھڑا م سے بند کر دیا۔ چوڑے سے مسکراتے ہوئے گیارہ سالہ اورنگ میں آگیا۔ پلاؤ کی اشتہا آمیز خوشبو اسے جگن میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دینی کی آواز کو "امیر" کا جان بول دیا۔ خوش فعل پلاؤ کو دیکھ کر ہی اعزاز ہو رہا تھا کہ کھانے میں کس قدر حرج ہو گا۔ اس نے اطمینان کے ساتھ پیٹ میں پلاؤ نکالا۔ "میر فرحت کھول کر جائزہ لیں۔ کس ما پوینے کا راز یہ بھی اسے نظر آگئے۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ حرج تین پر جانے اور پھر کے کمرے تک گیا۔ اس نے دروازے پر شہادت کی انگلی سے دھک دی۔

دور میں کھانے جا رہا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔“

سے کشف کی دعا پڑھتی ہوگی آواز آئی۔

”آل رائٹ“ غم ہو گیا تو مجھ سے گھٹ کرنا۔ ”وہ اس کے نصیب سے حنا ہوئے۔
اور اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ ”تو کے۔۔۔ تم لکھنا۔۔۔ میں کھانا کھاتا ہوں۔“ وہ اس کو چڑا
غرض سے بولا۔
”کیا ہے؟۔۔۔ کیوں میرے پیچھے پڑے ہو؟“ مکلف نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا۔
”سے بولی۔“

”حکم لے لو، یہ الزام ہے۔“ وہ جیت ہوا۔ ”وہی غلہ غضب دیا ہے۔ اور تھماری سزا پر ابھار ہا ہے کہ کشف عارین عادل جیسی ایک ایسی معمولی سے لڑکی کے خاطر مجھے اپنے اتارنے کی سماعت سے عزم کر رہی ہے۔ کیا یہ وہی کشف عارین عادل ہے جو بوسہ دے کتنی قوی کر مجھے کی نہیں جیت سکا، وغیرہ وغیرہ؟“ وہ مڑ کر تھا۔

”میں کسی کی وجہ سے بھوک ہڑتال نہیں کر رہی، سمجھے؟ تم خود سے قیاس مت کیا کرو۔“

”لو کے..... تو پھر کیا تم کھانا کھا رہی ہو؟“ تیمور نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”اے..... کیونکہ گاؤں میں نے بہت شوق سے ”کھنے“ لئے بنائے تھے اور میں نے یہ
چاہوں گی کہ تم اسے اکیلے چرپ کر گاؤ۔“ وہ تک کر رہی اور آگے بڑھتی تھی جبکہ تورا اپنی
چھپتا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھا۔ کشف اپنے لئے بیٹھ کر کھینچ رہی تھی۔
”ہوں..... بہت احمق بنے۔“ خاں صاحب نے کہا۔ تمہارے ہاتھ میں ٹیٹ ہے۔“

”میری ام کو میرے ہاتھ کے بٹے چاول بہت پسند ہیں..... بہت شوق سے کھاتی ہے اے بے اعتبار ماں کی یاد آگئی۔“

.....؟ "خواتین؟" اس نے پوچھا۔

ی۔ ماں۔ ”کشف نے کہا۔“ لیکن مجھے میری ام کے ہاتھوں کے بے کھانے پسند ہیں۔ ماں کے بے کھانوں میں ان کی متاب بھی شامل ہوتی ہے۔“ وہ آج اس وقت اپنے گمروالوں کو

میں۔
 لاؤٹ نو..... میری تو میں ہی نہیں ہے جو مجھے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر کھلاتی۔ بس بی بی
 میں کے ہاتھ کی کافی ہمت سے کھاتا ہوں۔" اس نے مسکراتے کہا۔ کھف غامض ہو گئی۔
 مرا کیا میرا ایک کام کرو گے؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

اکام؟“ تیور نے چونک کر اسے دیکھا۔

نے کہا تھا کہ ارمان کے ساتھ اس کے کلیٹ پر کوئی لڑکی بھی رہتی ہے۔ جبکہ اس کے جہول تاجہ صرف لڑکے روپائش پذیر ہیں۔“

ہمیں جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کے قلیق پر صرف وہ اور اس کی گرل فرینڈ ہی رہتے تھے۔

..... میں اس کے قہقہے پر چا کر اس بات کی تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔ "اس نے کہا۔
 لہو..... کمراس میں، میں تمہاری کیا دکر سکسا ہوں؟" دو کمرے سے اڑکا جے ہوئے ہے
 ہوگا..... مگر..... ایک منٹ، خر شاید ہے چارہری ہو کر میں تمہیں اس کے اپارٹمنٹ میں لے
 ہے؟؟" اس کے خیر داغ میں یکدم خیال آیا۔

”اس نے سرانجامت میں پایا۔“ تم مجھے کس وہاں لے جانا چاہتے؟ میں نے کہا اور جھوٹ کا پتہ
 دلائی ہوں۔“ اس نے مدد طلب نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”کلی یوں بھی میں فخری ہوں کہ کرات میں۔“ تیمور غلاف توقع فوراً مان گیا تھا۔
 ”کھفہ نہ کیا۔“

ہاں لوگ۔ اتنا اچھا چاؤ کھانے کے بدلے میں یہ کام معمولی ہے۔ وہ مسکرا دیا۔ "لوریوں
افزون میرے جسم میں دوڑ رہا ہے۔ کچھ اس کا بھی حساب چکانا ہے۔" اس نے شرارت سے
بہن اسے ایک لٹرو کچھ کر رہی۔

ان سے کوئی حوالہ دے کر حقائق نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہی اسے دل و جان سے چاہئے تھی کہ
 چھاپا گئے لکھا تھا۔ محراب سے زیادہ اہم تھا جو تھی وہ یہ کشف، ارمان پر مجبور دوسرے
 اسے ارمان دوسرے لڑکوں سے الگ لکھا تھا۔ وہ اسے ایک عبادت گزار اور مضبوط کردار لکھا
 تھا جو کہ چھانچہ نہ لڑائی پابندی کرتا تھا۔ جو کہ شمعوں کے جیسے تنک کے روئے دیکھتا تھا جس کی
 اسے نہ دوسری تھی نہ ہی مطلق۔ جو دوسرے دہن لڑکوں کی طرح نہ لڑائی کے آزاد تھا۔ اس میں
 کہ نہیں اُڑ رہا تھا۔ جو کشف سے بات کرتے وقت اپنی نگاہیں کھلی کر لیا کرتا تھا مگر جو ہم تیار
 اس کے سر پر مجبور تھا اس نے اسے یہ حد پہنچ کر دیا تھا۔ وہ ارمان کی حقیقت جاننا

چاہتی تھی۔ یہ جانتا جانتی تھی کہ کشف عارفین عادل کا اقتدار تو ہے یا ابھی سالم ہے۔

تجور کے سوا اسے اور کوئی اہل نفس نظر نہیں آیا تھا جس سے وہ مدد مانگتی۔ تجور کو لازماً جانے رہا کاش کا طالع تھا۔ پھر اس کے پاس اپنی ذاتی کار بھی موجود تھی۔ بس میں وہ ارمان کا بیج نکلتی تھی اور جس کی کار پہ فوراً پہل نہیں تھا۔ اُس نے ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی تجور لی تھی۔ اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اگر تجور کی باتیں سچ نکلیں تو اس کا اقتدار تو نونے کی جی کرہ نظروں میں سختی مرشد ہو جائے گی۔

وہ عشاء کی نماز پڑھ کر واکمن اٹھا کر گیلری میں آگئی تھی۔ واکمن پر دُھن بجاتے ہوئے گئی تھی۔ واکمن بجا کر اس کے اندر کی بے چینی اور فرسٹیشن کچھ کم ہو گیا تھا۔ تجور اپنے کمر تیار ہوتے ہوئے دُھن من کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کی انگلیوں میں چادہ ہے۔ جڑ دیتی ہے وہ سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔



اگلے روز جب وہ ارمان سے ملی تو اس نے بالکل بھی اس پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ باتوں باتوں میں اس نے اس کے شیڈول کے متعلق ضرور پوچھا تھا۔
”میں ٹیوٹر سے مگر جانتا ہوں۔ پڑھائی کرتا ہوں اور بس۔ تم تو جانتی ہو کہ سر کیسے آتا ہوں۔ ویسے بھی میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ تمھو سے پھر نہ نہیں۔“ ارمان نے مخصوص جواب دیا تھا۔ کشف نے گہری نگہروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں..... یہ تو ٹھیک کیا تم نے۔“
”اچھا..... تم چاہ کر رہے تھے؟“ کشف نے پوچھا۔

”اب چھوڑ دی ہے۔“ کشف بہت لیتے لیتے وہ لوگ۔ میں نے مگر والوں سے کہہ کر پاکٹ لی ہے۔ اب چاہ کی ضرورت نہیں رہی۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”اچھا کشف! آج تم راز کی؟ میں شاپنگ کے لئے بازار ہوں۔“ اس نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔ آج ہمیں سے چلیں گے۔ ویسے بھی ایک ہی کلاس ہے۔“ اس نے راز ہوتے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“
”مگر میرے پیسے گھر ہیں۔ پہلے وہاں سے چل کر پیسے لے لیں۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے تم مجھ سے لے لیا۔ بعد میں واکمن کر دیتا۔“ ارمان نے تجو ج ا ”ٹھیک ہے۔“ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

کلاس کے بعد دونوں مارکیٹ چلے گئے۔ کشف نے ڈرائی لے لی اور ضروری اشیاء اس میں لگی۔ جبکہ ارمان بھی اپنی ڈرائی لے کر ضروریات زندگی کی اشیاء اس میں بھر رہا۔

”میں ڈرائیو پہ لوں۔ تم جب یہاں کا کام ختم کر لو تو کاشکس والی سائڈ پر آ جا۔“

آگے بڑھ گیا۔ کشف اپنی خریداری میں مصروف رہی۔ مطلوبہ اشیاء لینے کے بعد وہ کاشکس میں چلی گئی۔ ارمان اسے دور سے ہی نظر آ گیا تھا۔ مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکی لی لڑکی تھی ای گنگ رہی تھی۔ ارمان کے ساتھ خاصی بے تکلفی سے گفتگو کرتی نظر آ رہی تھی۔ لطف لہر لہر کر رہی، پھر کچھ سوچ کر اس نے ڈرائی ارمان کی طرف کھینچی شروع کر دی۔ اس کے میں تجور کی باتیں گونج رہی تھیں۔

”بلو ارمان! کیا تم اپنی خریداری کر چکے ہو؟“ وہ اچانک ہی اس کے سر پہ بیخ کر بولی۔ ارمان ہاتھ ساتھ لڑکی بھی چوٹی کی تھی۔ اسے یوں یکدم سامنے دیکھ کر ارمان ہٹا گیا تھا۔

”لو وہاں۔“ بس ختم ہی سمجھو۔ تم کا ڈاکٹر پہ چلو۔ میں آتا ہوں۔“ ارمان نے جلدی سے کہا۔ مگر وہ وہیں بھی رہی۔

”یہ کون ہیں.....؟“ اس نے سنہری بالوں والی حید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آردو میں

”یہ..... میرے روم میٹ کی فرینڈ ہے۔ بس قلیٹ پر آتی ہے اس سے ملنے تو مجھ سے بھی بڑا ہو جاتی ہے۔“ ارمان بولا۔

”لوگ تم جلدی سے آ جاؤ۔“ کشف نے لہجے کو مارڈل رکھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ

نہ اپنا شک ظاہر کر کے اسے الٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے برابر امداد کو اتکا

اپن کٹس رکھا ہوا تھا۔
”کون تھی؟“ کشف کے چاتے ہی لڑکی نے پوچھا تھا۔

”میری کلاس کیلو ہے۔ میرے ساتھ شاپنگ کرنے آگئی تھی۔ اچھا تم سے بعد میں ملاقات ہو اس وقت میں بڑی ہوں۔“ ارمان نے کہا۔

”شاپنگ میں بڑی ہو یا لڑکی؟“ اس نے ٹھٹھکیا۔
”ٹھیک مت کرو۔ ظاہر ہے شاپنگ میں۔“ ارمان نے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہا۔

”اوکے.....“ لڑکی نے اس کے کال کو چستے ہوئے کہا اور اُلٹے ہاتھ کی انگلیاں ہلاتے

نے چل گئی۔ کشف نے یہ منظر بہت صبر کے ساتھ دیکھا تھا۔ مگر کرنی الوقت کچھ بھی روڈل ظاہر کرنا

اور وقت تھا۔ کچھ سوچ کر وہ صبر کے ہوتے تھے کسی کدات کو ارمان کا پل کل جانے کا اور وہ اسے

با باتوں پکڑ کر خوب بے عزت کر کے گئی۔
ارمان نے اس کا اور اپنا بل ادھر ادھر کیا تھا۔

”تم نے کبھی اپنا پارسٹ نہیں دکھایا جہاں راتنی ہو۔“ ارمان نے یونہی چلتے چلتے کہا۔
”دکھا دوں گی۔ ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔“ وہ دکھائی سے بولی۔
”اچھا دیکھو! صرف بار روز بعد روز سے شروع ہو رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلا روزہ ہم

"نہیک ہے..... اس میں کوئی حرج نہیں۔" وہ غلاف توقع مان گئی۔
 "اچھا، میری بس آگئی ہے۔ کل میں گسے۔ خدا حافظ۔" وہ اپنی بس کی طرف بڑھ گئی مگر
 ارمان کی آنکھوں میں سوچ کی لہریں بن بن کے دم توڑی تھیں۔



تیسروے کے مطابق اسے لے کر ارمان کے رہائشی قلیٹ پر گیا تھا۔ یہ علاقہ بہت عام
 یہاں کے لحاظ سے سستا ترین علاقہ تھا۔ یہاں پر نظر آنے والی عمارت بھی کچھ خاص نہیں تھی
 نے ایک قدرے پوسیدہ سی پرانی عمارت کے سامنے کارروائی تھی۔ یہ چار منزلہ عمارت تھی جس کا نام
 روغن بھی اُس ڈپ چکا تھا۔ علاقہ بھی بس یوں ہی سا تھا۔
 "یہاں رہتا ہے وہ۔ فرسٹ فلور پر پہلا ہی قلیٹ اس کا ہے۔" تیسورے نے بتایا۔ کشف نے براہ
 اور پیچہ اتر گئی۔

"کشف! امیں چلوں؟" تیسورے نے لورہر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"جیہیں" اس نے تسخ کروایا۔

"نی کیئر نیسل۔" تیسورے نے کہا۔ کشف خاموشی سے گیت کی طرف بڑھ گئی۔ تیسورے نے سرگرمی
 سے سرگیت لٹائی اور لائٹس سے سلگائی۔

کشف جیسے اس قلیٹ کے دروازے پر دستک دی تھی جس کے بارے میں تیسورے نے بتایا تھا
 لگوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولے والا ارمان ہی تھا۔ اس وقت اس نے
 اور بنیان مین روم تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی اسی سرخی تھی۔ اس کے ہوتوں میں سرگیت دبا ہوا
 کر آدھے سے زیادہ چل چکا تھا۔ یعنی وہ سرگیت نوشی کر رہا تھا۔ ارمان، کشف کو اپنے سامنے
 بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔

"قت۔۔۔۔۔ کشف! تم یوں اچانک۔۔۔۔۔ تم یہاں کیسے؟۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میں
 قلیٹ کا ایڈریس کیسے معلوم ہوا؟" اس نے گھبراہٹ آمیز حیرت سے پوچھا تھا۔
 "اندازے تو نہیں کچھ؟" وہ اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے بولی۔

"ہاں۔۔۔۔۔ ضرور۔" وہ ہنستا کے بولا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ کشف اندر آگئی۔ اس
 کو دیکھتے ہوئی نظریں اطراف میں ڈالیں۔ بہت چھوٹا سا قلیٹ تھا۔ جیسا یعنی کا قلیٹ تھا بالکل
 لگ رہا تھا کہ جس یہاں سامان بھرا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کشف کی نظریں لاؤنج میں بیٹھے کاک
 پڑیں۔ وہ چونک گئی۔ ایٹل بڑے سا راکھبری ہوئی تھی اور سرگیت کے چند اودھ چلے گئے تھے۔
 وہاں دو گلاس رکھے تھے۔ اس میں سے ایک گلاس میں سفیری سا مشروب موجود تھا جو کہ آدھا
 تھا۔ جبکہ دوسرا گلاس خالی تھا مگر اس کے کنارے پر کتبہ لکھا تھا۔ واضح نظر آ رہا
 ایک سبز رنگ کی بوتل، اچھی خاصی گاسا کے پاس رکھی تھی۔ کاک پٹ پر ارمان کی فیض مری ہوئی
 رہی تھی۔ کمرے میں جیسب یا نوٹور، ٹیلی فون کی تھی۔ قلیٹ کے انگوٹے کمرے کے دروازے

مادر کرو اور سے واضح نظر آ رہا تھا۔ کشف نے دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ اسے بیٹے کے اوپر لیڈ
 ہائی ہوئی نظر آئی تھی۔ گلاسوں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ارمان میں ڈرنک کی تھی ہے اور اس
 اصرے، آدھے خالی گلاس میں سے اب بھی کوئی ڈرنک کر رہا ہے۔ سرگیت کے گھڑوں نے تو
 اندوہ دے لیا تھا کہ انہیں گھڑوں میں بدلے والے ارمان کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ کشف سرگیت
 اس کے ہوتوں میں دلی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دوڑنے والے سرخ دورے اس کی
 نی کی گواہی دے رہے تھے۔ دوسرے گلاس پر موجود آپ اسٹک کا نشان صاف ظاہر کر رہا
 اس میں سے "پینے" والی کوئی صاحب نازک ہے۔ بیٹے کے ہوتوں میں سرخ دورے اس کی
 اہ بات کی گواہی کہیں "مکئی" موجود تھا۔ کشف نے بی بی ٹیلی وژن ارمان پر ڈالی تھی۔
 تم نے بتایا نہیں کہ میں یہاں کا پتہ کیسے چلاؤ؟۔۔۔۔۔ آئی مین میرے ساتھ تو تم بھی آئی نہیں۔"

ٹریٹ پیٹنے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

و چلانے والے ہر جگہ کا پتہ چلا ہی لیے ہیں۔" وہ مختصر ٹیبلے میں بولی۔ "یہاں تمہارے
 لی اور بھی موجود تھا؟۔۔۔۔۔ کوئی لڑکی؟" وہ تنکی ٹھٹھا بھڑا دے پوچھنے لگی۔

کی؟۔۔۔۔۔ کیسی بات کر رہی ہو تم؟۔۔۔۔۔ تم تو جانتی ہو کہ میں لڑکی۔۔۔۔۔ اس نے کہا تھا۔
 میں بے خوف تھی ہوں جیہیں؟" کشف نے بیکر اس کی بات کاٹی۔

کشف۔۔۔۔۔ ارمان نے کہا تھا۔

اس ارمان! امیں تمہاری حقیقت جان چکی ہوں۔ تمہاری ایک ایک بات میں جھوٹ تھا۔ تم
 لورہر اور دھوکے باز آدمی ہو۔" کشف غم دھنے کے عالم میں سارے لحاظ ڈالنے خالی رکھتے
 آہلی۔

کا کہہ رہی ہو تم؟۔۔۔۔۔ تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو؟" ارمان نے کمزور سا احتجاج کیا۔
 تمام۔۔۔۔۔ کشف طرے انداز میں تھی۔ "یہ شراب کے گلاس اس بات کی گواہی دے رہے
 تم نے نوشی کر رہے تھے۔ دوسرے گلاس پر آپ اسٹک کا واضح نشان، تمہارے کمرے میں موجود
 اور جیتنے تمہاری رو نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ تمہارے گال پر لگی سرخی کے سرخ ہوتوں کا نشان جو کہ شاید
 ابھل گئے ہو۔ تمہارے کارپٹ پر گری ہوئی جو کہ تم تو پیٹنے سے رہے۔ کیا یہ سب جھوٹ
 کیا تم اب بھی پر الزام کر رہے کہ کچھ دیر پہلے تمہارے ساتھ یہاں کوئی لڑکی موجود تھی اور تم
 نا تھا کہ چمڑے آزار ہے تھے؟" وہ چٹائی۔ مگر ہر کھول کر اس میں سے کچھ نہ نکالے۔
 تمہاری اسطیت معلوم کرنے آئی تھی۔ تیسورے نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔
 مل تھا کہ تم جاکر چوری تھی۔ یہ لو اپنی تم کو آج کے بعد مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ
 آؤ۔ ٹوٹ اس کے منہ پر مار دے تو ہوئی اور جانے کے لئے نرخی۔
 ف! امیری بات تو سنو۔ مجھے سنائی کا سونگے تو دو۔" ارمان اس کے سامنے آ گیا۔
 اب مجھ سے غلط بیانی کرنے کی کوشش مت کرنا۔ مجھے خود یہ جھرت ہو رہی ہے کہ مجھ بھی لڑکی

نے تم جیسے لڑکے کو پچھانے میں دو کا کیسے کیا تھا؟ تم میں اور تیمور خاں غلی میں زیادہ فرق ارمان! اسی وہ جو کچھ کرتا ہے کھلے عام کرتا ہے، کسی کو دھوکے میں نہیں رکھتا۔ اور تم جو کرتے جھوٹی شرافت کے بابک کے پیچھے کرتے ہو۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ تم تیمور خاں غلی سے ہو۔ زیادہ کیونکہ تم زیادہ دکھایا ہو تمہاری بہت کیسے ہوئی تھے سے کیسے کی؟ تم نے اُن دوسری لڑکیوں کی طرح کچھ رکھا جو کچھ ہوئے پہلی کی طرح تمہاری جھوٹی میں آ کے نہیں ارمان! تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں دوسری لڑکیوں جیسی نہیں ہوں۔ مجھے تغیر نہیں ہے۔ اس بار تم نے غلط لڑکی پر جال پھینکا ہے۔“ کشفِ غرت سے کہہ رہی تھی۔ اور سرخ ہو رہا تھا۔

”کشفِ اپ! تم ہو کیا؟ پاں..... کیا ہو تم کشفِ عارفین عادل!..... مجھ پر اپنا اور پاکیزگی کا رعبہ مت مہماؤ۔ تم خود کو دھوکے میں ڈال رہی تھیں ہو؟ تمہاری اصلیت میں تا: تیمور خاں غلی کے بے انگ گیسٹ نہیں ہو، اُس کی رکھیل ہو۔“ ارمان نے منہ سے آگ اُگل کر آگ نے کشف کے گرد کو دھوکے کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے بے اختیار ایک زنا۔ ارمان کے کال پر دے مارا۔

”خو کال کرنا!..... تم نے مجھے چھڑا مارا ہے..... اب اس کا نتیجہ بھی بھینچو۔“ ارمان دھوکے کرنے میں پکڑا دیا۔

”اچھ مت لگا، مجھے ذیل آدمی..... چھڑو۔“ وہ خود کو بھاننے کی کوشش کرنے لگی۔

”تم خود کو کیا سمجھتی ہو؟ مقدس سر ہم..... بہ، تیمور جیسے عارفی کے ساتھ راہ میں تم گمراہ لے تم مجھے شرافت کا سبق کیا دیتی ہو؟..... تم دوسروں کو بے وفائی سمجھتی ہو جو تمہاری کہانی پر بیٹ گئے میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کے باہر تعلقات ہیں۔“ ارمان کی وحشی دروغ سے لڑ

جھپٹ پڑا تھا۔ کشف کے منہ سے دلڑاؤں چلنے لگیں۔

”خو آ رہیں۔“ چھڑو مجھے۔“ وہ دوسری تھی۔

”کیوں؟..... کیوں چھڑو؟ جب تم تیمور جیسے امیر و معاش کو خوش کر سکتی ہو تو میں بھی ہوں۔ کوئی ٹیٹ پر توجہ نہیں ہوں۔ مجھے بھی اپنی تسلی کرنے دو۔ چند دالرز تو میں بھی جیتوں گا۔“ ارمان نے نہایت ننگی سے کہا۔ کشف کا پی جاہر ہا تھا کہ زمین پست کر دھو میں اور وہ اس میں سا جائے۔ یا پھر وہ پتھر بن جائے۔ وہ بگبگ رہی، چٹائی رہی اور خود کو اس کی آواز دہرانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر وہ جوتی ہو رہا تھا۔ اس کی گرفت ہے حد مضبوط تھی۔ اپنے اللہ کو یاد کیا اور کہا کہ اللہ کی دعا کی کوتاہی کی گوی تھی۔ خدا کو اس کا بھانا منسہ نہ دوں گا وہ ایک جھگڑے سے بچتا تھا اور تیمور اندر داخل ہوا تھا کشف کو گھسنے کا خیال نہ ہوئی تھی۔ اندر کی طرف آ گیا تھا۔ جیسا رات کے ستارے میں اس نے کشف کی دردناک چیخ سنی تھی دوسرا مگر بنے سگھنے کی نیت سے بیٹھوں میں دھپکا ہوا تھا مگر چیخ سننے ہی وہ ارمان کے

ہاگا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا تھا۔ ارمان شاید دروازے کو لاک لگا ہا تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر تیمور جیسے بندے کا پارہ بھی آسمان کو چھوئے لگا تھا۔ اس نے تیزی لے کر باہر ارمان کو سر کے بالوں سے پکڑ کر دوڑا دھکیلا۔ پھر اس نے کشف کو ناشوں سے پکڑ کر اس کے سر کا اسراف دوڑا ہوا تھا۔ کپڑے چھڑے بن رہے تھے۔ دوڑے گا پھینچتا تھا۔ ناشو تو تیمور کو کھینچے ہی ہر بن ہو گیا تھا۔ وہ جس حالت میں تھا اسی میں باہر کی طرف ہاگا۔ لی جاہر ہا تھا کہ اسے جان سے مار دے۔ مگر کشف کو ایسی نازک حالت میں چھوڑ کر جا بھی لگا تھا۔

”ف بے اختیار اس کے شانے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس وقت تیمور کا شانہ ایک دوسرا کھل کھل دے رہا تھا جو مشکل گمزی میں اپنے دوست کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ کشف دیکھ کر درحقیقت اسے بے اختیار دھکے ہو رہا تھا۔ اسے خود پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس نے کشف کو کیوں بھیج دیا۔ وہ اسرار کے بھی ساتھ آ سکا تھا۔ یا پھر اسے بتاتا ہے ہی چپکے سے اس پہاڑ آتا تو ارمان کی بہت اس حد تک نہ پاسکتی۔ اس نے اپنی جیکٹ اتار کر کشف کو پہنا دی لی کا وہ پٹہ جوتی دی فریال کے پیچھے کرا ہوا تھا، اٹھا کے اس کے سر پر پڑھا دیا۔ کشف کا پی جاہ اس وقت کے بعد دوسرا جائے۔ اس کی ناخوں سے جیسے جان ہی ختم ہو گئی تھی۔ تیمور نے کسی طرح اسے سہارا دیا اور اس کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد وہ زور زور سے

لڑ کر کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ تم بچا گئیں۔ میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی بہت کرے مجھے ذرا بھی آئینہ پا ہوتا کہ وہ اس حد تک بھی جا سکتا ہے تو میں جھیں بھی آکیے اندر نہ بھیجتا۔“

”اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نا میرے ساتھ کیوں ہوا؟..... میرے ساتھ رہا کیوں ہوا؟“ وہ تڑپ تڑپ کے دوسری تھی۔

”اُم تم دوست۔“ مجھے روتے ہوؤں کو چپ کرنا نہیں آتا۔“ وہ بے جاہر سے بولا۔ مگر وہ

اُن آخر تیمور نے کار اشارت کی اور تیز رفتاری سے ڈرائے کرنے لگا۔ مگر پیچھے پیچھے وہ غصاں

پہن کرے میں تھی۔ تیمور اس کے لئے پانی لے آیا۔

”اُلو..... پیچھلٹ پیچھلٹ لے لو۔“ وہ سلیپنگ پلڑا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے لو“

یہ کشف کے انکار پر اصرار کیا۔

”اے مجھے۔“ وہ پھر دوسری تھی۔

”اُلو..... اس نے دست درازائی ضرور دی تھی۔ مگر کھر ہے کُٹم بچا گئیں۔ جو وہ اس میں ناخوش تھی۔ مگر تم دہر کھانے کی بات کیوں کر رہی ہو؟ ہم سب اس سستے پر بات کریں

وقت نہیں ایک اچھی ٹینڈ کی ضرورت ہے۔“ وہ دوستانہ انداز میں بولا اور زبردستی اسے

گولیاں کھلا دیں۔

ن لندن پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ تیمور سے اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ اس نے بھی تیمور کو اس سے مدد لینے کی ضرورت پیش نہیں کی تھی مگر آج اس نے اس سے مدد مانگی تھی۔
 نے ارمان کو لندن سے ہی ٹھکانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ وہ چاہے
 می کرے، مگر ارمان کو چند روز کے اندر لندن میں سے ٹھکانا دے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس
 اسے ارمان کا کیریئر ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ لندن پولیس کا احترام اسے یونیورسٹی
 اٹھانے کا باعث بنے گا۔ اس کی ابھی خاصی بڑی عمر تھی۔ کیونکہ اسے جھڑکی لگا کر ایئر پورٹ پر
 اٹھانے کا اور لندن میں اس کا داخلہ ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار پایا جائے گا۔ اسے آکسفورڈ
 ٹی سے ٹھکانے کی وجہ سے دنیا کی کسی بھی یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملے گا۔ مگر یہ سب بھی اسے
 بڑی عمر کے سامنے بہت کم لگ رہا تھا جو اس نے سکف کی، کی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ ایسا
 کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک لڑکی کے لئے اتنا جذبائی کیوں ہو رہا
 وہ تو اس عارضی کے مطابق زندگی گزارنے کا تامل تھا۔ "جیہ اور جینے دو" نہ اُسے کسی
 معاملات میں مداخلت پہنچتی تھی وہ یہ بات پسند کرتا تھا کہ کوئی اس کے معاملات حیات میں
 مداخلت کرے۔ مگر سکف کے لئے اس کے ساتھ کچھ عجیب ہوتا چلا جا رہا تھا جسے وہ کچھ نہیں پا رہا
 آہستہ آہستہ اس کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی اہلی کو بھی اسی کی خاطر
 بلوا رہا تھا کیونکہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ آج والے واقعے کے بعد وہ ضرور اس کا قلبیت چھوڑ
 گی۔ اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے اسی قلبیت میں رہے دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی نظر کے سامنے۔
 اس نے ڈرک بھی نہیں کی تھی۔



"جانتے ہو اس نے کیا کیا تھا؟" سکف نے تیمور کو دیکھا۔ "اس نے کیا تھا کہ میں تمہاری
 ہوں..... ہمارے درمیان ناچیز تعلقات ہیں..... اس نے مجھے کال کر لیا تھا۔ وہ سمجھتا
 میں تمہارے ساتھ عوامی کام سامان میں کے رہ رہی ہوں۔" سکف نے چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ
 تیمور سناتے ہی رہ گیا۔ ارمان تو اس کی سوچ سے بھی زیادہ کھلیا نکلا تھا۔
 "اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تو خود بخوبی سکف ہے۔ جس کا ثبوت اس نے دے دیا
 لفظی تمہاری بھی ہے۔ تم نے اس پر کچھ زیادہ ہی غور کر لیا تھا۔ یا شاید وہی کچھ زیادہ کچھ
 بہر حال تم دیکھ لیا، وہ خود اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"
 نے نرمی سے کہا۔
 وہ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ سکف کی آنکھیں پوچھل ہوتے ہوتے بند ہونے لگی تھیں۔ پھر وہ
 روٹے روٹے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ تیمور چہلے دو ہیں بجھا لے دیکھا رہا۔ چند گھنٹوں
 اس کا گلاب سا چہرہ میلی میسوں جیسا ہو گیا تھا۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشانات صاف مایاں
 چہلے قلاب دماغی سے اسے دیکھا رہا۔ پھر اسے مکمل اور حاکم کے لائٹ آف کی اور دو واؤ ہند
 خود باہر نکل آیا۔ اس کا رخ فون کی طرف تھا۔ اس نے ریسپورڈ اٹھا کے فہرزد پیش کئے۔ چند گھنٹہ
 دوسری جانب رابطہ ہو گیا۔ وہ بڑی شہزادہ گیری میں بات کر رہا تھا کسی سے۔
 "تیلیفونک! میں تیمور بل رہا ہوں..... ہاں میں ٹھیک ہوں۔ جس تہاں ہدی ضرورت
 ہاں..... اس دوسری آپورٹنٹ..... تعلقات تمہیں بتاتا ہوں۔ بس ایک آدمی ہے، اسے سنی
 ہے۔ ہاں..... میرا دشمن ہی سمجھو۔ اس کا نام اور پتہ نوٹ کر لو۔"
 اس کے بعد تیمور نے ارمان کا مکمل نام، پتہ اور یونیورسٹی میں اس کا ڈیپارٹمنٹ حتیٰ کہ وہ
 تک اسے کھوا دیا۔
 "اس آدمی کو چھتر ہوا ہے ہیں اور اسے واپس پاکستان ڈی پورٹ کرنا ہے۔ کچھ مجھے ہے؟
 بھی اہرام تحوہ دیار اتم لوگ تو اہرام لگانے میں ماہر ہوتے ہوتے۔ وہ خود ابولا۔" مگر یہ کام
 ضرور کرنا ہے۔ مجھے وہ آدمی اس پورے لندن میں دوبارہ نظر نہیں آتا چاہئے۔ رقم تمہاری مراد
 کام میری مراد کی۔ اوکے ڈن..... ہاں!"
 تیمور نے مطمئن ہو کر ریسپورڈ رکھا۔ چہلے کچھ سوچتے رہنے کے بعد اس نے دوبارہ
 کرے شروع کر دیے۔ اس بار وہ حیدر کا سیل نمبر مل رہا تھا۔



اس رات تیمور ٹھیک سے سوئیں سلا تھا۔ پارک سکف کا ہے بس چہرہ اس کی نذر حالت
 آنکھوں کے سامنے آتی رہی تھی۔ حیدر سے اس نے کہا تھا وہ اپنی اہلی کے لندن پہنچانے کے
 کرے اور جلد از جلد انہیں یہاں بھیج دے۔ اس نے اپنے ایک دوست کو بھی فون کیا تھا۔

لی تھی۔ اب اس کا صرف چہرہ اور ہاتھ پاؤں شال میں سے جھانک رہے تھے۔ پانی سارا وجود میں یوں چھپا ہوا تھا جیسے اودھ کھلے سیب میں سے سوتی ہلک رہا ہو۔ کشف نے اپنی ٹھوڑی اس پر رکھی ہوئی تھی۔ چائے کا کپ سونے ہی دھر تھا۔

تھوڑے اے دیکھا اور چند لمحوں تک وہ ٹپکسی ہی جھپکنا بھول گیا۔ اس کا سوا گوار چہرہ کسی گلاب زور سے اسے دیکھا اور چہرہ گلاب سے نظر آ رہا تھا۔ اس کے دودھا، گلابی گلابی سے نرم و نازک ہر جھجھکیوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں گلابی گلابی ڈور سے حیر رہے تھے اور جلی نمی نے ان آنکھوں کے خنسن میں اضافہ کر دیا تھا۔ لانی بچوں کی تھار ان آنکھوں پر "شیش" دم کر رہی تھیں۔ وہ نہانے کب تک اسے پوچھ دیکھا رہا۔ کبریکدم اس کے موہا کی کھنٹی تھی۔ ہاتھ اور اس کے ساتھ ہی کشف بھی چوک گئی۔ وہ نہانے کن خیالوں میں گم تھی۔ تھوڑے تک دھکا اور پینٹ کی جیب میں سے موہا پل نکلا۔ اسکرین پر جانا بچہ انفر دیکھا تو فوراً "میں" کا

ایلا۔

"کلو سیک!..... واقعی بڑا! تو بہت ابھی خبر ندادی تم نے۔" خنسن کم جہاں پاک۔ اچھا، کب لائٹ ہے؟..... ٹھیک ہے، میں وہاں آؤں گا، ہاں، کچھ حساب چکانا کرنا ہے۔ ظاہر ہے اسے معلوم ہو چائے کہ اسے کسی کے جسم کی سزا مل رہی ہے۔ ٹپکس! امین!..... اور ہاں، ای کامنت تمہارے چیک اکاؤنٹ میں منجھکی گئی ہے۔ چیک کر لینا۔ لوکے، ہائے۔" وہ مسکراتے کشف کو دیکھنے لگا جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی جاب دیکھنے پا کر کشف نے نظریں اٹھیں۔

"تمہاری چائے اب شربت بن چکی ہوگی۔" تھوڑے اے یاد دلایا۔ کشف نے سر نیچے زمین دانے کے سے انداز میں رکھ دیئے اور کپ اٹھا کر لیوں لگا لیا۔

"تھوڑا میں تمہارا قلیت چھوڑ رہی ہوں۔" بس صرف آج کا دن اور مدت حرے یہاں رکوں گی۔

ایم یہاں سے چلی جاؤں گی۔" وہ کبر رہی تھی۔

"مگر اس کی وجہ یہ چسکا ہو؟..... اور تم روکی کہاں؟" وہ چوٹے کتیر پوچھ رہا تھا۔ کیونکہ جو وہاں پہل سوچ رہا تھا کہ اس بات کے ہونے کا اندیشہ پہلے ہی سے تھا۔

"کہاں رہوں گی؟..... میں..... واہی مینی کے اپارٹمنٹ میں چلی جاؤں گی۔ اس کی منت کرتے کہ کچھ دھوکوں کے لئے رہنے پر رضامند کر لوں گی۔" اس نے کہا۔

"مگر تم کیوں جانا چاہ رہی ہو؟" تھوڑا اپنے سابقہ اعزاز میں پوچھ رہا تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟..... کیا تم کو کل میں نے ایران کے الفا کا ٹپکس سنا ہے؟ کیا تمہاری دوست نے جو کہا تھا تم وہی ہو گئے؟" وہ چیخ اٹھی۔

"وہ سب کچھ ہیں۔ ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ کچ تو وہ نہیں ہے جو لوگ کہتے ہیں، جو

صبح دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ بہت زیادہ رونے اور بہت زیادہ سونے کی وجہ سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ سلگندی سے اٹھی اور سیدھی ہاتھ روم میں گھسی گئی۔ نیم گرم پانی۔ طرح نہانے کے بعد وہ تازہ دم ہو گئی تھی۔ اس نے ٹیکلے ہال تو لے میں پہلے اور کمرے میں سلجھانے لگی۔ لائٹ کرے اور بے لی بنگ بنگ کر کہاں میں گرم کرے مگر کی موٹی شال میں ڈھانچے ہوئے وہ بے حد افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی ٹپکسی نم دار ہو رہی تھیں۔ اس نے کھڑی دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ وہ اپنی ساری زندگی میں اتنا زیادہ کبھی نہیں سوئی ہوگی۔ اسے نہیں لگی تھی مگر چائے کی طلب بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ وہ دروازے تک پہنچی۔ اس نے دروازہ ہاتھ کے سامنے کدیم تھوڑا کچھ کر گز بڑا لگی۔ تھوڑے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور دوسرا میں تھا جیسے وہ دستک دینے والا ہو۔

"اودھ۔" ہائے۔ میں ابھی ناک کر کے تھیں جگنا لے لایا تھا۔" تھوڑا بیٹاش اعزاز میں اے "میں نے آج کچھ زیادہ عی بنید لے لی ہے۔ تم نے رات کو مجھے کون سی دوا دی تھی؟" وہ

لبے میں بولی۔

"سلیپنگ پاوچس۔" امی کے زیر اثر تم اتنی دیر تک سوئی رہی ہو۔" وہ بولا۔

"ہاں۔"

"چائے۔" اس نے کپ اس کے آگے کیا۔

"ٹپکس!..... میں باتوں کی۔" وہ نظر چڑھتے ہوئے بولی۔ اس کو رات کا ایک ایک لم

وہ تھوڑے نظر نہیں مل رہی تھی۔ وہ کبھی بغیر دوپٹے کے اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ مگر کل کی نہیں جبکہ جگہ سے جاتی ہوئی تھی جس میں سے اس کا نیم بے ہوش میں تھا۔

"یہ تمہارے لئے ہے۔" چائے نہیں پیتا۔" اس کا نیم بے ہوش میں تھا۔

لیا۔ "کیا تم میرے ساتھ چائے پیتی ہو؟" تھوڑے اے اسے جانے کے لئے خوات دیکھا تھا۔

کہا۔ وہ کھٹی۔ اس نے سوچا کہ اگر لکڑہ کر دے۔ پھر کچھ سوچ کر خاموشی سے اس کی طرف ہلی

کی گاہوں کا مضمون سمجھ گیا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لائٹ میں آگے۔ تھوڑا

گیا۔ اس کے ہاتھ میں اب کافی کاکہ سوچ رہا تھا جبکہ وہ صوفے پر اس طرح بیٹھ گئی تھی

ٹپکس اس نے سونے پر رکھی تھیں اور ٹھنوں سمیت پھرے وجود کے گرد اس نے شال

”جیسے ان لوگوں کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا ہو گا۔ مگر مجھے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سب کچھ میں اپنی ذات پر برداشت کیا ہے۔ اس لئے میرے ساتھ ایسا سلوک اس لئے کیا کہ وہ جانتا تھا کہ میں.....“ وہ بڑی انداز میں چلائی اور پھر چہرہ ہاتھوں میں چسپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”میں اپنی ہی غلطیوں میں گر گئی ہوں۔ میرے ابا کو اگر اس واقعے کی بجائے بھی پرکھی جائے گی جیسا کہ میں نے۔ لوگ تو پہلے ہی میرے لندن آنے پر باتیں بنا رہے تھے۔ اگر یہ بات آؤت ہو گئی تو.....“ اسے دایے ستارے تھے۔

”تم لوگوں کی پرواہ کیوں کرتی ہو؟ انہیں تو کوئی نہ کوئی بات چاہئے جسے وہ موضوع بنا کر کریں۔ اور پھر تم جیسی لڑکی ایسی باتیں کر رہی ہے۔ ویری اسٹریٹ“ وہ بولا۔

”کلی کے حادثے نے مجھ سے میری ذات کا بھروسہ جین لیا ہے۔“ اس نے آنسوؤں پر وہ اپنی مثال سے پوچھا۔

”تم صرف خود ہی کی ڈسٹر ب ہو اور بس۔ کچھ روز میں باؤل ہو جاؤ گی۔ اور پھر تم اپنی دہائی ڈوری ہو تو یہ راز تو صرف تم ہی جانتی ہو۔“ وہ غور سے منہ سے کیے گا کہیں۔ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو۔ مگر کس کوئی قسم یا بعد وہ غیرہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ جب مجھے حق ہونا پڑتا ہے کسی کا لٹاؤ نہیں کرتا۔ مگر جب کسی کچھ کی پاسداری میں کچھ کو چھپانا پڑ جائے تو یہ سب سب سے زیادہ ہے۔“ اس کے لہجے میں کچھ تو تھا کہ کشف کو اس کی بات کا یقین کرنا پڑا۔

”یہ روزانہ صوبہ باند کر اور ایک خوشخبری سنو۔“

”کیسی خوشخبری؟“ وہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”ابھی، اسی وقت ایئر پورٹ چلا۔ وہ خوشخبری وہیں تہا رہی خیر ہے۔“ تھور نے کہا۔

”میں تہا رہی بات بھی نہیں۔“ وہ اچھے کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”اچھا۔“ اس نے کہا کہ اگر مارن تہا رہے سامنے آئے تو تم کیا کرو گی اس کے ساتھ؟“ تھور نے کہا۔

”کشف اپنے سوال کے جواب میں ایسے سوال کی خیر برکت نہ تھی۔ مگر اس نے پھر بھی تھور کو جواب دے دیا۔

”میں..... میں اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاؤں گی اور اگر میرے بس نہیں ہوتا تو میں کو بیش کے لئے غرار اور دہام کر دوں گی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑوں گی۔“ وہ جیسے بولی

”میں پھر یہ موقع نہیں ملے والا ہے۔ چلو اور دل کی حسرت نکال لو۔“ وہ ٹھہرا ہوا گیا۔

”تہا رہی باتیں تہا رہی طرح عجیب ہیں تھور! وہ ڈیڑھ اسی سے بولی۔

”باتیں کار میں جینہ کر کر لیتا۔“ وہ بولے۔

”چلو اور جیتے ہوئے کیا۔“ بادل ٹھہرا۔ وہ اٹھی اور جیتے جا چکا کہ اس کے ہر بار ہاتھ لگنے پر اسے راتے وہ سوچتی رہی کہ تھور کی کیا چارہ ہا ہے؟ اس نے ایک آدھ بار پوچھا بھی تھا کہ وہ کیا جبراً آرام سے کوئی بات نہ دے۔ کشف اسے خبر سے اس کے بارے میں جیسا کہ جان پائی

ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اپنی مرضی اور بات کو اہمیت دیتا ہے۔ اور جب تک اس کی مرضی نہ تانے کی نہ ہوتی، وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ چاہے کوئی کتنا ہی سراسر لے۔ کشف نے بھی زیادہ باتیں خاموشی سے سوچتی رہی تھی۔

ایک کک کار اسے خاصا غوطہ تھا اور تھور آتی دیر خاموش نہیں جینہ سکتا تھا۔ لہذا وہ دیکھتا تو تھا بات کرتا تھا۔ کشف ہوں، ہاں میں اس کا جواب دے دیتی۔ اچانک اس کے موبائل کی اس نے ویسٹ پورڈ سے اپنا سٹائل اٹھا اور کان سے لگا لیا۔

..... زیدی صاحب! کچھ کچھ یاد کیا کرتی تھی بعد؟“ اس نے خاصے خوشگوار موڈ میں ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد وہ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

..... زیدی صاحب! ابھی ہماری عمر سوچ سستی کرنے کی ہے، اللہ اللہ کرنے کی..... زیدی صاحب! اس کی خوب صورت مردانہ شکل کا دیکھ کر اس نے کہا۔

..... کون سے دوست اہم لگانا چاہتے ہیں؟ ہاں، میں جانتا ہوں انہیں۔ اچھے ہیں مگر میری طرف سے مدد دے کیجئے گا۔ فی الحال تو میرے ابھی وقت نہیں ہے کس کس کاٹوں کی ریکارڈنگ کرواؤں۔ جی ہاں..... دیکھئے، اگر چینیوں ان آنے کا موڈ میں گیا، تب..... چینیوں میں ابھی دن پڑنے ہیں۔ میں ضرور فون کروں گی نہیں، آپ جانتے ہیں کس کس کاٹا سا دھار سا انسان ہوں۔ آسے پر نہیں دھکتا۔ تھور نے موبائل آف کر کے واپس رکھا۔ کشف خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے تھور سے انہیں کیا۔

ہاں صاحب میرے بہت ہی اچھے دوستوں میں سے ہیں۔“ وہ خود ہی بتانے لگا۔ ”جانتی ہو اہم لگانے کے لئے خدا کر رہے تھے۔“

ہاں مگر بھی ہو؟“ کشف نے چونکے بغیر پوچھا۔ بالکل سرسری سا۔

..... بہت زیادہ پاپارٹوئیں ہوں گرا چکا ہوں۔“ وہ رٹن لیتے ہوئے مسکرایا۔

..... میں نے نہیں کئی بار ٹکٹا ہے۔ بوائے سائے کے کنارے سمیت۔ اچھا گا لیتے ہو۔“ وہ سٹیو وہم بولی۔

..... اہا میں بہت اچھا جانتی ہو۔ میرے ساتھ اہم میں کام کرو گی پاکستان چل کر؟“ تھور نے پوچھا۔

.....“ وہ حیرانگی کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔

..... کار میں تہا رہے سو دوسری کوئی ڈی روج موجود نہیں ہے جسے میں یہ آخر

..... اور نے منہ بٹا کے کہا۔

.....“ وہ اس میں کھرف اپنی ذات کی تسکین کے لئے بجاتی ہوں۔ جب بھی اہم میں ہوں

ناکی۔

اس ہال..... تم سمجھتی ہو نا۔ بس ٹھیک ہے۔" تیمور نے ہاتھ کبھی اڑانے کے سے انداز

نہیں کیا۔ تیمور اسی سوچ رہی ہوں کہ تمہارا انجام کیا ہو گا؟" کشف نے تاسف بھری نگاہ اس کے خوب
چہرے پر ڈالی۔

ابا ہام؟..... کیا مطلب؟" تیمور نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
تم اپنی ساری زندگی بے راہ وادی میں گزار کر اللہ کے دربار میں جاؤ گے تو کیا منہ لے کر چاؤ
کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" کشف نے آنکھیں سے پوچھا۔

اور؟..... ڈر کیا؟" یہی انسان نے مر جانا ہوتا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا کیا
"وہ اور وادی سے بولا۔ کشف کو اعزاز ہو گیا تھا کہ وہ واقعی صرف نام ہاد مسلمان ہے۔ اس کی
کے بارے میں میں اب بھی زیر و کبر ہے۔

تیمور ایک مسلمان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ ایک اور زندگی بیٹے گا۔ وہ زندگی
کے بعد پھر دوبارہ موت کو نہیں آئے گی۔ اس زندگی میں وہ اپنے رب کے حضور پیش کیا جائے
اس کے اعمال کی جزا یا سزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مصلحتاً پر پلے والوں کے لئے
یہ فخر ہوں گے اور گناہوں اور گمراہی کے راستوں کو خدا کے سامنے روکنا اور اللہ کے فضل کے طوق
نہا جائیں گے۔ اس وقت تو ابھی کی برہانہ بند ہو گی۔ جب..... جب کیا کرو گے جب حقیقت کو
گواہی دے گا کہ تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" وہ خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"موت سے کیا ڈرنا؟" وہ مسکرایا اور ساتھ ہی ایک جھماکے سے اسے پچھلے برس کا وہ واقعہ یاد آ
اب وہ کارکن میں حصہ لے کر اپنی کارروائیاں تھا اور اسے لگتا کہ کوئی ناپاک اس کے
ہا کیا ہے۔ جب اس نے پوری قوت سے پھینکیں لگا کر کار کو کا تھا اور ایک خوف ناک حادثہ
ہوئے تھا تھا۔ جب زندگی میں پہلی مرتبہ اسے موت کا پلکا سا خوف محسوس ہوا تھا۔ مگر یہ خوف
اب کچھ دیر کا تھا۔

"ابو پورٹ آ گیا ہے۔" وہ آنکھیں سے بولا۔ پارک میں کار روکنے کے بعد وہ کشف کو ساتھ
بر اس طرف چلا آیا جہاں بیرون سماک پر واز میں سڑک کے والے مسافر آ جا رہے تھے۔ وہ
ان نظروں سے کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ "مطلوبہ" افراد پر نگاہ پڑنے سے وہ تیزی سے کشف کو لے
اس طرف بڑھا۔ کشف نے دیکھا تھا کہ وہاں چند اسکاٹ لینڈ یا رڈز موجود ہیں۔ انہما کے
ہاں وہاں ارمان بھی موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور چہرے پر باپ کی کی سیاحی
آپ بولی تھی۔ ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر ارمان کے چہرے کی تاریکی بڑھ گئی۔

"جسٹس میک ایلڈن جیسے صاف سحرے شہر میں اپنی گندگی سے مزین گندہ پھیلنے کا اندیشہ تھا۔"
نے سہری بالوں اور بزرگ آنکھوں والے میک سے ہاتھ ملائے ہوئے کہا۔

یا اوس ہوں، جب واکمن بجاتی ہوں اس طرح میری بے چینی کم ہو جاتی ہے اور میں ریگاری
ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو اس میں ہرج مری کیا ہے؟..... میرے خیال میں تم میوڈیشنر کے گروپ میں
اشافہ دیت ہو گی۔" وہ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں..... یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔
"ایک بات کہوں؟" چند لمحوں بعد کشف نے کہا۔

"ہوں۔" تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔
"تم گانے گاتے ہو۔ کبھی نعت شریف یا حمد باری تعالیٰ سے فیض یاب کیوں نہیں ہو۔
نے پوچھا۔

"میں..... میں..... ہا ہا ہا....." تیمور کے منہ سے بے اختیار قہقہے پھوٹ پڑے۔ کاش
ناگوار سے اسے دیکھا۔

"میں نے کوئی لیلیڈ نہیں سنا ہے۔" وہ برہانہ لگی۔
"مگر لیلیڈ سے کچھ کم تھیں نہیں۔" وہ ہنسنے بیٹھے بولا۔

"ایسا کیا کہا ہے میں نے؟" وہ ٹک کر بولی۔
"کم آن کشف! ابھی جیسا لڑکا اب یہ مولویوں کا کام کرے گا؟..... نعت، حمد،

یاب..... ہائی گاڈ!" وہ پھر ہنسنے لگا۔
"کیوں؟ تم مسلمان نہیں ہو؟" اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف کرنے سے اس
جائے گی تمہاری؟..... یہ کیوں بھول رہے ہو کہ یہ ابھی تمہیں خدا نے عطا فرمایا ہے۔

کے بولی۔
"ہاں..... مگر اس کام کے لئے نہیں جس کا شعور ابھی ابھی تم مجھے دے رہی
ہر جتہ بولا۔

"تیمور ابھی کبھی تم ایسی بات کر جاتے ہو کہ مجھے تمہارے مسلمان ہونے پر شک ہو لے۔
کشف نے تاسف بھری نگاہ میں کہا۔

"بھئی دیکھو! اپنا نظریہ ڈالنا کافی ہے۔ اب یہ ہر وقت کے کچھ سے بھوکے بچہ۔
میں قرآن بھی پڑھ لیا۔ بس اتنا کافی ہے۔ اب یہ ہر وقت کے کچھ سے بھوکے بچہ۔

صحت برپا کرنا ہے سب مجھے بالکل مشورہ لگتا ہے۔" تیمور کا اشارہ نماز اور روزے کی طرف لگا۔
انسان کی اپنی لاف میں ہی پڑی ہوتی ہے اسے اپنے لئے تمام گناہوں کا جواز مل جاتا ہے۔

کے لئے کہاں کی لاف میں ہی پڑی ہوتی ہے اسے اپنے لئے تمام گناہوں کا جواز مل جاتا ہے۔
میں ذک شامل کر دیا جائے جس میں اسے "گانے" کے بارے میں سوچ سکا ہو۔ "وہ بولا

"نعت" گانے، "نہیں، "پڑھتے" ہیں۔" کشف نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اُس آل رانٹ۔ گندگی کو صاف کرنا بھی ہمارا کام ہوتا ہے۔“ میک نے مسکرا کے جواہر
 ”سو سزاوارمان! اب آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔ تو کیا یہ بیکر نہیں کر آپ کو اس طرز
 کے کٹالے جانے کا پڑن بھی بتا دیا جائے؟“ تیمور، ارمان سے مخاطب ہوا۔
 ”کیا مطلب؟“ ارمان نے حیرت سے پوچھا۔
 ”یہ سب میرے کہنے پر ہوا ہے۔“ تیمور نے کہا۔
 ”کیا؟..... مجھ کیوں؟“ میں نے تجھارا کیا بچا ڈا ہے؟“ ارمان چیخ اٹھا۔

”تم نے میرا کیا بچا ڈا ہے؟ تم جیسے دو کوڑی کے پیٹنڈو زمینداروں کو تو میں گلے گلے کر
 کرنے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ مگر یہ سب اس جرم کی پاداش میں کیا گیا ہے جو تم نے کیا تھا۔ ا
 تیمور معنی خیر نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
 ”کوہ..... پلیز تیمور! مجھے معاف کر دو۔ زیادہ شراب نوشی نے مجھے عقل سے بیدل کر
 پلیز! تم یہ سب زکوٰۃ دے کر اسی کیسے تیرا بڑا دو جانے لگا۔“ اس نے تیمور کے سامنے ہاتھ جوڑ دیا
 کے اندر ایک غصہ کی آہٹ مچی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ارمان کے لئے اتنی حسرت مچی کہ ارمان
 سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔
 ”تمہیں اپنے کیریئر کی کتنی فکر ہے۔ اور کل تم ایک معصوم لڑکی کی پوری زندگی برباد کر
 گئے تھے۔ شرم آتی جا رہی ہے۔ تم جیسے لوگ ہی دیار غیر جا کر اپنے وطن کا نام ڈوبتے ہیں۔ اور تم
 کشف کا اتنا لحاظ بھی نہ کیا تھا کہ وہ تمہاری ہم وطن تھی۔ ڈوب مرو نکلیں جا کر۔“ وہ ہنسے۔
 تھا۔ کشف بس خاموش کھڑی سب دیکھ کر رو رہی تھی۔
 ”مجھے معاف کر دو۔ کشف! میں نے تجھارے ساتھ بہت بدچیزی کی تھی۔ پلیز مجھے معاف کر
 ارمان نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے ہر
 پر ہے کسی بھی۔ خیرات تھی۔ اپنی زندگی کے برباد ہونے کا تم قلم ڈو۔ وہ جس طرح سے بے عزت ا
 نکالا جا رہا تھا اس کی خبر تیمور نے پاکستان میں اپنے ایک رپورٹر دوست کو بھی دے دی تھی اور وہ
 تیمور کی بداعت کے مطابق دو روز بعد اخبار کے فرنٹ پیج پر چھاپنے والا تھا۔ تیمور نے اس نے
 اسے اچھا خاصا معاوضہ بھی دیا تھا کہ وہ ارمان کی تصویر کے ساتھ وہ خبر چھاپے۔ ارمان پر لہو آنے
 نے ٹیکٹ ملیں بنانے کا اہرام دیا تھا۔

تیمور نے کشف کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسے اور نفرت کے عالم میں ارمان کو دیکھ رہی تھی۔ ار
 اس کا ہاتھ فٹسا میں اٹھا اور جو پھل ارمان کے کمال پر پڑا تھا اس کی آواز ارگرد کر رہے لوگوں
 سن رہی تھی۔
 ”واؤ..... وہی کٹو۔“ پانچوں اگلیوں کے نشان جم گئے ہیں گل پر۔“ تیمور غاسا مہر
 رہا تھا۔ جبکہ ارمان کا شرمندگی اور فٹسے کے مارے برا حال تھا۔
 ”تم جیسے لوگ ملک کے سامنے پر کلک کا یٹا ہوتے ہیں..... جہیں عیاشی کا اتنا ہی شوق

رہا۔ لائٹ ایریا سے بھرا پڑا ہے۔ اپنی عیاشی کا سامان وہیں ڈھونڈ لیتا۔ اور ایک بات اور۔“
 اب کہہ رہی تھی۔ تیمور تم سے بہتر ہے۔ اب کبھی کرم خود سوچ لو کہ میں اس کی تعریف کر رہی
 ہوں۔ میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ وہ نفرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ارمان نے سر
 اٹھا اور تیمور نے گردن ہٹھا کر گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
 ”پلیس.....“ وہ اسے دیکھ کر بولی۔
 تیمور، میک سے ہاتھ ملا کر کشف کے ساتھ چلے گا۔ اس کے لبوں پر ایک مٹھنیں سی مسکراہٹ پھیلی
 تھی۔
 ”تم نے درست کہا تھا تیمور! کچھ لوگوں کو ٹیکہ ہاں کی کانے کا شوق ہوتا ہے تاکہ وہ دوسروں پر اپنا
 اہم برتن ڈال سکیں۔ ارمان ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔“ وہ چلنے پونے لگا۔
 ”کیا اب بھی تم مجھے دوستی کے قائل نہیں سمجھتے؟“ تیمور نے کار کا درمحلے ہونے پر چھا۔
 ”شاید تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔“ وہ مسکرا دی۔ تیمور نے
 اُٹھا ہاتھ نہیں دیا تھا۔
 ”کشف!“
 اُٹھی وہ دونوں کار میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک جانی بچیانی آؤر پر دونوں جیسے سرزد کیٹنے لگے۔
 ”ارے آپ..... آپ یہاں کیسے؟“ کشف نے روٹی کو دیکھتے ہوئے خوشگوار سی حیرت
 بکھاری۔
 ”میں یہاں کسی کوئی آف کرے آئی تھی۔ اور تم؟..... ارے تیمور! آپ کیسے ہیں؟“ ان کی نظر
 پر پڑی تو پوری خوشگواریت سے پوچھا۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔ ہم بھی یہاں کسی کوئی آف ہی کرنے آئے تھے۔“ وہ کشف کو دیکھتے ہوئے
 ”ایہا ہوا کہ تم دونوں اکٹھے ہی نظر آ گئے۔ اب دیکھو! مٹھن کو پہلا روزہ ہے اور میں ہمیشہ سے
 آتی آتی ہوں کہ پہلا روزہ ہو تو اس کی انتظار پارٹی اپنے گھر کر داتی ہوں۔ اس انتظار پارٹی میں
 نے اور میرے بڑے بھائی کے جاننے والے خاص خاص لوگ مدعو ہوتے ہیں۔ اور آپ دونوں بھی
 آ رہے تھے۔“ روٹی نے اصرار سے کہا۔ ان کے اصرار میں عمت بھی چھپی ہوئی تھی۔
 ”اس کی ضرورت نہیں..... آئی میں، کشف آ جائیں گی۔ میں کیا کروں گا وہاں؟“ تیمور نے
 سے کہا۔
 ”پاکل بھی کوئی ایکسکس ڈینس چلے گا۔ میں بھتر رہوں گی۔ لو کہ بھئی، اللہ حافظ!۔“ وہ بہت جلدت
 ہوتی آئی جانی کار میں بیٹھ گئیں۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے
 اُٹھیں اور ہاتھ ملا کر بٹے بٹے لگا۔
 ”محب خانو! میں۔ زبردستی اوائٹ کر گئیں۔ تم جانتی ہو انہیں؟“ تیمور نے سن کا سزا کر کے

”لیکن مجھے تو ناز پر حق نہیں آتی۔ نواز تو درکنار مجھے وضو تک کرنا نہیں آتا۔“ اس نے اسے اعتراف کیا۔

”تو کیا ہوا؟ سیکنا چاہو گے تو ضرور سیک لو گے۔ یوں بھی بھول تمہارے تم فوٹو گرا فک کے مالک ہو۔ تو پھر کیا مشکل ہے؟“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”تم سکھاؤ گی مجھے یہ سب؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تیور نے پوچھا۔

”ضرور..... یہ تو بہت ذرا ب کا کام ہے۔ میں نہیں ضرور سکھاؤ گی۔“ وہ غلطی سے اس کے غمک سے..... تو پھر یہ ذمہ داری تمہاری ہے۔ کب سے کلاس اسٹارٹ کر، اگر مسکرایا۔

”آج سے ہی۔ ٹیک کام میں ہمیشہ جلدی کرنی چاہئے۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”اوکے..... پھر یہ ایک فاسٹ فٹ کرو۔“ تیور نے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا جو ارام ویز میز پر جن کر گئی تھی۔

”تیور! یہ ہاتھ میں ایک شراب پر کروں گی۔“ کشف نے کہا۔

”وہ کیا؟“ تیور نے یوکل اظا پھیلنے ہوئے پوچھا۔

”بل کی آدمی تم میں جیسے مگر باہر کے آدمی کی۔“ وہ ہنسی کے لیے بولی۔

”اوکے اوکے۔“ بھیجی تم تو بہت ہی اصول پرست ہو۔ یہ سب غصہ کیسے کر گئی ہو؟“ وہ اپنا تے پوچھنے لگا۔

”ننگی میں چند اصول ہیں سب کو ضرور بتا لینے چاہئیں۔ اور ان پر عمل درآمد بھی کرنا چاہئے۔ طرح طرح کی مشق اور بار بار طور پر گزرتی ہے۔“ اس نے کافی کاپ لینے ہوئے کہا۔

”ابھی ایک بات بتاؤ، کیا تم واقعی ان رمان میں انٹر ملٹھس؟“ تیور نے جابجگ سوال کیا۔

”وہ ایسا ہی تھا۔ جابجگ اور جانا لانا ہر بات پوچھ لیتا، ہر بات کہہ دیتا اس کے لئے اسان، وہ اس کشف کو بھر پور کھتی تھی۔ کافی کاکہ وہ لوں تک لے جاتے تھے رک جی تھی۔

”تاکیں میز پر رکے گھٹان پر مرکوز تھیں۔ تیور نے اس کی شہ و آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا تو حد سیاہ آنکھیں جن پر سیاہ لانی اور گھٹی پلکیں کی چھلاری تھی۔ اس کی سفید رنگت پر یہ کانی، آنکھیں بہت حسین تھیں۔ اس کو کابل گانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اسکرین تھیں۔ تیور بے احتیاری کی کیفیت میں انہیں سنا جا رہا تھا۔

”ان رمان مجھے اچھا لگتے تھے کھا..... میرا مطلب ہے اس کی عادات، اس کی باتیں۔“ اس نے کہا شروع کیا۔ ”مگر میں اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔“ اس نے بغیر جھجکے بولا تھا۔

”تو میں اس میں کیا چیز پسند تھی؟..... آئی مین، اس کی شکل؟ اس کی مالی پوزیشن؟ ایکسٹرا۔“ اس نے سوال کیا۔

”میں اس کو مقبوضہ کر دیا کہ باندہ کچھ چٹھی تھی۔ جسے کوئی بھی چیز تو نہیں سکتی۔ ایک سپا مل۔

”جی جی جی آزاد فرماؤں میں بھی اپنے دین کی رسی کو کھائے کھائے چل رہا تھا۔ میں اسے سب الگ کچھ چٹھی تھی۔ مگر وہ تو.....“ کشف کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ ”تیور! جب وہ کسی اسے بات کرتا تھا تو نظر میں جھکا لیتا تھا۔ مجھ سے بھی بات کرتے وقت وہ میری طرف نہیں دیکھتا۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ عورتوں کا بے حد احترام کرتا ہے۔ وہ تلوار اور مصری نمازیں تقاضا نہیں کرتا تھا۔

اس کے وہ تھوڑے گراہے۔ ”جھکا کر نماز کا پابند ہے۔ میں کچھ چٹھی کہہ دو تھی ہے۔ اس کی گفتگو 65 فیصد باتیں اسلام کی ہوتی تھیں۔ حدیثوں اور آیات کے حوالے سے وہ بات کرتا تھا۔ وہ اتفاق میں رمضان کے روزوں کے علاوہ نقلی روزے بھی رکھتا ہوں۔ میں کبھی کہہ کر ہیڑ کر باہر

اگر جب یہ ہم بیٹھواری میں ساتھ ہوتے تو وہ یہاں پر بیٹنے والے ضرورت مند مسلم علماء و بات کی مختلف ادا کرتا تھا۔ کبھی مال سے، کبھی مولی سپورٹ کرتا تھا۔ میں اسے دوسروں کا ہمدرد

نہی تھی مگر میں نہیں جانتی تھی کہ وہ یہ سب مجھے حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ ڈرامہ کر رہا .. دکھاوا کر رہا ہے۔“

وہ کہتے کہتے ڈراما ساری۔ تیور غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”تیور! میں نے جیسے بھیج چکا۔ تمہاری ذات میں مجھے شیطان نظر آیا کرتا تھا۔ تم مجھے بہت ار کے ٹھکانا ذہنیت والے موقع پرست، احسان فراموش انسان لگتے تھے جس کی نظروں میں عورت

لے صرف ہوں ہوتی ہے۔ جس کے نزدیک بھائی، مائی، مکران کی کی تقریق نہیں۔ جس کے لئے ذات سے شک رشتہ صرف ایک سی ہے۔ بھوک کا ہوں کا.....“ اس نے تیور کی طرف

ما۔ تیور پات چہرے کے ساتھ اسے تک رہا تھا۔ ”میں تمہیں حد سے زیادہ گھبراہٹ بھیجتی تھی۔ جب تم سے ملاقات ہوتی، میں سب کی لگتا تھا کہ تم صرف موقع کی تلاش میں ہو۔ جہاں تم کو موقع ملا

اب تم نے مجھے اپنی ہوں کا کھنڈن بتا لیا ہے۔“ کشف کی پلکیں اس کے عارضوں پر جھک گئیں۔

”رنا موٹی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہاں لندن میں جب رہائش کے سلسلے میں جیتی تھی تمہارے قیث میں لائی تو جب میں نے

اتھا کراہ تو تمہارے پاس کوئلہ جاس موجود ہے۔ میں تمہارے ساتھ رہنے پر بے حد مجبور

مگر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اتنے بے نہیں ہو جتنا میں سمجھ رہی

تم نے اس رات لٹے کی حالت میں جو کچھ کہا اور طاقت و اختیار کے باوجود مجھے یونی چھوڑ دیا

میں نے جانا کہ تم مجھے میرے ساتھ زندگی نہیں کر سکتے۔ بس اس رات کے بعد جو تم سے خوف

ار محسوس ہوتا تھا، وہ ختم ہو گیا تھا۔ پھر ان رمان نے اپنی اصلیت دکھائی تھی۔ جب اس رات میں یہ

فارسی تھی کہ شاید اللہ کو میری بات پسند آئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈراما ساری۔ اس نے کافی کا

مکونہ ہر اور پھر اپنی بات کا پسند آئی سے جزا جہاں سے بات منتقل کی تھی۔ تیور بغیر ہنسنے

کے اسے سن رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا۔

”میں اپنے کردار پر بے حد نازاں تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے کوئی تفسیر نہیں کر سکتا۔ میں بہت پاک

”اگر ایسا ہو تو اپنا زار سار شقیہ کی سمت کرنا چاہئے۔“ اس نے جواب دیا اور پھر اسے وضو کا پتہ اور دعائیں سکھانے لگی۔ تیمور کے لئے یہ سب صرف دیکھ اور سن لینا کافی تھا۔ اسے ہر جہجہ ازہر لگتی تھی۔

”تمہارے پاس شلوار قمیض نہیں ہے؟“ کشف نے وضو کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔ وہ ہاتھ اٹک کر دروازے کی بندیز میں دونوں ہاتھ بیٹھنے کے گرد لپٹے کھڑا تھا۔

”ہے۔ مگر شاید یہاں تو کوئی ایک آدھ کرنا ہی رکھا ہو۔ دراصل یہاں شلوار قمیض کی اتنی ضرورت نہیں رہتی۔“ تیمور نے کندھے اٹکا کر ہونے جواب دیا۔

”نماز اگر شلوار قمیض میں ادا کی جائے تو زیادہ اچھی بات ہے۔ سر پر ٹوپی پہننی چاہئے۔ روزہ کوئی باں وغیرہ سر پر باندھ لینا ضروری ہے۔ سکھسے نماز ادا نہیں کرنی چاہئے۔“ وہ باہر آتے ہوئے

ایک کہنے لگی۔

”ایک بات کہو؟..... تم اسلامک سینٹر جہان کرلو۔ میرے حساب سے تمہیں اسلام کے متعلق بہت سی چھٹی اور بڑی سے بڑی باتوں کی ناگ ضرور ہونی چاہئے بحیثیت ایک مسلمان۔ ٹھیک ہے؟“ وہ بولی۔

”ہاں ہاں..... دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو میں صرف ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں نماز کا۔ دیکھنا داتا بھوں کہ میری ذات پر اس کا کتنا اثر ہوتا ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”نماز کو شروع کرنا کرم ادا کرو۔ دل سے اور توجہ سے ادا کرو گے تو ہی فیض یاب ہو سکو گے۔“ اس نے سمجھائی۔ پھر کشف اسے نماز سکھانے لگی۔ اسے تیمور کے ساتھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس کی یادداشت پر حیران تھی۔ یہاں وہ تیمور کو قرآنی آیات، تفسیر وغیرہ پڑھ کر سناتی تھی اور وہاں سے وہ سب ازہر ہوتا تھا۔ آخر میں جب تیمور نے اسے پوری کی پوری نماز باطل ٹھیک ٹھیک سنا دی تو داتا بھو نے ہنسنے نہیں روکی۔

”میں نے اپنی پوری زندگی میں تم جیسا ذہین آدمی نہیں دیکھا۔ تمہاری یادداشت واقعی قابلِ لک ہے۔“ دوسرے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا۔“ وہ مسکرایا۔

”تیمور تمہاری یادداشت اتنی اچھی ہے کہ تم قرآن پاک حفظ کر سکتے ہو۔ تم ایسا ضرور کرنا۔“ وہ لالہ لہجہ میں زبان پہ لے لگی۔

”جیسے کچا کھانسی بنا لے کر نقد کر سکی ہو کیا؟“ وہ مسہرنا کر بولا۔

”تم کو کیا خبر تیمور! شاید تمہاری اس قابلِ رنگ میموری کا مقصد یہی ہو کہ خدا تمہارے دل کو ہمارے مافوقِ قرآن حکیم کی مقدس سورتوں سے متور کرنا چاہتا ہو۔ اگر ایسا ہے جیسا کہ میں سوچ رہی ہوں تو تم کی قدر خوش نصیب ہو گے۔“ کشف نے کہا۔

”کم آن کشف! اب میں پور ہونے لگا ہوں۔“ وہ آسمان کر بولا۔

دائیں ہوں۔ تیمور! میں ہمیشہ تم کو دیکھ کر سوچتی تھی کہ تم جیسے پست کردار اور آلودہ شخص کی نسبت میں کتنی مضبوط اور پاک ہوں۔ پھر جب ارمان ملا تو اس کا موازنہ تم سے کرنے لگی۔ میں سوچتی تھی کہ لڑکا تیمور سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ اور تیمور ملٹی خان میرے سامنے کچھ نہیں۔ بس شاید خدا کو میری سوچ پسند نہیں آتی تھی۔ اسے میرا غرور نا پسند آیا۔ اسے میرا بڑا بول نا پسند آیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے شخص کے ہاتھوں رسوا کر دیا جسے میں اپنی دانتیں بچھوٹتی تھی جیسے خود کو کھینچتی تھی۔ اور ایک بار شخص کے ہاتھوں اس نے مجھے رسوائی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا جسے میں بے حد ذلیل سمجھتی تھی..... تیمور! میرا اب بڑا انصاف ہے۔ میرے رب نے فوراً ہی انصاف کر دیا۔ مجھے معاف کر دو پلیز! اس نے بچوں کی جھار اٹھا کر اسے دیکھا۔ تیمور نے اس کی سیاہ آنکھوں میں موتی پڑ دیکھے تھے۔

”میں نے تمہارے اندر ”اچھائی“ کی رقع دیکھی ہے..... تم حق کو برائی اور گمراہی کے اندھروں سے لٹکانا چاہتی ہو۔ تم بہت اچھے انسان بن سکتے ہو۔ تم سیدھی راہ پر آگئے تو یقیناً تمہارے جانے والوں میں سب سے زیادہ خوش مجھے ہی ہوگی۔“ کشف نے اطمینان سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ تیمور اب بھی خاموش تھا بلکہ خاموشی سے ہاتھ کرنے میں مگن تھا۔ جیسے یہ کام دنیا کے کام سے زیادہ اہم ہو۔

”ہاتھ کرلو۔ خفا ہو رہا ہے۔“ تیمور نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

کشف ایک کبوتری سانس لے کر رہ گئی۔ اس نے سر ہٹا کر اور ہاتھ کر کے کھینچنے لگی۔ مگر اس نے من میں تجاہد کر لیا تھا کہ وہ تیمور کو راستے پر لانے کی کوشش ضرور کرے گی۔ وہ دعا تھی کہ کوشش کی ہی دوسری شکل ہے۔ دل میں امید کا دیا روشن رہے تو اس کی روشنی میں ”کوشش“ خود روشنی کر جیٹتی رہتی ہے۔



تلم کا وقت ہو رہا تھا۔ کشف نے تیمور کو زبانی وضو کرنے کا طریقہ سمجھا دیا تھا۔ کیونکہ اسے اسے کرنے کا صحیح طریقہ معلوم نہ تھا۔

”اس طرح نہیں۔ تم میرے سامنے وضو کرنا کہ مجھے بائیں ٹھیک سے طریقہ معلوم ہو جائے۔ میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے کشف سے کہا۔

”ٹھیک ہے..... میں وضو کرتی ہوں۔ تم طریقہ دیکھ لو اور وضو کی دعائیں بھی۔“ وہ راضی ہو گئی۔

”سب سے پہلے تمہیں قیہ کی طرف رخ کر کے کھڑا ہونا ضروری ہے۔“ وہ آستینیں فولا کرتی گئی۔

کھڑی ہو گئی۔

”اور اگر جلد مخالف سمت ہو گیا کرنا چاہئے؟“ تیمور نے سوال کیا تھا مگر اس کی نظر میں اس کے دودھیا بازوؤں پر جس نے آج اس نے ٹھیک مرتبہ کشف کے بازو کپڑوں تک دیکھے تھے وہ

بہت پوری آستین کی پیش پینٹنے کی عادی تھی۔

بہت چھوٹا سا کمرہ تھا..... میں بائی ٹین کے اس چھوٹے سے کمرے میں ننگے فرش کو لئے ایک پٹائی چھٹی تھی۔ پٹائی پر انی سی تحریر صاف تھی۔ کمرے کی دیواریں قدرے نیس اور کمرے میں ایک طرف ایک کونے میں کچن بولڈ کا ایک چھوٹا سا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس کی علاوہ اور کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں مصلیٰ بچھا ہوا تھا اس میں قرآن مجید رکھا تھا۔ قرآن مجید کھلا ہوا تھا اور پرانے، بو سیدہ لباس میں ایک بڑی سی اپنے آپ کو چھپانے، مادی طور پر قرات میں مگن تھی۔ وہ قرآن مجید کی قرات بعد ترجمہ کر رہی تھی۔ میں کوئی روزانہ، کوئی کھڑکی نہ تھی۔ بس اکھٹا دروازہ تھا۔ کھڑکی کا پرانے طرز کا بنا ہوا اگر اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکی اندر داخل ہوئی تھی اس نے بھی اپنے جسم کو ایک چادر میں چھپا رکھا تھا بلکہ اس کا آدھا آدھا چہرہ بھی چادر میں نہ آہٹ نہ کر بھی مادیوری کویت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

بہنوں تک اسے دیکھتی رہی، پھر اس کے پاس ہی بندھ گئی۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک ٹرے بہت خوب صورت گلاب کے پھولوں کی کڑھائی والا ٹرے پر رکھا تھا۔ لڑکی نے ٹرے پٹائی اور مادیوری کے قاریغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ چندہ میں منٹوں کے بعد مادیوری نے قرات قرآن مجید کو چم کو بے حد احترام کے ساتھ جڑان میں واپس لپیٹ دیا۔ اس کے بعد اس نے لے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ کمر لڑکی نے دیکھا کہ اسے بند آنکھوں سے اپنی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی نرم تھیلیوں میں جذب ہو رہی ہیں۔ اس کے یا قوتی لب آہستہ ہرے تھے۔ یہ منظر لڑکی کے لئے ناپسند تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بے شمار مرتبہ اسے رقت مہم دیکھ چکی تھی۔ دعا مانگتے کے بعد مادیوری نے اپنے چہرے پر ہاتھ بچھڑے اور جیسے ہی اٹھنے اڑکھ کر چنگ لگی۔

یہ ٹالو! تم کب آئیں گی؟ اس نے پوچھا۔

دیر ہو گئی ہے۔ آپ تو قرآن پڑھتے میں اس طرح مگن ہوتی ہیں کہ پھر ادرگمڑا کا ہوش ہی اٹھائی لڑکی نے سلام کرنے کے بعد کہا۔ "آپ سے کئی بار کہا ہے کہ باہر کا دروازہ بند رکھا جائے اور دوسرا آگے لڑکی نے ناراضی سے لیجے میں کہا۔

انہوں نے کہا تو میں ہی ہوگا۔ کیا ہے یہاں جو چرا کر لے جائے گا؟" مادیوری مسکرا دی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم نماز ادا کرو۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔" اس نے صوفے سے اڑ ہوئے کہا۔ تیسرا سے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تب تک اس کا پیچھا کرتی رہیں وہ تک کہ وہ اپنے کمرے میں داخل نہیں ہو گئی تھی۔ کشف کے جانے کے بعد وہ اٹھائیں بلکہ صوفے پر انگلیں پیچھا کر لیت گیا۔ اس کی نگاہیں چوت پر گئے تھیں فانوس پر بھی ہوئی تھیں مگر تھوڑا کشف تھی۔ اس کے خوب صورت سر میں انگلیوں والے دو دھوا ہاتھ اس کے پائیں ہاتھ کی تیر انگلی میں پڑا ہوا صوفے کا بھٹا جو آج پہلی بار اس کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ شاید وہ اسے اپنی بہن رہی ہو مگر تیسری کی نگاہوں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ اس کے سین بازو کا وہ کالا تلی اسے یاد آیا تھا جو وضو کے دوران اس نے دیکھا تھا۔ اس کے ربوٹی بالوں والے سر سے بچے روشن چٹائی جس پر سیاہ بالوں کی چند تلیں چمکی ہوئی تھیں۔ اس کی چمکی ہوئی سیاہ، مگی بھی آنکھیں۔ نسکی سی کھڑی ہانک اور اس میں چمکتا نور میں جس کا زرقون پانی سے جھپکنے کے بعد شمع طرح چمک رہا تھا۔ اس کے گھٹی کرتے لب جو گلاب کی سرخ پھلجیوں کی مانند کھلتے اور بند ہوتے آتے تھے۔ اس کے کھینے ہوئے سفید دانت جو انار کے دانوں کی طرح ترتیب سے نظر آ رہے تھے گردن کا مسح کرتی ہوئی غزلی انگلیاں جو شیشے ایسی شفاف گردن کا مسح کر رہی تھیں۔ اس کے کے چمکوں کی مانند گورے گلابی پیر جو ٹخنوں تک دھو رہی تھی۔ آج اس نے بڑی تفصیل سے اس جائزہ لیا تھا۔ تیسویں کی آنکھوں میں صوف کے سامنے بڑھ رہے تھے۔

کشف نماز ادا کرنے کے بعد بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ کھلی آنکھوں سے چہت کو گھور رہی تھی۔ اس نے جن صوفوں کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کی صوف کا بخور تھوڑا۔



اس کے بدلے میں چھ گیا اور اشتیاق سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی الماری کے نچلے خانے میں سی ایم کیو کی ایک اور اس کے پاس کیا۔
 ”دیکھیں..... آپ کی تصویروں کی کتنی بے گنجش موجود ہے میرے پاس۔“ وہ اسے الم کیوں کر لگا۔ واقعی اس کے پاس تیرور کی تقریباً ہر وہ تصویر موجود تھی جو مختلف اخبارات و رسائل میں تھی۔

”جیسے آنوگراف دیکھتے گا۔ یہ لیں۔“ اس نے آنوگراف بگ۔ اس کی طرف بڑھا دی۔ تیرور بارک بگ اس سے لے لی اور چند لائیں لکھ کر بگ واپس کر دی۔
 آپ کو چہ بچہ بچہ اپنا نام بالکل پسند نہیں تھا۔ جب سے آپ کو دیکھا تھا اپنا نام اچھا ہے آپ بھی تیرور میں بھی تیرور ہوں۔“ وہ اشتیاق سے کہہ رہا تھا۔
 اچھا تو سسر تیرور آپ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 میں آپ کی طرح بننا چاہتا ہوں۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔
 رنگی؟“ تیرور نے پوچھا۔

ہاں میں ایک بار میں نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا اور میں نے ان کو یہی جواب دیا تھا تو نے فوراً کہہ دیا تھا ”خدا نہ کرے کہ تم تیرور بننا چاہتے ہو۔“ اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟“ وہ ارادہ تھا۔

اور کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ ”یہ تو وہی بنا سکتی ہیں۔ شاید میں انہیں اچھا نہیں سمجھتا۔“ تیرور نے اچانک سے پوچھا۔
 وہ کیوں؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

اور نے لاشکی کے اعزاز میں کندھے پکڑے۔
 وہ تو آپ کی فریڈ ہیں؟“ اس نے بھراپنی معلومات میں اضافے کے لئے سوال کیا۔

میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔“ تیرور نے ہنسنے میں اچانک پکڑا۔
 فریڈ تو ایک دوسرے کو پسند کر کے ہیں۔ جیسا تو فریڈ نہ ہوتے ہیں نا۔“ وہ اچھا ہوا لگا رہا تھا۔

میں..... آف کروں۔“ تیرور کو اس کی بیٹائی حارہ سے رنج تھی۔
 میں کس سے پوچھوں گا کہ انہوں نے اس روز ایسا کیوں کہا تھا۔ اپنے فریڈ کے لئے تو اچھے ارادے بنائیں۔“ وہ بولا۔
 اگلے۔“ تیرور محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔

اسے آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو وہاں ڈھونڈ رہی تھی۔“ اسی بلر دہی انداز میں۔
 لی..... یہ تیرور مجھے یہاں لے آیا تھا۔“ تیرور علی خان نے کہا۔
 بہت پسند کرتا ہے یہ آپ کو۔ دیکھا آپ نے، کتنی تصویریں مع کر رہی ہیں اس نے آپ کی۔“ لہذا اسے کہا۔

خواتین کی فہم کے لئے انتظام کیا گیا تھا جبکہ مردوں کے لئے جس سے میں فہم کا اہتمام کیا گیا سب اس طرف چلے گئے تھے۔ تیرور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اسے تو فہم لکھ آتی ہی نہیں تھی۔ وہ کیا کرتا جماعت میں لکھتا اور کہہ سوتا؟ وہی بیٹا رہا۔
 ”اگلے! آپ لہذا نہیں پڑھ رہے؟“ کچھ دیر بعد تیرور پر سفید فونی پینے اصرار لگتا تھا۔
 دیکھ کر پوچھتے لگا۔

”آپ نے پڑھ لی فہم؟“ تیرور نے اس سے پوچھا۔
 ”جی ہاں۔“ تیرور نے تیرور سے سر ہلایا۔
 ”آپ کی کس نے بتایا ہے کہ آپ واکمن بہت اچھا بناتے گئے ہیں۔“ تیرور نے اس کے ”اور صحت مند چہرے کو دیکھا۔

”میں نے سمجھا ہی تھا اچھا ہے۔“ آپ ان کے کیا سمجھتے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔ ”آپ کے سسر ہیں؟“ وہ قیاس کر رہا تھا۔ تیرور کی فنی چوٹ مٹی۔ اگر کشف یہ سن لے تو اس کے بازو کیسے ہوں گے؟ وہ سوچ رہا تھا۔
 ”نہیں..... میں ان کا سسر نہیں ہوں۔“ تیرور نے سسر کے جواب دیا۔

”تو پھر؟“ اس نے سوال کیا۔
 ”وہ میری فریڈ ہیں۔“ تیرور نے اسے سمجھایا۔
 ”ہوں..... وہ واقعی بہت اچھی فریڈ ہیں۔ میری بھی فریڈ شپ ہے ان سے بہت اچھی۔“

لے گا یا انعام کیا۔
 ”رنگی؟“ تیرور تو آپ سے بڑی ہیں۔“
 ”سو دات؟“ میں بھی تو ان سے چھوٹا ہوں۔“ وہ کندھے پکڑا۔

”مائی بوائے۔“ تیرور نے سانس نہ ہوا۔
 ”آپ میرے روم میں ٹھہریں۔ میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“ اس نے تیرور کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
 ”چلو۔“ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ تیرور اسے لے کر اپنے بڑے روم میں چلا گیا۔ اس کا بیڈ روم بہت خوب صورتی سے بنایا تھا۔ بہت صاف تھرا تھا۔ چاروں طرف مختلف رنگ کی کپڑوں کی ایکشن فو کی کنگ چھپائی تھیں۔ ان میں کچھ اسپورٹس میوز کی تصویریں بھی نظر آرہی تھیں۔ بڑے عین میں ہر بڑے سے فریم میں سفید تیرور کی فنی فونٹھی۔ سائیکل پر تیرور کی مسکراتی ہوئی تصویر فریم میں بڑا ہوئی نظر آرہی تھی۔ تیرور دیوار پر تیرور علی خان کی مختلف پڑوس میں بھی ہوئی تصاویر کی کنگ آج کل تھیں۔ ہر تصویر میں تیرور علی خان کا اسٹائل مختلف تھا۔

”تم نے تو میری اتنی ساری تصویریں مع کر رکھی ہیں۔“ تیرور اس سے مخاطب ہوا۔
 ”آپ میرے سوسٹ فوٹو مائل ہیں۔ میں نے تو آپ کی پوری الم نہ کر بھی ہے۔ آپ نہیں، میں دکھاتا ہوں۔“ وہ جوش سے بولا۔

”جی ہاں۔“ وہ مسکرایا۔

”کھانا لگا رہا ہے۔ آپ کالیں۔“ روہنی نے کہا۔

”پلے۔“ تیمور علی خان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”مام! سب کہاں ہیں؟“ تیمور نے اس سے پوچھا۔

”وہ کھانا کھا رہی ہیں۔ تم بھی چلو، کھالو۔“ انہوں نے کہا۔

”میں تیمور اہل کے ساتھ آ رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”اوکے بھی..... آپ تو آپ ہم سے زیادہ ان کے مہمان ہو گئے ہیں۔“ روہنی نے مسکرا

کہا۔ وہ خاموش رہا، بس مسکراتے ہوئے تیمور کو دیکھ رہا تھا۔

کھانے کے بعد کلاں کا دور چلا اور پھر مہمان آپس آپ ہنست رخصت ہونے لگے۔ آخر میں ام

والے اور کشف اور تیمور علی روہنی کے خور و رک آیا تھا۔

”بس اس اجازت دیں۔ رات بہت دوری ہے۔ کوشش پر اہم ہو جائے گی۔“ اس نے ا

اجازت طلب کی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ مگر تم آتی جاتی رہنا۔ یہ نہ ہو کہ تیمور کی کلاسز ختم تو تمہارا آنا چاہی بھی ختم

بھی ناظم نے شروع کر دیا کرو اور تیمور علی خان کو مہرا لایا کرو۔ تم دونوں ساتھ ساتھ گئے اچھے گئے

روہنی اپنی دھن میں کھدی رہیں۔

کشف نے جڑ بڑھ کے تیمور کو دیکھا۔ وہ زہر لب مسکرا رہا تھا۔

”اچھا!..... اللہ حافظ!“ وہ کہہ کر فوراً ہر گل گئی۔ تیمور نے بھی اس کی پیروی کی۔

”مری! ابھی خاموشی بڑھ چکی ہے۔ اچھا ہو کر کھالے آتے۔ اب انتظار کرتی رہو گا۔“

کا۔ ”تیمور نے اسناپ پر بس کا انتظار کرتے ہوئے طفر کیا۔

”جنہیں آج کسنا گا؟“ وہ اسے سنائی انہی کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اچھا لگا ہے۔“ وہ اسل مجھے۔ ”ج“ گھر گئے۔“ سے ماحول کی عادت نہیں ہے۔ اس لئے یہ سہ

اور اچھا لگ رہا تھا۔“ اس نے اپنے تاثرات دہرائے۔

”کیوں؟..... تمہارے گھر میں کوئی نہیں ہے؟“ کشف نے پوچھا۔

”گھر میں بہت کچھ ہے۔ چتر، اینٹ کی دیواریں ہیں، جنتی ڈیکوریشن چتر ہیں، ام

ملازمین ہیں، سونے چاندی کے برتن ہیں۔ اور ہاں..... ایک پایا بھی ہیں۔ جنہوں نے نہ ل

اور اپنی مہلی تیری کے مرنے کے فوراً بعد اپنی سوتلی دنیا کو آباد کر لیا تھا اور میرے لئے ”مام“

لے آئے تھے۔ ہاں، بی اماں بھی ہیں۔ جو دوسروں کے لئے تو ملازمہ ہیں مگر میرے لئے میرا

سے بڑھ کر ہیں۔“ وہ ہنسنے ہوئے کہہ رہا تھا۔

کشف اسے دیکھ کر گہری۔ اس نے محسوس کیا کہ تیمور کی آنکھوں میں پانی کی طرح جگہ جا

ہے۔ اس کی ہنسی کا ٹھکانا چن و شدت سے محسوس کر سکتی تھی۔

لہارے گھر میں کون کون ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

میرے پاس باپ اور ایک چھوٹا بھائی۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔“ وہ مختصر سا بیان کرتے

بازی تھی۔

اور تمہارا فریاد کیا ہے؟“ تیمور نے سوال کیا۔

بہرا۔ دونوں ہنسنے لگے۔ بڑی ہیں۔“ وہ بولی۔

بھائی مجھے آج بے تازہ کو تم دوسری لڑکیوں سے اتنی مختلف کیوں ہو؟..... آئی میں تم نہ دولت

ہوئی ہو نہ صورت سے۔“ جبکہ تمہاری عمر اور تمہاری کلاں کی دوسری لڑکیوں تو ان چیزوں کی

مانے پر ہی اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔“ تیمور نے دونوں بازو پیٹے پر پلپٹے

پھا۔

مامی میرے والدین کی تربیت کے ساتھ ساتھ خود میرے اپنے ارادوں اور سوچوں کا بھی

باقی تو اللہ جسے ملے گی حمایت دے، اس کے قدم نہیں لٹکا سکتے۔“ اس نے کہا شروع

دور میرے بابا نے اپنے کل و سائل کے باوجود ہم بہن بھائی کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔

لڑکیں اعلیٰ تعلیم دلوائیں اچھے برے کافر کو تیار کرائیں۔ انہوں نے بھی ہم پر بھتی نہیں کی بلکہ

زنی سے ایک چیز ہم چاہوں بہنوں اور بھائی کے ذہنوں میں غلطی دی۔ اور وہ یہ کہ غنا یا

عزت اختیار نہیں ہے۔ جس سے چیز میں نہ گھر سے ہاتھ لی تھی۔ جنہیں پتہ ہے، میں اپنے

بائیں لڑکی ہوں جو پہلے یونیورسٹی تک پہنچی اور آج یہاں لندن میں موجود ہوں۔ دنیا کی ٹاپ

اسٹ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہی ہوں۔ یہ میرے بابا کا دیا ہوا وہ امتداد ہے اور وہ اعتبار

مائی وجہ سے آج میں یہاں پہنچی ہوں۔ تیمور اگر میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح عشق و

کے پکڑوں میں پڑ کر اپنے والدین کے امتداد کو ٹھیس پہنچاتی تو آج اس مقام تک نہ پہنچ

بھی دوسری لڑکیوں کی طرح سہل لی اے کرنے کے بعد کسی کے گھر اس کی بیوی کی

یہ گھر دہرائی مگی ہوتی۔ اس کے بچوں کی ماں بن کر ایک بے کار زندگی جی رہی ہوتی۔“

تھی۔

رے نزدیک شادی شدہ زندگی بے کار ہوتی ہے؟“ تیمور نے دلچسپی سے سوال کیا۔

تک تو ضرور جب تک کہ انسان اپنے اصل مقصد کو حاصل نہ کرے۔ اور میرا مقصد، میری

ماجھے سے قاصط ہے۔“ وہ مسکرائی۔

لی تو دولت کمانا چاہتی ہو۔؟ اور نہ تازہ پڑھ لکھ کر کیا کر گی؟“ تیمور نے پوچھا۔

۔ دولت کمانا ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے تیمور! میرا مقصد کچھ اور ہے۔“ اس نے تنبیہ کی

سکا ہوں وہ مقصد کیا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

بتانے کا وقت نہیں آیا ہے۔ پھر کبھی بتاؤں گی۔“ وہ ناٹنے کے سے انداز میں بولی۔“ وہ

پسے

انہا تیسس کیلٹ کر رہی تھی کہ چاکا کی اس سے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ کر کے بجا۔ وہ جو سے لگنے میں مگنی تھی، تقریباً اچھل پڑی۔

کون؟ "اس نے اپنے دھڑکنے والے دل کو تباہم لالٹے ہوئے دہیں سے پوچھا۔
 کشف! میں تیرور ہوں۔ جلدی سے دروازہ کھولو۔"
 وہ کی آواز پر وہ بھجلائی تو کئی قسمی۔ اس نے قلم خفٹے کے سے اندام میں ناگل پر پھینکا اور بڑے موڑ کے ساتھ دروازہ کھولنے چلی گئی۔

کیا بات ہے؟..... جھپٹیں سکون کیوں نہیں ملتا؟ میں اتنا ضروری کام کر رہی تھی۔" وہ بیٹا لٹا۔

کر لینا کام اٹنا۔ جو بات میں جھپٹیں بتانا چاہ رہا ہوں وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔" تیرور نے اسی از میں کہا۔

تم کو کتنا سسپنس پھیانے کا شوق کیوں ہے؟ کہیں ڈیکٹر (جاسوس) تو نہیں ہو؟" وہ کھول لٹا۔
 تم باتوں میں ناظم دیسٹ مگر۔ جلدی آؤ۔" تیرور نے غلٹ میں اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً دوا سے اپنے ساتھ لاؤنچ میں لے آیا۔

کیا پتہ پتہ ہے؟ جھپٹو دیر اٹھ۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے فیسے سے بولی۔
 رکھو اپنا ہاتھ اپنے پاس۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ تم وہ دیکھو۔" تیرور نے دی کی طرف لٹا۔

کیا ہے اور؟" کشف نے حملے کے اُدھر دیکھا۔ نوز جھلک چل رہا تھا۔ نوز کا سٹرنوڈ پڑھ رہی اس کے عقب میں ارمان کی تصویر صاف نظر آ رہی تھی۔
 ہائی گاڈ! یہ ارمان ہے؟" وہ چونکا۔

اے۔ اور پھر اسے نوز میں بتایا جا رہا ہے کہ ارمان لندن میں مریاں تھیں بتانے میں ملوث نہ کیے ایسے گروہ کے ساتھ تعلقات بھی تھے اسے پانچ سال کی سزا سنائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کی کیریئر بھی ٹائمن ٹائمز میں۔" جس میں اس نوز کی بیڈ لائن۔"
 کر کیا رہا وہ دیر اٹھا؟" کشف تیرور کو دیکھنے لگی۔

خدا تو نہیں مگر ایسے لوگوں سے زیادہ برا تھا۔" تیرور نے کندھے اچکا تے ہوئے کہا۔
 تو بغیر جھٹ کے اسے سزا کیسے ہو گئی؟" وہ حیران بھی تھی اور ابھی ابھی بھی۔
 موت بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ کاندے کے چند کڑی نوٹ ایسے جھوٹے جھوٹوں کو خریدنے کے والے ہوتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

تو سب تم نے....." وہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔
 میرا پس چلنا تو اسے چھانی دلوانا۔ مگر خیر، یہ سزا چھانی سے زیادہ اچھی ہے۔ کسی کو موت دکھانے

تجہا رہا متعدد حیات کیا ہے؟" اس نے تیرور سے پوچھا۔
 جتنی میں تجہا رہی طرح مشکل زندگی جینے کا عادی نہیں ہوں۔ میرے کچھ شوق ہیں جن کی کرنا رہتا ہوں۔ کسی جیمز کیمبل کر، کسی باڈنگ کر، کسی سنگل سے تو کبھی چیلنجز کو قبول کر دراصل میں ایک چیز سے مطمئن نہیں ہوتا ہوں۔ جلدی کسی بھی کام سے آگیا جاتا ہوں۔ تم نے ہو؟" اس نے کشف کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ میں مستقل مزاج ہوں۔" کشف نے کہا۔
 "ہاؤ رینگ تم آسانی کیوں نہیں ہو کسی ایک چیز سے؟ تم اتنی مطمئن کیسے رہتی ہو؟" وہ سے پوچھ رہا تھا۔ کشف نے لٹکے پیر کا رے دیکھا۔

"تم بھی مطمئن ہو سکتے ہو۔ تجہا رے اندر کی ہے یعنی اضطراب کو بھی قرار آ سکتا ہے۔" وہ "تم کیسے ہو سکتی ہو کہ میں بے چین اور مضرب ہوں....." تیرور نے دلچسپی سے اسے دہا "یہ جو تم ساری ساری رات سوئیں سکتے۔ دنیا کے پچاسوں میں، لڑکیوں کی ذات میں، کے گھاس میں تم اپنی بے چینی کا صلہ دھوڑتے ہو، یہ سب کیا ہے؟ تجہا رے چہرے سے! آنگھوں سے یہ اضطراب صاف عیاں ہوتا ہے۔ تجہا رے اندر اتنی بے چینی ہے کہ تم اسے کہا نہیں کر رہے ہو۔ کسی بھی تو مجھے لگتا ہے کہ مجھے تجہا رہی چیز کو بھی ہے جسے دھوڑتے رہنے کشف نے اس کے حلق پر اجازت دے لیا تھا، وہ بالکل سچی تھا۔ اس نے کشف کی باتوں کی تردید کی تھی۔ وہ بس خاموش ہو گیا تھا۔

"کیوں؟..... کیا کچھ نڈل کیا میں نے؟" کشف نے اس سے پوچھا۔
 "نہیں..... تم نے تو اتنا سچی کہا ہے کہ آج تک کسی نے اتنا سچی نہیں سمجھا مجھے۔" وہ سے لڑا۔

"تم اپنی ان کیلیات کو فٹم کر سکتے ہو۔ وجہ تو میں نہیں جانتی مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ تم نہ رجوع کرو۔ اس کی طرف بڑھو۔ تجہا رہی ساری بے چینی اس قسم ہو جائیگی۔"
 "تیرور! میں کرتا نڈا پڑھنے کو۔" اس نے بھوری بیان کی
 "دل چاہے یا نہ چاہے تم نے پتا تو شروع کرو۔ خود اس میں لطف دوسرا رہے گا۔" نے سمجھایا۔

"فی الحال تو بس اتنی ہے۔" تیرور نے دور سے آتی بس کو دیکھ کر کہا۔ وہ خاموش ہو گئی۔
 وہ لوگ گھر آ گئے تھے۔ سارے راستے دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ تیرور نے کشف سے ا کردہ روزہ نہیں رکھے گا۔ کشف نے بھی اسے بھجور نہیں لیا۔ ایک عبادت کا ناکام ہی کیا ہو، جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے شوق سے عبادت کی طرف آئے۔ وہ آتے ہی سو گئی۔ کیا سحری کے لئے بھی اٹھنا تھا اور پھر پوندہ رتی بھی جانا تھا۔

پوری کر لی جائے۔" وہ ہنس رہا تھا۔ کشف چپ سی ہو گئی۔ تیور کے اندر بھیجی عروسی اسے دائر آنے لگی تھی۔

"یہاں ایک دن کا آنے کے وہ آسٹریلیا پہلے جائیں گے۔ میری کرن کی شادی ہے۔"

"اچھا..... جب تو تم کو بھی جانا چاہئے۔" کچھ آؤنگ تک ہو جائے گی۔" کشف نے ہلکے سے میں کہا۔

"مجھے رشتہ دار بہت پر کڑے ہیں۔ بالکل پسند نہیں ہے مجھے رشتوں کی زنجیر میں بندھا رہنے کا خیال کرتے ہیں۔ ان کی ڈیباغز ذہنت ہائی بھی ہوتی ہیں اور لوجھی۔ مگر مجھے رشتوں میں بالکل پسند نہیں ہے۔" وہ بیزار سی ہے۔" کشف نے کہا۔

"کشف! کچھ نہ بولی۔ اس وقت وہ کچھ بھی کہتی، اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ بہت ٹوٹا ہوا کشف کو اس پر کس آ رہا تھا۔ وہ والدین کی شفقت، اس کی قربت اور توجہ سے عروم بچہ تھا جس اندر عروسی اور احساسِ تنہائی کچھ نہیں سے ہی بس گیا تھا۔ لفتوں کی چاشنی اس کی زندگی کے زہر کو ختم کر سکتی تھی۔

"تیور! مجھے کچھ سامان لینا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ مارکیٹ چلو گے؟" اس نے کہا تو وہ! اس کی صورت دیکھنے لگا۔ کشف کے بول پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

"تم مجھے ساتھ چلنے کو کہہ رہی ہو؟" وہ حیرت سے بولا۔ "سوچ لو۔ میں تو کار میں جاؤں گا طرے بولا۔

"اسی اوکے۔" کشف کا اطمینان اسے حیران کر رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ کیا کیسے پلٹ گئی "ٹھیک ہے..... جب چاہنا ہو تا رہا۔" اس نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔



عصر میں وہ اپنی جاب سے فارغ ہوئی تو تیور اس کے کہنے پر اسے کپ کرنے وہیں آ گیا تھا۔ وہ بابرنگلی تو تیور اس کے انتظار میں کار کے پورٹ پر بیٹھا تھا اور انگلیوں سے پورٹ پر کوئی مٹی باریک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ وہ اصرار ہی پہلی آئی۔

"ہائے!" تیور نے خصوصاً اعزاز میں کہا۔

"بھئی سلام بھی کر لیا کرو۔" کشف نے اسے گھورا۔

اوسے..... السلام ملے گا! وہ خوشی سے بولا۔

"وہیلکم السلام!" کشف نے جواب دیا۔ "اس سلام نے تمہارے کھاتے میں ایک ایسے کام کا ناز کیا ہے۔" کشف فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے بولی۔

"چلو، تمہارے ساتھ میں یہ تو فائدہ ہوا سیر۔" وہ ہنسنا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ "تمہارا تو وہی ہے؟ شاید؟" تیور کو حوصلہ خیال آیا۔

"شاید نہیں، یقیناً۔ اور اب انتظار بھی باہری کرنا پڑے گا۔" وہ بولی۔

"اوسے..... تو پہلے انتظار کرنا ہے؟ شاید؟" اس نے سوال کیا۔

"انتظار۔" نام کر رہ گیا ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ آج میں تمہیں کسی انٹرن یا پاکستانی ریسٹورنٹ میں لے جاتا ہوں۔ آج کا انتظار اسی طرف سے۔"

"سینکس! تم جانتے ہو کہ روزہ دار کو روزہ بھلوانا کس قدر ثواب کا کام ہے۔"

"اوہ..... ہا ہا..... پھر تو آج میرا کھانا نکلیوں اور ثواب کے کاموں سے بھرے گا۔" وہ اعزاز میں ہنس پڑا۔

"تو ابھی بات ہے۔ خوش قسمتی کی علامت سمجھو۔"

"خوش قسمت تو میں ہوں ہی۔ تو ڈاؤن۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"مائے خوش فہم ہو۔" کشف نے کہا۔

"کیا فائدہ ہوں؟" تیور نے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ کسی حد تک صحیح ہو۔" وہ مسکرائی۔

"تم مسکراتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔ مگر پھر بدست ایسا سزا ہوتا ہے کہیں بٹا کے رکھتی ہو؟" وہ

”میں نے کہا تھا کہ ڈرافٹیں صاف کر دے۔“
 ”او۔۔۔۔۔ اچھا، اچھا۔۔۔۔۔ ابھی بات ہے۔ کسی کی تو بانی اس نے۔“ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔
 ”لیاں! میں نے تو اس سے روز بھی رکھا تھا ایک۔“ کشف نے مڑاؤں آ کے بتایا۔
 ”جی؟“ لیاں خوشگوار سی جرت سے تیور کو دیکھنے لگیں۔
 ”نہیں، ایک ہی روز رکھا تھا۔“
 ”بہت ادا کر دی، ماشاء اللہ، تمہارا قدم بہت بخت آور ہے۔ بڑی ٹیک قدم بچی ہو۔ اس کے ہونے کو روز دیکھا دیا۔“ کشف کو محبت سے دیکھنے لگیں۔
 ”میرا اور تو اسے پورے پورے کا سدر حائل ہے۔ مگر یہ ہاتھ کہاں آتا ہے۔“ وہ اپنی دھڑکی بولی۔ لیاں نے گہری اور متنی نظر لڑوں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔
 ”مگر کس بچی ہو تو مراد کا بگھوٹو میں خود بخود آ کے چھپ جاتا ہے۔“ وہ مگر بے انداز بولیں۔ ”تمہاری ادا کہیں کا تیرے میں نہ فرختم میں رکھا ہوا ہے۔ سب معاملے تیار ہیں۔ میں غا دیئے تھے۔ بس لیں لیاں! نہیں۔“ وہ جس کام سے آئی تھی اس کی جاہت اسے دینے لگیں۔
 ”جی اچھا۔۔۔۔۔ میں کر لوں گی۔“ وہ سعادت مندی سے بولی۔
 ”لیاں! وہاں چلی گئیں۔ تیور نے اسے دیکھا۔
 ”لیاں! میں نے بہت دور تھی گاٹھ لی ہے تم نے۔“
 ”کیوں؟ تم کو پسند نہیں؟“ اس نے اظہارِ پسند اور ساتھ ہی اسے دیکھا۔
 ”ابھی بات نہیں۔ مگر آج کل کی لڑکیاں بے رنگوں سے دور بھاگتی ہیں۔ جبکہ میں نے تو ہے تم پر کیا نہیں کرشم۔“ تیور نے کپڑا ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کارنس کے اوپر حریف بیٹھا ہوا تھا۔

”میں تیرے عشق میں * 374“
 ”میں تیرے عشق میں * 375“
 ”میں تیرے عشق میں * 376“
 ”میں تیرے عشق میں * 377“
 ”میں تیرے عشق میں * 378“
 ”میں تیرے عشق میں * 379“
 ”میں تیرے عشق میں * 380“
 ”میں تیرے عشق میں * 381“
 ”میں تیرے عشق میں * 382“
 ”میں تیرے عشق میں * 383“
 ”میں تیرے عشق میں * 384“
 ”میں تیرے عشق میں * 385“
 ”میں تیرے عشق میں * 386“
 ”میں تیرے عشق میں * 387“
 ”میں تیرے عشق میں * 388“
 ”میں تیرے عشق میں * 389“
 ”میں تیرے عشق میں * 390“
 ”میں تیرے عشق میں * 391“
 ”میں تیرے عشق میں * 392“
 ”میں تیرے عشق میں * 393“
 ”میں تیرے عشق میں * 394“
 ”میں تیرے عشق میں * 395“
 ”میں تیرے عشق میں * 396“
 ”میں تیرے عشق میں * 397“
 ”میں تیرے عشق میں * 398“
 ”میں تیرے عشق میں * 399“
 ”میں تیرے عشق میں * 400“

”میں تیرے عشق میں * 374“
 ”میں تیرے عشق میں * 375“
 ”میں تیرے عشق میں * 376“
 ”میں تیرے عشق میں * 377“
 ”میں تیرے عشق میں * 378“
 ”میں تیرے عشق میں * 379“
 ”میں تیرے عشق میں * 380“
 ”میں تیرے عشق میں * 381“
 ”میں تیرے عشق میں * 382“
 ”میں تیرے عشق میں * 383“
 ”میں تیرے عشق میں * 384“
 ”میں تیرے عشق میں * 385“
 ”میں تیرے عشق میں * 386“
 ”میں تیرے عشق میں * 387“
 ”میں تیرے عشق میں * 388“
 ”میں تیرے عشق میں * 389“
 ”میں تیرے عشق میں * 390“
 ”میں تیرے عشق میں * 391“
 ”میں تیرے عشق میں * 392“
 ”میں تیرے عشق میں * 393“
 ”میں تیرے عشق میں * 394“
 ”میں تیرے عشق میں * 395“
 ”میں تیرے عشق میں * 396“
 ”میں تیرے عشق میں * 397“
 ”میں تیرے عشق میں * 398“
 ”میں تیرے عشق میں * 399“
 ”میں تیرے عشق میں * 400“

اب اس وقت روٹی کے گھر جا رہے تھے۔ روٹی نے خود نوں کر کے اسے اطلاع دی تھی کہ ان نائیکے ہیں، وہ تیرور کو لے کر جائے۔ کشف، بی اماں کے ساتھ چھٹی سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ اراکیو گر رہا تھا۔ کشف بی اماں سے دھبی آواز میں پائیں کر رہی تھی جبکہ تیرور حے سے دھمن مٹکتا رہا تھا۔ یکے دیر بعد وہ لوگ روٹی کے گھر پہنچے۔ روٹی نے بڑے بڑے تپاک انداز واستقبال کیا تھا۔ ان کے شوہر اس وقت گھر نہیں تھے۔ تیرور کے انتظار پر انہوں نے بتایا کہ مرضی کال کی گئی ہے اور وہ ابھی گئے ہیں۔

بی اماں کو وہ کہاں ہیں؟ کشف نے ری ملک ملک کے بعد پوچھا۔
ا، جاتی ہوں تمہاری بے قراری۔ آؤ وہ چلے ہیں۔ روٹی مسکرائیں اور انہیں لے کر انکسی جلی گئیں۔

لی کارروازہ بکڑا ہوا تھا۔ روٹی نے دروازے پر دستک دی۔ ہم اندر آسکتے ہیں؟ انہوں نے ہانکتے ہوئے پوچھا۔ اجازت ملے گی وہ اندر آسکتے ہیں اور ان سب کو بھی اشارہ کیا۔ اندر نے پر پہلا بھکا جو تیرور کو لگا تھا وہ آنا شروع کیا کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو نہ

پ..... یہاں؟ بس یہ وہ لفظ تھے جو اس کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔

وہ گڑبگڑا کشف نے ٹوکا۔

لی..... سلام علیکم! وہ بڑبڑاکے بولا۔

ا، سلام! مخصوص انداز میں جواب دیا گیا۔ حمایت پارشاہ مصلیٰ تہہ کر رہے تھے۔ تیرور کو دیکھ کر ان پر مسکراہٹ پڑی۔ ایک گئی۔ اتنے حیران کیوں ہوئے خود را؟ وہ مسکرا کے پوچھنے لگے۔

لی..... میں آپ کو یہاں لندن میں ایکسپکٹ نہیں کر رہا تھا۔ وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ اب رکھئے۔ انہوں نے خواتین سے کہا اور وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔ جبکہ تین خواتین کمرے آرام دہ صوفوں پر بیٹھ گئی تھیں۔ تیرور سونے پر بیٹھنے لگا تو حمایت سرکار نے اسے اپنے پاس

یاں ہمارے پاس بیٹھو! تیرور ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

انہیں جانتے ہیں؟ کشف نے حیرت سے پوچھا۔

بندے تو خاص ہوتے ہیں! یہی خاص لوگوں کو کون بھول سکتا ہے؟ وہ معنی خیز حیرور کو دیکھتے ہوئے بولے۔

بی اماں ہیں..... میری ماں بھی ہیں۔ تیرور نے بی اماں کا تعارف کرایا۔

ب..... بی اماں نے ادب سے کہا۔ وہ پہلی بار انہیں دیکھ رہی تھیں۔ مگر انہیں دیکھ کر بی اماں احساس ہو رہا تھا۔ کشف غیر معمولی بین الا میں ہلک رہا تھا۔

لیکٹنٹ ہے آپ کی گواہیں جی! جس میں تیرور ملی خان پر دان چڑھا ہے۔ وہ اپنے

وہ کشف کو دیکھنے لگا۔ کشف بی اماں جیسے بھائی تھیں۔ اچھی باتوں اور اچھے عمل کی تلقین کرتی تھیں مگر میں ان پر عمل صرف اس لیے نہیں کرتا تھا کیونکہ مجھے اپنی ماں کو بڑے دینا ہوتا تھا۔ مجھے اپنے باپ کو شرمندہ کرنا ہوتا تھا۔ میں نے بڑے کام کیا جس سے میرے ماں باپ کو شرمندگی ہو اور میری اشیبہ دراز آجائے۔ شاید یہ میری ناشوری کو کشش تھی ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کی۔ لٹا دے..... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے..... بہتر نہیں تھی تہا کی طرف کے ہوتے تو یقیناً میں بھی تہا کی طرح ہوتا۔ شاید جگہ تم سے بھی اچھا۔ وہ مسکرایا۔ وہ بھی کسی ہی سکان تھی۔ لہذا چلے آؤ گئے..... درس دینے سے بیٹھ جائے۔ وہ اپنی پرانی جون میں واپس آ گیا تھا۔

کشف کچھ بولی نہیں۔ بس وہ کسی سوچ میں کھنکھی۔ ڈوریل بھی تو تیرور کا دروازہ کھولنے چاہ گیا۔ وہ بس اسے جانتا تھا کہ وہی تھی۔ دروازے پر روٹی اور ان کی جلی موجود تھی۔ کشف مسکرائی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔

اس دن اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔ کتنے دنوں بعد یہ سب کرتے ہوئے اسے پوری محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ اور بھانوں کی آمد سے اس ٹیٹ کے خاموش دروازہ پر کچھ دیر کے لیے بیٹھنے پڑے ہوئے لگے تھے۔

بہت اچھے داخل میں کھانا کھانے کے بعد وہ تین عورتیں تھیں جو روٹی کا بی بی تھیں جس تب اس نے ان سے پوچھا۔

آپ نے جن بھان کا ذکر کیا تھا، ان کی آمد تو کس قدر ہے؟

پاکل..... بلکہ ایک اچھی بات یہ ہے کہ وہ روز بعد آ رہے ہیں۔ وہ بولیں۔

میں تیرور کو ان سے ملوانا چاہتی ہوں۔

تو ہمارے گھر لے آؤ۔ وہ تو خود کبھی بھی نہیں جاتے۔ یہاں بھی نہیں آ رہے تھے۔ معلوم ہے، میں پانچ برس سالوں سے لگا رہی نہیں یہاں آنے کی دعوت دے رہی ہوں مگر وہ راضی نہیں ہو رہے تھے۔ مگر اس بار جب میں پاکستان گئی تھی تب میں نے دھور کرائیں آنے کے لئے راضی کر لیا۔ نہ صرف راضی بلکہ وعدہ لے لیا تھا۔ اور اب دیکھو وہ آ رہے ہیں۔ روٹی نے تفصیل سے جواب دیا۔ مگر وہ لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں کھنکھیں۔

کافی پینے کے بعد وہ لوگ چلے گئے تھے۔ کشف نے محسوس کیا تھا کہ تیرور کو ان کی آمد اچھی لگی ہے۔



آخر ایسے کون سے مہمان ہیں ان کے جن سے ملوانے کے لئے تم اتنی بے چین ہو؟ وہ کوئی بچی مرتبہ پوچھ رہا تھا۔

جب ملو گے تب جان جاؤ گے۔ اس نے چچی مرتبہ یہی جملہ ہرایا۔

تم..... بس..... تیرور نے اسے گھورا۔

خصوصاً اندر میں بولے۔

”بس جی، اللہ نے میرے جینے کا مقصد ہی شاید اسی میں رکھ چھوڑا ہے کہ میں تیرو کی جاؤں۔“ لی اماں کے لہجے میں عداوت تھی، مبتلا تھی، مازنی تھی۔

”سبحان اللہ! جی تو ہے۔ ہر ایک کی زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے۔ بس ضرورت مرا کو کونج کر سامنے لانے کی ہوتی ہے۔ جو لوگ بلا ضرورت، بلا مقصد زندگی کے دائرے میں ہیں، ان کا ہار وہی وارزہ بن جاتا ہے۔ بس گول گول کھو جاتا۔ ڈو بھی اپنے جینے کے دھوپڑ مقصد سامنے ہے، بس نظر میں گہرائی پیدا کر۔ جس روز مقصد پر نظر پڑے گی اسی روز۔ من کو قرار آ جائے گا۔ خود پر ہر جھٹکا بند کر دے گا۔ تیرے اندر کی بے چینی کو قرار آ جا دھوپڑ۔ اپنا مقصد حیات دھوپڑ۔ کہاں جھک رہا ہے اب بھول جلیوں میں؟“ ”وہ تو ہے اور تیری نگاہ نہیں پڑی۔“ وہ بات کرتے کرتے بھر تیرے سے مخاطب ہوئے۔

”میری نظر کیوں نہیں پڑتی اس در پر؟“ کیوں مجھے نظر نہیں آتی وہ راہ؟“ وہ جیسے گیا تھا۔

”آئے گی نظر۔“ مل جائے گا وہ دروازہ جو تیری اصل منزل کی طرف داہتا ہے۔ ہر نگاہ میں وسعت پیدا کر۔ نگاہ کی وسعت اور روشنی بڑھے گی تو سارے اندھیرے سے چھٹ جائے گا۔ خود کو اندھیرے سے نکالنے کی کوشش شروع کر دے۔ بے لڑی تیرا ساتھ دے گی۔“ انہوں نے کشف کی طرف اشارہ کیا۔ تیرو سمیت کبھی نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔

”اس کا ہاتھ قدام لے۔“ یہ تجھے اس دروازے تک لے جائے میں دھکار ثابت ہو گا کہہ رہے تھے۔

تیرو نے ابھی ابھی نظروں سے کشف کو دیکھا۔ کشف بھی کچھ ایسی ہی نظروں سے ا رہی تھی۔ جبکہ لی اماں کی آنکھوں میں سوچ کے آثار بہت واضح نظر آ رہے تھے۔



آج وہ پھر بے چین تھا۔ اتنا بے چین کہ شاید پوری زندگی میں اتنا بے چین کبھی اس کا پڑھنے میں دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے کتابیں بے دلی سے بند کر کے ایک طرا اور رگیزی میں آگیا۔ پورے عالم کو رات کے سیاہ اندھروں نے اپنی آغوش میں چھپا رکھا۔ اس کے سارے تھکنے رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی کسا پارٹنٹ میں روشنی جھنکی طرح ٹھنڈی تھی سے ہرف کے نرم لٹام گالے موتیوں کی طرح برس رہے تھے۔ آج وہ ابھی خاموش تیر کی سردی میں بے حد افسانہ ہو گیا تھا۔ تیرو نے اپنی جھلی کھولی اور پھر بلا کے ہرف کو اپنی جھلی کیا۔ سردی اتنی تھی کہ گھون میں اس کی جھلی ہرف سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے جھرجھری کی اور اپنے ہاتھ بھل میں دیا کہ گرم کر لے گا۔ اس نے کچھ دیر ہاں مزہ کھا۔

الہائی شہ پہنچی تھی کہ وہ باہر جو گرم کپڑوں کے جھنڈ ہوا جا رہا تھا۔ وہ اہاں اندر آ گیا۔ کمرے میں آ کر اس نے شراب کی بوتل سے دھنسن بنایا اور گلاس میں ڈال کر بوتل تک لے گیا مگر اس کے کانوں ایت ہادشاہ کی آواز کو غصے لگی۔ اس کا ہاتھ جسے کسی غیر میری قوت نے پکڑ لیا۔ شراب سے اسے اہستہ اہستہ ہونے لگی تھی۔ اس نے بیزار اور بے بس ہو کر گلاس اہاں میز پر رکھا اور بیڈ پر جا کر سما گیا۔

”اب لے گا مجھے وہ دروازہ؟“ کشف..... کشف کی طرف کیوں اشارہ کیا تھا انہوں..... وہ کیا دھڑ کرے گی میری؟ ہر وقت تو جلی کی رات ہے۔ نہیں، میری دھڑکی نہیں کر..... کوئی نہیں۔“ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا دماغ پسینے لگ رہا تھا۔ اس نے بستر چھوڑا اور باسو پے کچھے اہالی اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”بٹن میں ابھی خاموشا تھا۔“ وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بے مقصدی میں کسک پ بعد بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سٹکنا ہوا سرگٹن دیا ہوا تھا۔ آنکھیں غون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر رات ہی بے چینی چھائی ہوئی تھی کہ اس وقت کوئی اسے اس میں دیکھ لیتا تو اسے عادی نظر نہ پڑتا۔ چاہے مطلب بے شرم سے چٹائی سے اپنی ”مطلبہ“ اٹھ رہا ہو.....!

”نکالے کے اُجالے کے ساتھ وہ اندر داخل ہوا تھا۔ لی اماں اس وقت اپنے کمرے میں قرآن کی حد کر رہی تھیں۔ ان کے حجابات کر کے لی آواز واضح لاؤنج تک آ رہی تھی۔ کشف اپنے لئے دور لی اماں کے لئے نشست بن رہی تھی۔ اسے اسے دیکھ کر وہ چونکی مگر نہ سے کچھ نہ بولی۔ تیرو کو وہ اس حالت میں دیکھ چکی تھی کہ میری اس نے سوال نہ کیا تھا۔ آج بھی کوئی سوال کئے بنا باپ نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کام میں مگن ہو گئی تھی۔ تیرو نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنے کی طرف بڑھ گیا۔ عداوت کی پڑاؤ آواز اس کی ساتوں سے گزر رہی تھی۔ لی اماں سورۃ البقرہ ۱۱۱ ک کر رہی تھیں۔ تیرو کو میری زبان کا ایک لفظ نہ پڑ رہا تھا۔ مگر اس آواز کا ہر لفظ اسے اہ بے چین کر رہا تھا۔

لی اماں سے کچھ آہستہ پڑھیں۔“ وہ تقریباً چائے کر کشف سے مخاطب ہوا تھا۔ کشف نے ایک کی نظر اس پر ڈالی مگر خاموش رہی۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور بہت دور سے دروازہ بند اٹھا۔



خاموشی دیر سے پڑھنے پڑھنے اب تھک گئی تھی۔ اس نے اپنی جھلی کھولی آنکھوں پر اپنی ہار میں اور سر کو آرام سے کر کے کی پٹ سے نکلا دیا۔ اس طرح اسے خامساکو ملا تھا۔ امتحان دہ رہے تھے۔ اس نے بہت زیادہ محنت کی تھی۔ مگر جس پونڈریش میں وہ پڑھتی تھی وہاں دنیا کے نالامع باغ تھے اور اسے ان کے درمیان اپنی پوزیشن بنانی تھی۔ اس سسٹر کے بعد اس کا ایک

ہاتھوں سے کھائی تھیں۔ وہ کچھ کچھ ہوش میں تھی اور کچھ بے ہوش تھی۔ مگر اسے کچھ کچھ محسوس تھا۔ تیمور کے ہاتھوں کا دوستانہ لمس، لی اسے ان کے ہاتھوں کا شیفٹ لمس۔ پھر شاید وہ اس کا اثر ہی وہ پوری طرح ہوش وہ اس سے بچا نہ ہوئی تھی۔

دو روز وہ بخاری کی حالت میں رہی۔ تیسرے روز اس کا بخار اتر گیا تھا مگر کمزوری اور تھابت تھی۔ ان دو دنوں میں اس نے تیمور کا ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ ایک ہمدرد اور خیال کرنے والا دوست کا روپ۔ اس نے دن رات اس کے سر ہانے بیٹھ کر گزارے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے اس وقت یہ دو اینٹیاں دی تھیں۔ اسے سوپ پلایا تھا۔

تیسرے روز جب کشف ہسٹری سے اٹھی تب اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔
"اچھا طریقہ ہے خدمت کرانے کا۔" وہ بالکل افسانے کا چمکا افسانہ ہے جو بے کھر ہوا تھا۔
"تم نے میری بہت کیرکری کی ہے تیمور!..... شکس اکٹین۔ تم واقعی ایک ایسے انسان! وہ بولی۔

"نہا یہ بزرگ مہر مت کرو۔ چلو یہ ختم کرو۔" تیمور نے لا پرواہی سے اسے چماتے ہوئے "اور سنو، میں تو بخیر روشی جا رہا ہوں۔ کچھ کام ہے تم ہسٹری سے مت الٹنا۔ ابھی دیکھیں بہت کہیں گمراہ کر گئیں تو میرا نقصان ہو جائے گا۔" تیمور نے اسے چاہت کی۔
"تمہارا نقصان کس حساب سے ہوگا؟ چوتھ تو مجھے لگے گی۔" وہ مسکرائی۔ تیمور نے اسے ایک نظر دیکھا۔

"حساب کتاب کسی اور دن بتاؤں گا۔ فی الحال جو کہا ہے وہ کرنا۔" وہ ٹال گیا تھا۔ یا کشف محسوس ہوا تھا۔

"مگر مجھے آج اپنی جاب پر جانا ہے۔ پہلے ہی دو چٹیاں ہو چکی ہیں۔ اسٹور کی مالکہ بہت کڑی ہے۔ اگر آج بھی چھٹی کر لی تو نکال دیا جائے گی۔" اس نے بھید کی سی کہا۔
"تمہارا دماغ خراب ہے۔ شکل دیکھو اپنی۔ مجھے پھر سے پتہ چلی ہو۔ ابھی تو تین روز مزہ عمل کر رہی ہو۔ تیمور نے اسے ڈانٹ دیا۔
"پھر تو فوری پر ناغہ ہی چھٹی پر جانے لگی۔"

"تو بڑا چالو۔"
"مجھے کسی کو کشش کرو تیمور! میں یہ اب فوراً ڈھین کر سکتی۔ مجھے آج جانا ہی ہوگا۔"
"میں تمہارے اسٹور کی مالکہ سے بات کر لوں گا اور اس سے مزے تین روز کی چٹیاں بھی لوں گا۔ تم غلط مت کرو۔" اس نے قلمی دی۔

"مگر میری ہنر مند مہر کی تھوڑا کٹ جائے گی۔" کشف غمر مند سی ہوئی۔
"تمہیں کئے گی۔" کہا نہ کچھ پر چھوڑ دوں۔ "وہ اطمینان سے بولا۔ کشف نے مزہ بہت کھا رہی تھی کہ وہ کتنا خفیہ ہے اور جو کہتا ہے وہ دکر کے بھی رہتا ہے۔ اس کی حالت ابھی

ہاں کئی تھی کہ وہ تو کڑی پر جاکتی۔ سو وہ ان دو تین دنوں میں عمل آرام کر کے پھر سے پانچ و لہ ہونا چاہتی تھی۔

جیوری وہاں شام کو ہوئی تھی۔ اس نے اسے قلمی دے دی تھی کہ وہ اسٹور کی مالکہ سے بات کر اس کی پیاری کے متعلق بتا دے گا۔ وہ اس پر تین روز کی چھٹی بھی لے چکا ہے۔ وہ مطمئن ہو گئی اور پلٹ کر "آئندہ" کا سوچنے لگی۔



لی ماں کا دیر آخرم ہونے میں دو روز باقی رہ گئے تھے۔ اب وہ واپس جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ کشف ان کی پیٹنگ میں ان کی مدد کر رہی تھی۔
"آپ بہت یاد آئیں گی۔ کتنا اچھا ہوتا کہ کچھ روز مزہ یہاں رک جائیں۔" وہ ان سے کہہ چکی۔

"مجھے بھی تمہاری بہت یاد آئے گی۔ ان چند دنوں میں تو تم نے مجھے نیکی کی کی محسوس ہی نہیں نے دی۔" وہ محبت سے کہہ رہی تھیں۔ "میرے جانے کے بعد تیمور کا خیال رکھنا۔ میں نے اس میں سی تبدیلیاں دیکھی ہیں بیٹی! وہ کہتے کہتے ذرا سارکس۔ کشف خاموشی سے ان کے کپڑوں کو تیرے تھم لگاتی رہی۔ "وہ برا نہیں ہے۔ بس آکھیا ہے۔ تم اس کی تھالی بانٹ لو، وہ دھڑکا جائے گا۔ ابیتیں ہے یہ۔" کشف کے کپڑوں کو تھم لگاتے ہوئے ہاتھ رک سے گئے۔

"اس کی زندگی میں بہت عمر بچاں ہیں..... بہت دھکی ہے وہ۔ محبت کا بھوکا ہے۔ کشف! نے مجھے اپنا کیوں لگنا ہے کہ اگر اس دنیا میں کوئی اسے سوار سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔ بیٹی! وہ بچہ آپ کو ضائع کر رہا ہے۔ تم اسے سمیٹ لو۔" لی ماں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے گویا منت کی۔

کشف کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔ بس خاموش بیٹھی ان کی بوڑھی آس بھری لہو کو دیکھتی رہی۔

"مجھ سے دھڑک کر دو کہ تیمور کو کیا نہیں چھوڑ دو گی۔" وہ بے حد بے امید نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کشف کچھ کچھ میں جھٹکا ہو گئی تھی۔ اسے کوئی بھی جواب دینے میں وقت پیش آ رہی تھی۔ وہ لڑنے کی بجائے کسی کو اپنی کیا جواب دے۔
"ہلو! بیٹی! وہ جتنے نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جی....." اس کا دل دیکھ کر اس وقت اس نے اتنا ہی کہا تھا۔
"یقینی رہو بیٹی! میرا مان کر لیا ہے تم نے۔" وہ جیسے مکمل آگیا۔ انہوں نے فرما سرت و محبت سے اسے سنے سے لگا لیا تھا۔ "مجھے یقین ہے تیمور کو راست پر لانے والی تم ہی ہو گی۔" وہ اسے خود اگ لگ کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ بس خاموش تھی۔

اسی وقت تیمور اُتر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سفید لٹاف تھا۔ کشف نے اسے دیکھا۔ وہ اس کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ کشف نے رخ موڑا اور اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

”آپ کی پرسوں کی تلاشف کتلم ہو گئی ہے۔ بہت خوش ہیں نا؟“ وہ ان کے پہلو میں ہوئے کھڑا تھا۔ اعجاز میں بچوں جیسا ناراضگی کا اثر واضح تھا۔

”ٹوٹے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ پاکستان چلے گا۔“ انہوں نے اس کے گلے مارا۔
”اگلیاں چائیں۔“

”آؤں گا مٹھے لیتے۔ اس بیٹے کو کمزوری کام نہ نانا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کشف ابلی رہے گی یہاں؟“ بی امی نے پوچھا۔

”سو واٹ؟ یہاں عورتوں کی اکثریت اسکی عی رافتی ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”میں فرنگیوں کی بات نہیں کر رہی۔“ وہ منہ ہٹا کے بولیں۔

”اگلیاں پن کسائی امی! سارا دن تو مصروفیات میں باہر ہی کتنا ہے۔ بس سونے کے! گھر آنا پتا ہے۔“ وہ بولی۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی یہ بہت بہادر ہیں۔ کسی سے نہیں ڈرتیں۔“ وہ معنی خیز اور مسکرایا۔ تیرور کا اشارہ سمجھ کر وہ اسے ٹھوڑے لگی۔

”تہہاری بھی تو پٹھانیاں ہیں نا۔ تم بھی چلی چلو۔“ انہوں نے مشورہ دیا کشف بس نا۔ مسکرا دی۔

”نہیں بی امی! میں نہیں جاسکتی۔“ وہ اپنی ادا ہی چمپاتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی تمام دلی ہے۔ بس اب جو چند چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی ہیں وہ کل رات کو بیک کر لیں گے۔“ اور

بیک کی ٹپ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کھانا لگاتی ہوں۔ آپ آجائے۔“ وہ باہر نکل گئی۔

”بہت اچھی لگی ہے۔ بہت سلیبی ہوئی ہے۔“ بی امی نے اس کے بعد تیرور۔ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔ آپ بہت پیار جتا رہی ہوتی ہیں ان محترمہ سے۔ مجھے ملن ہوتی ہے۔“ اعجاز میں بولا۔

”پگل! تیرا بچپنا نہیں جانے گا۔“ وہ مسکرائیں۔ ”میں نے تو اس سے کہہ دیا ہے کہ تیرا نا کرے میرے جانے کے بعد۔ اور تو بھی اس کا خیال رکھا کر۔ مجھے تو یہ بچی بہت پسند ہے۔“

رعی نہیں۔ تیرور آنکھیں موندے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”تیرور! تمہیں کبھی لگتی ہے کشف؟“ وہ لا چور رعی نہیں۔

”اچھی۔“ وہ تیرور آنکھیں بند کئے بولا۔

”صرف اچھی؟“

”بہت اچھی۔“ وہ مسکرایا اور آنکھیں کھول دیں۔ ”مگر آپ کچھ ایسا دیر مت سوچنا۔ شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ نہ ہی وہ میرے بارے میں ایسا سوچتی ہے۔ وہ بہت اگا۔“

”نا۔“ تیرور کھڑا تھا۔ بی امی کچھ نہیں بولیں۔ مگر ان کی آنکھوں میں سوچ تیر رعی تھی۔

”کھانا لگا دیا ہے۔ آپ لوگ آجائیں۔“ اسی لمبی کشف نے اطلاع دی۔ بی امی باہر نکل گئیں۔ اور رعی لپٹا کچھ سوچنا رہا۔

”کھا ہوا؟۔۔۔۔۔۔ کھانا نہیں کھا؟“ کشف پٹٹی۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔ بھوک نہیں ہے۔ بعد میں کھاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”کو کے۔“ وہ کندھے اچکا کر چلی گئی۔ مگر تیرور کی آنکھوں میں اس کا عکس رو گیا تھا۔



دکھائے۔

"میں سوچ رہا تھا کہ کتنی اڑکیاں ہو۔ خوب صورت ہو۔ بہت زیادہ حسین نہیں ہو مگر ہر بھی خوب ہو اور تمہاری خوب صورتی میں کچھ تو عجیب بات ہے جو مجھے آج تک کسی لڑکی میں نظر نہیں آئی۔ وہ صاف کوئی سے بولا۔ کشف اس کی بات سن کر بھی اطمینان سے بیٹھی رہی۔ نہ اس کی تائید کر دی نہ ہی تنقید میں۔ نہ ہمارا تنگی کا ہر کی نہ ہی خوشی۔ بس سناٹ سا چہرہ لہے ہوئے تھی۔

"تم کسی لڑکی ہو؟ اپنی تعریف سن کر بھی خوش نہیں ہوئی۔" تیمور نے منہ ہٹا کر کہا۔

"میں چیز کا علم مجھے ہے اس پر کیا خوشی کا اظہار کرنا۔" وہ سرکائی۔

ای وقت دیگر لڑکی اور بیٹھ چڑے آیا۔ تیمور خاموشی سے اس کو دیکھ کر رہا۔

"تم کس قدر مفرور ہو کائنات؟" اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"کائنات..... کتنے دن بعد اپنا تھی نام سے کسی کے منہ سے۔" اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

"بیٹھو۔" تیمور نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"شعریہ۔ میں صرف کافی لوں گی۔" وہ بولی۔ "جب مجھے کوئی میری اپنی ذاتی پہچان سے شناخت ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ جانتے ہو تیمور میرا خواب تھا کہ میں اپنی الگ پہچان بناؤں۔ مجھے میرے نام، میری ذات کے حوالے سے پہچانیں اور میں کامیاب بھی ہوئی۔ میں اپنے ان کی پہلی لڑکی ہوں جس نے اتنی کامیابی پائی، اتنی شہرت پائی۔ اور یہاں لندن میں دنیا کی ان بے گندہ لڑکیوں سے تقسیم حاصل کر رہی ہوں۔ بلکہ ہمارے تو خاندان کے لڑکوں نے بھی اتنا مقام نہیں کیا۔ مجھے بے حد حسرت ہوتی ہے جب میں سوچتی ہوں کہ ہر نیا دن مجھے میری منزل سے ہٹا رہا ہے۔ زندگی جینے کا کچھ تو مقصد ہونا چاہئے۔ مجھے میرا مقصد ملا تو میں نے اس کے پاس لے لی تو ذمت شروع کر دی۔ اب میری منزل اور دھنیں ہے۔ بس کچھ دن اور..... اس حد تک، کشف عارضین عادل کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔" وہ کسی دوست کی طرح ہی اس سے لڑی تھی اور تیمور کو اس کا یہ انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"کیا کرنا چاہتی ہو تم؟..... چاہ کر گئی؟ روپیہ کماؤ گی؟ سیکھ تو ہونا ہے ہر آدمی کا سنا۔" تیمور اچھا۔

"میرا مقصد صرف پیسہ کمانا نہیں ہے۔ پیسہ تو کوئی بھی آدمی کما سکتا ہے۔ تم بھی تو بلاؤنگ کر کے آ رہے تھے۔" وہ سادہ سے لہجے میں بے سارناہ اسے فوک لگی۔ تیمور نے اسے دیکھا اور پھر کافی کا گلاس لے کر نکلا۔

"مجھے پیسے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میری ضرورت پورے نہیں ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"تو پھر کیا شہرت پانے کے لئے؟" کشف نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے اس کی بھی ضرورت ہے نہ خواہش۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر؟" کشف اب سب کچھ جبب ہوئی۔

"تم اگر پاکستان چاہا تو میں تمہارا انتظام کروا سکتا ہوں۔" تیمور اس سے کہہ رہا تھا۔ دونوں کی اماں کو بھی ابھی ایئر پورٹ چھوڑ کے کار میں بیٹھے تھے۔

"شعریہ۔ میرا اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے انکار کر دیا۔

"ہم دونوں دوست ہیں۔ نہ تو پھر دوستی میں انکار کیوں؟" وہ تنک کر بولا۔

"ضرورت نہیں کہ دوست کی ہر بات مان لی جائے۔" وہ ہنوز اسی انداز میں بولی۔

"لیکن اس میں مضامین ہی کیا ہے؟" وہ بحث پر آمادہ تھا۔

"تیمور میں اگر تم سے پیسے لے کر پاکستان جانے آئے کا ربا یہ دوں گی تو اس سے میری کیا خود داری کو نہیں پہنچے گی۔ میں اس بات کو سخت نا پسند کرتی ہوں۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں؟" وہ بولی۔

"میرے پارا تم بھی تائیں۔" تیمور نے بے حرجی سے اسے دیکھا۔ "کو کے محریرے ساتھ آپ کپ کافی پیسے سے تو تمہاری اماں اور خود داری کو نہیں نہیں پہنچے گی؟" وہ ایک کافی شاپ کے کنارے کار روکے ہوئے بولا۔

"تم اتنی کافی کیوں پیتے ہو؟ دل اچاٹ نہیں ہو جاتا تمہارا ایک ہی ڈانٹ سے؟" وہ بولی۔

"کبھی کبھی ایک ہی ڈانٹ کی عادت پڑ جاتی ہے۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے سختی خیر انداز بولا۔ کشف نے اس کا انداز نوٹ نہیں کیا تھا۔

دونوں کار سے اترے اور اونچاں اونچاں میں رکھی کرسیوں کی طرف بڑھ گئے۔ سردی کی شدت کی تھی۔ شہری سی دھوپ پہنچی ہوئی تھی۔ کشف کرسی پر بیٹھ کر اطراف کا جائزہ لیتے گئی۔ جبکہ تیمور کو کافی کا آڈر دینے لگا تھا۔ آڈر دینے کے بعد وہ سیدھا ہو کے پیٹھا کو کشف کو کسی سوچنا دیکھا۔ وہ بونٹی اسے دیکھنے لگا۔ سیاہ اسکارف سے سر کو چھپانے سے وہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی گئی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں سوچ کا عکس واضح تھا۔ گائیٹا نرم لپوں پر بیٹھنے کی کی نموشہ تھی۔ دھوپ کی تازت سے اس کے گالوں کے گال کسرتی میں بدل رہا تھا۔ اس وقت اس نے نیلے رنگ لپاس پہن کر کھانا اور اس رنگ میں اس کا سنہری رنگ دک رہا تھا۔ وہ بیہوش سا اسے دیکھ کر کیا کی لگا ہوئی کی گری اتنی تھی کہ وہ یکدم پتھر کی سی ہو گئی۔ اس نے گردن کھما کر تیمور کی جانب دیکھا اس کی خوبیت پر کچھ بڑھ ہوئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے تیمور کی آنکھوں کے سامنے جنگلی بھائی۔

"آں..... کچھ نہیں۔" وہ چونک گیا۔

"کچھ تو سوچ رہے ہو گے تم۔" تیمور نے اسے اسرار کیا۔

"تم ناراض ہو جاؤ گی اگر میں سچ بولوں گا تو۔" تیمور نے سن گاڑ کر جبب سے نکال کر خواہی اس کے شہسے صاف کرنے شروع کر دیے۔

"پھر مجھ میں سنا ضرور ہوا ہو گی۔" وہ بعد تھی۔ تیمور نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”بس یوںی..... جنت فارہیج..... جنت فارہیج..... تجھ کو کدے کدے اہ.....
 سے اچکائے..... کیا بھر..... اپنے پاؤں کو تیز کرنے کے لئے.....“ وہ بولنے کے سے اعزاز میں
 کلف چمک کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”تجھو! اس نے بس اسے صرف دیکھا تھا۔

”فارہیج اٹ..... تم اپنے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ اس نے ہا
 ہوئے پوچھا۔

”میں سندھ کے فروہ اور بے بس افراد کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہو اہ.....
 سندھ کے بے شمار چھوٹے چھوٹے گاؤں اور دیہات میں لوگ فارہیج سے بدتر زندگی گزار
 ہیں۔ چنے کے لئے انہیں پانی تک ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ کئی کئی وقت قانون کی نذر ہو جاتے ہیں
 ڈھانچے کے لئے چھوڑ دیے گئے گاؤں کا نام دے دیتے ہیں۔ جانتے ہو تجھ اور وہاں عورت کے نام
 سلوک ہوتا ہے؟“ وہ بے حد غصہ کی گھڑی سے کہہ رہی تھی۔ تجھ خاموشی سے اس کو کن رہا تھا۔

”سندھ کے ڈوبے ہوئے غریب گاؤں والوں کو کرنا جڑا تین کر ان پر راج کرتے ہیں
 ان کی عورتوں اور بیٹیوں کو مالی قیمت بھجور کر ”استیصال“ کرتے ہیں۔ سکولوں کا وہاں صرف نام ہے۔
 وہ بھی سرکاری کاغذوں میں۔ تم ان لوگوں کی غربت اور دکھوں کا اعزاز بھی نہیں لگا سکتے۔ یہ اہ.....
 ڈوبے ہوئے اپنی جائیداد کے ہزاروں کے خوف سے اپنی بیٹیوں اور بیٹیوں کا نکاح قرآن سے کرنا
 ہیں یا بھران بے چاروں کو “سستی“ بنا کے تمام غریب لادہ بیٹے پر بھجور دیتے ہیں۔ مظلومی کی اہ.....
 گھاسے جس کی شروعات تو ہوتی ہے مگر جس کا اختتام..... کسی کو کچھ نہیں کھیں کرب کہاں.....
 ہو؟..... بس میں ایسے ہی لوگوں کی مدد کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ یہی میرا مقصد حیات
 یہی میرا ایم ہے۔“ وہ کہتے کہتے رکی۔

”تجھیں لگتا ہے کہ کام بے حد مشکل ہے؟“ تجھ نے سوچتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں نہیں نا بس اسی مشکل کام میں سے راستے نکال کر اسے آسانی اور کمزورتیاں کے اہ.....
 پر لے جاتا ہے اور میں ایسا ضرور کروں گی انشاء اللہ۔“ وہ بے حرام تھی۔

تجھ نے اس دھان پانی کی لڑکی کو دیکھا جو بے حد اعتماد اور یقین تھی۔
 ”میری زندگی میں آج تک تم جیسی لڑکی کا گز نہیں ہوا۔“ وہ بے ساختہ ایک بار بھرا ہوا
 بیٹھا تھا۔ ”تجھیں مشکلات سے کیٹنا پسند ہے؟“

”آسان زندگی کو کون پسند کرتا ہے؟ مگر زندگی جینے کا مزہ تو تب ہی آتا ہے جب مٹا۔
 مقابلہ کیا جائے۔“ تجھیں اچھا نہیں لگتا؟“ وہ مسکرائی۔

”نہیں..... یہی مشکل میں گھرا رہی نہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔
 ”تجھی مشکلات کو اپنا کرتو دیکھو۔ طبیعت کی ساری بے زاری اور غم جو ہا جانے گی۔ سب لہو
 جیتے جیتے تم پر ہو گئے۔ چھوڑ دو اس زندگی کو اور اپنا لکھو۔ کو..... یقین کرو بہت کچھ “پا“ جا.....

”بس جو تجھیں تہداری سیدی سادی زندگی میں نہیں مل سکا۔“ وہ سنی نیر انداز میں بولی۔
 ”میری زندگی بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ دور کے دھول سہانے۔“ وہ مسکراتا کہ بولا۔
 ”تم میرے جیسے لوگوں کی زندگی جی کے بتا دو، میں مان جاؤں گی۔“ وہ سنی نیر انداز میں بولی۔
 ”اٹ ڈوبو میں؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”اٹ بے کہ تہداری زندگی جینا بہت آسان ہے۔ مگر جو زندگی میں جی رہی ہوں وہ جینا آسان
 کیا تم میری زندگی جی کے بتا سکتے ہو؟“ کشف نے عجیب سی ٹھنڈی سے اسے دیکھا۔
 ”اٹے ناٹ..... بالکل..... اس میں کیا مشکل ہے؟“ وہ غریبان کے ساتھ بولا۔

”اٹ..... اپنی بات سے ٹکر تو نہیں جاؤ گے؟“ وہ بولی۔
 ”نہ نہیں۔ تم نے مجھے پہچان لیا ہے اور میں نے پہچان لیا ہے کیا ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔
 ”ٹھیک ہے۔ جب ہم پاکستان جا سکیں گے اور اپنی اپنی عملی زندگی کا آغاز کریں گے تب تم کو
 دیکھ کر جینا پڑے گا۔ تب تک تم میرے کرلو۔“ وہ مسکرائی۔
 ”جی اس وقت کا شدت سے انتظار رہے گا۔“ وہ بھی مسکرایا۔ کشف نے کافی کا آخری گھونٹ
 خالی کپ میز پر رکھا۔ وہ کسی سوچ میں گئی۔ تجھ نے بل ادا کیا تو وہ بھی کھڑی ہو گئی۔



اور مہینوں میں پاکستان جا چکا تھا۔ انہی مہینوں میں اس نے ایک میوزیکل ایلیم بھی نکال لی تھی
 ماسی مشہور ہوئی تھی۔ لوگوں کے لئے دو کوئی ”پاپیرو“ نہیں تھا۔ میڈیا میں اس کا خاصا جہ چا تھا
 پھر گلوکار بھی اس کی داد دہا ہو رہی تھی۔ انہی دنوں تجھ نے رفیق خان کے بارے میں یہ
 وہ صرف سیاست میں حصہ لے رہے ہیں بلکہ انتخابات میں ان کی فواید کا یابی کا چرچ بھی
 لہا۔

”اپا اڑے جیس..... سنی پلس اتھاری اڈ اڈیکوٹیل نپاور۔“ پاپا کا فارمولا خاصا زوردار ہے۔“ وہ
 غصے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔
 ”ان کل صرف جیسر سب کچھ نہیں ہوتا میری جان! پاور ایڈ اتھاری پلس ہو تب بات جتی
 ہو۔“ نے سنا لی کا ساتھ دیا۔

”اپہ بھائی نے دوسری شادی کی سب کی؟“ وہ اس کی بات ان کی کرتے ہوئے یکدم ہی پوچھنے لگا۔
 ”اڑا وہ دن نہیں ہوئے۔“ حیدر نے اچھلی سے جواب دیا۔

”ہی جی تہداری جی بھائی؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
 ”ہی جی۔۔۔ میری دور کی کزن بھی نہیں ہیں۔ مگر تو بھائی جی نہیں ہیں۔“ وہ اندر سے بولا۔
 ”اس جی تو بھی تو بھی نہیں ہو سکتی۔ عجیب وغریب۔ جو بے ڈھائی انہوں نے کی ہے اس لحاظ سے تو
 لی نہیں۔“ وہ مل کے بولا۔ حیدر خاموش رہا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ”حیدر! مجھے ان
 آپ۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے فوراً ہی ایک فرمائش کر دی۔

”مگر وہ گاؤں میں ہوتی ہیں۔“ حیدر نے اسے دیکھا۔

”سو داتا؟“ ہم پھٹیں گے۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”سب فیملی ممبر نے ان کا پانچواں کیا ہوا ہے۔“ حیدر نے کوٹیا دودھانی کر لی۔

”مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم بتاؤ تم چلو گے؟“ وہ اپنے مخصوص اعزاز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ مگر کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے ورنہ ڈیلی سے مجھے بہت سختی پڑیں گی۔ اور شاہد ام بھی۔“ حیدر نے وارن کیا۔

”اوکے اوکے۔۔۔۔۔۔ جان کیوں جاری ہے تمہاری؟ نہیں بتاؤں گا۔“ اس نے فوراً سر ہٹا دیا۔

”تو پھر سنو۔۔۔۔۔۔ کوئیں گے۔۔۔۔۔۔ سب سات بجے تیار رہنا۔ جس جہیں تمہارے گھر سے پک کر ان کا حیدر نے پروگرام ڈن کر لیا۔

”اوکے۔“ وہ راضی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کا عکس واضح تھا۔



نہیں کچھ اور خواہش آپ کے در پر میں لایا ہوں

منا دیجئے منا دیجئے، یہاں مننے کو آیا ہوں

محابت پر شاہد درس دے رہے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح وہی ایک کونہ پکڑے بیٹھی تھی۔ اس کا ان کی آواز سن رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ان کے چاک چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔

وقت اتنی بے خبر تھی، اتنی خاموشی کہ اگر کوئی اسے دونوں شاموں سے چلا کر سمجھوڑتا تب بھی وہ بے عی رہتی۔

حسب معمول درس کا اختتام ہوا۔ سب غور تھیں چلی گئیں۔ پر کراہہ خالی ہو گیا اور وہ اپنی بیٹھی رہی۔ اس کی دیوانی سے سب عی واقف تھے لہذا کوئی اس پر توجہ نہ دے رہا تھا۔ محابت اپنی بھی اٹھ کر جانے لگے تھے وہ بے قرار سی نظروں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ کمرے باہر نکل گئے تو وہ بھی میکانیکی انداز میں ان کے پیچھے باہر نکل آئی۔ ان کا رخ صبر کی جانب نو

وہ صرف ان کو ہی اپنی نگاہوں میں محصور کئے ہوئے تھی۔ مگر صبر کھنک وہ ان کے پیچھے پیچھے ہوں رہی ہو گئی کوئی چٹا تار نہ کیا ہو انسان ہوتا ہے۔ ہر سمت سے بے نیاز، ہر کسی سے لاپرواہ۔

میں صبر سے داخل ہونے تک اس نے ان کو دیکھا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئے تب،

جسکا کہ اپنی کھڑکی کی سمت چلی آئی۔ دھیان میں تھی وہی تھے۔ نھر کے سامنے نہ ہوتے ہو۔

بصارت کے پردے پر انہی کا چہرہ عیاں تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلی جا رہی تھی۔

”بھائی!“ حیدر کی آواز پر بھی اس کا دھیان نہ ٹٹا تھا۔

”نور بھائی!“ حیدر اس کے سامنے آگیا۔

”آ۔۔۔۔۔۔ کون؟“ حیدر۔“ وہ چونکی۔ جیسے گھر کے خیال کے سمجھوڑ سے نکل آئی تھی

یہاں۔“ وہ بس کہہ رہی تھی۔ حیران نہیں تھی۔

”میں آپ کو کب سے آواز دے رہا ہوں۔ کن خیالوں میں کھنک ہوئی تھی؟“ اس نے اس کو ہراپے پر حیران اور حریفانہ نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”خیالوں میں نہیں کھنک تھی۔ جب دھیان میں کوئی بسا ہوا ہو تو پھر کوئی اور خیال جگہ عی کہاں پا

تا ہے؟“ وہ دھیسے سے لہجے میں بولی۔

”بھائی! حیدر آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“ حیدر اس کی بات کا مفہم سمجھتے ہوئے بھی ان خبرا ہو گیا تھا۔

”تجور!۔۔۔۔۔۔ کیسے ہو؟“ وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ٹھیک ہوں۔“ آپ مگر کچھ ٹھیک ٹھیک لگ رہی ہیں۔“ حیدر نے اس کو دیکھ کر کہا۔ بے حد

نولی سے لباس میں سر سے ہر ایک خود کو پرانی سی چادر میں چھپائے ہوئے ہے یا نور تو کوئی اور عی

رہی تھی۔

”میں اب بالکل ٹھیک ہو چکی ہوں۔“ ماہور نے سنی خیر لہجے میں کہا۔ ”چلو، میرے گھر چلو۔ ہم

تم سے کمرے ہیں۔“ ماہور نے کہا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس کے مکان کے

اٹارے تک پہنچے۔ دروازہ دروازہ سے دروازے کے دونوں پتہ ڈاکے اور اندر آ

لی۔ ان دونوں نے بھی تھکدیں میں ایسا ہی کیا۔

”آپ یہاں رہتی ہیں بھائی؟“ حیدر نے اطراف کی طرف دیکھا اور پھر غصے سے پوچھا۔

”یہ میرا گھر ہے۔“ بیجو۔“ ماہور نے سادہ سے لہجے میں کہا اور اس انگوٹے کمرے میں آگئی جہاں

کا آغوشا بیٹھا، سونا چاٹا ہوا تھا۔ جکی مٹی کی سونڈی سونڈی خوشبو سے مکان ہلک رہا تھا۔ کمرے

کا کھڑکی پر بھی درہی پر دونوں بیٹھ گئے۔

”آپ یہاں کس طرح رہ رہی ہیں؟۔۔۔۔۔۔ آئی مین۔ یہ جگہ کبھی بھی انسان کے رہنے کے قابل

ہی ہے؟“ حیدر مزید پوچھنے لگا۔

”مگر چھاننے کا فائدہ بھی تو ایک نعمت ہے۔ مجھے تو محبت اور چھار دیواری کا تحفظ حاصل ہے،

تو فٹ پاؤں پر بھی رہ رہے ہیں تجور! میں تو ان سے بہت اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔“ وہ

اپنی حیدر نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ کیا یہ وہی ماہور تھی جس نے فرائض کر کے اسلام

میں اپنی پسند و مرضی کے مطابق حقیر حقیر کر دیا تھا؟۔۔۔۔۔۔ کیا یہ وہی ماہور تھی جس کی پسند ہے حد

ہاں! مضمول اشیاء ہوتی تھیں؟۔۔۔۔۔۔ آج وہ اس کیسے سے مٹی کے گھر وندے کو بہت اچھا کہہ رہی تھی۔

”بھائی۔۔۔۔۔۔ حیدر نے کچھ کہنا چاہا۔

”حیدر! تمہارے بھائی نے مجھے طلاق دی ہے۔ تمہیں دفعہ۔ اب میرا تم سے بھائی والا کوئی رشتہ

نہیں۔ مجھے اب بھائی کہہ کر مت پکارنا۔“ اس نے ٹوک دیا۔ حیدر کو ہر کو خاموش ہو گیا۔

”تم لوگ کیسے آئے؟“ ماہور نے پوچھا۔

”حیدر ملنا چاہتا تھا آپ سے۔“ حیدر نے بتایا۔

”ہاں! باہر بھی تم نے ملنا چاہتا تھا۔ کیونکہ کام ہے کیا؟“ اس نے ماٹل سے اٹارے میں پوچھا۔

”نہیں۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کس طرح زندہ ہیں؟۔۔۔۔۔ آئی میں سب سے کہے، ایک گاؤں میں کس طرح؟۔۔۔۔۔ آپ کو کوئی دکھ، کوئی پیچیدہ انہیں ہے؟ وہ سب جس کے ایک مائل انسان چنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ آپ اس طرح ان سہلیات کے بغیر کیسے زندہ ہیں؟۔۔۔۔۔ آپ کی دیوانگی نے آپ کو کیا دیا ہے؟ جو بیڑا۔۔۔۔۔ یہ ڈکھ۔۔۔۔۔ یہ مجھے چائے چمکنے سے کیا آپ کو کوئی دیوانگی ہے؟“ وہ گویا اسے ڈانٹ رہا تھا۔ شاید اس کا دل آج ماہ نور کو اس حالت میں، کو تیار نہ تھا۔

”کیا کیا؟۔۔۔۔۔ کیا مجھے اس دیوانگی ہے؟“ وہ بیڑائی۔۔۔۔۔ یہ تم بکھو گے جب خود عشق کے۔۔۔۔۔ تھوڑا مجھے میرے عشق نے مزاج کی وہ بلندی عطا کی ہے جس کی اونچائی کا اندازہ زخم، بیٹھے ہوئے تم جیسے لوگ نہیں کر سکتے۔ میری دیوانگی نے مجھے وہ خزانہ عطا کیا ہے جو تمہاری انا، وہ کرکھی میرا مقدور نہ بنتا۔ میرے عشق نے مجھے میرا ”اسل“ دیا ہے۔ میرے ”اسل“ سے مجھے ہے۔ یہ تھوڑا، جس نے مجھے اس شکوہ دیا ہے جو اولیہ کے عشق سے نہیں دیا تھا۔ ان چیزوں میں راحت ملی ہے جو ہزاروں ڈالر سے خریدے گئے لباس میں بھی نہیں کی۔ جن سہلیات کی بات تم رہے ہو، مجھے وہ سنا ہے چھوٹا کر دیتی تھی۔ میں ہر وقت بے قرار ہوں کی زد میں رہتی تھی۔ کہیں شکوہ نہیں ملتا تھا، کہیں راحت نصیب نہ ہوتی تھی۔ دنیا کا کیا کون سا ملک ہو گا جہاں نہیں ملتی ہوں گی مگر ہر جگہ بھی لگنے لگتا تھا کہ میرے اندر ایک غلام ہے جو بچہ نہیں ہوتا۔ میرے اندر، کی ہے جو درد نہیں ہوتی۔ میرے اندر ایک بچہ ہے جو بڑھتی جا رہی ہے۔ جب مجھے پتہ تھا کہ جو چیز میں میں وضو رکھی ہوں، ان نوادر میں، مگر ان کوں کوں کہ وہ تو مجھ سے کسی بات کے فاصلے پر ہے۔ اور پھر جب میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ خود میں طرف آگئی۔ میرے عشق نے تو مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ میں نے گمانے کا سودا نہیں کیا۔ مجھے اور چمکتا انہیں ہے۔ اس راہ پر آنے کے بعد سارے ممال، سارے بچھوے کہیں کھو جائے۔ وہ ایک جذب کے عالم میں کبھی رہی تھی۔

”تم نے تم عشق نہیں کیا ہے تھوڑا۔۔۔۔۔ ایک بار عشق کر کے ضرور دیکھو۔ تم میری کیا جاؤ گے۔ عشق ان سب پر دلوں کو پھانسا ہے جو انسان کی بہت پر پڑے ہوئے ہیں۔ عشق خود سے ملاتا ہے۔ جانتے ہو۔ میں یہاں نہیں ہوتی۔ ”ان“ کی یاد مجھے آگیا ہونے لگتی۔ کبھی وہ یہاں پہنچی ہے بیٹھے نظر آتے ہیں تو میں چپکے سے ایک کونے میں دیک جاتی۔ کہیں ان کی عبادت میں غلط نہیں ہو۔ کبھی وہاں اُچھ بیٹھے نظر آتے ہیں، کبھی وہ یہاں آتے ہیں تو کبھی کھن میں چل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر سوا، ہر جانب جہاں میں وہی وہ نظر آتے ہیں۔ میرا دل، میرا کمر ب ان کے دم سے آباد ہے۔ تم کہتے ہو کہ نہ ۱۱۱ ہے؟ یہ تو وہ خزانہ ہے کہ کہیں مل جائے تو تم دنیا بھر گمانے میں نہ لگاؤ۔“ وہ نور کو کہہ اس کی آنکھوں کے کنارے نم تھے۔ حیدر اور تھوڑا سا اسے اس کوں رہے تھے۔ وہ خاموش

ان اپنے اپنے سر جھکا کے بیٹھ گئے۔ وہ بکھ گئے تھے کہ اب یہ ماہ نور کچھ اور ہی بن چکی ہے۔ ان کو بھل دل نے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔



”میری بھئی میں ابھی کبھی نہیں آیا کہ عبت کا یہ کون سا انداز ہے؟۔۔۔۔۔ آخر وہ ایسا کون سا جذبہ نہیں نے انہیں اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا؟“ وہ اُٹھ اُٹھ اُٹھ سا کھڑا ہوا۔

”یہ عبت نہیں ہے۔ یہ تو عبت سے بہت اونچا درجہ ہے، جسے ہم عشق کہتے ہیں۔ عشق کو تم کہہ سکتے ہو؟ تم نے تو شاید کبھی کسی سے بھی عبت نہیں کی۔“ وہ بولی۔

”تو کیا تم نے کی ہے؟۔۔۔۔۔ کیا تم کبھی کسی سے وہ ان کی اس کیفیت کو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مگر میں کسی حد تک اس جذبہ کی عظمت و گہرائی کو کبھی سکتی ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

گھر کو واپس آئے یہ دوسرا درخت تھا اور اس وقت وہ لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کشف کا ماہ بہت تفصیل سے بتایا تھا اور اب وہ دونوں اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔

”ارگٹ اسٹ۔“ مجھے تو کچھ نہیں آری۔ اگر کبھی عشق کیا تو شاید کچھ سکوں۔“ وہ مذاق کرنے لگا۔

”میں بھی بھائی کی طرح عشق کے بچے کھر میں چمکتوں میں لیٹا رہتی ہوں کی کھا کر کوں کا کھیں رہی ہوں۔“ وہ ہنس پڑا۔

ان کا مذاق مت اُڑاؤ۔۔۔۔۔ وہ بہت لونی اُڑاؤں بھری ہیں۔“ کشف نے ہرمان کہہا۔

”اگر تم بتاؤ، میرا سیکڑا کون کس کا؟“ تھوڑے سے موضوع بدلا۔

”ابھی تھا۔ مگر تمہاری آواز میں درد نہیں ہے۔ مگر انہیں ہے۔“ کشف نے ہنس دیا۔

”میں آواز میں واقعی درد اور گہرائی آتی ہے۔“ کشف نے تیسرہ بتایا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میرا اہم تو بہت ہوا ہے۔“ وہ ہرمان کر بولا۔

”تم نے میری رائے پوچھی تھی، میں نے کج کا ج تا دی۔ میرے جیسے،“ سننے والوں کو تنکیت میں ہانپہ ہوتی ہے۔ صرف آواز انہیں ہونے سے کیا ہوتا ہے؟“ وہ اُٹھ اُٹھ سے بولی۔ ”اچھا، اُٹھ اُٹھ اُٹھ آتا تھا۔ میں بتانا بھول گئی تھی۔ تم ان کو کال ایک کہہ لیتا۔“ اسے یکدم یاد آیا۔

”وہ صرف میرے پاپا نہیں ہیں۔ بڑی محترم بی بی شخصیت بیٹنے والے ہیں۔“ وہ مقررہ انداز

”نہیں ہر بڑا آدمی اسی بکر میں ہے۔ تم بھی ایسا ہی کرو گے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”وہ ڈاؤر چاہیں گا کچھ پتہ نہیں چلا۔ کبھی سکتا ہوں اور نہیں سکتی۔“ وہ بے نیازی

”وہ ہاؤر چہرا یہ سو ڈک دن جھیں نے ڈو ہے گا۔“ کشف نے تا سلف سے کہا۔

”ساتھ چلیں گے۔“

”پچھلے کٹکس کی جگہ تو ہو جائے“ کشف بولی۔

”سب ہو جائے گا۔“ وہ بولا۔ پھر اس نے اپنی اور کشف کی کٹکس کنٹرم کرائیں اور اسے لے کر ان کی سر کوٹھل گیا۔ ان کی کٹکس پانچ روز بعد کی گئیں۔ تیمور نے جان بوجھ کر پانچ روز بعد کی کٹکس لے کر دوائی گئیں۔ وہ ان پانچ دنوں میں کشف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا خواہاں تھا۔ دواؤں روٹی کے مکران سب سے ملنے لگی تھیں۔ کشف بھی کٹکس کے کلیت پر بھی لگی تھی۔ وہ سگریٹ کا خاص اڈائی، شراب کا گھاس لے ان دواؤں سے لیتی تھی۔

کشف نے مکرانوں کے لئے بیج شدہ رقم سے چند تحائف بھی خریدے تھے۔ وہ ایک شاندار لالہ پائی کے مراد اپنے وطن جا رہی تھی۔ اپنے ان خواہوں میں سے ایک اور خواب کی تیسرہ وہ حاصل کر چکی تھی جو بیسوں سے اس کی کھلی آنکھوں میں بے ہوئے تھے۔

لندن ایئر پورٹ سے کراچی ایئر پورٹ تک سفر اس کے لئے بہت خوش گوار تھا۔ تیمور کی سنگت بھی وہ مستقبل کے چان بن رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اب اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ تیمور نے پچھلے دنوں کے کتنی تصویریں اپنے موبائل میں کھراش Save کر لی تھیں۔ یہ پل اس کے لئے بہت ہی ناممکن تھے۔ ان لمحات کو وہ کسی نہ کسی طرح یادگار بنانا چاہتا تھا۔ یوں تو کشف کے مراد گرا ہوا ہر لمحہ اس کی فوٹو گرافک میموری میں پرت ہو چکا تھا۔

”تیمور!..... لندن میں جو وعدہ تم نے کیا تھا وہ یاد ہے؟“ اس نے نرمی میں اپنا سامان دیکھتے دیکھتے کہا تھا۔

”ہاں..... اب میں تم سے جب ملوں گا جب اپنا یقین دلا سکوں۔ بس یہ یاد رکھنا کہ تم کو میرا نکال کرنا ہے۔“ وہ بولا۔ کشف نے کوئی جواب نہ دیا۔

”تم پہلے چلو۔ میں ابھی چاہتی کہ ہم ساتھ ساتھ باہر نکلیں۔“

”نہیں..... تم پہلے جاؤ۔“ وہ اسے دیر تک دیکھنا چاہتا تھا۔

”خدا حافظ!“ اس نے ابھی سے کہا اور نرمی میں ہوتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ تیمور کی نظریں اب تک اس کا پیچھا کرتی رہیں جب تک کہ وہ اندرونی سے اوبھل نہیں ہو گئی تھی۔ دروازے سے باہر آتے سے وہ چلی گئی۔ اس نے تیمور کی طرف دیکھا تھا۔ تیمور نے اٹنے کا ہاتھ کی انگلیاں پٹا کر اسے اندر آکر کہا تھا اور بس ہولے سے زبردست مکران لیتی تھی۔

تیمور نے بے اختیار اس لئے کبھی اپنے موبائل میں قید کر لیا تھا!



تیرے عشق میں 404

کشف بہت بار اسے جتا چکی تھی کہ اسے اپنے انٹاک کو بدلنا چاہئے۔ وہ باقی قہر کی اس نے اندر کا اچھا انسان باہر آ جائے اور وہ اپنی صلاحیتوں کا مثبت استعمال کرنا سیکھ جائے۔ اسے امید تھی وہ کامیاب ہوگی۔ اس نے اسے ٹپکے ٹپکے انداز میں سمجھایا کہ وہ جب تک لندن میں ہے، اسے اسلحہ منسٹر کو جان کر لے وہاں پر تعلیمات اسلامی سے مستفیہ ہو۔ اور لالہ شوریٰ طور پر تیمور سے ہی کرنا شروع کر دیتا تھا۔ مکران نے کشف کو اس بارے میں لاطمی رکھا تھا۔

انتقامات ہو چکے تھے اور کشف کو توقع تھی کہ اس بار وہ کوئی نمایاں پوزیشن حاصل کر لے گی۔ نیا ویسا لگا جیسا اس نے سوچا تھا۔ بہت شاندار نمبر لے کر اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اور پوزیشن لے لی تھی۔ جبکہ تیمور نے اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھتے ہوئے پوری پوزیشن میں ٹاپ کا فنایا تیمور کی اتنی شاندار کامیابی پر کشف نے اس کو ایک جتنی فائنٹین بین کا تحفہ دیا۔ جبکہ تیمور نے اس کے ایک گولڈ پلینڈ کمزری خریدی تھی جو داکٹرن کی شکل میں تھی اور اس میں بہت خوب صورت، لمبے تھیں ہیرے جڑے تھے۔

”تیسری تیمور! میں اتنی خوش نہیں لے سکتی۔“ اس نے تحفہ لینے سے انکار کر دیا۔

”تحفہ لینے دیتے وقت اس کی قیمت نہیں، غلوس اور محبت کو نظر رکھتے ہیں۔“ وہ ناراضگی سے اسے ”سواری تیمور! یہ میرے اصول کے خلاف بات ہے۔ تمہارا غلوس اپنی جگہ مگر پلینڈ! یہ میں لے سکتی۔“ اس نے انکار کیا۔

”اول تو تم نے تمہارا جواب نہیں۔“ وہ براہمان گیا۔

”چلو، اب یہاں کو تم مجھے وہ پھول خریدے کہ دے دو۔“ مجھے زرد گلاب بہت اچھے لگتے ہیں۔“

نے روڈ کے کنارے سے فلورڈز اسٹال کی طرف اشارہ کیا۔ تیمور نے کچھ سوچے ہوئے اسے دیکھا پھر آگے بڑھ کے اسٹال سے زرد گلابوں کا گلدستہ خریدے کے لے گیا۔

”کوئی! اب تو خوش ہو؟“ اس نے گلدستہ اسے تحفہ کیا۔

”ہاں..... دیکھو! کس قدر پیاری ہلک ہے ان کی۔“ اس نے بے ساختہ گلابوں کو اپنے ہاتھ سے لگے کے آکھیں موند گئیں۔ تیمور کو وہ اس سے بعد پیاری لگی تھی۔ اس نے پچھلے سے اپنے سہما میں اس حسین لئے کو قید کر لیا۔

”مگر یہ کمزری تمہاری امانت بین کے میرے پاس رہے گی۔ ایک نہ ایک دن اسے تم کو لوٹاؤں گا اور تم کو اسے لینا پڑے گا۔“

”اوکے..... اب چلیں۔“ داکٹرن کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔ ٹکٹ وغیرہ کی بلیک کرنی پڑے گی۔

”سب ہو جائے گا۔ چلو آج تمہیں پورا لندن تمہاں ہوں۔“

”ہمارا..... پورا لندن تمہیں گھسنے کے لئے ایک ہفتہ چاہئے۔“ وہ سن دی۔

”خاص خاص پہلوں پر لے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر چند چھوٹوں سے اور دیا ملا کر دیتی ہے۔“ اس نے کہا۔

وہ بیڑہ انڑوں بیٹا تھا۔ اس نے صرف بیڑہ اور بیٹیاں بہن رکھی تھی۔ بیڑہ ہر طرف اس کے ماحول پر چڑھ رہی تھیں۔ یہ کشف کی تصاویر تھیں۔ مختلف پوز میں۔ بے خبری کے عالم میں چٹکی چٹکی ماحول۔ اس نے خود سے ایک تصویر اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ وہی تصویر تھی جب اس نے کشف کو روز کیا تھا اور اس نے فرط سرت سے ان پھولوں کو اپنے رخسار سے لگا لیا تھا۔ تیور ایک نف اس کی اور دیکھ رہا تھا۔ اس کے حافظے میں کشف کے چہرے کا ایک ایک نقش جیسے چھپ گیا تھا۔ اس نے اس کے اوپر سے ایک کارڈ اٹھایا۔ یہ کارڈ کشف نے اُسے تھے کے ساتھ دیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ کے مع ہوئے اس کارڈ کو کھول کر پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ بہت خوب صورت کھلی میں بہت خوب بات لکھی تھی۔

To a dear friend!

Feeling is a painting, never spoil it. Face is a book, try to read it. Love is precious, be ready to sacrifice for it. Friendship is a mirror, never break it.

From
A good Friend

ابھی تو پہلا روز ہی گزرا ہے، تمہارا یہ حال ہو گیا ہے سڑتیور علی خان!..... باقی برس کیسے کاٹو؟ وہ زرب لب سنرایا۔

اس نے ان تصاویر کو سمیٹا اور اپنے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی درواز میں احتیاط سے رکھا۔ اس کارڈ کو اس نے اپنے سر ہائے یں رکھ دیا تھا۔ دوسرا چر تھا..... کیا؟ اس بارے میں اس کے چہرے پر ابلیشیں ہو رہی تھیں۔

”مجھے یقین تھا کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی میری بچی!..... زندگی میں کسی بھی بلڈ تم سے میرا سر نہیں دیا۔ اب جو فیصلہ تم نے کیا ہے وہ بہت مشکل ہے۔ مگر مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“

عارفین عادل اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے تھے۔ وہ اس وقت ان کے ساتھ ایک قریبی محلے کے بیٹے پر بیٹھی تھی۔ ان سے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے وقت نے انہیں بتایا تھا کہ اس کا انکا قدم کیا ہو گا۔

”مگر یہ بابا! مجھے آپ کی سپورٹ اور دعاؤں کی قدم قدم پر ضرورت ہے۔“ اس نے ان کا ہاتھ اپنا ہون میں سے لیا۔ ”میں کئی پروفیسر صاحب کے پاس جاؤں گی۔ انہوں نے بلور خاص مجھے ہے۔ ان سے بھی بہت مدد مل سکتی ہے اس سلسلے میں۔“

”ہاں..... بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں ٹل چکا ہوں۔ وہ تمہاری خاصی مدد کر سکتے ہیں۔“ انہوں نے فرمایا۔

کشف کو لینے عارفین عادل اور ممد آئے تھے۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکی تھی۔ وہ آنسو جو سرت کے آنسو تھے۔ انہوں سے لینے کی خوشی، کامیاب لوٹ کر آنے کی خواہش ہو جانے کی خوشی۔

وہ کیا آئی تھی، گو باکھر کی رونقیں لوٹ آئی تھیں۔

”ام کی چیتیاں تو تعداد میں زیادہ لگ رہی ہیں۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا تھا۔ سب اس کو مبارک باد دینے آئے تھے۔ اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے اس کی کامیابی کی سب رشتہ داروں، احباب تک پہنچ چکی تھی۔ فلک بھی اس سے ملنے آئی تھی۔ راجہ بھی اپنے شوہر، ہمراہ آئی تھی۔ سزاوے بھی کھلے دل سے اسے مبارکباد دی تھی۔ اپنی دھڑوں مبارکبادوں کی موج کے باوجود کسی ایک شخص کی کمی نے اس کے اندر عجیب سی خاموشی پیدا کر دی تھی۔

رات گئے وہ سب لوگ واپس لوٹ گئے تھے۔ جب وہ اپنے کمرے میں بالکل اکیلی تھی، د اس نے اپنے سامان میں سے ایک خوبصورت سائیناپٹ لٹلا اور بستر پر بیٹھ کر اسے کھولا۔ اس نے مہجائے ہوئے زرد گلاب تھے۔ اس نے نرمی سے ان گلابوں پر اپنی انگلیاں پھیریں۔ اس انگلیاں ان گلابوں کی نرمایت کو محسوس کر رہی تھیں۔ اس نے ایک پھول نکالا اور اسے دیکھنے لگی۔ اس میں سے ابھی بھی ممد آ رہی تھی۔ گو کہ باہی مہک تھی۔ کشف نے اس پھول کو اپنے لبوں سے لگا لیا۔ ”اسحاق تو اب شروع ہوا ہے تمہارا بھی، میرا بھی..... دیکھنے ہی اس میں کامیابی کس کی ہے؟“ محبت کے اس مکمل میں جیت کس کی ہوتی ہے؟..... میں خدا سے تمہاری ثابت قدمی دعا کروں گی۔“ وہ ہولے سے سر کوٹھ کر کرتے چپ سی ہو گئی۔

”مجھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم مجھے اس طرح جیت لو گے۔ میں جو ہمیشہ تم سے چلتی تھی، مارتی تھی، مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک وقت آنے کا جب میں تمہاری یاد میں ہوں افسردہ نہیں کی..... یہ کیسا درد بخش دیا ہے تم نے مجھے۔ جس میں سکون بھی ہے اور محاس بھی۔ یہ انتظار مقدر بتا دیا ہے تم نے جس میں آس بھی ہے اور کامیابی بھی۔ کون جانتے تم جو کہہ رہے ہو..... ہے یا..... خدا کرے وہ سب کچ ہو۔“

وہ دامن لے کر بیٹھ گئی۔

بہر حال یہ تو طے ہے کہ میں برس نہیں سنیاں سکا۔ مجھے اس میں انٹرسٹ ہی نہیں ہے۔" اس بات سے متصاف کیا اور کھڑا ہو گیا۔

"نہر....." انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو دیکھا کہ ان کا ہاتھ دبا کے انہیں کچھ کہنے سے روک دیا۔

"تم چاہو تھوڑا جوڑنا چاہتے ہو وہ کرہ....." انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

پور ایک سرسری نظر ان پر ڈالتے ہوئے چلا گیا۔

"پڑا کب سنجیدہ ہو گا؟....." مجھے اس کی بہت فکر رہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی

یہ اپنے عرصہ پر کھڑا ہو جائے اور یہ ہے کہ سنجیدہ ہونے پر تیار ہی نہیں۔ رؤف علی خان نے

لی ہے اپنی چٹائی کی۔

"ہو جائے کہ سنجیدہ ہو جائے پڑاؤ ڈالنے سے وہ ضدی اور ذہیت ہو جاتے ہیں۔ جب تک تیور

پہنسا جاتا، میں تو جا رہی ہوں نا۔ آپ کیوں گھر کرتے ہیں؟ میں سمجھاؤں گی اسے۔" انہوں

ہمت سے رؤف علی خان کا ہاتھ پکڑا۔

"ہاں..... تم جی سمجھاؤ اسے۔ میری تو سنتا ہی نہیں۔" وہ جیسے ٹھک آ کے بولے تھے۔ وہ دیکھ کے

ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔



"تیور تیور..... کب آئے آپ واپس؟" مراد اسے اپنی شاپ پر دیکھ کر خوشی سے پوچھنے لگا۔

"بیس مینٹ ہو گیا ہے۔ اور کیا حال چال ہیں؟" تیور نے پوچھا۔

"الٹوٹھ۔ آپ کا کامیابیوں کی خبر تو بذریعہ نذر نہیں ملتی ہی رہتی تھیں۔ پوری دنیا میں نام روشن

آپ نے پاکستان کا۔ آپ جیسے لوگوں کی بدولت تو ابھی تک بچا ہوا ہے یہ ملک۔" مراد

ماے اس کی تعریف کر رہا تھا۔

"اور سے بھی بہت زیادہ ہے۔" تیور مسکرایا۔

"بہت اچھی کوشش آئی ہے۔ چلنے میں دکھاتا ہوں۔" مراد بولا۔

"مجھے اسلام پر کتب چاہئیں۔ تیور نے ایک پرچی اس کے سامنے رکھی۔

"یہ....." مراد نے نام پڑھے۔ یہ تقاسیم قرآن اور احادیث نبوی اور "سیرت نبوی کی بہت

کتابیں تھیں۔" میں اس کا نام لیا ہوں۔" وہ خود کاؤنٹر چھوڑ کر اس کے لئے کتابیں لینے چلا گیا۔ تب

چوہدری دوسری کتابوں پر نظر ڈالنے لگا۔ "کائنات" کے نام پر اس کی نظر پڑی آگئیں۔ اس کی

ماپ تھی۔ تیور نے فوراً کتاب اٹھائی۔ مراد اس کی مطلوب کتب لے آیا تھا۔ تیور نے ادراستی کے

ناہیں اٹھائیں اور باہر نکل آیا۔

گھر آنے کے بعد اس نے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے مطالعہ پڑھتا جا رہا تھا، علم

داد سے اس پر ہوا تو سچے چارے تھے۔ علم کی روشنی جیسے جیسے بڑھ رہی تھی..... دینے دینے اس

نور کے اندر سے چھپنے چارے تھے۔

"ام کو سننا ہوا ہو گا یا! وہ تو مجھے سے اکڑ جائیں گی۔" اس نے ماں کے حلق تھوٹا ہوا

تھکرایا۔

"یہ تو ان کی پرانی عادت ہے بنی اتم فی الحال اس معاملے کو دلا میں ہی رکھو۔ جب سارا

معاملات طے پا جائے گا تب بتادیں گے ان کو۔ ورنہ گولہ باری کے ساتھ ساتھ خون خرابے کا شہید بنا

ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے مٹی میں مسکرائے گئے۔

"چلو..... اب چلے ہیں۔" عارفین عادل کھڑے ہو گئے۔

"جی..... اس نے ان کی تقلید کی۔

"دوینے یہ کچھ بہتر مٹی ساری باتیں کرنے کے لئے مگر میں تمہاری ام کے ہوتے اسے ملتا ہے۔

اور تحصیل سے گفتگو کرنا ممکن ہوتا ہے۔" عارفین عادل مسکرائے۔

"پاپا! اب ام کی بھی بری نہیں ہیں۔" اس نے مصروفی سے مارتا سے کہا۔

"تو میں کب سنجیدگی سے انہیں برا کہہ رہا ہوں۔" واقعی تمہاری ام بہت اچھی ہیں۔" انہوں

بولے ہوئے تو قدر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "زندگی کے سر دو گرم میں ہمیشہ ساتھ دینے والے ہیں ساری

خوش قسمت لوگوں کا نصیب ہوتے ہیں۔ اور میں انکی خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں۔" عارفین

عادل کے انداز میں محبت اور عزت دونوں تھی۔ وہ لوگ یونہی کبھی پھٹکی باتیں کرتے کرتے پارک

نکل گئے۔



"وہیل..... اب تو تم نے اپنی ایلز پر بھی کنیٹ کر لی ہے۔ اب تمہیں میرے ساتھ برسوں

توجہ دینی چاہئے۔" لا ابالی پٹن بہت ہو گیا ہے تیور! اب سنجیدگی کے ساتھ اپنے کیریئر پر توجہ

کھانے کی میز پر رؤف علی خان اس سے مخاطب تھے۔

"بنت پاپا! مجھے برسوں وغیرہ میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ پھر آپ ہیں تو یہ سب سمجھنا سنبھال

کے لئے۔" وہ اس کے بولا۔

"مجھے صرف برسوں کے ٹھیکیزے نہیں سنبھالنے ہوتے ہیں جیسا اتم اچھی طرح سے جانتے ہو کر

اس وقت پر فیکس کے نکتے اتم مجھ سے پر غارت ہوں۔ یہ سب آسان نہیں ہوتا۔ اس کے بھی ہزار ہا

ہوتے ہیں۔ پھر میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ہی تم اپنے جیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ موت، زنا

کا کچھ پھر نہیں ہوتا۔" انہوں نے کہا تو تیرے ٹھٹھک کر آئیں دیکھا۔ اس کا باپ قائل رہ گیا۔

کا مالک تھا اور اتنی مرعب دائرہ شخصیت کا مالک کہ کوئی بھی ان کے مرعب میں آسکا تھا۔

"لوکی باتیں مت کریں پاپا! مجھے ایسی باتیں پسند نہیں ہیں۔" تیرے لہجے میں بولا۔

"یہ حقیقت ہے زندگی کی اور اس سے منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ بہر حال تم ملے سے آؤں جو اس

اور اب سارے معاملات سنبھالو۔" انہوں نے ٹھکانا انداز میں کہا۔

"پاپا! میں آؤں جو اس کا لڑکا ہو۔ مگر مجھے فیوچر میں کیا کرنا ہے اس کا فیصلہ مجھے بعد میں

اس نے کتاب بند کی اور اپنے کمرے پر لٹکا ڈالی۔ عریانی اور بے مانی نہ بھانڈے اس کمرے کے دروازے اور سے ظاہر ہو رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے ایسا تجربہ کیا کہ کچھ خاص ہو رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اندھ کر کمرے کی دیواروں پر سے وہ سارے پڑاؤ تصاویر اتار کر شروع کر دیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی الماری اور درجہ بیک بیک کی درازیں خالی شروع کر دیں۔ سب غلط قسم کی فلمیں، تصاویر اٹھا لیں اور اس دھیر دھیر ایک بڑی بڑی پوری میں نہ بھر اپنی کتابوں کی بڑی بڑی الماری کھولی اور اس میں سے تمام گھٹیا مواد اکٹھا کر کے اسی پوری میں نہ اس کے بعد اس نے اپنی الماری کے اوپر سے اپنی سونے کی چین، سونے کی گھڑیاں، ہیر، انگلیاں، سونے کے برسات سب کچھ نکالا اور انہیں ایک لفافے میں بھر لیا۔ پھر اس نے اس اور لفافے کو اٹھا لیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”اے تیرا چور کیا ہے؟“ بی بی اس کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

”گناہ کے سانپ بچھو ہیں بی بی اس!..... سمندر کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔“ اس عجیب سے انداز میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ بی بی اس جبران پر بیٹھ سی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔



اس نے کار میں جگہ کر لی تھی وہاں سے سمندر خاصا گہرا تھا۔ لہریں اپنے زور میں بار بار چڑھ چٹاؤں سے سرخشی ہوئی تھیں واپس لوٹ جائیں۔ چاروں طرف گہرے تالے کا راج تھا۔ بس اگر آواز تھی تو صرف اور صرف ان چوٹیں سے زور لہروں کی۔ تیرور نے اس پوری کو اٹھا کے زور گھماتے ہوئے دور پانی میں اچھال دیا۔ پوری خاموشی دور پانی میں جا کے گر گئی تھی۔

تیرور کے چہرے پر عجیب سا اطمینان نمودار ہوا۔ اس نے سفید پوری کو دیکھا، لہروں کے یہاں سے وہاں ڈوٹتی ہوئی پوری آہستہ آہستہ سمندر کی تہ میں جا رہی تھی۔ اور بالآخر وہ چوری کر بعد تیرور کی نظر سے اوچھل ہو گئی۔ تیرور کے اطمینان پھر سے چہرے پر بھگی کی مسکراہٹ نمودار اور پھر معدوم ہو گئی۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے چلا۔ اس بار اس کا رخ کافی شاپ کی طرف تھا۔ آدھے گھنٹے ڈرائیو لینے کے بعد وہ سمندر کی طرف سے علاقے میں موجود تھا۔ یہاں آنے کے بعد وہ سٹاپنگ سے کسی کو تلاش کرنے لگا اور پھر مطلوبہ چہرے پر نظر پڑے تھے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ نیچے آنے اور اس کی طرف بڑھا۔ بیٹھے پرانے، پیلے کھیلے لباس میں بیٹوں وہ لڑکی اب بی بی تھی۔ ان چند سالوں میں وہ جوان ہو گئی تھی۔ مگر تیرور کی حیرت انگیز یادداشت کے سامنے کچھ چہرے کے تشویش کو بچکانہ لہجہ مشکل کام نہ تھا۔ اس نے لڑکی کے پاس جا کے عجیب سے کہا ”تیرور! اس کی شخصیت کو دیکھ کر بہت متزلزل رہی تھی۔“

”اندھ کے نام پر صاحب!“ اس نے اپنا ہاتھ بچا دیا۔ تیرور نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ اس کی ہوتی چٹکی پر رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے صاحب؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔ ساتھ ہی لفافے کے وزن سے اس کے اندر اشیاء کا اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”یہ تمہارا ہے..... اس بچہ جوں کے بعد تم کو بیک باگھے کی ضرورت نہیں، ہے کی۔“ تیرور واپس دیا۔

مدان لڑکی نے لفافہ کھول کر اندر بھاٹکا تو جیسے چتر کی بن گئی۔ بے یقینی سے اس نے تیرور کو دیکھا۔

”یہ..... یہ خفا ہے صاحب؟“ اس کی زبان لکڑا رہی تھی۔

”نہیں..... قرض ہے۔ سمجھو آج اتر گیا۔“ وہ بولی۔

”قرض؟“ لڑکی نے الجھ کر اسے دیکھا۔

”ہوس پیلے اسی جگہ تم نے ایک گاڑی والے سے بیک باگھی تھی اور جواب میں تم کو کاپیاں ملی۔“ تیرور نے اسے یاد دلایا۔

”تم تو روزی کاپیاں کھاتے ہیں صاحب! ہوس پیلے کی کہانی کون یاد رکھتا ہے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”فہمیں ایک لڑکی نے گر کر کھلا تھا۔ مجھے یاد ہے سب۔“ وہ جیسے خود کا ہی کر رہا تھا۔ ”یہ تمہارا دوواہیں مڑ گیا۔“

”صاحب!..... بھانکر لڑکی آواز میں دیتی رہ گئی اور وہ اپنی کار میں بیٹھ کر آگے بڑھی۔“

کوئی مستانہ ہے۔ اتنی قیمتی چیزیں مجھے دے گیا۔ وہ مولا میرے! ایسے صاحب دلی روز روز کیا بات ہے۔“ بھانکر نے لفافہ گریبان میں ڈالا اور پھر صدا لگاتے لگے۔

”لٹکے کے نام پر..... مولا کے نام پر اس فقیر کی کو کچھ دے دو صاحب!“



ور کی زندگی میں ایک ایسا دن آیا تھا جس دن دل کے جیسے ہی اس شخصیت کو ہی بدل کے رکھ دیا مانے کا بعد بھی سے لائبریری میں جانا شروع کر دیا تھا۔ وہاں وہ کھٹوں جیٹا ہوا مختلف اسلامی کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس کی معلومات میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بیوی کی اور گھر کے ساتھ اب قرآن پاک بھی پڑھنے لگا تھا۔ جس قاری سے وہ روزانہ قرآن پڑھتا تھا انہی قاری صاحب کے مشورے پر اس نے قرآن حفظ کر بھی شروع کر دیا تھا اور انگریزوں پر قرآن پاک کے کئی بارے حفظ کر چلا گیا اور وہ بھی معتمد تہ۔ قاری صاحب اس پر بے انتہا حیران تھے۔

یہ عجیب طریقے سے نماز پڑھتی بھی سیکھتی تھی۔ قاری صاحب اس سے بے حد متاثر تھے اور

”اگر ہمارے مذہب کا ہر جوان ہماری طرح بن جائے تو ہم پھر سے ایک مومن قوم ہیں۔“ انہوں نے ایک بار اس سے کہا تھا۔

”میں بہت گنہگار ہوں تیری صاحب! ہر گناہ کبیرہ و صغیرہ کا سرکبہ روچکا ہوں۔ میں یہ لے کر رہا ہوں کہ شاید اس سے میری تکفیل ہو جائے۔ میں نے اپنی ساری زندگی بے راہ گناہوں میں ڈوب کر گزاری ہے۔“ وہ سر جھکا کر ہونے لگا۔

”خیر خوار و گناہ گار مجھے کتنا ہی برا گناہ کر چکا ہو اگر اسے احساس ہو جائے اور وہ ہے معافی مانگ لے تو وہ ضرور بخش پاتا ہے۔“ تیری صاحب نے کہا۔

”مگر ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہم کو معافی مل گئی ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”یہ جو عمار اول ہے۔۔۔۔۔۔ یہ صرف خون پسپ کرنے کی مشین یا گوشت کا کھنڈ تو ہوا نہیں اس دل میں پیدا ہونے والے اس احساسات میں کسی بھی تبدیلی کا احساس دلاتا ہے۔ تم نے اسے اپنے رب کو پکارا، اس سے معافی اور مغفرت طلب کرو۔ وہ تمہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹے گا۔ کیونکہ اس کی شان۔۔۔۔۔۔ یہ اس کی بڑائی و عظمت۔۔۔۔۔۔ انہوں نے اسے ایک راہ دکھائی۔

”مصرام مستقیم مانگتے ہو اس پر چلنے کی خواہش رکھنے والے کا ساتھ خود خدا دیتا ہے۔“ ساتوں نے کشف کی آواز کرائی۔

”مصرام مستقیم۔۔۔۔۔۔ تو یہ ہے مصرام مستقیم۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”اسے سال نکوادے۔ ضائع کر دیے۔ یہ ہیں۔ بے قرار گھومتا تھا۔ سر نہیں اٹھا۔ شراب میں خود کو ڈبو کر رکھتا تھا۔ خوراک میں زندہ تھا اور سکون تو مجھ سے بس پشت بھر کے کا تھا۔ یہ ہاتھ بڑھایا اور سکون حاصل کر لیا۔ گھبراتے ٹھنڈوں سے اوجھل تھا۔ تم نے آگے دکھائی۔ تم میری نجات کا سبب بن گئیں۔ مجھے روشنی بن کے کج سمت دکھائی۔ وہ کشف! تم میرے لیے کیا بن چکی ہو یہ تم جان بھی نہیں سکتیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

دین کے تنبیہ کے سے ملنے کا شوق چون بٹا چلا گیا۔ اور اس شوق نے اسے یہ احساس سے دلا دیا تھا کہ وہ اپنے دین، اپنے رب سے کتنا دور تھا۔ اسے علم میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا، ساتھ ہی چھتھنوں کے انگ افسانے بھی لگے تھے۔ اس عرصہ میں اس نے نمازوں کی شروع کر دی تھی۔ ہر نماز میں جب وہ قیام میں کھڑا ہوتا تو اس کا سر عزت سے جھکا ہوا، شریف پڑتے وقت وہ باقاعدہ کانپ رہا ہوتا۔ روگ میں جاتے سے اسے محسوس ہوتا کہ وہ درجہ شیع کے آگے جھکا ہوا ہے۔ کبہ سے سر جھکا کر وقت اس کی گردن جیسے ٹوٹ جاتی۔ ربی الاعلیٰ ”پڑھتے پڑھتے اس پر ہفت کی غباری ہو جاتی۔ کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ کتنی کتنی حالت میں کبہ سے میں ہزار ہا دور اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ کتنی گنہگار اور گنہگار ہے۔“ وہ بارہ سے نماز پڑھنے لگا اور پھر سے کبہ سے جاتا تو یہی حالت ہو جاتی اور اس طرح کی آواز دے جاتا کہ نماز ادا کرنے کے پھر میں یونہی گزار دیتا۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا تو آنکھیں لگی

۔ وہ دعا مانگتا بھول جاتا اور گنجیوں سے رو لے لگ جاتا۔ اس کا من دینا سے آسمان لگا تھا۔ لگ بھگ ساتوں سے اس کو گنہگار ہونے لگی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنا کلب مانا ختم کیا۔ اسٹون سے قلع تعلق کر لیا۔ شراب نوشی تو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ سٹرک سے چلتی بھی اس نے انہی کی کر دی تھی۔ حیدر سے بھی اب وہ شاد و ہادی رہا تھا۔ اب اس کا زیادہ تر وقت ہی میں اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ اس کے اندر کی اضطرابیت بھی بتدریج کم کی جاتی تھی اور ہادی طرح سے مذہب میں گھومتا چلا جا رہا تھا۔

انسان میں اسے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس ایک سال کے عرصے میں دوسرے لے کر بھی نیک دل چلا تھا۔ ایک بھڑا ہوا، نہایت خمدی، خود سر، عیاش امیر زادہ اب ایک سویرہ و شبیرہ مزد میں رہا تھا۔ اس کے اس بلاؤ سے رزف علی خان پریشان تھے۔ دینا حیران تھیں اور لی اماں خوش، خوش۔ وہ کبھی تھیں کہ ان کی دعا میں اڑ لے آتی تھیں۔ شرابی اور عیاش تیسور مر چکا ہے۔ اس کی نظر آن۔۔۔۔۔۔ بچکانہ غماز کا پند، تنبیہ گزار، نیک وجود رقم لے چکا ہے۔

ماہیک سال کے عرصے میں تیسور نے سوائے مذہب کے بارے میں جاننے کے اور کچھ نہیں کیا۔ اب تیسرا وہ ایک دوسرے ملاقات کر کے گاؤں گیا تھا۔ اس نے جب ان سے پہلی جی کی جب وہ اسے دیکھ کر مثنیٰ خیر انداز میں کمرے گئے تھے۔

راز دل لیا گیا ہے۔ بس سفر جاری رکھ۔ منزل دور نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا تھا۔ مری ملاقات کے لئے انہوں نے بطور خاص اسے بلوایا تھا اور وہ ایک دن ضائع کئے بنا اپنی لہ کر دیا کہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

بادا آیا ہے حیرا۔۔۔۔۔۔ اگلے سال زیارت کعبہ کا شرف حاصل کرنا۔ کج کر آنا۔“ انہوں نے باغ انداز میں کہا۔

ج۔ کیا میں اتنی بڑی سعادت حاصل کرنے کا اہل ہوں؟“ اس کی مرضی ہے، کس کو فرض ہے اٹھا کر عرض پر بخاؤ۔ اور کس کو بچھڑے نکال کر دم دم اڑے۔ وہ لڑکی تیرے لئے ویلہ تھی۔ ٹوٹے اپنے دل کے اندر جھانک لیا اور خود کو پالیا۔ نگرا دیتا تو دل پر غم شربت ہو جاتا۔ خدا نے خود تجھے بنایا ہے۔ اس کی پکار کو گھبراتے نہیں۔“ نے جیسے اس کے دل کی آواز سن لی تھی۔

اور نے غم آنکھوں سے آنکھیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔

کس حد کے ساتھ سامنا کروں گا؟ میں بہت گنہگار ہوں۔“ اس کی آنکھوں سے موتی گھٹے۔

پہلے تیرے گنہگار ہونے کا احساس اور عزت ہے۔۔۔۔۔۔ سر جھکا کر چلا اور مغفرت طلب کر۔“ گراچی واپس جاتے ہوئے ٹھیلن میں بیٹھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی کے اس انداز میں بٹا گیا کیا

اف کو وہ کیا یاد کرتا؟ وہ تو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دکھاتے

پہنچے اور پھر اپنا واسے کیا جاتا ہے جسے دل نے بھلا دیا ہو۔ اور وہ تو اس کے اندر رہتی تھی، جسکی اس کی آنکھوں کو بھی اس کی دیکھ کی طلب نہ ہوئی تھی۔ اسی تصویر کی طرح وہ تصویر کی آنکھوں میں جڑ چکی تھی۔

اُس نے سی ایس ایس کے امتحانات کی تیاری شروع کر دی تھی۔ بزنس سے اسے کچھ بھی نہ ملتا۔ چاہے اس امتحان پاس کر کے کوئی پوسٹ حاصل کرنے کا خواہش تھا۔ اس امتحان میں ابھی با تھا اور اسے اتنی لمبی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی عرصے میں اس نے حج کے لیے بھی کر دیا۔ اس کا نام جب سامنے آیا تو اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سرفہرست اس کا نکلا تھا۔

روف ملی خان کو جب یہ پتا چلا تو وہ خامسے ہاراض ہوئے۔

”تجور! تم یہ کیا کرتے پھر رہے ہو بھئی؟..... چلیتم نے بیٹھنے کی طرح نماز روزہ مش دیا۔ پھر درس لینے لگے۔ اب یہ حج..... جیسی اتنی لمبی عمر کی حج کی کیا ضرورت آن پڑی؟“ حیرت سے ان کا منہ دھکیلا ہو گیا۔ اس کا بپے بھائے فکر کرنے کے، خوش ہو کر اسے سارا کہا کہ اس پر خدا ہو رہا تھا۔ گردہ ان سے بحث کرنے کے موزن نہیں تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ ”پاپا! میں صرف وہی کر رہا ہوں جو بحیثیت مسلم ہے، آپ کو ہم سب کو کرنا چاہئے۔“ وہ سے ہوا۔

”اوکے، اوکے..... جو کرنا ہے۔ کہ۔ تم سے کون بحث کرے۔ محراب تم یہ بھی بتاؤ گا کہ ہے؟ زندگی کیا یعنی اللہ اللہ کرنے گزرا دینی ہے؟“ وہ سخت برہمی سے بولے۔ ”میں حج سے آ کے بتاؤں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“ وہ دہرہ وہ کے اٹھ گیا۔ بی ایس اُس کے اس فیصلے سے بے حد خوش تھیں۔ وہ بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگا جب اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا تھا۔

وہ خانہ کعبہ کے سامنے سروقت کھڑا تھا۔ اس کے تن پر ہنس و سوسیدہ چادریں تھیں۔ اُس کا اور تھا اور آنکھوں سے آنسو کی تیز دھار دیکھائی کی طرح رواں تھے۔ اس کے لب کا بپ رہے تھے پورا جسم کپکپا رہا تھا۔ وہ دعا مانگتا جاتا تھا کہ اُسے کچھ دیکھیں آ رہا تھا کہ وہ کیا مانگتا چاہو۔ اپنے لیے معافی طلب کرنا چاہو یا تھا کہ معافی مانگنے کے لیے سب اللہ اللہ کہیں کہیں گئے تھے۔ اس کے جنت میں تیار ہونے والا نہیں تھا۔ لوگ دھواں باز مار کے رو رہے تھے اور دعائیں مانگتے تھے۔ اتنی جگہ پہنچ گئی کہ وہ دھڑکنا ہاں لگ رہا تھا۔ وہ شدت سے خواہش کر بیٹھا کہ کمال مقدس مگر کی دیوار کو چوم لوں۔ اور اسے شدید دھن میں لیکن ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی بڑھنے کی سعی کر رہا تھا۔ اس کے مضبوط بازو ابھرم کو بچ رہے تھے۔ مگر وہ جیسی نسل بھی مرد

یونیکل وجود کے سامنے تجور جیسا صحت مند اور اونچا لمبا پھر پھر مرد بھی بڑا نخر آ رہا تھا۔ پھر اسی سے پیچھے سے زوردار دھکا لگا اور اس کا سینہ جاکے سیدھا خانہ کعبہ شریف کی چادر سے ٹکرایا۔ اس پانہ دار چادر کو چوم لیا۔ تجور اسو با نکل کر ٹریب تھا۔ اس نے ہمت کی اور لوگوں کے جھرم جھجکا ہوا ادھک چٹکایا اور نہایت عقیدت و محبت سے اسے بوسہ دیا۔ بس یہی لمحہ تھا کہ جب اس کا سن نا سے بھر گیا۔

اُس کے دوران اس نے اپنا پورا پورا وقت صرف اور صرف عبادت کو کیا تھا۔ جس مقصد کے لئے وہ اپنا تھا۔ وہ تو پورا کر رہی تھا۔

پہ روز وہ مسجد نبوی میں بیٹھا آنکھیں موندے تلاوت میں مگن تھا۔ اس کی خوش الحان آواز اتنی لی کہ ارگرد کے لوگ بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ سورۃ البقرہ کی تلاوت کرنے والی نے آنکھیں کھولیں اور اپنے بچکے ہوئے چہرے کو صاف کیا۔

سبحان اللہ! کیا آواز پائی ہے آپ نے۔ میں نے اپنی زندگی میں اس قدر خوب صورت اور نہ اتنی بھی نہیں سنی۔“ دامن جانب سے ابھرنے والی مردانہ آواز پر وہ چوٹا۔ اس نے گردن کھٹا ہوا ہاں گندی رنگت والا بٹنیش چھتیس سالہ ایک مرد بیٹھا تھا۔ تجور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ادب۔

”اب لائیں ہیں؟“ مرد ابھی تک انگریز کی میں سی بات کر رہا تھا۔

میں پاکستانی ہوں۔“ تجور نے آدھوں میں جواب دیا۔

اوہ..... گف۔ آپ تو میرے ہم وطن ہیں۔ میں بھی پاکستان سے ہوں۔ مجھے ڈاکٹر نوید اللہ بن۔ میں آپ کو یہاں روزانہ دیکھتا ہوں۔ آپ کی ملازمت سستا ہوں۔ عجیب کشش ہے آپ کی سسٹر.....“ نوید اللہ نے اس کی طرف مصافحہ کا ہاتھ بڑھایا۔

جور ملی خان۔“ تجور نے اس سے ہاتھ ملایا۔

”سٹر! تجور! آپ کی عمر تو اتنی نہیں گئی۔ کیا حفظ کیا ہے قرآن آپ نے؟“ نوید اللہ نے پوچھا۔

لی ہاں۔“ وہ مختصر جواب دیا۔

انشاء اللہ۔ بس شوق کی بات ہے۔ اب پھر خدا جسے تو فیض دے۔ کہاں رہائش ہے آپ کی؟“

رہنے اس کوئی کا نام بتا دیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

کس جگہ رہتے ہیں آپ پاکستان میں؟“ نوید اللہ کی گفتگو خوں ہوتی جاری تھی۔ تجور کو اب الجھن ل۔ وہ انکیا بیزکر عبادت کرتا پھر رہا تھا۔

ارہی میں۔“ وہ اس پھر بھی بے حد مختصر سا جواب دیا۔

لی بھی کر پائی میں رہتا تھا۔ مگر آج کل پر پونگ اندرون سندھ ہو گئی ہے۔ اچھا بھائی! آزار وہ ل کے تحت یہاں آئے ہیں، وہ پورا کر لیں۔ زندگی ری اور موقع ملا ضرور میں گئے۔ آپ

میں ہی کشش ہے، جیسی میں بے اختیار کھینچا چلا آیا۔ خدا حافظ۔“ نوید اللہ چلا گیا تو اس نے

”نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”تو پھر؟“ حیدر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ تیمور بولا۔

”اگر چاہو، ذرا میرے ساتھ چلو۔ مجھے کچھ کتابیں خریدنی ہیں۔“ حیدر نے موضوع بدلا۔

”میرا موڈ نہیں ہے۔ تم چل جاؤ۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”تم بہت ڈل ہو گئے ہو۔ دین کی راہ پر چلے ہو تو کیا دنیا کو بالکل ہی چھوڑ دو گے؟ بس چلو۔

اب کمر ہاتھوں۔“ ورنہ تم سے آج کے بعد میری شکل کتر ہو گے۔“ حیدر نے ناراضی سے دھمکی دی۔

”اگر چاہو۔“ وہ ہنسنے لگا اور اسے اپنے دوست کو وہ ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”تیمور! مجھے کچھ میں نہیں آتا کہ تمہارے اندر رپا کج عی ہے بدلاؤ، یہ تبدیلیاں کیسے آئیں؟“ حیدر

انہر کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”اپنا کج نہیں، آہستہ آہستہ میری ذات کی تکمیل میں کشف عارضین عادل کا ہاتھ ہے۔“ تیمور

ہوئے سے کہا۔

”کشف؟“ وہ فلک کی دوست؟“ حیدر کو یاد آیا۔ ”لوہ۔“ وہ تمہارے قیث میں اپنے اپنا

سٹ بھی تو تھی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ تیمور نے سر ہلایا۔ ”مگر تم مجھے تفصیل سے بتاؤ ساری باتیں۔“ حیدر نے کار ایک

فورنٹ کے احاطے میں روکی۔

”تم کو شاپنگ نہیں کرنی؟“ تیمور نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ تو بہانہ قائم کو کمر سے باہر نکالنے کا۔ میرا موڈ اب بڑے کھانے کو چاہ رہا ہے۔“ وہ

اسے سرکرایا۔

”تم نہیں سوچو رہے۔“ تیمور نے اسے گھبراہٹ۔

”تمہارا ہی کچھ لگتا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا اور ساتھ ہی ہارن بجا کر کوٹر کو بلایا اور آرڈر دے دیا۔

”ہاں اب اطمینان کے ساتھ ساری کہانی سناؤ۔“ حیدر اس کی طرف سرگرمی اور تیمور نے ساری کی

آپ اپنی آواز سے سنا دی۔ کچھ بھی نہ پچھایا۔ حیدر خاموشی سے اس کو سن رہا تھا۔

”ذہنی نے بہت اپنا کج پانا کھایا مگر مجھے زندگی کی اصل حقیقت مل گئی۔ کشف میرے لئے کیا

یہ میں شایستگیوں میں نہیں بیان کر سکتا۔“ تیمور نے گہری سانس لیتے ہوئے سرینٹ کی پشت

ٹکایا۔

”تم نے اس سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ حیدر نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ جب تک اس سے کچھ ہوئے پورا نہیں کروں تب تک تو ملاقات کا

ابھی نہیں سکتا۔“ وہ غلطی اعجاز میں بولا۔

”حقیقی حقیقت اب کچھ میں آتی ہے حیدر! میں نور بھائی کا مذاق اڑاتا تھا، انہیں برا سمجھتا

اطمینان کا سانس لیا اور سر جھکا کے مراکتب میں چلا گیا۔

وہ طبلین میں بیٹھا تھا کہ جانی بچانی آواز پر چونکا۔

”لوہ۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نوید اللہ۔“ وہ اس کے برابر دلی سیٹ پر آ کے بیٹھ گیا تھا۔

”کیا اچھا اتفاق ہے، اب سزا سننے کر رہا۔“ وہ سرکرایا تو تیمور نے بھی مروتا مسکرا کے

دیکھا۔ پھر تقریباً سارے راستے ہی وہ دونوں باتوں میں مگن رہے۔ نوید اللہ کی غنیمت آتی رہی

اور اچھی جگہ کی تیمور جو شرمیل میں اس سے بیزاری محسوس کر رہا تھا بعد میں اس کی کبھی اسے اپنا

لگی تھی۔ یہ نہ منورہ سے کراچی ایئر پورٹ تک کے سفر میں نوید اللہ اسے اپنے بارے میں

تفصیلات بتا چکا تھا۔

”یہ میرا کارڈ ہے۔ تم کو جب بھی موقع ملے، تم ضرور مجھ سے ملنے آنا۔“ وہ اپنا ڈرائیونگ کار

دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”ضرور۔“ تیمور نے حافی بھری۔

”تمہارا فون نمبر تو میرے پاس ہے ہی۔ میں انشاء اللہ کال کروں گا۔“ نوید اللہ نے کہا۔

ایئر پورٹ پر دونوں جدا ہوئے تھے۔

”ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ حاجی بن گئے موصوف۔ اب اور کیا کیا انتخاب لاؤ گے میرے حضور؟

ٹانگ پر غائب ہو گئے پوچھ رہا تھا۔

”حیدر! میں سول سروسز جرائن کروں گا۔“ تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔

”مائل گھر سے نکال کر پھینک دیں گے۔ تم انہیں دوسے ہی بہت چاہتے ہو۔“ حیدر نے ڈاڑھ

”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ سی ایس ایس کے انگریز حریف ہیں۔ میری تیاری کی پالیسی ہے

میں وہی کروں گا جو جوت چکا ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تھک ہے۔ تمہیں کوئی روک سکتا ہے؟ تم کسی کی سنتے ہو؟“

”مگر انکلی کی خواہش کا کیا ہوگا؟ وہ تو آس پر زندہ ہیں۔ اور تم کو کہہ رہا ہوں کہ ہر بار ان کو ہاں کر

ہو۔“ حیدر سنجیدہ ہو گیا۔

”ان کا کارڈ بار سنہانے کے لئے دوسرا بنا آ جائے گا۔“ تیمور اب بھی سنجیدہ تھا۔

”دوسرا بنا کیا آسان سے چٹکے گا؟“ حیدر چڑکایا۔

”مام از پر یکسٹ۔ ان کو بنا ہی ہوگا۔ تم دیکھ لیا۔“ وہ دوشی سے کہہ رہا تھا۔

”لوہ۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ انٹرا ساڈر وغیرہ کر لیا ہوگا۔ تم کو بتایا تھا کیا؟“ حیدر نے

مانسلی۔

تھا۔ مگر مجھے اب معلوم ہوا کہ عشق کرنے والوں کی نظر کیا ہوتی ہے۔ جانتے ہو، کشف ہمیشہ میرے آس پاس رہتی ہے۔ ہر جگہ، ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ مجھ سے دور ہے۔ یہ احساسات وہی ہیں جن کی میں فی اُزرا تھا۔ عشق ہر انسان کو کرتا ہے۔ عشق انسان کو اس کے رب سے ملاتا ہے۔ عشق انسان کو اس کی "اصل" بتاتا ہے۔ کشف کے عشق نے مجھے جینے کا صحیح مفہوم دیا ہے۔ میں اندھروں میں بلکہ رہا تھا۔ کشف کے عشق نے مشعل کا کام کیا اور اندھروں سے نکال کر روشنی میں لے آئی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ ایک جذب کے عالم میں.....

ایک بے خودی کے عالم میں۔

"مگر کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟ کیا وہ تمہارے لئے ایسے ہی جذبات رکھتی ہے؟"

نئے سوال کیا۔

"پتہ نہیں..... مجھ سے محبت نہ بھی کرے تب بھی میرے دل میں جو مقام اس کے لئے ہے، کم نہیں ہوگا۔ میں اس سے صرف محبت نہیں کرتا بلکہ اس کی عزت بھی کرتا ہوں۔ عزت..... جانے ہو حیدر! اس نے مجھے جو کھڑکی کی عزت کرنا سکھایا ہے۔ در نہ عزت میرے لئے کیا تھی یہ تم بہتر جانتے ہو۔" حیدر کہہ رہا تھا اور حیدر سوچ رہا تھا کہ اس وقت جو حیدر اس کے سامنے بیٹھا ہے وہ بہت اچھا ہے۔



مقابلے کے امتحان میں بھی اس نے گولڈ میڈل جیتا تھا۔ انٹرویو کی کامیابی کے بعد اسے اسٹاٹس کنٹرول پر نہیں بنا کے حیدر آباد پوسٹ کر دیا گیا تھا۔

دفعہ ملی خانا کو کوئی دنوں خدا نے ایک اور بیٹے سے نواز دیا تھا۔ وہ خوش تھے مگر حیدر کے فیصلے سے ناخوش بھی مگر وہ جانتے تھے کہ وہ مانے گا نہیں۔ وہ وہی کرتا ہے جو اس کی مرضی ہو اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ سو وہ تھک گئے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ نئی جاب حیدر کے لئے خاصا مصحقی تھی۔ اس نے اپنی سیٹ سنبھالی تھی۔ سرکاری بنگلے کے علاوہ تھا۔ وہ پوری امداد عیاری اور تنبیہ کی کے ساتھ توہری میں جت گیا۔ اسے اٹھانے میں نوے لاکھ کا بھی ہوا۔ یاد کا فون اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے اسے اپنے کمر آئے کی بلور خاص دعوت دی تھی۔ حیدر آئے کا وعدہ کیا تھا مگر کام کا پوچھ اٹا تھا کہ اسے وقت ہی نہ ملے پڑا تھا۔ حیدر انکی ادھیلاڑ بٹین کے لئے ہر یکہ چلا گیا تھا۔

لیا امان کو حیدر نے اپنے پاس ہی بلوایا تھا۔ اب وہ بے حد مدد دیتی ہو گئی تھی۔ نظر آتا بھی کم ہو گیا تھا۔ بیمار بھی بہت رہے تھے۔ حیدر نے ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک عورت کا کام کروایا تھا۔ زندگی کے شب و روز اپنی مخصوص چال چلتے پار ہے تھے۔ حیدر تھکے پادشاہ۔ فون پر باتیں کیا کرتا تھا۔ ان سے باتیں کر کے اسے عجیب سا سرور ملتا تھا۔ کشف کے حلقوں نے خبر نہ لی کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کیا وہ اسے یاد کرتی ہوگی یا بھول

اگے؟ اس کے آرٹیکلز وغیرہ اخبارات میں چھپتے رہتے تھے۔ اس کی کئی کتابیں بھی مارکیٹ میں آتی تھیں۔ وہ بہت اعتبار اور شہرت سے انہیں متوجہ کرتا تھا۔ لیکن اسے شادی کرنے کے لئے نہیں تو وہ مال جاتا۔ وہ اکثر اس سے اس بات پر ناراض بھی ہو جاتی تھی۔

"سرنے سے پہلے تیری دلہن کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ تیرے بچوں کو اپنی گود میں رکھنا چاہتی ہوں۔ لڑو حادی ہی نہیں بھرتا۔" وہ تنگی سے کہتیں۔

"ابھی آپ نے سو سال اور بیٹا ہے سرنے کی عمر کہاں ہے آپ کی؟ ابھی تو کھیلنے کوئی کی عمر ہے۔" وہ مذاق کرتا۔

"مذاق میں بات کو مت مال۔ مجھے تو وہ لڑکی کشف بہت ہی پسند ہے۔ تو ذرا سوچ تو اس کے اسے میں۔" وہ کہتیں تو وہ چپ ہو جاتا۔

"ایک کو تو سوچا رہتا ہوں رات دن۔" وہ من میں ہی من میں لی امان کی ساری اور لاطینی پر فیس پڑتا۔ اس روز چھٹی تھی۔ جو کمر پر ہی تھا مگر کمر پر ہونے کے باوجود کام اتنا ہو کر چھٹی کے دن کا وہی نہ پڑا۔ کچھ وہ خود کو خود بھی بہت زیادہ مصروف رکھتا تھا۔ لگا کر دس دن، بار بار وہ گھٹنے کام لیتا رہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ ضروری فائلوں کے ڈیڑھ کے درمیان بیٹھ کر کام کرتا تھا کہ ملازم نے اسے کسی کی دیکھ لیا ان کے ساتھ ایک کارڈ تھا۔

"میرے بھائی! اور جانے وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔ اس نے شرٹ بدل دی سے پہلی اور بالوں کو ہاتھوں سے سلجھاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ "السلام علیکم نوے صاب! کہنے کیسے حراج ہیں؟" وہ پرتپاک انداز میں نوے صاب اللہ سے ملنے ہوئے پڑا تھا۔

"وکیلیم السلام! آپ بتائیے جناب! خاصے مصروف ہو گئے ہیں۔" نوے صاب نے مخصوص مسکراہٹ لکھتا تھا۔

"جس جناب! کام کا جو یہی اتنا ہوتا ہے۔ آپ اپنی بتائیے کیسا چل رہا ہے کلینک؟" اس نے پوچھا۔

"نعمتہ..... بالکل ٹھیک۔ بس آپ تو سوچ رہا ہوں کہ گاؤں میں ایک ہسپتال بنوا لوں۔ بھڑی سے کام نہیں پڑتا۔ لوگوں کو بے حد تکلیف ہوتی ہے جب انہیں کسی بڑی بیماری کے علاج یا تشخیص وغیرہ کے لئے شہر کے سرکاری ہسپتالوں کے دیکھنے کا منہ پڑتے ہیں۔" نوے صاب نے جواب دیا۔

"بہت اچھی سوچ ہے۔ مگر کیا حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کرتی؟" اس نے پوچھا۔

"نعمتہ....." نوے صاب نے فیس پڑا۔ "میری حکومت ایک کام کی ادھک کر لیتی ہے۔

"وہ ہے؟" "قرض" لینے کا۔ حجازی طرحیوں سے قرض لے کر اپنے چیک اکاؤنٹس بھرتی جاری

نہ سے شکر یہ ادا کر کے منع کر دیا۔

وہ بچے کے روڈ پر کار کا جھولا بھولے ہوئے اس برائے نام ٹیکسٹ بک پہنچا جس کو گاؤں کے لوگ بھڑکی کہتے تھے۔ تیور نے دیکھا کہ مریضوں کی ایک لمبی لائن وہاں لگی ہے۔ وہ کار سے اترا تو مریض ہوا پیچھے دو بھاڑ میں آ گیا ہے۔ بے انتہا شہدائے گری سے اس کا دماغ اٹھنے لگا تھا۔ اس نے گہری نظر ان لوگوں پر ڈالی جو کبھی قہار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کالے سیاہ، بے لافرد و کمزور جسامتیں، میلے پٹیلے اور بوسیدہ کپڑے، سینے میں ڈوبے ہوئے وہ پٹیلانی گری صرف ایک شامیانے کے سامنے تلے کھڑے تھے۔ تیور نے ان پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد پتائی کہ بہت افسوس محسوس ہوا تھا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس کی شخصیت اور لمبی گاڑی بہتر نظر آ رہے تھے۔

تیور اندر چلا آیا۔ اندر کا ماحول صاف قہار تھا۔ نوید اللہ ایک کمرے میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ وہ ذات کی عورت کا چیک اپ کر رہا تھا۔ تیور نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور باہر کھڑے دیکھنے لگا۔ عورت کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ اس کی پائیں آنکھ سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور وہ ہائے گری کر رہی تھی۔ نوید اس کے زخم صاف کر رہا تھا۔ عورت کے ہاتھ میں خون نکل رہا تھا۔ نوید اسے ہلکے ہلکے دبا رہا تھا۔ جواب میں عورت دوتے دوتے کچھ بول رہی تھی۔ آواز میں صاف سناٹا کی زد سے رہی تھیں۔ نوید نے سر ہم ہٹ کر کے، دوا دے کر اسے فارغ کیا۔ باہر نکل آئی۔ اسی وقت نوید کی نگاہ تیور پر پڑی تو وہ خوشی سے کمرے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے استقبال کے لئے باہر آ گیا۔

”اگر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ سید سے کمرے میں آ جائیے۔“ وہ بڑے جوشی انداز میں سے ملا۔

”آپ بڑی تھیں۔ جیڑا میں نے ڈسٹرب کرنا ضروری نہ سمجھا۔“ تیور مسکرایا۔

”کب آئے آپ؟“ نوید نے اسے اندر لے کا اشارہ کیا۔

”جب آپ اس عورت کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ کیا ہوا تھا اسے؟“ اس نے پوچھا۔

”غور کرنے جیڑا تھا۔“ نوید نے بتایا۔

”کیوں؟“ کیا خطا کی تھی اس نے جو ایسا جانوروں والا سلوک کیا اس کے شہر ہر نے؟“ وہ دے پوچھنے لگا۔

”انسان میں ملک تیز ہو گیا تھا۔ بس یہی قصور تھا بے جاری کا۔“ نوید نے تاسف سے بتایا۔

”اپنی گاڑی..... نری جہالت ہے یہ تو۔ اتنی سی بات پر کیسا جانوروں کی طرح مارا اسے۔ کیا مگر ہانے والا کوئی نہیں تھا؟“ وہ شاکہ مند ہو گیا تھا۔

”انسان تھی۔ مگر بے جا بے جا بھڑکانے کے بیٹے کو بھلا دے رہی تھی۔ عجیب متعلق ہے ان کی۔“ نوید نے کہا۔

ہے۔ غریب عوام جانوروں کی طرح بنیادوں سے مر رہیں، پھینک انہیں اس سے کیا۔ خود کو تو چمک مچانے تو اسے کچھ دیکھا جاتے ہیں علاج کروانے۔ اور یہاں لوگ خون ٹھوک ٹھوک کر مر جاتے ہیں، ان کے لواحقین کے پاس کفن دفن تک کے پیسے نہیں ہوتے۔“ نوید اللہ نفرت سے اور دھک کے ماحول میں کہہ رہا تھا۔

”کیا واقعی ہمارے ملک کا یہ حال ہے؟“ تیور بے ساختہ پوچھا تھا۔

نوید اللہ نے چند لمحوں کے لئے اسے دیکھا۔ وہ بالکل چپ تھا۔ اسی وقت ملازم چائے دوسرے لوازمات لے کر آ گیا۔ ”خزانی وہاں رکھ کر اس نے چائے بنا کے دونوں کو دی اور تیور کہنے پر باہر چلا گیا۔

”یہ کیسے نوید؟“ تیور نے بکٹ کی پلیٹ اس کے آگے کی۔

”تیور! جس کلاس سے تمہارا تعلق ہے وہاں بیٹے والے لوگ جنت میں رہتے ہیں۔ میں تم کو بھی ذہنی بتاؤں، تم کو اس حقیقت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے اس کی بد صورتی کا اندازہ ہو سکے گا۔ ہو گا۔ تم کسی دن وقت نکال کر میرے ساتھ چلو میرے گاؤں۔ تمہیں وہاں کاسوے کرنا پڑے گا۔“ کو احساس ہو گا کہ وہ لوگ جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔“ نوید اللہ نے کہا۔

”مغز۔“ میں اسی پتے کی ایک روز تمہارے گاؤں آؤں گا۔ مگر گاؤں میں، میں تم کو اپنیوں کا کیسے؟“

”آسان ہے..... کسی سے بھی کہہ دینا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ وہ تمہیں خود بھیجے گا۔ تم دے گا۔ تم خود کو میرا مہمان خود کر دینا۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں تمہیں اسے پہلے فون کر دوں گا۔“ وہ پروگرام ڈان کر چکا تھا۔ نوید اپنی وہاں آدھ فٹنڈ بیٹھا رہا اور اس آدھ گھنٹے میں وہ اسے اپنے گاؤں کی غربت کے حالات سنانا بہا تیور سوچ رہا تھا کہ کتنی کم ایک درخت یہ بھی ہے۔ انتہائی سفاک اور خوف ناک درخت۔



تیور دوسرے کے مطابق اس غربت و افلاس کے بارے لوگوں کے گاؤں میں موجود تھا۔ وہ اپنی لپاس میں قہار اپنی ذاتی کار میں آیا تھا۔ گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی برائے نام سڑک پر گاڑی پکڑ کر رنڈا سے پکڑے گئی جلی جاری تھی۔ دھول اور مٹی کے ٹھارے تھے کہ روڈ اسکرین وینڈلائی کی تھی۔ وہ کار کے شیشے بند کر کے اسے آگے کر کے ڈرائیو کر رہا تھا مگر اس کے پاؤں جو صوبہ کی اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ ڈھیلے ڈھالے شلوار کھن میں ملیں تھا۔ اس نے نوید اللہ کی سی فون پر اپنی آدھ کی اطلاع دے دی تھی۔ نوید اللہ نے اس کو جواب دے دی تھی اس کے مطابق اس نے ایک کالے مکھوٹے سے، دھان پان سے سندھی آدی کر دو کہ سندھی زبان میں ہی نوید کے بارے میں پوچھا۔ وہ آدی نوید اللہ کا نام نہ کر رہی اصرار ہو گیا تھا۔ اس نے بہت تفصیل سے اسے راستہ سمجھایا اور یہ آفر بھی کی کہ اگر وہ چاہے تو وہ خود اسے کیلک تک چھوڑ کے آسکتا ہے۔ مگر تیور نے

”اے سلام کہ اور اندر کرے میں نے آیا۔“

”آپ کچھ غصہ اور غمور ہیں گے؟“ اس نے تیز سے پوچھا۔

”جانی پلا دو۔“ تیمور نے بیڑے پر غم و راز ہوتے ہوئے کہا۔

”جی بھئی۔“ الف دین واپس پلٹا اور تیمور جوں سے جوتے اتار کر آرام سے پٹک پر بٹھ گیا۔

لیٹ گیا۔ اس نے تین گھنٹے کی ذرا سوئی تھی۔ وہ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ ملازم پانی لے آیا۔ اس

پانی کی کرکھاس واپس لے کر آیا۔

”کھانا کھاؤ وقت کھائیں گے جناب؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”تمہارے ڈاکٹر صاحب آج آئیں، پھر کھائیں گے۔ کھانا بتاتے ہو؟“ تیمور نے پوچھا۔

”جی جناب اور آج کا صبح تو خاص ہے۔ پچھلی کے کباب، پچھلی بریانی اور ٹکڑے۔“ الف دین

ناک عی سانس میں جواب دیا۔

”اچھا۔ تم آج صبح خاں سے لگ ہو۔“ تیمور نے دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھا۔ اس کے کپڑے، ہاتھ

صاف تھرے تھے۔ موٹھیں اور سر کے بال بھی تراشے ہوئے تھے۔ سر پر نماز وانی چالی کی ٹوپی

نہا کر تھی اس نے۔

”پڑے تھکے ہو؟“ تیمور نے ہاتھ پاس کرنے کے لئے سوال کیا۔

”جی جناب! ٹیکہ پاس ہوں۔ مجھے پڑنے کا بہت شوق تھا۔ مگر بس حالات نے اجازت نہ دی

پارہی بنادیا۔“ وہ صاف سے بولا۔

”مگر بڑی توجہ سے جی ہوتی ہے۔“ تیمور نے اس کی بہت بندھائی۔

”جی جناب۔“ اس وقت باہر کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ”باہر کوئی ہے جی۔ میں ذرا دیکھتا ہوں۔“

ابہل گھر گیا اور تیمور سر کے نیچے ہاتھوں کو تکیے بنا کے لیٹ گیا۔

”بہل پھندہ زندگی ہے جیسے تیرے ہر ہونے کو۔“ چھوڑ دیا اس زندگی کا اور اپنا لوشن کو۔ ”کشف کی

از ہے پھر اس کے کانوں میں گرجش کر رہی تھی۔

”میری زندگی جی کے تباہ ہو۔“ وہ چیخے پٹخے آ کر اساری تھی۔

”سلام لی بی۔“ صاحب تو گھر پہنچ گئے۔ ”الف دین کسی سے بات کر رہا تھا۔“

”کس وقت آئیں گے؟“ ایک زمانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ ابھل پڑا۔

”جی بس آئے والے ہوں گے۔ آپ انتظار کر لیں۔“ الف دین کمرہ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے جلدی ہے۔ ان سے کہنا میں شام کو ملے آؤں گی۔ بہت ضروری کام ہے۔“

نہا آواز پھر سے سنائی دی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میری ساتوں کا کھانا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اس آواز کو تو میں ہزاروں میں پہچان سکتا

ن۔۔۔۔۔ وہ دروازہ دنگ رہے پھر باہر بھاگا۔ الف دین دروازہ بند کر رہا تھا۔ اس نے اوجھلے دروازے

میں عورت کی بے حد صدا جھٹک دیکھی تھی، اسے دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کشف فارغین

”تو یہاں کی عورتیں سب کیوں سختی ہیں؟ تمہارا تو ہوگا۔ رپورٹ دین کر انہیں۔“ نیل کی

کھانسی ان مردوں کو۔ پھر دیکھیں کس کی مجال ہوتی ہے کہ ان پر ہاتھ اٹھائے۔“ وہ ہنسنے سے بولا۔

”تم کو معلوم ہے تیمور؟ کہ ہماری ان بیٹیوں اور ماؤں کا کیا حال ہے؟ ان سے اگر یہ کہو کہ تم

شوہر کو مار کٹائی سے منع کر دو تو یہ کہتی ہیں کہ تو مرد کی شان ہے کہ وہ عورت کو مارا جائے۔

عورتیں فجر سے بھی پہلے اٹھتی ہیں۔ گھر کا کام کاج کرتی ہیں، اناج چستی ہیں، بچے پالتی ہیں

جانوروں کو چارہ دلاتی ہیں، گائے بھینسوں کا دودھ دیتی ہیں، بھیتوں پہ جا کے وہاں بھی کام کرتی ہیں

اور اس کے باوجود ماریں کھاتی ہیں۔ کھانے کو مارا زیادہ اور کھانا کم ملتا ہے۔ ظلم سختی ہیں۔ بیمار

جب بھی انہیں کام ضرور کرنا ہوتا ہے اور یہ سب ہے ان کی جہالت کی بدولت۔ یہاں اور ایسے

شمار علاقوں میں اتنی جہالت ہے کہ تم اندازہ بھی نہیں لگ سکتے۔“ نویہ اللہ اس کو کڑی حقیقت

کہہ رہا تھا۔

”میں ذرا اپنے سریشوں سے فارغ ہو جاؤں تو تمہیں یہاں کا سروے کر آؤں گا۔ تم اگر چاہو

میرے کوارٹر جا سکتے ہو۔ وہاں میرا ملازم موجود ہوگا۔ تم ٹھوڑا آرام کرو۔ میں ٹھنڈ پڑھ میں فارغ

کر آتا ہوں۔“ نویہ بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ تیمور رضی ہو گیا۔

”میں لڑکے تمہارے ساتھ بھیجا ہوں۔“ نویہ نے گھنٹی بجائی۔ ملازم لڑکا فوراً اندر آ گیا۔

”بخش دین! تیمور صاحب ہیں۔ انہیں گھر لے جائو۔ میں نے الف دین کو ہدایت دے

تھی۔ صاحب کو کمرے میں پہنچا دینا۔“ وہ لڑکے کو ہدایت دینے لگا۔ ”کھانا ہم اٹھائے کھائیں گے۔“

نویہ مسکرائی۔ تیمور مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا۔

”صاحب! مگر قریب ہے۔ بیٹل عی چلیں۔“ بخش دین نے تیمور سے کہا۔

”میری کار ہے، اسی میں چلتے ہیں۔“ تیمور کو اتنی شہ پہ گری سے گھبراہٹ ہوئے تھی جی ا۔

کہاں عادت تھی اسے سی کے بغیر سانس بھی لینے کی۔ چاب بھی اسی کے انداز شانہ ہی تھے۔

نوراکار میں بیٹھا اور فل اسے کی گول دیا۔ بیٹھڑی ہوائے اس کے کھولنے ہوئے دماغ کو غصہ کیا۔

”تم میرے جیسے لوگوں کی زندگی جی کے تباہ۔۔۔۔۔ میں مان جاؤں گی۔“ کشف کی آواز تیمور کی

ساتھوں سے ٹکرائی۔ وہ نے پھر کو ٹھک گیا۔

”کیا ہوا صاحب؟“ لڑکے نے اسے اٹھتے دیکھا تو پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ تیمور نے سر ہٹا لیا۔

بخش دین اسے راستہ بتاتا چلا ہوا اور وہ چند لمحوں بعد ایک چھونے سے پکے کوارٹر کے باہر

گھر کو اس نے لہٹا سانسے والی ٹیک پر پارک کیا تھا۔ بخش دین اسے لے کر آ رہا تھا۔ اندر آ

سو گئے سے سنوئی سے اس کا استقبال کیا۔ بخش دین نے اسے بتایا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے کہیں

ہیں۔ انہیں کمرے میں لے۔؟ اور غصہ اور غمور پیش کرو۔ پھر خوش دین واپس چلت گیا۔ الف اب

عادل نہیں تھی۔ وہ تو کوئی سادہ سی، موٹی سی، عمر دار عورت تھی جو اپنی سادگی چادر کو ماتھے تک پہنچا رہی تھی۔ تیور نے گھبرا سانس لیا اور وہاں اندر آگیا۔
”تو کف مار رہیں عادل! اب تم میرے پیشی سے نکل کر میری نظروں کی حقیقت جتنی جا رہی ہو۔“
اس نے سوچا۔

”کون تھا الف دین؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بی صاحب سے ملنے آئی تھی لی۔“ الف دین نے بتایا۔

”اچھا، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ صاحب آ جائیں تو مجھے آغا دیتا۔“ تیور نے آگے سے بولے اعلان کیا۔
”مئی بہتر۔“ ملازم وہاں پہنچ گیا اور تیور کشف کو سوچے ہوئے غیندی وادیوں میں اتر گیا۔
سو دیکھا تھا، وہی چمکی آئی تھی کہ الف دین نے آ کر اسے دیکھا دیا۔ ”ڈاکٹر صاحب آگے گئے ہیں جی۔
کھانا لگانے لگا ہوں میں۔“

وہ اللہ گیا۔ فوہ اللہ دوسرے کمرے میں اس کا منتظر تھا۔

”سوری بات رقم کو خاصی کوٹھ ہوئی ہوگی۔ واصل آج کر میزوں کا رن بھی تو بہت تھا۔“ فوہ اللہ اسے دیکھ کر سسکا رہا۔
”نہیں، نہیں..... ایسی بات تو نہیں۔ تمہارا ملازم خاصا خوش گپ آدمی ہے۔ پور نہیں ہونے دیتا۔“ تیور نے جلدی سے کہا۔

”بس کھانا کھا لیں تو پھر ہمیں ملائے گا سروے کروانا ہوں۔“ فوہ اللہ نے کہا۔

الف دین نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔

”مجھے وہاں بھی لگنا ہو گا۔ سروے کے فوراً بعد لگنا ہو گا۔“ تیور نے بتایا۔

”یہ کیا بات؟..... ایک رات تو رکھو۔ میں تو کچھ دیر تھا کہ تم رات نہیں گھر آنے کے ارادے سے آئے ہو۔“ فوہ اللہ نے ہنسی سے کہا۔

”نکل ڈیوٹی پر جانا ہے۔ آج تو میرا آف ڈے تھا۔ ابھی آسکا ہوں۔ تم تو جانتے ہو کتنی ذمہ داری کی پوسٹ ہے۔“ چمکی نہیں کر سکا۔ ”وہ بھوری بیان کر رہا تھا۔“

”فیک ہے بھائی! میں بھور نہیں کرتا۔ لیکن تم وعدہ کرو کہ جب بھی موقع ملے گا یہاں رات رکھے ضرور آؤ گے۔“ فوہ اللہ نے غلوس بھرا اصرار کیا۔

”وعدہ رہا۔“ وہ ہائی بھرے ہوئے بولا۔ پھر کھانا کھانے کے دوران وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔

”الف دین! تم کھانا دہاتی بہت اچھا دیتی ہو۔“ تیور نے چلنے چلنے اس کی تعریف کر دی۔

”شکر یہ صاحب! وہ شرمایا۔“

تیور نے اپنے والٹ سے چھوٹو نکال کر اسے تھما دیے۔

میں صاحب! اس کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ہلکا سا ہونے لگا کر کہا۔

فلو۔ اسنے اچھے کھانے کا انعام کھلو۔ ”وہ بولا تو الف دین نے اجازت طلب نظروں سے لگا۔

فلو۔ ”فوہ اللہ نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔

لریہ جناب! الف دین نے کہا۔

اللہ اسے گاؤں کا سروے کروا رہا تھا۔ گرمی کی شدت و تیزی میں اب کی آگئی تھی۔ وہ دونوں نے جا رہے تھے۔

بلے یہاں سڑک نامی کی چیز نہیں تھی۔ میں نے اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے بے ایک ملی تھی۔ مگر اب اس کی حالت بھی خست ہو گئی ہے۔“ فوہ اللہ نے ایک لمبی سی قدرے بڑبڑاہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں میں ایک سکول بھی تعمیر کروانے کا سوچ رہا ہوں۔“
اس سکول نہیں ہے؟“ تیور نے پوچھا۔

ہاں..... صرف دیواریں ہیں۔ کاندھ کی سکول۔ دو دو کیمو، وہ چہار دیواری دیکھ رہے ہو؟“ فوہ ایک طرف اشارہ کیا۔ تیور نے اس طرف نگاہ دوڑائی۔ ایک کھلے سے میدان میں دو دو اونچ بوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔

.....“ تیور نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

اس کا ڈیرہ سکول تعمیر ہونے نہیں دیتا۔ بس یہ دیواریں ہی ہیں۔ بیچے بچے چارے اسی کے مائے کے پیچھے ہیں اور بجائے نام پڑھائی کرتے ہیں۔“ فوہ اللہ نے بتایا۔
راڈ پر ایسا کیوں کرتا ہے؟“

رے بھائی! اگر گاؤں کے بچے سکول جانے لگے تو وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے۔ اور تعلیم یافتہ عہان کے اندر ضرور آگئی پیدا ہوگی۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو جوان و ذریوں کو مفت کے تلامذوں پڑی ہوئی ہے وہ کہاں سے پیدا ہوں گے۔ یہ ڈیرے اپنے مفاد کے لئے ان غریبوں کے جائز حقوق بھی چھین لیتے ہیں۔ خیر میں نے بھی کوئی فیصلہ نہیں چھوڑا۔ اپنے تعلقات کا رہا ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ اس ڈیرے کی پیچھے کئی خاصی کوپ“ تک ہے۔“

و اگر تم مناسب سمجھو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ آئی مین میرے اور ار کے تعلقات خاصی اونچے ہیں۔ پھر نا کیشلی جی ہم خود سکول کی تعمیر میں بھیکتے ہیں۔“ تیور نے آفر دی۔

ایسا ہو سکتا ہے تو اس سے ابھی تو کوئی بات ہوئی نہیں سکتی۔ تم اس کا خیر میں حصہ ضرور لو۔“
ن ہو گیا۔

جہادی ڈھنری کو ہسپتال بنانے میں بھی تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ یہ دو کام تو بہت آسان

”تم واقعی ایک درد مند دل رکھتے ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ سب لوگ تم کو بہت عاتیں دیں گے۔“
 ”میں تو صرف اپنی ان غلطیوں کے ازالے کی کوشش کر رہا ہوں جو ماضی میں مجھ سے سرزد ہوئی۔ بہت گناہ کئے ہیں میں نے۔ بس سمجھ لو کہ ان کی معافی کا ایک انداز ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
 ”نویہ اللہ سوچ رہا تھا کہ اتنے اچھے آدمی سے کیا گناہ سرزد ہونے ہوں گے جو اسے اڑا رہیں۔“



نویہ نے اس کے جذبے کو سراہا تھا۔ پھر وہ خاموشی سے ایک لمحہ اسے گاؤں کے بارے میں بتاتا رہا۔
 ”یہاں پانی کا بہت مسئلہ تھا۔ لوگ پینے کے لئے یہ پانی استعمال کرتے تھے۔“ نویہ اللہ نے اسے جو بڑھا جاتا وہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”یہاں پر سے جانور بھی پانی پیتے تھے اور یہ لوگ بھی۔“
 ”نویہ اللہ نے قہقاری طرح کے خنجر عذرات کا سپورٹ حاصل کر کے یہاں پینے کے صاف پانی کا کام کر دیا۔ ان سب کاموں میں یہاں کی لیدی دور کرنے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ کبھی طواؤں کا کام ان سے۔ بہت ہی قابل خاتون ہیں۔ پچھلے دو سالوں میں ان کی سرزد کوششوں نے اس گاؤں لوگوں کے لئے بہت سی آسانیوں کی راہیں پیدا کی ہیں۔ عورتوں کے بے شمار مسائل ہیں جن کے لئے دن رات ایک کر دیتے تھے ہم نے۔“ نویہ اللہ تارہا تھا۔

گاؤں کی حالت واقعی اتر چکی تھی۔ تیور نے تک و تحیز بھوک سے پھٹتے بچوں کو دیکھا۔ بیماریاں، تڑپتے لوگوں کو دیکھا۔ اس نے زندہ و سانس لیے ہوئے انسانوں کو جانوروں سے بدتر حالات دیکھا۔ غربت سے فچڑے ہوئے مفلس لوگ، ایک ایک روپے کو ترستے ہوئے لوگ، بے رحم معمولی سی پریشانیوں سے پریشان ہوتے لوگ، ظلم کے ہاتھوں لڑتے ہوئے لوگ۔ تیور کی آنکھ میں آنسو آگئے تھے۔ کشف کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ اس کی یادداشت میں بازگشت کر رہا تھا۔ تیور نے اپنی جیب سے چیک نکال لی اور اس میں خاموشی سے رقم بھر کے نویہ کو دیا۔

”تمہیں تیور یا یہ چیک مجھے مت دو۔ خود اپنے ہاتھوں سے تم ان لوگوں کے لئے جو کر سکتے کرو۔“ نویہ اللہ نے چیک لینے سے انکار کر دیا۔

”میرے پاس وقت کی بہت کمی ہے۔ اور پھر میں یہاں رہتا بھی نہیں ہوں۔ تم یہاں رہو۔ تم وہ سب کر سکتے ہو جو میں دور رہ کر نہیں کر سکتا ہوں۔ ان غریبوں کے لئے کچھ کرنے کا حق تو بھی ہے۔ یا یہ کہہ کر میرا فرض ہے۔ اس کا فرض میرا حصہ لینے سے مت روکو۔“ تیور نے کلمہ اسے سمجھا کر راضی کیا۔

”یہاں کے مسائل دور کرنے کے لئے میں بھی کچھ کرتا ہوں۔ انشاء اللہ خدا کی مرضی ہو! ہوگی۔ ان غریبوں کو ان کے حقوق ضرور ملیں گے۔“ تیور نے تسلیہ کر لیا تھا۔

”تم جیسے لوگوں کی ہی ان جیسے لوگوں کو ضرورت ہے۔ اگر تم جیسے لوگ پیش قدمی کرتے، آدھے سے زیادہ مسائل تو ہم خود ہی حل کر لیں گے۔ اپنی حکومت کی آس پر تو رہنا ہی فضول! نویہ اللہ ہلکا۔“

”میں یہاں ایک فرسٹ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم سے بھی کچھ گفتگو کرنی ہے۔ کے علاوہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک مدرسہ بھی قائم کیا جائے اور ان سکولیات سے نہ صرف کے لوگ بلکہ گرد و پیش کے رہنے والے بھی مستفید ہوں۔“ تیور نے اپنی خواہش بیان کی۔ اس زرخیز دماغ میں بہت سے منصوبے اور بھی تھے جن کے متعلق وہ نویہ اللہ سے تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ نویہ اللہ اس کے اچھے جذبوں کی قدر کر رہا تھا۔

اتفاقاً اس نے کوئی چوں چا نہ کی۔ تیمور نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کو لیاٹ دے اور طاقت کے زور کی بجائے محبت اور اپنائیت سے ان کے دل جیتے تو وہ اس کے غلام کے رہیں گے۔ وڈیرے کی عقل میں یہ بات آگئی تھی اور اس نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ اس کے سامنے آ گیا۔ لوگ اب اپنے وڈیرے کی تعریف کرنے لگے تھے جو کہ وڈیرے کے نامی خوشی کی بات تھی۔



ان جنگوں کے اثر رہے تھے۔ تیمور کو اپنی زندگی کا مقصد مل چکا تھا۔ اس نے رؤف علی خان سے کہا تھا کہ وہ اس گاؤں میں آئیں اور یہاں کے لوگوں کے مسائل سنیں۔ انہیں یہاں سے غامضہ دل سکتے تھے۔ رؤف علی خان کے دل کو بیٹے کی بات لگی تھی۔ وہ بذات خود یہاں آئے تھے۔ اسے لوگوں کا پیار اور عزت و کچھ کر وہ بہت حیران ہوئے تھے۔ تیمور جیسے شخص کس طرح ان سے غریب لوگوں کے درمیان بے تکلفی سے بیٹھا تھا، وہ کچھ حیران تھے۔ لوگ تیمور کے ایک بے پناہ جان دینے کو بھی تیار تھے۔ انہیں اس بار اپنا کشن میں اپنی سو فیصد کامیابی نظر آ رہی تھی۔ ہائے گاؤں میں ہسپتال بنوانے کا نہ صرف وعدہ کیا تھا بلکہ جلد ہی ہسپتال تعمیر کرانے کا کام بھی اگوارا رہے تھے۔ علاوہ انہیں انہوں نے سوچا کہ یہ جگہ کی فیکٹری لگانے کے لئے بہترین ہے۔ ہائے زمین وغیرہ دیکھی تھی، بس اب بانی کے معاملات طے کرنے رہ گئے تھے۔ انہوں نے دہلیوں سے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ جب یہاں فیکٹری بنوائیں گے تو بہت سے لوگوں کا روزگار فراہم کر دیا جائے گا۔ اپنے مفاد کو انہوں نے دوسروں کی ضرورتوں اور جمہوریت میں مضبوطی کی تھا۔ سب تیمور کی بدولت ممکن ہوا تھا۔ اب انہیں تیمور سے زیادہ شکایتیں نہیں۔ اپنے اس بیٹے کی وجہ جہاں انہیں بے شمار مسائل اور پیچیدگیاں سامنے آ رہی تھیں۔ اس اثنا میں ان کو خدا نے ایک اور بیٹے سے نوازا تھا۔ نام انہوں نے ارغمل علی خان رکھا تھا۔

ارغمل اپنی مخصوص رفتار سے سڑ کر رہے تھے۔ کشف کا تجلil اب ایک زندہ وجود کی شکل میں سامنے رہنے لگا تھا۔ یہ اپنا معرکوںات کے بعد بھی وہ ایک لوگ اس کے ادب نہ ہوتی تھی۔ ارغمل خان کی زندگی ایک مخصوص دائرے کے گرد گھوم رہی تھی۔ انہیں کے کھیلنے، گاؤں کے مسئلے مسائل۔ اور وہ بس انہی میں الجھ کر رہ گیا تھا حمایت بادشاہ سے وہ مسلسل رابطے میں تھے۔ وہ تین مرتبہ تو لاہور، انہوں نے ان سے فون پر بات کرتا تھا۔

ان کی حالت اب بہتر ہو گئی تھی۔ ان چار سالوں میں تیمور علی خان نے ان لوگوں کے لئے اتنا کیا تھا کہ سب مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ تیمور اب کشف سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنا چاہتا تھا کہ عیساء وہ چاہتی تھیں وہ یسایا بن چکا ہے۔ اس نے بہت مہر کے ساتھ سات سال سے تھے۔ ان سات سالوں میں بھی اسے کشف سے ملاقات کرنے کی غاب نہیں ہوئی تھی۔ مگر

اُس کا ہر ایک ایڈاپٹ گاؤں میں گزرنے لگا تھا۔ اپنے منصوبوں پر وہ عمل درآمد کرنے نہ سکتا تھا۔ وہ یہاں آتا اور لوگوں کے مسائل سن کر حیران ہوتا۔ کسی کے پاس سائیکل خریدنے کے لئے پانچ ہزار نہ ہوتے تو وہ وڈیرے سے پانچ ہزار قرض لینے پر مجبور ہو جاتا اور بدلے میں اپنی کوئی چیز گروی رکھ دیتا۔ اور اگر گروی رکھنے کو کچھ نہ ہوتا تو وڈیرے کو قرض لوٹنے تک اس کے کو کا کوئی چیز وڈیرے کے یہاں مفت کام کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

کسی کو بیلوں کی جوڑی خریدنے کے لئے رقم درکار ہوتی تو کسی کو نان خریدنے کے لئے کسی اپنے کچے مکان کی مرمت کے لئے پیسے چاہتے ہوتے اور وہ سب وڈیرے سے قرض لینے پر مجبور رہے اور قرضے کے لئے یا تو اپنی کوئی چیز گروی رکھواتی یا تو ان کا پیار وڈیرے کی تلاقی قبول کرنی پڑتی تیمور ان کے مسائل سن کر سوچتا کہ کیا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟ اور کیا اتنا بڑا کہ لوگ خود کو بیٹنے سے مگر نہیں جانتے۔

وہ ہر بار اپنے ساتھ ہماری رقم لاتا اور لوگوں میں بانٹ دیتا۔ اس نے جلد از جلد فرسٹ کا کام شروع کروا دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد لوگوں کے ان مسائل کا سد باب کیا جائے۔ اس نے اپنی طاقت اور وسائل دونوں کے استعمال سے ممکنات کو ممکن بناتے ہوئے انتہائی تیز رفتاری سے ان سارے منصوبوں پر کام شروع کروا دیا تھا۔ اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں ایک خاص مقام بنانا رہا تھا۔ لوگ اس سے محبت کرنے لگے تھے۔ وہ ان غریب، بددیوار لوگوں میں اپنے لوگوں کے درمیان انہیں ان کے ساتھ بیٹھا ان کے مسئلے سننا رہا۔ جو مسئلے بیٹوں سے مل ہو سکتے وہ بیٹوں سے حل کر دیتا۔ جو مسئلے اس کے تعلقات سے مل ہو سکتے وہ اپنے تعلقات استعمال کر کے ان کے حل نکال دیتا تھا۔ لوگ اسے جہلیاں آٹھا آٹھا کر دعا مانگتے دیتے اور ہر دعا کے بدلے اس کے دل میں عاجزی بڑھتی جاتی۔ اس کا دل بھرتا تھا۔ اس نے اپنے ذاتی تعلقات کا استعمال کر کے ایک سال کے اندر اندر وہ یہاں پہلی سڑک بنوائی تھی۔ جس سکول کی صرف دیواریں نظر آ رہی تھیں اب وہاں کچھ اینٹوں کی مضبوط عمارت نظر آتی تھی جہاں بچے پڑھ کر تک کے پتے پڑھتے تھے۔ تیمور نے نوپے سے کہا تھا کہ وہاں ہی بانی سکول کی تعمیر بھی شروع کر دیا ہے۔ کچھ بھی اب اس گاؤں میں آ چکی تھی۔ نہتا گاؤں کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی۔

گاؤں کا وڈیرہ تیمور کی شخصیت اس کی پہنچ اور اثر و رسوخ سے بے حد متاثر تھا اور اس سے نار

اب وہ اس سے ٹکے کے لئے بے چین رہنے لگا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کراچی جانے گا اور اسے ملے گا۔

اور پھر اس نے چند روز کی چٹیاں لے لیں۔ وہ کراچی پہلے بھی کافی مرتبہ آچکا تھا۔ یہاں کے بعد اس نے بھی کشف سے ٹکے کی کوشش نہیں کی تھی مگر دل میں ایک مہم جوئی خراش ضرور۔ کربیں اپنا یک ہی پس بچی کر رہے تھے تو وہ نظر آئی جائے۔ مگر آج تو وہ آیا ہی اس سے ملا کرنے کے ارادے سے تھا۔

وہ علی نظام میں تھا اور اپنی سرکاری جپ میں سیوہ حاکف کے گھر کی طرف گھوم رہا تھا۔ قہار برسوں پہلے وہ انہی راتوں سے گزرتا ہوا، انہی نگہ گلیوں سے گزرتا ہوا ہی چھوٹے کے سامنے بچی کھڑا تھا۔ اس کے حاکف میں اتنے سال پہلے کا ایک ایک لہو قید تھا۔ آج مگر گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور گیٹ پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد گیٹ کھل گیا۔ اس کے انگوٹھی پر رسید و عورت کھڑی تھی۔

”کی فرمائیے؟“ اس کی وردی اور اونچے لیے قد سے متاثر ہو کر وہ پوچھ رہی تھی۔

”جی یہاں عارفین عادل رہتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ عورت کی صورت اس کے لئے انجان تھی۔ کون ہو سکتی ہے یہ؟ کشف کی ماں یا کوئی رشتہ دار؟ وہ سوچ رہا تھا۔ خبر لے نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ ورنہ تو ایک جھلک ہی دیکھ لیا اس کے لئے ہوتا تھا۔

”عارفین عادل۔۔۔۔۔ شاید آپ ان لوگوں کی بات کر رہے ہیں جو دو سال قبل یہاں رہا کرتے تھے۔“ عورت نے سوچتے ہوئے کہا۔

”دو سال پہلے؟۔۔۔۔۔ ان کی ایک بیٹی کا نام کشف تھا۔“ تیور کو ہاتھ مل دیتا ہوا سامعہ اس پر جھپکی۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ہم نے ان سے دو سال پہلے یہ مکان خریدا تھا۔ اب وہ لوگ یہاں نہیں رہتے۔“ عورت نے بتایا۔

”آپ کو کچھ معلوم ہے ان کے متعلق؟۔۔۔۔۔ کچھ بھی کہہ دو کہاں گئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں جی۔ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں کہہ دو کہاں چلے گئے ہیں۔“ عورت نے معذرت کی۔

”وہ لوگ بھی اس علاقے میں آتے جاتے تھے جی نہیں؟“ اس نے بگلی سی امید کے وقت پوچھا۔

”جی نہیں۔ انہیں ہم نے دو بارہ یہاں نہیں دیکھا۔ آپ کیا ان کے رشتہ دار ہیں؟“ عورت پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میں ان کا رشتہ دار ہی ہوں۔“

وہ پلٹ گیا اور عورت اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اپنی جیب میں بیٹہ کراس نے ہاتھوں کو گھس گھسایا اور غصہ منہ پر کھینچ کر وہ سوچ رہا تھا۔

”فلک!۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں امید کی روشنی سے چمکیں۔“ فلک سے اس کی دوستی تھی۔ اسے یقین آ ہوگا۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا اس سے بڑبڑایا۔ پھر اس نے جیب انارٹ کی اور حیدر کے ہسپتال کی روانہ ہو گیا۔

فلک کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے شہر کے ساتھ بیرون ملک رہتی تھی۔ تیور کے پاس اس کا نمبر نہیں تھا مگر وہ حیدر سے مل سکتا تھا۔ حیدر کراچی میں ہی تھا اور اپنا ذاتی ہسپتال بک آج ہی میں مصروف تھی۔ اس وقت اس کی غیر متوقع آمد ہسپتال میں بے حد مصروف حیدر کے لئے حیرت تھی۔

”تم اپنا کیم کیسے آگئے یا؟۔۔۔۔۔ جانتے ہو، پورے آٹھ ماہ داخل دکھائی ہے اپنی۔“ وہ حیرت بردار تھا۔

”مصدقہ بات کا عالم تو ہمیں پتہ ہی ہے یا رکاب دن ڈھلتا ہے، کب صبح ہوتی ہے، کچھ پتہ نہیں۔“ وہ بولا۔

”جانتا ہوں۔ پھر اے۔۔۔۔۔ اسی نے عیاشی کرتا رہا ہے۔ بیٹا! بیڑیاں ڈھلاؤ ہوں حیرے بیروں جب جا کے قادی میں آئے گا۔“ حیدر نے دھمکی آمیز غصہ سے کہا۔

”ہسپتال کیسے چل رہا ہے؟“ حیدر کی بات کوئی ان کی کرتے ہوئے تیور نے پوچھا۔

”بے حد مصروفیات ہیں۔ آج کل کچھ نئی مشینیں منگوا لی ہیں۔ اس میں مصروف تھا۔ سوچ رہا تھا۔“

”ماؤں۔۔۔۔۔ کانی مینے ہو گئے وہاں آئے۔“ تو یہ اللہ سے تو اکثر ڈاکٹروں کی کسی منگ یا کالٹرس واقعات ہوتی رہتی ہے۔“ حیدر نے کہا۔

”حیدر! مجھے فلک کا کنٹیکٹ نمبر چاہیے۔“ تیور نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنا ہمدردانہ بیان کیا۔

”نمبر ہے؟“ حیدر نے حیرت و تشویش سے اسے دیکھا۔

”میں کشف سے ملنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پرانے مگر بھی گیا تھا مگر وہ لوگ وہ مکان چھ کر جا رہے ہیں۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی کسی دوست کا پتہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس کا ایک کزن مجھے بھی جانتا ہوں مگر میں دانستہ اس کے پاس نہیں گیا کہ وہ مجھے کیا سوچے۔“ فلک اس کی کبتی کیا ہے۔ وہ یقیناً اس کے کنٹیکٹ میں ہوگی۔“ تیور نے تسلی سے ”وچ“ بیان کی۔

”کوہ۔۔۔۔۔ تو یہ ہے قصہ۔ میں ابھی تمہاری بات کر رہا تھا۔“ حیدر نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔

”ابھر ڈال کر کے کان سے لگا لیا۔“ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔

”فلک!۔۔۔۔۔ ہاں، کیسی ہو بھئی؟ ہمارے بھتیجی صاحب اور ان کی بیویوں کا کیا حال ہے؟“

”ابا۔۔۔۔۔ اچھا بھئی ہے تیور میرے پاس موجود ہے۔ پہلے اس سے بات کرلو۔ کچھ کام ہے تم سے۔“ حیدر نے فون اسے تھا دیا۔

”فلک!۔۔۔۔۔“ تیور نے فون کان سے لگا لیا۔

”ہائے تیور! کیا حال ہے؟ اتنے سالوں بعد کیسے یاد کر لیا؟“ فلک کی چٹکی ہوئی آواز اس کے

کاٹوں سے نکرائی۔

”کچھ ضروری کام تھا۔“

”ہاں، ہاں۔ یوں۔“

”تجاری ایک کھلی تھی کھف۔“

”ہاں، ہاں۔ تھی نہیں، ہے۔“

”تجہرا آج کل اس سے رابطہ ہے یا؟“

”تیور امیر اتو اس سے تقریباً چار پانچ سالوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ جب وہ لندن۔“

”حق میں اس سے ملی تھی۔ پھر اس کے بعد دو تین مرتبہ ملی ہوں گے۔ ہم اس نے کئی

ورک اشارت کر دیا تھا۔ کراچی میں ہی کام کر رہی تھی۔“

”اس ادارے کا نام کیا تھا جہاں وہ کام کر رہی تھی؟“

”ادارے کا نام تو مجھے یاد نہیں۔ البتہ وہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے مینٹر میں پروفیسر کرا۔“

ساتھ کام کر رہی تھی۔“

”اس کا کوئی فون نمبر وغیرہ؟“ تیور بے ڈیڑھی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ایک نمبر دیا تھا اس نے مجھے۔ ممبروں میں دیکھ کر بتاتی ہوں۔“ فلک نے ا۔۔

کرایا۔ وہ بوہٹ کاٹنے ہوئے انتظار کر رہا تھا۔ حیدر خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ

اندرونی کیفیت کا عکاس بنا ہوا تھا۔

”تیور انکو نمبر۔“ فلک نے کہا تو تیور نے جلدی سے اپنا سیل نکال کر اس میں نمبر فیز کرا

کر دیا۔

”دیکھو، اگر تجہرا اس سے رابطہ ہو جائے تو اس کی اطلاع مجھے ضرور دینا۔“ اس نے تاکید کی

”ضرور۔“

”میری دعا ہے کہ تجہری کبھی سنا رہے لگ جائے۔“ فلک بچی نہیں تھی کہ اس کی کیفیت

سکتی۔ وہ اس کے بتاتے ہی سب کچھ جان چکی تھی۔

تیور نے فون آف کر کے حیدر کی طرف بڑھا دیا۔

”اس نمبر فون کر کے دیکھو۔“ حیدر ہلا۔ تیور نے وہیں بیٹھے بیٹھے نمبر لایا اور انتظار کر لیا۔

چند لمحوں بعد کسی نے فون اٹھایا۔ تیور نے فون ریسیو کر کے اسے سے کشف کے حلق پوچھا۔

”جی، یہاں کام کرتی تھیں۔ دو برس صرف ایک سال ہی کام کرنے کے بعد انہوں نے یہاں

ریزائن کر دیا تھا۔“ وہاں سے اطلاع ملی تو تیور نے کوفت بھرے انداز میں فون آف کر دیا۔

”تم اس کے کزن سے ملو اور ایڈریس لو۔“ حیدر نے کہا۔

”حیدر! یہ کام میں خود نہیں کرنا چاہتا۔ رشید داری کا معاملہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ خود کو

اس پر لگی اٹھائے۔ تو سنا کر بھائی سے یہ کام کرا لو۔ یہ مراد کی شاپ کا فون نمبر ہے۔“ اس نے

ہر کانٹہ ہر لکھ کر اسے دیا۔

”یہ نمبر کسٹمر ہے؟؟؟۔۔۔۔۔ کبھی اسے عرس میں پہنچ نہ ہو گیا ہو۔“ حیدر نے پوچھ دیکھے

نے پوچھا۔

”نہیں۔ مراد سے میں کئیوں کے سلسلے میں رابطہ رکھتا ہوں۔ نمبر سچی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں تجہیں رات تک پتہ کر کے بتاتا ہوں۔“ حیدر نے کہا۔

”میں انتظار کروں گا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کہاں چل دیئے؟“

”مگر۔“

”کب تک ہو کر اپنی میں؟“

”ابن تین روز کی چٹاں لے کر آیا ہوں۔“

”اچھا چلو ٹھیک ہے۔ میں خود رات کو تم سے ملوں گا۔“ تیور وہاں سے اٹھا اور ست قدموں سے

اٹھا وہاں بیٹھ گیا۔ بیپ ڈرائیو کرنے کے دوران میں اس کی سوچ کا محور کشف ہی تھی۔ اس کو

محاسن میں اگر کوئی پرانا جانے والا دیکھ لیتا تو یقین نہ کرنا کہ یہ وہی تیور جی خان ہے جس کے

لئے لڑکی صرف ایک استعمال کی چیز تھی۔ جسے وہ اپنے تصرف میں لانے کے بعد پھینک دیتا تھا۔

گھر آیا تو تنہا سارا دم اپنی گورس کی گود میں رہیں کر رہا تھا۔ گورس بے چاری اسے بہلا رہی

تھی کہ وہ مسلسل رو رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ تیور نے رک پر پوچھا۔

”شاید نیگرجا صاحب کو کس کر رہا ہے۔ ہر کوشش کر کے دیکھ لی، چپ ہی نہیں ہو رہا۔“ وہ بے چارگی

نے بولی۔

تیور نے بے حد صحت مند سے ارحم کو دیکھا جو حیرت انگیز حد تک اسی سے مشابہت رکھتا تھا۔ تیور

دیکھ کر وہ ہنسنے لگا اور دونوں ہانڈ پھیلا دیئے۔ وہ بے حد حیران ہوا۔

”مجھے کیسے پہچانتا ہے؟ میں تو کتنوں بعد یہاں کا چکر لگا تا ہوں۔ نہ ہی میں نے آج تک اسے

”میں اٹھایا ہے۔“ وہ گورس سے بولا۔

”خون تو اپنا اثر دکھاتا ہے نا! آپ دونوں کی رگوں میں دوڑنے والا خون تو ایک ہی ہے نا۔“

سکرائی۔

تیور نے ہاتھ بڑھا کر سات ماہ کے بے حد صحت مند اور خوب صورت ارحم کو گود میں اٹھایا۔ وہ

ہاکی گود میں آتے ہی چپ ہو گیا۔

”واہ! یاد! بہت چمکنے والے بھائی کی طرح۔ گود میں آتے ہی سکرانے لگے۔“ تیور نے اس

لہر سونگلی گچھے جیسے گول پر پیدار کیا۔ بے اختیار ارحم نے نکلا ری ماری۔ تیور کو اس پر بہت پیار آیا۔

”مام کہاں گئی ہیں؟“ اس نے گورس سے پوچھا۔

"ان کی کلب میں بیٹنگ تھی، وہاں ہی ہیں، وہاں تو اب رات گئے ہی ہوگی۔" گورنس نے ماہر امراختی رورہ جاتا ہے مام کے بغیر؟ اس نے پوچھا۔ پھر خود ہی چپ ہو کر سوچا۔ "جب ساری زندگی اپنی ماں کے بغیر رہ سکتا ہوں تو پھر یہ بھی رہ سکتا ہے۔ بس میں فرق یہ ہے کہ اس ماں زندہ ہے اور میری مری ہوئی۔ مگر مہر سے عروہ ہم دونوں کا مقدہ رری۔" اس نے ارم کو ہاتھ سے لگا لیا۔

"پاپا کو اب عادت ہو چکی ہے۔" گورنس نے کہا۔ "لیکن کبھی کبھی یہ بہت تنگ کرتے ہیں۔ پھر ماں ہوتی ہے۔ کوئی بھی دوسرا اہم بدلہ تو بس وقتی سہارا ہی بنتا ہے۔" وہ بہت گہری بات ہوا تھی۔ چور نے ارم کو اسے بکرا دیا۔

"ماتر جیسی عورتوں کو ماں کہنے کی ذمہ داری نہیں اٹھانی چاہیے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ گورنس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "میرے پاس تو بی ماں تھی۔ مگر مہر..... اس کا بہت خیال رکھا کہ اس نے گورنس کو خاص چاہتے تھے۔

"میرا آپ سے فخر ہے۔ یہ میری ذمہ داری ہے اور میں اپنے فرض سے کوتاہی نہیں ہوں گی۔" گورنس نے ہتھکڑیاں لٹائی۔ چور اپنے کمرے میں آ گیا۔ سارا دن اس نے دروازے پر کھڑا رہا تھا۔ وہ تمام شایستگیوں سے لیس تھا۔ اس نے سب سے پہلے غسل کیا اور اپنے ملازم سے کہہ دیا کہ اسے حیدر کے فون کا انتظار تھا۔ تمباکو کے سوا اس کے ذریعے بھی کوئی کامیابی لے پا نہیں؟ کہا تو اسے دلی سے تھکا رہا تھا۔ اسی دوران اس کے فون کی بلیک ہوئی۔ اس نے فوراً سے چیٹر سوسائٹل امارا کمر میں چل کر نام تک ہا تھا۔ اس نے "ہیں" کے جھن کو پٹلی کیا۔

"ہاں حیدر! یلو کیڈ کیا پوچھ رہی؟" حیدر نے پوچھا۔ "سلام نہ دے۔ بندے کو اتنا بھی سے میرا نہیں ہونا چاہیے۔" حیدر کی شرخ آواز ابھری۔ "پلیز حیدر! افضل باتوں میں قائم رہتے نہ کرو۔ مجھے تازہ مراد سے بات ہوتی سونیا کی؟" از حد تنبیہ دیا۔ مجبوراً حیدر کو بھی تنبیہ ہونا پڑا۔

"میں اپنا مراد پندرہ دنوں کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس کی دکان میں کام کرنے کے لئے ہے۔ پتا۔" حیدر نے کہا۔ "اوہ....." حیدر سمجھ گیا۔

"میں پندرہ سولہ دنوں بعد دوبارہ ہے۔ پتہ کروا کے تمہیں وہیں حیدر کا فون کروں گا۔" حیدر نے جیسے اس کی ہمت بندھائی۔ "نہی ہے۔" حیدر نے فون بند کر دیا۔

حیدر نے ریموڈ کر ٹیل پر رکھنے کے بعد بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ سوائے نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "یہ شخص ہے جو کہتا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وہ شخص ہے جو آج اپنی بہن

لے دیا تھا تھا ہوا ہے۔" حیدر نے تنبیہ کی ہے۔ "ایسے لوگ یا تو محبت کرتے نہیں۔ اگر کریں تو پھر اپنی ذوق کر محبت کرتے ہیں کہ اس کی گہرائی کو اپنے والا کوئی پتا نہ آجیاد ہو ہی نہیں سکتا۔" سونیا نے نکل نکل کر کہتے ہوئے کہا۔ "بہت گہری بات کر دی ہے۔ میری محبت کو اپنے کے لئے کوئی پتا نہ آجیاد کر یا۔" حیدر نے ہاتھ سے بیوی کو دیکھا۔

"آنے والا ہے نہ؟" حیدر نے پوچھا۔ "ذرا مہینہ بھر مہینے۔" وہ بھی خیر انداز میں اپنے وجود کی طرف دیکھتے ہوئے بولی جو کہ واضح "تجدلی" کا اعلان کر رہا تھا۔ حیدر سرگرا دیا۔ مگر اس کا ذہن مسلسل حیدر کی اوجھا ہوا تھا۔



اس کی بھوک تو ناکامی کی خبر سن کر ہی مر گئی تھی۔ اس نے بے دلی سے طرے دھکیلی اور اٹھ کر بیٹھ لے پاس آ گیا۔ اس نے سائیکل کی دروازہ کھولی اور اندر سے ایک لٹاؤ نکالا۔ پھر بیٹھ پر اٹھتی پانی مار لے بیٹھ گیا۔ لٹاؤ اس نے بیٹھ پر اتار دیا۔ اندر سے کھٹ کی تصاویر کا ڈھیر نکلا۔ وہ ایک ایک تصویر کو دیکھا جاتا تھا۔

"ایک اور جگہ سے تمہارا برتنان ڈھونڈ رہا تھا۔ خدا کرے مل جائے۔" وہ دیر لب بڑبڑایا۔ غامی یہ وہ ان تصاویر کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر اپنی الماری کے پاس آیا۔ اس نے الماری کے پتھوے اور وہ سے گھنٹا نکالا۔ بہت عرصے بعد اس کے ہاتھوں میں گھنٹا آیا تھا۔ وہ بیٹھ پر بیٹھ گیا۔ لٹاؤ کی طور پر لی کی اٹھیں نے گھنٹا کے تاروں پہ وہی دھن چھیڑ دی تھی جو اس نے اکثر کشف کو داکھن پہ بجاتے تھے۔

غامی دیر تک وہ گھنٹا بجاتا رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خیلوں کے پردوں پر بس ہی کی کھیل کی چھاپ تھی۔ کل اسے پھر کشف کو ڈھونڈنے لگنا تھا۔ کیونکہ صرف وہ روز ہی ہوتی تھیں۔ تیرے دن اسے ہر حال میں اپنی ڈھونڈنی پڑا تھا۔



اگلی صبح وہ یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ صاف کے فیڈر اسٹنٹ پہنچ کر اس نے پروفیسر کرمانی کے حلقہ چلا پتہ چلا کہ ان کا کچھلے سال انتقال ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا سر کھڑا کیا۔

"کہاں تھائی کروں تمہیں؟" حیدر ہر تنان بھیہ متا چلا جا رہا ہے۔ مجھے تم تک پہنچنا ہے۔ چار اہل۔ چار سالوں کا ہر ایک مہینہ۔ ہر مہینے کا ہر ہر دن اور ہر دن میں گزرنے والے گھنٹے، گھنٹہ اور ایکٹھ میں نے سوچا تھا کہ بس اب تم سے ملنے کی گھڑی دور نہیں..... میں تمہیں تمہاری وہ وہ شخصیت کے سانچے میں ڈھل کر تاناں گا۔ اور دیکھو! میں تمہارے ہی پسند کے سانچے میں مل چکا ہوں..... کشف اب میں تمہارے کھیل سے نکل کر تمہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ اسنے اس لئے تم سے ملنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی کہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ آج جب وعدہ

پورا ہو گیا تو اب تمہارا کوئی نشان نہیں مل رہا۔ کہاں ہو تم؟..... لوٹ آؤ۔۔۔۔۔ میں انتظار رہا ہوں۔

وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے مسلسل سوچوں میں غلط تھا۔ اس نے رابہ کو ڈھونڈنے کی بھی کڑا کی۔ شاید اس کے ذریعے کشف کا کچھ اکتا پڑل جائے مگر بے سود۔

یہ وہ دن اس نے صرف اور صرف کشف کو ڈھونڈنے میں صرف کر دیے تھے۔ صبح سے وہ کار لے کر لاکھوں رات گئے واپس لوٹا۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کی فکر۔ نہ نیکروں کی پرواہ نہ آرام و صیانت۔ بس خیال تھا تو یہ کشف کا کوئی نشان مل جائے۔ اس کا کوئی کیل مل جائے۔ مگر پورا کراہ چکان لینے کے بعد بھی اسے اس کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔

آخر تیسرے روز شام میں وہ مایوس سا دایہ کی لے لٹا تھا۔ روئے ملی خان نے اس سے کہا: ”بھئی تمہارے وہ اتنی کم چٹھیاں لے کر کیوں آیا ہے۔ تو اس نے بھانہ کر دیا کہ کسی ذاتی کام سے آیا تھا۔ دس بجے وہ تھکا ماندا مگر پچانچا تو ایسا سو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے کھل اور ملازم کو کال لے کر کہا۔

”کہنا نہیں لیسے کمر؟“ ملازم نے پوچھا۔

”نہیں۔ صرف کافی آؤ۔“ وہ بیزار سی ہو گیا۔

”آپ کی غیر موجودگی میں نوید اللہ صاحب آئے تھے۔“

”اچھا..... کچھ کہہ رہے تھے؟“

”بس آپ کا پوچھا تھا۔ کہہ رہے تھے صاحب آئیں تو بتا دینا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ تیمور بیڑ پر دروازہ ہو گیا۔ اس کا ذہن صرف اور صرف کشف کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ برسوں پہلے جس بے چینی نے اس کے اندر دھک دیا تھا وہ اب جو کچھ عرصے سے نظم، نظم کی اسی بے چینی اور اسی کیفیت نے دوبارہ جمل لے لیا تھا۔ وہ اسی بے نامی اضطرابیت کا پھر شکار ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ نماز پڑھنے سے بھی وہ بے تابی کی کیفیت ختم نہیں ہو رہی تھی۔ مگر اس بار شراب کا سہارا نہیں لے سکتا تھا۔ اس بار اس نے نماز اور قرآن کا سہارا لیا تھا اور اس کی اس کلیہ میں وہ کسی کی بھی آجانی۔ جیسے کسی نہ سکون کی بھیل کے ظہرے ہوئے پانی میں کوئی بڑا سا پتھر پھینک اترتا تھا۔ پانی پکرتا ہے اور چند لمحوں کی شدہ بھیل کے بعد اس پانی کی سطح پر اس ارتعاش کی شدہ ہوتی جلی جلی جاتی ہے۔ اور پھر سے کوئی بڑا سا پتھر دروازہ اور انداز میں پھینک کر پانی میں پھینک جاتا ہے۔ اس کے اندر بھی ایسی ہی کیفیت پھیل رہی تھی۔ نماز اور روزے سے اس کے اندر کی بے سکونی گرا کر ازل جاتا تھا مگر بعد میں وہی اضطرابیت کا عالم دوبارہ ہو جاتا۔

وہ ان دنوں بہت زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔ کام کا بوجھ اس قدر تھا کہ اسے سانس لینے کی فزہ بھی نہ تھی اور وہ اس مصروفیت پر خوش تھا کہ کام کے دنوں سے کم از کم اس کی اضطرابیت میں تو کمی جاتی تھی۔ وقتی عی کسی۔

حیدر نے حسب وعدہ چندہ دنوں کے بعد اسے فون کیا تھا۔ ”سہارک ہو بھئی..... غامی اچھی خبر ہے۔“ وہ مسکرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”سپیشل کری ایٹ مسٹر۔ جلدی بلو۔“ وہ جڑ بڑھ کر بولا۔

”عد ہوگی تیمور اتم تو بالکل سلی بھی گئے کام سے۔“ حیدر نے منہ بنایا۔

”تمہیں میری فیلنگز کا اندازہ نہیں ہے؟۔“ تیمور آہستہ سے بولا۔

”اچھا! اچھا!۔“ حیدر نے بھی تو ”تمہاری“ کشف کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا۔

پارے اس کی بات کانٹے ہوئے ”تمہاری“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بھئی تم نے تمہی کئی ڈھونڈ

ہے تھے، وہ تو تمہارے مگر کے پچھڑا دیے ہی رہتی ہے۔“

حیدر کی بات پر وہ اب بھی کے انداز میں سر کھانے لگا۔

”کیا مطلب؟“

”بھئی تو وہ تو ای گاؤں میں سماجی خدمت گزار ہے جہاں کا نقشہ ہی تم نے بدل دیا ہے۔“

”واٹ؟..... کیا تم کو یقین ہے؟“ وہ اچھل پڑا۔

”بھئی میں نے مراد سے سونا کے ڈریس اس کا اتنا پتہ لے لیا تھا۔ وہ وہی وہ رہی ہے آج

فل۔ اور نوید اللہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔“ حیدر نے بتایا۔

”اُدو۔۔۔۔۔ شکر ہے خدایا!۔“ تیمور کے دل پر سے جیسے چٹان سرک گئی تھی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں آج

لاہاں جاتا ہوں۔“ حیدر نے تیمور کی میری خاطر بہت خوشی سمجھی۔

”شٹ اپ۔۔۔۔۔ یہ فارمیٹی اپنی کشف کو دکھانا۔“ سمجھے؟“ حیدر نے اسے ڈنکا۔ ”اچھا، مجھے

فرجی“ جلدی سنا۔ ”حیدر نے کہا اور اس نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔

”موسو۔۔۔۔۔ مس کشف عارفین عادل اتم میرے بالکل سامنے تھی مگر مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور

ن روز وہ نوید اللہ کے کمرے میں نے تمہاری آواز کو اپنی ساتوں کا فریب سمجھا تھا۔ وہ کوئی فریب نہ

نام۔ تم اس روز میرے بالکل سامنے تھی اور میری نظر نے مجھے دھوکا دے دیا۔ سو کشف عارفین

بال! آج جبر اور انداز کی گڑباز تمام ہو گئی۔۔۔۔۔ انتظار کے ان ٹھنڈے ٹھنڈے دو درجے لوگوں میں

بہم میرے لئے خیر راہ تھی، جب میں سوچتا تھا کہ کس..... دن دن آنے میں کوئی دیر نہیں

ب میں تمہارے سامنے سرخو کھڑا ہوں گا۔ اور آج، اس جلی میں ہے سوچ رہا ہوں کہ میں کس طرح

لہار سامنا کروں گا۔ کشف! میں کیا احتیاج بندہ ہو سکتا ہوں کہ تمہیں سامنے دیکھ کر خود پر قابو پا

لوں؟ بس بہت کم وقت رہ گیا ہے پر دے بیٹے میں۔ اور جب بھر کے پر دے کریں گے تو کیا میں

تمہارے سامنے کھڑا رہ پاؤں گا؟..... میں کس طرح تمہیں مخاطب کروں گا؟ میں کیسے گزروں

مے سالوں کا ایک ایک جمل تمہیں کنواؤں گا؟..... وہ ہر ہل، وہ ہر قدم، وہ ہر ساعت جب میں نے

تمہیں محسوس کیا، جب میں نے تمہیں اپنے ساتھ ملا اپنے دل کی دھڑکنوں پر جب میں نے تمہیں

فہم کرتے دیکھا، اپنے خیالوں کی وادی میں تمہیں آزادی سے مگھانے سنا، جب میں نے تمہیں ہر

”تجور! خدا کے لئے مجھے بچا لو..... یہ دندہ یہاں بھی آپہنچا ہے..... تجور.....“ کشف کی اڑکھ پہ لکھ ڈھونڈ چلی گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتی کن کر تجور کے اعصاب مزید تن گئے تھے۔ اس نے گیت کو زور سے دھکا دیا مگر وہ اندر سے بند تھا۔

”گیت! اندر سے الگ ہے کشف!..... کھلو.....“ تجور نے اس بار اور زور سے کہا۔ ”چاہی نہیں ہے۔“ کشف کی آواز آئی اور ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلتی دلخراش چیخ بھی سنائی۔ تجور کے لئے مزید انتظار کرنا ناممکن تھا۔ اس نے ڈرامیور کو نیچے جھکنے کا اشارہ کیا۔ گیت خاصا بلند اور بغیر دست کی کسی چیز کی مدد کے اندر داخل ہوتا ممکن نہیں تھا۔ پھر گیت پہ کانٹا تار بھی لگی نظر آ رہی۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ گیت کو پھلانگ کر اندر جاتا۔ اسے اندر پھلانگنے کے لئے کانٹوں کی بازو کو پار کرنا تھا.....!



ہر ہل اپنے وجود کے اندر روشنی بن کے سراپت کرتے دیکھا۔ میں کیسے بتاؤں گا جہیں اپنی بے قرار یوں کی داستان؟..... میں کیسے تم سے اقرار و قار کروں گا؟..... برسوں پہلے ایک اکابر کا یہاں تھا۔ میں نے مگر اس وقت یہ ترپ، یہ کنگہ، یہ احساسات کہاں تھے؟..... اب تو لگتا ہے کہ میں، میں نہیں رہا، تم بن گیا ہوں۔ میری ذات میری نہیں رہی، کشف عارفین عادل کی ذات میں وصل ہو گیا ہے۔ کشف! کیا یہی وہ مشق ہے جس کا ذکر تم نے اپنی کتابوں میں کیا ہے؟..... کیا یہی وہ معرمان ہے جسے چالے تو انسان امر ہو جائے؟..... جہادری موت نے مجھے مشق کا تہرہ پتکایا ہے اور اس مشق نے مجھے میرے رب سے ملایا ہے۔ اس مشق نے مجھے اپنے کامل مقصد دیا ہے۔ اس مشق نے مجھے سمجھ سے ملایا ہے۔ اس مشق نے مجھے میرے رسول اللہ ﷺ کی محبت کا احساس دیا ہے۔ اس مشق نے مجھے دونوں جہاں کا علم دیا۔ اور اس علم نے احساس سے روشناس کر لیا۔

وہ مسلسل سوچوں میں غفلان تھا۔ اس وقت وہ اپنی سرکاری جیب میں بیٹھا تھا۔ اس نے آفس سے ی فون کر کے لی اس کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ ضروری کام سے گاؤں جا رہا ہے اور آفس آئنگ کے ختم ہوتے ہی وہ قہانے سے نکل گیا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ سردیوں میں شام کے اندھیرے کے ساتھ ہی رات کی تاریکی بھی چھا جاتی تھی۔ اس روز بھی جب وہ گاؤں کے لئے نکلا تھا تو جب اندھیرا مگر ابو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پہنچنے پہنچنے اسے رات کافی ہو جائے گی۔ مگر وہ صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے بڑے تھے اور اس کے لئے ایک ایک ہل کا ٹھکانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ہی نظام میں ہی لمبوس تھا۔ راستے میں اس نے ڈرامیور کو کھانا کھلا دیا تھا اور خود صرف چائے پی تھی۔ بھوک تو اس کی دیرپے ہی سر ہو چکی تھی۔ پہلے کشف کو کھانے اور اس کے انتظار میں ابو اب اس سے ملنے کی گھڑیاں آنے میں بھی ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے تھے۔

جس وقت وہ گاؤں پہنچے تھے، رات خامی ہو چکی تھی۔ گاؤں میں تو یوں بھی سرد شام کتے بھونکتے تھے ہیں اور آج کل تو قہانے بھی سردیوں کا موسم۔ مگر سناٹے اور مکمل اندھیرے کا راجہ برسر تھا۔ تجور نے راستے میں ی فون کر کے نوید اللہ سے کشف کے مگر کا ایڈریس حاصل کر لیا تھا۔ یہ جگہ اس کی کئی پار کی دھکی بھالی تھی۔ لہذا اس جیسے ذہن کے بندے کو بھٹنے کے لئے اشارہ ہی کیا ہوا تھا۔ وہ مین اس کے مگر کے گیت کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اندر سناٹا تھا۔ گیت لائٹس بھی آف تھیں۔ چونکہ اندر بچانے کہاں تھا۔ ابھی وہ اترنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے کشف کی تیز بیڑوں کی آواز سنائی دی اور اس جیسے مضبوط اعصاب کے بندے کا دل کانپ گیا۔

”سر جی!..... اندر کچھ گڑبڑ ہے۔“ ڈرامیور نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ہوں.....“ تجور اور ڈرامیور دونوں ہی گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ اس وقت اس کا دل کانپ رہا تھا اور وہ عا کر رہا تھا کہ کشف کتنی جیت ہو۔ اس نے ہونٹوں کو بری طرح کاٹا۔ ”کشف!..... کشف! میں تجور ہوں..... دروازہ کھلو!.....“ تجور نے گیت کے قریب منہ کر کے تقریباً بچا کر کہا۔

مذہبن پر ان کے برے اثرات پڑتے ہیں۔ بس یہی کامسکایا گیا ہے۔ اس کا ذہن اتنی کم سن
نکشر ہوا تھا کہ اب اس کے مسد کرنے کے پاس صرف ایک فیصد ہیں۔ میں بہت مرتبہ اس سے
برکچا ہوں مگر وہ کسی بھی طرح ماننے یا سمجھنے پر راضی ہی نہیں ہوتی۔ ویسے بھی لندن میں کسی کے
انتانت وقت نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی باتوں یا سمجھانے پر دھیان دیں۔ وہاں لوگ وہی کرتے ہیں جو
وہاں کہتا ہے۔ ”پروفیسر کربانی کھڑے رہے۔“

”میں۔“ یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ کلاڈ یا سنوار تو مگر کی چار دیواری سے ہی متعلق ہوتا
مگر کے اندر کی فضا خوش گوار ہو، محبت سے نگہری ہو تو پی مضبوط شخصیت لے کر وہاں چڑھتا
اور اگر مگر کے ستون ہی نکرو رہوں تو دیواریں اور محبت کیسے باقی رہ پائی گی؟“ ”کشف نے سر
لے ہوئے تاسف سے کہا۔ اس کے تصور میں تیسرے طبعی خان موجود تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا سا، ناراض
فریسا۔“

”کجی کجی ہو چلی والدہ اور والدہ مگر کے ستون ہی تو ہوتے ہیں۔ ستونوں کا میٹرل خراب ہوتا
یا مگر ہی خطرے میں رہتا ہے۔ اس معاملے میں پھر ہمارا ملک بہت بہتر ہے۔ بے شک بہت
دھمکیاں ہیں، ہوائیاں ہیں یہاں مگر بہ حال پھر بھی ہمارے یہاں مگر اتنی جلدی نہیں ہوتی۔
زیر اس آگہی کا نہیں تب بھی مصالحت کی لپیاں پوتی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ مگر یورپ میں کبہرہ مائز کا
لب کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ وہاں تو رہتے دھاگے سے بھی زیادہ کچے ہوتے ہیں۔ بس ہاتھ کا ہلکا سا
کاہی کافی ہوتا ہے اور رشے کی ڈور ٹوٹ کر انگ انگ ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں پھر بھی
نول کا بہت احترام کرتے ہیں۔ خاص طور پر عورت کی لپک اور طبعیت نے ان رشتوں کو جوڑے
لیے ہیں۔“ ”بھئی“ کا کام کیا ہے۔ دراز چاہے کتنی ہی مگر ہو، عورت اپنی مصالحت کے سینٹ سے
بہرہ روتی ہے۔“ ”پروفیسر کربانی کھڑے رہے۔“

”یعنی مگر کے ٹوٹے یا جڑنے کی ساتھ فیصد وید عورت ہوتی ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”بالکل..... دیکھو نا بھئی! اگر مرد میں لپک کی خرابی ہوتی جو کہ عورت کا خاصہ ہے تو پھر اسے
نی لائق میں دیوار پیدا کرتے۔ مگر اس خرابی کی زیادتی سے خدائے عورت کو نوازا ہے۔ سو مردوں کو
انے میں 65 فیصد عورتوں کا ہاتھ ہوا۔“

”مگر سہاوی عورت تو مگر بنانے کے پیکر میں ظلم بھی کتنی ہے۔ اور کتنی ہی خواتین ایسی ہیں
نہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ ظلم کا شکار ہو رہی ہیں۔“ ”تفصیل کا سلسلہ پڑی بدل چکا تھا۔“

”ہاں..... یہ ہمارے قوم کی بد نصیبی ہے کہ ان میں سے ایسے نہیں ہیں کہ قوت کی پیمانہ کریں اور
قلم کے خلاف سر اٹھائیں۔ اور تم جیسے لوگوں کا دشمن ان دونوں میں سے ایسے نہیں (شور) پیدا کرتا ہے۔“

”ہم اتنی رات؟“ ”پروفیسر کربانی آخر میں بہم سنا کرتے۔“

”کریکٹ سرائیر سے مشن میں یہ چیز بھی شامل ہے۔ یہ بہت ہی اہم پوائنٹ ہے۔ میں آپ سے
ان سلسلے کے متعلق کچھ بات بھی کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو کشف! لندن میں بھی آپ اپنی ذہانت کے جھنڈے کا ڈھکے لگائے۔ ویسے کیسا لگا تھا ان
نوں میں؟“ کیا احساسات تھے؟ ”پروفیسر کربانی اس سے پوچھ رہے تھے۔ اس وقت وہ ان کے
مگر کے ذرا لگ دم میں بیٹھی تھی۔ پروفیسر کربانی نے بطور خاص اسے جانے پر بلوایا تھا۔

”سرا ج پوچھتے تو میں ڈری ہوئی تھی۔ وہاں میرے ہمراہ بہترین مصالحتیں اور بہترین دماغوں
والے لوگ پڑھتے تھے۔ ان سب کے درمیان اپنی جگہ کو نمایاں بنانا جو ہے شیر لانے کے حراف تھا۔
وہاں ہونے والے عطف تجربات نے مجھے مختلف سبق دیے تھے۔ میں نے وہاں وقت کی قدر کرنا
سیکھا ہے اور وقت کو کیسے صحیح استعمال کیا جائے یہ بھی۔ وہاں کے لوگوں کی زندگی بے شک مشینی ہے مگر
وہ لوگ بھی ”فصیح“ نہیں کرتے۔ نہ وقت کا نہ اپنی مصالحتوں کا۔ ایک اور چیز جو میں نے وہاں سیکھی
ہے وہ یہ کہ وہ لوگ اپنی جگہ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ سرا ان سب چیزوں کا اقتدار ہمارے لوگوں
میں ہے۔ اگر ہمارے لوگ یہ سب سیکھ جائیں تو ہمارا ملک بھی لندن، امریکہ جیسے ممالک میں شمار
ہونے لگے۔ ہم مسلمانوں کی تمام تر خوبیاں ان لوگوں نے اپنا رکھی ہیں۔ انہوں نے ہم سے ہی سیکھا
ہے۔ مگر وہ سیکھنے کے بعد اس چیز کا کچھ سے استعمال بھی کرتے ہیں۔ جبکہ ہم لوگ تو خود اپنے ہی
بنائے اصولوں اور اساتذہ کو بھول چکے ہیں۔ سرا مجھے وہاں اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر نفوس ہوتا تھا۔
وہ کہتے کہتے تری۔ اس کے ذہن کے پردے میں کئی شکلیں ابھریں۔ جن میں سب سے کراہ
صورت ارمین کی تھی۔“

”میرے ہم وطن وہاں جا کے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کون ہیں؟..... میں نے وہاں ایسے
استاذین کو دیکھا جو جرنل کو مہمانی کا سامان سمجھتے تھے یا پھر پاؤں اوپر کرنے کی کج جگہ بہت
معدرت کے ساتھ سراسر اقرارہ اہمیں کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ وہ اپنے پیر میں کے ساتھ نہیں رہتی
ہے بلکہ جس انارمنٹ میں وہ رہتی ہے وہاں کا حال نہ پوچھیں۔ آپ اسے سمجھتے کیوں نہیں؟“ اس
نے بات کے آخر میں ہنسنے ہوئے کہا۔

پروفیسر کربانی نے ایک گہری سانس لی اور پھر بولے۔
”وہ بگنی وہاں کے بزاروں انکھوں بچوں کی طرح گھلے جھگڑوں کا شکار ہے۔ اس کے پیر میں
میں ہمیشہ جھگڑے ہوتے تھے جس کے لیے حدیثی اثرات اس کے ذہن پر مرتب ہوئے۔ وہاں ہ
سب عام کی چیز ہے۔ ہر سو میں سے پچانوے فیصد مگر میں جھگڑے ہوتے ہیں اور بچوں کے

”گھو“ پروفیسر کہانی بہت عجیب تھی۔

”سرا“ فتح“ نامی ادارے کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا؟“

”ہاں،..... بہت پرانا اور بہت ہی اچھا ادارہ ہے۔ عورتوں کے مسائل پر خاصی اہم کارکردگی دکھا چکا ہے۔“ پروفیسر کہانی نے سر ہلایا۔

”مجھے اس ادارے کے چیز میں سے جاب آفر کی ہے۔ پوسٹ بہت اچھی ہے مگر بے حد اداری ہے آپ کی کیا رائے؟“ اس نے مشورہ طلب کیا۔

”مخلی اور پوچھ پوچھ۔ ارے بھی تم کو تو پہلی فرصت میں اس ادارے کو جواں کر لینا چاہئے۔ تم جیسے لوگوں کی بھرپور ہی سے تو ایسے ادارے صحیح طور سے کام کر سکتے ہیں۔“ انہوں نے اس کی ”ا“ بندھائی۔

”ٹھیک ہے! میں کل ہی ان سے مل لوں گی۔ اور ہاں، سرفتوی ادیب صاحب آپ کو بلا دے رہے تھے اور پیغام دیا ہے آپ کے لئے کہ آپ کو جب بھی فرصت ملے ان سے ضرور ملیں۔ اسے یاد آیا۔

”ہاں میں خود بھی ان سے ملنے کا سوچ رہا تھا۔ یعنی، خاصے دن مگر مجھے ان سے ملا تا ہوا۔ تم کہہ ملیں ان سے؟“

”میں پرسوں گئی تھی۔ انہوں نے بھی مجھے چائے پر بلایا تھا۔“ کشف نے بتایا۔

”اچھا، اچھا..... بھی کشف عارفین عادل کو چائے پر بلانا بھی ایک سعادت ہے۔“ سکرانے۔

”کیوں شرمندہ کرتے ہیں سرا؟“ وہ چیخ پڑی۔

”یہ مذاق نہیں ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ ہر گھر میں ایک کشف ضرور پیدا ہو۔“ وہ محبت اور غلوں سے بولے۔

”یہ آپ کی محبت ہے سرا؟“ اس نے اگساری سے کہا۔ ”اچھا اب مجھے اجازت ہے؟ انتہاء اللہ“ فتح“ کی خبر کے ساتھ آپ سے ملوں گی۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”میرا دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“ وہ شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

کشف جب وہاں سے اٹھی تھی تو وہ سوچ رہی تھی اب اسے اگلا قدم کون سا اٹھانا ہے۔ وہ سن ہی من میں سارا پلان ترتیب دے رہی تھی۔

اگلے چند روز بے حد مصروف گزرے تھے۔ وہ ”فتح“ کے ادارے کی جزل فیجریں چلی تھی۔ اہلی اس کامیابی کی خبر اس نے اپنے شفیق استاد کو بھی۔ عارفین عادل بے حد مسرور تھے۔ کشف کی پڑوسی ہوئی کامیابیاں جہاں ان کے سر کو فخر سے بلند کرتی جاری تھیں وہ ہیں تیسری فکر میں اپنے عروج کو چہرہ

رہی تھیں۔ انہیں بے وقت ایک ہی فکر پریشان رکھ رہی تھی کہ کشف کی شادی کب ہوگی؟..... اور شادی تو جب ہوتی نا جب وہ کسی رشتے پر ”ہاں“ کہتی۔ اس کے لئے اب خاندان سے باہر سے بھی

”آ رہے تھے اور اسے اچھے کہ لیرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہی میں سے کسی ایک کا ہاتھ چکر بات اس کا لٹا کشف سے کرنا دیتی۔ مگر کشف کا انکار مسلسل بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”بہی شادی کر کے میں اپنا سارا کیا کر لیا پانی میں نہیں ڈبو سکتی ام؟“ اس کا جواب ہمیشہ ایک سا تھا۔ لیرہ اس پر کھڑکے رہ جاتی تھی۔

”ارے اگلے برس سنا نہیں کی ہو جائے گی۔ اس عمر کے بعد کن پر بیٹھے گا ہے؟..... ہال سفید کمزولی میں بیٹھے گی؟“ وہ سبک اٹھیں۔

”ام! شادی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ پھر آپ اس بات پر تو یقین کرتی ہیں نا کہ جوڑے نوں پر بننے ہیں۔ بس اگر میرا جوڑہ ہو تو ایک دن وہ خود سامنے لے گا اور میں انکار نہیں کر پاؤں“ وہ دھڑکی سے کہتی۔

”تیرے باپ نے سر چڑھا رکھا ہے بس۔ سامنے آئے گا۔ ارے کیا سلیانی چادر اوڑھے ہوئے سامنے نہیں آ رہا؟“ وہ نیسے اور ناراضگی سے چلا اٹھیں۔ کشف ان سے بحث فصول ہی سمجھتی اور لی سے اٹھ جاتی۔

اس نے آفس جوائن کر لیا تھا۔ کام بے حد مزدوری کا تھا اور کام کا بوجھ بھی زیادہ تھا۔ کشف نے لیرہ کی اور مزدوری کے ساتھ اپنے کام کو سنبھال لیا تھا۔ یہ ادارہ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے رہا تھا۔ خاصا مقبول ادارہ تھا۔ کشف جانتا تھا کہ اس کے ساتھ اپنے کام میں جتن لگتی تھی۔ مصروفیات بھجلی تھیں کہ اسے شون کا بوش تھا، نہ رات کا خیال۔ انہی مصروفیات کی تہوں میں اس نے لی خان کی یاد خیال کو بھی دفن کیا تھا۔ اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی ہیں۔ کے قلم کی دھار کی تھوڑی دھار کی طرح تیرہ جی جو بہت سے انہی نمروں کے سینوں میں گھس کر لہلہا کر رہتی تھی۔ کائنات کا نام ایسے عناصر کے لئے ایک جینچ بٹا جا رہا تھا۔ وہ ایسے بات چیتی تھی جن پر لکھتے تو رکنار لوگ ان پر بات کرنے سے بھی کراہتے تھے۔ مگر وہ نا سکی اور لحاظ سے لکھ دیتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے کام کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے لاتی تھی۔ اس کو اس ادارے میں کام کرتے چارہ گزر چکے تھے اور ان چارہ بیٹوں میں کشف ان عادل کا نام ہر ایک کی زبان پر آ چکا تھا۔

انہی دنوں مرادی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش تھا۔ کشف اس کو دیکھ کر سوچتی کہ یہ شخص اس سے محبت کرنے کے دعوے کرتا تھا اور آج اپنی نئی زندگی کی رعنائیوں میں اتنا گھمکھا رہا ہے اسے اپنی یاد بھی یاد نہیں تھیں وہوں چوایک روز اس نے ہمارے گھر کے آگن میں بے حد سے کھانے کی دھج

میدانم لی لی ایس کر کے ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ اس کا خواب تھا کہ وہ اپنا پڑیشن کے لئے بھاگے۔ کشف نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا خواب ضرور پورا کرے گی۔

پورے حلق کشف کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے۔ بس وہ اس کے بارے

ایک ماہ ہے۔ وہ کہہ کر بچانے کے لیے اڑی چلی کا زور لگا رہا ہے۔ ”وہ بھیجی سے کہہ رہی تھی۔“
 ”تو لگے دیں۔“ خزان کو بھی اپنے بیٹے کے بچاؤ کے لیے اچھے دواؤں مانے کا حق حاصل
 ہے مگر ہم یہی کہہ کر نہیں۔ ایسے کتنوں کو خوب حق سمجھا چکے ہیں۔ آپ گھر نہ کریں۔ آئی ول پنڈل۔“
 مدلل سچ نے اسے عام سے انداز میں کہا کہ وہ حیران ہو گئی۔
 ”آپ کو نیشنل میں ہوتی اسے مشکل کیسز پنڈل کرنے ہوتے ہیں؟“ وہ پوچھتے بغیر نہ
 ل۔

”شروع میں قوتی تھی۔ بالکل آپ کے جیسے۔ اب عادت ہو گئی ہے۔ آخر دس بارہ سالہ تجربہ بھی
 لا یعنی رکھا ہے۔“ وہ اطمینان سے مسکرائے۔
 ”لوگے۔“ وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”ویسے اس کے باپ کا مجھے دو بار دمکی آمیزخون آن چکا
 ہے۔“ وہ ہاتھ لگئی۔

”اچھا۔ کیا کمر ہاتھ؟“ آصف علی نے چونکے۔
 یہی کمر سبز زردوں کے لئے یہ کھیل حلق ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے بیچ اس عمر میں یہ سب نہیں
 ہے تو کسے کیا لڑ کلاس کریں گے؟..... اور یہ بھی فرما رہے تھے کہ وہ معمولی ملازمہ تھی تو
 کسی شہر کی بیٹی تھی۔ اور اگر یہ کمرش اور چاہوں تو ان سے بالکل چپکے لڑائی مرضی
 اس پر بھڑکتی ہوں وغیرہ وغیرہ۔ وہ مختصر کا خلاصہ بیان کر رہی تھی۔
 ”اچھا تو پھر آپ نے کیا جواب دیا؟“ آصف علی نے غصیدگی سے پوچھا۔
 ”جواب تو میں بہت اچھا اس صورت میں دے سکتی تھی جب وہ یہ عجیب شخص میرے سامنے

”ایچھا۔ کیا کر تھیں؟“ آصف ملی فتح نے اشتیاق سے پوچھا۔
 ”اس کے منہ پر ایک زوردار طرغی رسید کرتی اور موربختی کر لیتی دونوں بیٹیوں کے بارے میں ایسا
 بدل کرو۔ اگر انہیں کوئی درد نہ اپنی ہوس کا شکار بنا کر چلا ڈالے تو کیا ان کے بارے میں بھی اتنے
 ”نیک“ خیالات چٹھر کر دے؟؟؟؟ محرم اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ میرے سامنے نہیں تھا۔ میں
 نوں بند کر دیا تھا۔“ وہ دانستہ میسے ہوئے کمرہ پر تھی۔

”ایسے ہی بے خبریوں سے یہ معاشرہ بھرا ہوا ہے کشف! ابھی تو ابتدا ہے۔ یہاں جذبات سے مارا گیا ہے ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے بی کنٹرول۔“ وہ ہنسی کی سے بولے۔

”میں سر! وہ دوسرا بلاتی ہوئی مڑی۔ اصف علی حج کی نظر اس پر جمی ہوئی تھی۔

”اے ہاں، میں تو بھول ہی گئی تھی۔“ وہ یکدم مڑی اور اصف علی حج اس کے اچانک مڑنے پر جا کے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ مگر کشف کی توجہ اس طرف تھی ہی نہیں۔ ”یہ فائل آپ نے منگوائی ہے؟“

”جی ہاں بی بیس کی۔“ اس نے فائل اٹھا کے ان کے آگے رکھ دی۔

”جیکس!..... اچھا کشف! کل دو دن ویلفیئر ایجنسی انٹرن کی میٹنگ ہے بی بی کلب میں۔“

میں کچھ بھی خبر رکھتا نہیں جانتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیور کو دیکھے اور اس کا دل کھٹکنے لگے۔ ۱۰۔
 بھی جانتی تھی کہ جیور اگر اس کے لئے واقعی پیغمبر ہے تو ایک تا ایک روز وہ خود اسے (موصوفی سے) ۱۱۔
 وہ اس کا یقین نہیں کرتا جانتی تھی۔ جیور بھی کمزور شخصیت ہے مگر دوسرے کے وہ ایمان دہی نہیں آتا ۱۲۔
 تھی اسی لئے وہ اس کو سنا بھی نہیں جانتی تھی۔ جانتی تھی کہ جتنا وہ اس کو سوسے گی اتنی ہی کمزور ۱۳۔
 چلی جائے گی۔ اور وہ خود کو کمزور نہیں بتانا جانتی تھی۔

محبت ہی تو صرف زندگی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محبت میں اعتبار کنیٰ شرط ہوتی ہے۔ جس میں اعتبار نہ ہو اس کی وفا کا بھروسہ کس طرح کیا جائے؟..... محبت تو جس جذباتی ہی ہوتی وقت کے ساتھ ساتھ ایسی محبت کے رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔ اور جس محبت کے رنگ باڑا ہووے کے ساتھ پھیکے پڑنے لگیں ایسی محبت کہاں قابل بھروسہ ہو سکتی ہے؟ اور کیا اسے ہم محبت کہہ سکتے ہیں؟ یہ تو محض اڑکیشن ہوگی۔ اور جس کی اڑکیشن کا نشانہ نہیں بن سکتی۔ ویسے ہی، علی خان کو کئی نئی سرحدوں کی تلاش رہتی ہے۔ وہ کب کب ایک سرزمین پر ٹھکانا بنانے کا ہے؟..... چلو دیکھتے ہیں، ابھی تو وقت باقی ہے۔

وہ سوچوں میں ڈوبتی ہوئی گئی۔ والسن کی ذہن میں گھٹی اپنی ذہنی تحن اتار رہی تھی۔

فانبرن عادل نے بیوی بچوں سے مشورہ کر کے گلشن اقبال کے علاقے میں زمین دیکھ کر اس مکان تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا۔ یہ علاقہ بہت صاف ستھرا تھا۔ یہاں رہنے والے بھی خاتون لڑکے تھے۔

اُس نے بندہ روزے پر دھک دی اور ”میں“ کی آواز سن کر اندر آگئی۔
 ”آجے کشف!..... کچھ کام تھا؟“ ریا لوگ جیتر پر برا جہان آصف علی فتح اسے دم
 مٹرائے۔

”جیسر! ایک ضروری بات کرنی تھی۔ اگر آپ فارغ ہو تو۔“ ٹکٹ بولی۔
 ”فارغ کہاں ہوتے ہیں ہم۔ ہم مگر ضروری باتوں کے لئے وقت نکالنا بھی ایک ضروری کام کا ہے۔“ وہ ٹکٹ سے بولے اور ساتھ ہی اسے بیٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ ”ٹکٹس“ سمجھی ہوئی ایک کڑی جینہ مٹی۔ ہاتھ میں پکڑی ناک اس نے میز پر رکھ دی۔ آصف علی فتح جو کچھ کہنے میں مصروف انہوں نے قلم بند کیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”زہرا! یہ کیس کیس کے بارے میں بات کرتی ہے۔“ اس نے بات شروع کی۔
 ”زہرا! یہ.....“ وہ روپ کیس جس کو بعد میں زعدہ جلا کر مارنے کی کوشش کی گئی تھی؟“ انہ
 نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”جی ہاں..... سزا لوگ بہت اشد و گہر پڑیشن رکھتے ہیں۔ اس لڑکے کیس کا باپ بہت اہ

اس کی باتیں آنکھ بری طرح سوتی ہوئی تھیں۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔ اس کے پورے جسم کو پھار سے گردن تک ڈھکا گیا تھا۔ کشف کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ وہ بے ہوش لگا تھا۔ اسے ہوش کے عالم میں بھی اس کے ہونٹوں سے سیکیاں نکل رہی تھیں۔

"اس کی ماں کو ہوش آیا؟" کشف نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"وہ تو جب سے ہی بے ہوش ہے جب سے اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھا ہے۔" وہ لوگ باقی رہے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ ڈاکٹر نہایت سانس سے بتا رہی تھی۔ کشف سوچ رہی تھی اس ماں کا ہوش سے پرانہ ہو جانا کوئی خوب خیر بات نہیں جس نے سولہ سالہ اس ننھی لکی کی حفاظت کی ہوگی۔ جس نے اس ننھے پورے کو اپنے خون سے سنبھال رکھا ہوگا۔ اس کو کبھی بیٹی موتی کی طرح پیب بند کر کے رکھا ہوگا۔ پھر اس کی آنکھوں میں اپنی مصیبت بچی کے لئے ان مکت خواب جیسے ہوں۔ مگر اسے کیا معلوم ہوگا کہ ایک آدمی آئے گی اور اس کی مدد بندگی کی ساری چیزیں اکٹرا جائیں۔ اس کی آنکھوں کے سارے خواب اس آدمی میں بچنے کی طرح اڑ جائیں گے۔ اس بیٹی انمول نامی ایسا داغ لگے گا جو کبھی زخم سے بھی نہ ڈھل سکے گا۔

کشف کی ایک سالہ ملازمت میں یہ رپ کا چٹا کپڑا تھا۔ مگر بار کشف کی فیملی ایک جیسی تھیں۔ اس کا دل علم کے اس گمان سے انہماز پر یوں کھٹکے جیسے کوئی رنگ آلود آری سے اس کو رنگے کر رہا ہو۔ اس وقت اس کا بی بی چاہتا کر وہ ایسے سٹاک درندوں کو سہرا تو کیلئے پتروں مارے۔ ان کے ننگے جسموں پر بکتی سلاخوں سے داغ لگائے۔ انہیں تک تک کوڑے مارے کہ تک ان کے جسموں میں روح بانی ہو۔ وہ کندی، غلیظ روح جس کا اصل مکان نہ جہنم کی دہلی ہوئی ہے۔

رپ کے چار کیسوں میں سے صرف دو کیسوں کا فیصلہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ لوگ اتنی کم پوزیشن نہیں رکھتے تھے جتنی کیسوں کی سٹوای بھی ہوئی اور جرموں کو سزا بھی تھی۔ بقیہ دو کیسوں "حاملہ" کا تھا۔ مخالف پارٹی میں مہران ہے بعد مضبوط معاشرتی اور معاشی پوزیشن رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے ایک فیس تو مصالحت کی بخر ہو گیا۔ ان لوگوں نے لڑکی کے کمر کو ڈراما دھکا کے اور موتی رقم دے دلا کے حاملہ دیا گیا تھا۔ جبکہ دوسری لڑکی جو کہ بھلا دی گئی تھی، اس کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ بیٹھی تھی۔ اس لڑکی کے مگر والوں کا مذہب بھی بھاری رقم دے بند کر دیا گیا تھا۔

کشف اس نا انصافی اور بے حسی پر کتنے دن بچا و تاب کھاتی رہی تھی۔ آصف علی فتح اسے سمجھاتے تھے کہ سب تو ہوتا ہے ایسے معاملات میں۔ جیت ناخو سے فیصلہ مخالف پارٹی کی ہی ہوتی ہے۔ یہ ہوتی ہے کہ زیادہ تر لوگ بدنامی کے خوف سے معاملہ عدالتوں اور پولیس اسٹیشن سے دور ہی نہ ہیں۔ اور جو لوگ بہت کچھ بھی لیتے ہیں ان میں سے بھی زیادہ تر لوگوں کو خوف زدہ کر کے اور اڑے کر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ بہت ہی کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ہمت کر کے حق کے لئے لڑتے

انہوں نے یاد دہانی کرائی۔

"مجھے یاد ہے سراسر میں نے تقریر بھی لکھ لی ہے۔ آپ ایک نذر کو لپیٹے گا۔ میں اپنے آفس بائی بھجواتی ہوں۔ اگر کوئی کی ہو تو بتا دیجئے گا، میں بھی کچھ کرلوں گی۔" اس نے کہا۔

"تمہیک ہے۔" آصف علی فتح نے سر ہلایا۔ کشف کمرے سے جا چکی تھی۔ مگر آصف علی فتح کی ایک مہک ایک تک محسوس ہو رہی تھی۔

آصف علی فتح پچیس پچیس برس کے چار سال اور ڈیڑہ دار و عبیدہ مرد تھے۔ یہ ادارہ ان بڑے بھائی و تار علی فتح نے شروع کیا تھا۔ آصف علی فتح اپنے بڑے بھائی کے سہرا یہاں کام کرتے۔ مگر وہ تار علی فتح بہت جلد ہی دشمنی کی بیسٹ چڑھ گئے۔ جب سے آصف علی فتح ہی اس ادارہ کے کرتا کرتا رہا تب ہی گئے تھے۔ وہ خود بھی غاصی مضبوط بیک رکھتے تھے۔ ان کے والد سیاست کی کامیاب ترین برادری تھے۔ بھلے بھائی بھی سیاست سے شغف تھے۔ چٹا، تاجا، ماموں سب کے سب کسی نہ کسی حوالے سے معاشرے میں اسٹرونگ پوزیشن رکھتے تھے۔ اس ادارے کو چلانے کے غاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن کو آصف علی فتح اہت سے فیس کرتے تھے۔

کشف نے جب یہ ادارہ جوائن کیا تھا تب اسے اپنے پاس کوڈیکر اسے حیرت کے ساتھ ہار کچھ پائی سی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آصف علی فتح صرف اپنے باپ اور بھائیوں کے نام چل رہا ہے۔ مگر جیسے جیسے اس نے ان کے ساتھ وقت گزارا تھا، اسے احساس ہوتا چلا گیا کہ وہ شک کم عمر کسی مگر بعد با مصالحت ہیں۔ اور کام کو عادت کچھ کرتے ہیں۔ تب وہ مطمئن ہو گئی۔ اس ادارے میں وہ کراس نے زندگی کی بہت سی مزید بدصورتیوں کو دیکھا تھا۔ ایک سال عرصے میں اسے یہ احساس شدت سے ہوا تھا کہ زندگی میں ہر چھوٹے اور ہر بڑے آدمی کو کسی نہ کسی کمپروماز ضرور درنا پڑتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اسے کہیں نہ کہیں جھکا ضرور پڑتا ہے۔ اور جو لوگ ایسا کرتے وہ ٹوٹ جاتے ہیں یا توڑ دیئے جاتے ہیں۔ زندگی کی بدصورتی کا ایک اور بھیا تک کمرہ اس کے سامنے آیا تھا۔

فیہ نکال ایک مصیبت دم کم کا بچا گزر گئی تھی۔ وہ بے حد حسین تھی اور اس کی بھی خوبصورتی اس لئے وہاں بن گئی تھی۔ فوڈ مشنر کے بیٹے کی نظر اس پر پڑی اور اسے جیتنے کی وجہ میں وہ زندگی ساری حدوں کو پار کر گیا تھا۔ یہ واقعہ حیدر آباد کا تھا۔ کشف، آصف علی فتح کے سہرا و چٹا چٹا پرانی بیٹہ روم میں ٹکڑی تھی جس میں ٹیڈا ایک دو تاجوں والے درندے کی درندگی کا مہر تھا۔ نمونہ بنی ہوش و احساس سے بچا نہ موت و زندگی کی تکفیل تھی۔

"چارلر تھے اور چاروں نے اس بچی کے ساتھ زنا باجبر کیا۔ حالت بہت تشویش ناک رہنے کے باوجود صرف چالیس فیصد ہیں۔" لیدی ڈاکٹر اسے بتا رہی تھی۔

کشف نے بھرا دی ہوئی آنکھوں سے اس زندہ لاش کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کھردر کے نشانات واضح تھے۔ جیسے کسی لمبی نے اس کے خوب صورت چہرے کو اپنے نوکیلے پنوں سے ک

ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسے کسوں میں سب سے پہلی جو چھ ضروری ہوتی ہے وہ ثابت قدمی اور مضبوط ارادہ۔ جو لوگ بہت کچھ کے حق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں ان کا سامہ قدرت بھی دیتی ہے۔ اور کشف نے بھی کچھ دیکھا تھا۔

”پہلی کوشش صاحبِ شریف لائے ہیں ڈاکٹر!“ ایک نرس نے بڑی تیزی سے اطلاع دی تھی۔ ”اوہ..... اچھا، اسکینک زنی پلینز!“ ایڈی ڈاکٹر ان سے معذرت کرتی ہوئی سیدھی چلی گئی۔ کشف اور آصف علی ج وہیں کھڑے رہے۔

”کیا لگتا ہے؟“ اس کیس میں دم ہے؟“ کشف نے پوچھا۔ ”کچھ نہیں کہیں سکتے۔ یہ تو لڑکی اور اس کے گھر والوں پر ڈیپنڈ کرتا ہے کہ وہ کس حد تک کام چاہے ہیں۔“ آصف علی ج نے کٹھن سے اٹھائے۔

”سب سے پہلے تو لڑکی کی زندگی و صحت یابی کی دعا مانگی جاوے۔“ وہ کہہ رہے تھے۔ اور اس نے سچا کر اس قدر خوفِ خدا کے یاد دہانے کو کیا وہ صحت یاب ہونے کے بعد کھانا پائے گی؟ ہر بار ڈاکٹر کی وہ لڑکی دنیا والوں کی باتیں سنتے سنتے۔ جب لوگ ترم آئینہ نظروں سے اسے دیکھیں گے۔ جب وہ خود کو کٹھن میں دیکھے گی۔ جب تب وہ خود کو داغ دار دیکھے گی۔ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا ایسا بہت والا ہوگا جو سب حقیقت جان لینے کے باوجود اس بھری ہوئی لڑکی کو سنبھالے گا؟ فریڈ کون ہوگا اس نفسا نفسی کے زمانے میں؟ وہ اپنی سوچ کو الفاظ کا روپ دے کر آصف علی سے کہہ رہی تھی۔

”دنیا ابھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے کشف!..... بے شک ایسے لوگوں کی تعداد میں شک کے برابر ہے۔ مگر ایسے لوگ ابھی بھی دنیا میں موجود ہیں۔“ انہوں نے بولے سے مگر ”کچھ میں یقین ہو کر کہا۔

اس سے پہلے کہ کشف مزید کچھ کہتی، کٹھن سے ایک شور مچا اٹھا اور ساتھ ہی فونو گرامز، صحافیوں کا ایک جھرم سا آواز نظر آیا مگر کشف کے بری طرح چونکنے کی وجہ یہ جھرم نہیں تھا بلکہ اس میں گری و غصہ تھی جسے دیکھ لینے کے بعد وہ کچھ دیر تک ہت کی تپ رہ گئی تھی۔ آصف علی ج کے ہاتھ پر ٹوے تو ان کی نگاہیں بیضام میں بند کوشش آف پوئس پر پڑی۔

”یہ یہاں کے نئے کوشش ہیں۔“ تیمور علی خان۔ بہت نام ہے ان کا۔ سی ایس ایس گولڈ میڈل۔ ڈائریکٹ ایوانٹ ہوئے ہیں۔ بہت شہرت کمائی ہے انہوں نے کچھ ہی عرصے میں۔“ آصف علی ج بتا رہے تھے۔

وہ کم سمی کھڑی تھی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کتاب دلا دلا سا لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی تھی۔ کس قدر رنج رہا تھا وہ ڈاکٹر اور بیضام میں۔ چہرے پر کھلنا رہا نہیں تھا بلکہ ایک تنہائی کی اور وقار نے جب نے لگی تھی۔ وہ لوگوں کے جھرم کو چھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے کمر جو نیز زان کے لئے راست بنا رہے تھے۔ کشف پر اس کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ وہ بے ارادہ کہ

طرف منوگئی۔ آصف علی ج کی نگاہ چور پر تھی۔

”ان سے ملنا چاہئے..... کیوں کشف؟“ وہ کشف کو دیکھنے میں پوچھ رہے تھے۔ ”ہوں.....“ وہ کم سمی تھی۔

”چلو..... وہ روم میں ہی جا رہے ہیں۔ وہیں مل لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ آدمی ہمارے کام کا ثابت ہوگا۔“ بیکے والا بندہ نہیں ہے۔“ آصف علی ج کہہ رہے تھے۔

”آپ چاہے سراسر آپ مل لیتے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں بھی آپ میں یا میں، ایک ہی بات ہے۔“ وہ بہانہ بنا کر ہل گئی۔

”نہایت؟“ کیا ہوا؟“ انہوں نے اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔

”شانہ لی ٹی ٹو ہو گیا ہے۔ میں گاڑی میں بیٹھتی ہوں۔ آپ میری فکر مت کیجئے۔“ وہ اسے مطمئن کرنے میں لگ گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے..... میں بھی چلا ہوں۔ تیمور علی خان سے ہم ان کے آفس میں مل لیں گے۔“ وہ چپنے لگے۔

”نہیں سراسر موقع بہت اچھا ہے۔ آپ کم از کم ان کو اپنا انٹروڈکشن تو دے دیں۔ میں ڈراما اور کسٹھ و ریٹ ہاؤس میں چلی جاؤں گی۔ اس چائس کو مت گھوٹے پلینز۔ اس کیس کو ہم نے ہر صورت جیتنا ہے۔ گنا کو انصاف ہر حال میں ملوایا ہے۔ آپ میری فکر چھوڑیے۔ جو چیز زیادہ اہم ہے اس پر توجہ دیں۔“ وہ اس بار ڈراکتی سے بولی۔

”لوکے..... تم جہلی جاؤ۔ میں اس سے مل لیتا ہوں۔“ وہ مان گئے۔

جب کشف اطمینان کا سانس لیتی ہوئی باہر کی جانب بڑھ گئی۔ تیمور جب اندر کرے میں جا پکا تھا۔ آصف علی ج کی گاڑی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ وہ اسی طرف جا رہی تھی۔ ابھی کسی نے اسے

آواز دی۔

”بیکسکے زنی مس کشف!“ وہ جانی پچانی آواز سن کر کٹھن۔ نیلی بیڈ، سفید شرٹ پر سفید بورڈ آل پہنے کٹھن میں ایشیہ اس کو پٹے ایک جواں سال مرد کھڑا تھا۔

”اوہ..... السلام علیکم ڈاکٹر نوید اللہ!..... کیسے حراج ہیں؟“ وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے

منوگئی۔

”وہیکم السلام! میرے حراج بالکل بخیر ہیں۔ مگر آپ یہاں کیسے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”گنا کمال کیس کے سلسلے میں آئی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ ہاں۔ بہت بریس کیس ہے۔ ڈاکٹر داغدار اور میں ان کیس کو ہینڈل کر رہے ہیں۔

لگتا ہے بارے میں تو کیا جانے کہ میں ہینڈل کر رہا تھا۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مجھے میری ٹرانسفر گاؤں میں کر دی گئی ہے۔ آج ہی، ابھی کچھ دیر میں ہی اٹھنا ہے مجھے۔

”لوہ..... مگر اس کھڑانے کی وجہ“ وہ اس کے انداز سے اس کا جواب پائے تھے۔

”کچھ باتیں اتنی پرستش ہوتی ہیں سر! کہ ہم انہیں کسی کے ساتھ دیکس نہیں کر پاتے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی تو خود اپنے آپ سے بھی نہیں۔“ اس نے ذوقی انداز میں کہا۔

”آصف علی فتح کا چہرہ ایک دم بھمرا گیا۔“ سوری! مجھے آپ سے اس طرح سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ انہوں نے معذرت کر لی۔

”اُسی اوکے۔“ آپ کل ان سے ضرور ملے گا۔ فتح کمال کو انصاف ضرور ملنا چاہئے۔“ اس نے موضوع کارخ پھیرا۔ ”ارے ہاں، ڈاکٹر نوید اللہ تھے آج ہاسپٹل میں۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا! جی، فتح کی مبارک یاد دینے تھے مجھے؟“ انہیں۔ بس اس کے بعد تو ملنا ہی نہیں ہوا۔ کہاں ہوئے ہیں آج کل؟“ آصف علی فتح نے پوچھا۔

”گاؤں میں پوسٹنگ ہو گئی ہے۔ انوائسٹ کر گئے ہیں۔ بے رخی خیال ہے کہ ہمیں ایک بار اس گاؤں میں بھی ضرور جانا چاہئے۔ وہاں پر کبھی لوگوں کے مسائل کو دیکھنا چاہئے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟“ اس نے رائے پوچھی۔

”فیک ہے۔ ابھی تو ہم حریف چار پانچ روز ہیں۔ پرسوں کا پروگرام سیٹ کر لیتے ہیں۔“ انہوں نے پروگرام ڈن کر دیا۔



آصف علی فتح تھکائی تھور سے ملاقات کے لئے چلے گئے تھے۔ جبکہ وہ ہاسپٹل فتح کمال کے پاس آگئی تھی۔ وہ کچھ ضروری کالکاف اکٹھے کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں وہ فتح کمال کے گھر والوں سے بھی ملی تھی۔ فتح کمال اب ہوش میں تھی۔ اس کی حالت کنٹرول میں آگئی تھی۔ وہ اس سے ملی تھی اور اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔ اس کی امید بے حد حالی تھی کہ وہ اسے انصاف ضرور دلائیں گے۔

فتح کمال نفسیاتی طور پر بہت ذرا مٹی تھی اور کشف کسی ماہر نفسیات کی طرح اس کی برین وائٹنگ کر رہی تھی۔ بہت محبت سے، بہت اپنے پن کے ساتھ۔ آصف علی فتح اور کشف گاؤں کا پروگرام بھی بنا رہے تھے مگر انہیں وقت نہیں مل رہا تھا۔ فتح کمال کيس کے سلسلے میں انہوں نے دن رات ایک کر دیے تھے۔ چاروں کی بجائے حیدر آباد میں انہیں آج نوواں دن ہو گیا تھا۔

”کشف! کمشنر تیور علی خان سے ہمارے معاملات طے ہو چکے ہیں۔ وہ خود بھی بہت زیادہ پوزیشنل ہیں۔ اور بھر بھی اپنی پار اور کنٹیکٹس کا استعمال کر رہے ہیں۔ فتح کمال کيس میں کاسمیائی کے پاسز نوے فیصد ہیں۔ فی الحال تو کمشنر صاحب نے اس کے فیصل کو اس کے تینوں ساتھیوں سمیت اریسٹ کر لیا ہے۔ ضمانت بھی قابل قبول نہیں۔ اب بس دیکھتے ہیں کہ مقدمہ کس طرح چلنا ہے۔“ وہ کہہ رہے تھے۔

”تلاشی گھبراہٹ ہوئی ہے۔ یہ تین عدالت میں صحیح سے سوالوں کے جواب دے پائے گی یا نہیں؟“ کشف نے خدشہ ظاہر کیا۔

بس کچھ ضروری کام تھے جن کو نفاذ لایا تھا۔ آپ بتائیں کہ آپ نے کیا سوچا پھر؟ آری ہیں گاؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”فتح کمال کا کيس کنارے لگ جائے، پھر سوچوں گی۔ ویسے سوچ رہی تھی کہ درمیان میں ایک آدھ پتھر لگا دیں۔ آج کل حیدر آبادی میں ہوں تو گاؤں آنے کا اچھا موقع بھی ہیں۔ دیکھیں، جب بھی موقع ملا ضرور آؤں گی۔“ اس نے کہا۔

”بیرا کنٹیکٹ فہرست ہے نا آپ کے پاس۔ بس جب بھی موقع ملے، آئیے گا ضرور۔ ان سب چارے گاؤں والوں کو شہر والوں سے زیادہ آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”انشاء اللہ۔ اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!“

”خدا حافظ!“

وہ پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کار کی پشت سے ٹپک لگائے وہ سوچوں میں غلطیاں تھیں۔ اس کی سوچ کا مرکز تیور علی خان تھا۔

”سو..... تیور علی خان! تم کمشنر بن گئے، مقابلے کا امتحان پاس کر کے..... تمہاری ظاہری شخصیت میں تو تبدیلی نظر آئی ہے۔ مگر کیا معلوم کر اندر سے بھی تبدیلی ہو یا دوسری ہے؟..... ابھی تو ملے ہو، ابھی تو تم کو ابھی طرح پچکانا ہے۔ ابھی تو دیکھنا ہے کہ تم میں ثابت قدمی کتنی مقدار میں ہے۔ تم اپنے وعدے کا پاس کس حد تک کر سکتے ہو؟ ایک مرد کی زندگی جی سکتے ہو یا چھ مہینے میں بھاگ جاؤ گے؟..... اس میں تمہاری سب افتخاریں رکھوں گی۔ اب مجھے پتہ ہونا چاہئے کہ تیور علی خان اپنے قول کا سچا مرد ہے یا پھر دوسرے عام مردوں کی طرح اس کی باتیں بھی بوس نہیں۔ سو تیور علی خان! امتحان تو شروع ہو چکا ہے تمہارا۔“

وہ سوچوں میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ کب ریسٹ پاؤں آگیا اسے معلوم ہی نہ ہوا۔ اس ریسٹ پاؤں میں تین کرے آصف علی فتح نے ٹپک کر دیے تھے۔ ایک ان کا دوسرا کشف کا اور تیسرا ان کے ذرائع کار۔ کشف اپنے روم میں چلی گئی۔ اس نے ذرائع کار کو گاڑی سمیت واپس بھیج دیا تھا۔ کمرے میں آکے وہ لیٹ گئی۔ اس کی سوچ کا محور ابھی تک تیور تھا۔



وہ لوگ ڈانٹک ہال میں بیٹھے تھے۔ آصف علی فتح اسے اپنی تیور کے ساتھ ملاقات کے متعلق بتا رہے تھے۔

”میں نے ان سے ناٹم لے لیا ہے۔ ہم کل وہ پیر کو ان سے ملیں گے۔“

”پلیز سر! آپ چلے جائے گا۔ میں نہیں جا سکتی۔“ اس نے معذرت کر لی۔

”مگر کیوں؟“ وہ چہرے۔ ”کشف! میں تمہیں کر رہا ہوں کہ آپ تیور علی خان سے کتنا اری ہیں۔ کیا آپ انہیں پہلے سے جانتی ہیں؟“ انہوں نے تنبیہ کی ہے پوچھا۔ وہ خاموشی سے نظریں جمکا گئی۔

”ہماری وکیل صاحبہ کس دن کام آئیں گی جناب! اپنی راجیلہ اسلم نے بھی اپنے تئیں سالہ کی میں جنک نہیں ماری۔ وہ اسے مٹھلی پر پی جھڑ کر رہی ہیں۔“ وہ بہت بڑے اُمید تھے۔

”خدا کرے کامیابی حق کی ہو۔“ کشف نے دل سے دعا کی۔

”اے اللہ! اچھا لیا کر ہے انہی گاؤں پٹلے ہیں۔“ وہ بولے۔

”ابھی؟“ کشف حیران ہوئی۔

”کلی ہو سکتا ہے بھروسہ نہ ہو۔ ابھی پٹلے پٹلے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب پھر ناراض نہ جائیں۔“ وہ مسکرائے۔

”وہ ایسے نہیں ہیں۔“ کشف مسکرائی۔

”نچ راستے میں ہی کسی ڈھابے سے کر لیں گے۔“ آصف علی فتح نے کہا۔

”میں ان کو کون کر دوں۔“ کشف نے اپنے سیل پر فوہ اللہ کا نمبر ڈال کر۔

”ٹھیک ہے۔ میں جب تک پہنچ کر لوں۔“ آصف علی اٹھ گئے۔ اس نے شخص سر ہلانے پر اکتاہ کیا۔



ڈاکٹر فوہ اللہ نے بہت خوش دلی کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔ وہ انہیں اپنے کوارٹر لے گئے۔ چائے وغیرہ پلانے کے بعد وہ انہیں گاؤں کا سروے کروانے گئے۔ نہایت ہی خستہ حال ڈھنڑری تھی۔ وہ انہیں تک پوری نہ تھیں۔ فرخبر نہایت ہیسید تھا۔ دیواروں سے پلستر اکڑا ہوا تھا۔ لوگوں کے بیٹھے تکے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ گاؤں کی زمین تو کیا خاک تھیں، بس کیا راستہ تھا جس میں سڑک نہ تھی۔ ایک مشقت ہی تھی۔ سکول کے پاس ہی صرف نوٹی دیواریں تھیں۔ عمارت کا کچھ نہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ پینے کا صاف پانی تک میا نہ تھا۔ غربت و افلاس کی ایک شاہکار تصویر لگتا تھا یہ گاؤں۔

”اس گاؤں کا ڈائری ان لوگوں کے لئے کچھ نہیں کرتا؟“ کشف نے پوچھا۔

”وہ اگر کسی قابل ہوتا تو اس وقت گاؤں کا نقشہ ہی اور ہوتا۔“

”میں تو زندگی کی بنیادی سہولیات تک میسر نہیں۔ نہ بجلی، نہ گیس، نہ پینے کا صاف پانی۔ یہ لوگ تو جانوروں سے بدتر زندگی ہی رہے ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”اسی لئے تو آپ لوگوں کو یہاں بلایا تھا کہ آپ لوگ آئیں اور ان لوگوں کی حالت دیکھیں اور ان کے لئے کچھ کریں۔ یہاں کی تو جو عمریں بھی ظلم کے درجے ہیں حتیٰ کہ شہر کی عورت اس کا قصہ بھی نہیں کر سکتی۔“ فوہ اللہ نے بتایا۔ ”میرے خیال میں آپ لوگوں کو اپنے ادارے کی ایک برائی یہاں بھی سمجھنی چاہئے۔ میں تو اپنے تئیں کوشش کر رہا ہوں کہ ان لوگوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔ مگر ایسے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے انکلیکس استعمال کئے ہیں، یہاں کے لوگوں کو کم از کم زندگی کی بنیادی سہولیات تو میسر ہوں۔“ فوہ اللہ ہوا۔

”بہت اچھی بات کی طرف توجہ دلائی ہے آپ نے ڈاکٹر صاحب! اے اللہ بہت جلد اس مشورے پر عمل درآمد ہوگا۔“ آصف علی فتح نے وعدہ کر لیا۔ پھر وہ لوگ جینہ کر مختلف پلان مرتب کرنے لگے۔ کشف کے مشورہ کو آصف علی فتح نے بہت پسند کیا اور وہ اب جلد از جلد یہاں ایک ادارہ بنانے کی سوچ رہے تھے۔



کراچی واپس آ کر انہوں نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنایا اور تدری سے کام میں لگ گئے۔ ابھر نیا لہال کیس میں چل رہا تھا۔ تیور اور آصف علی فتح کی کوششوں سے بہت حق کی ہوئی۔ فیصل اور اس کے دوستوں کو سزا ہو گئی۔ خضر صاحب کی ساری کی ساری طاقت دھری کی بھری رو گئی تھی۔ اس روز وہ اپنے آفس میں بیٹھی کچھ لکھنے میں مصروف تھی جب آصف علی فتح اس کے کمرے میں اعلیٰ ہوئے۔ وہ دوپٹی اور اسٹرا نا کھڑی ہو گئی۔

”سرا آپ..... مجھے بلوایا ہوتا۔“

”اُسی لو کے۔“ ڈوفٹی فی قابل۔ ”بھئی، مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ وہ خود ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کشف نے انہیں اپنی سیٹ پر بیٹھنے کی آفر کی۔

”بھئی اپنی کرسی کسی کو نہیں دیتے۔“ وہ مذاق پرے انداز میں بولے۔

”موڈ بہت اچھا لگ رہا ہے آپ کا۔“ وہ مسکرائی۔

”ہاں بھئی۔“ وہ گاؤں والا پروڈیجٹ مکمل ہو گیا ہے۔ بجلی اور گیس کے لئے جوائنٹ کی گئی تھی، وہ ہی خضر ہو گئی ہے۔ اور یہ کہ اب اس گاؤں میں بجھے پانی بے حد باصلاحیت ورکر کو بھیجتا ہے جو وہاں آکے وہاں کے لوگوں کے لیے سیما بن جائے۔“ وہ کہتے کہتے رکے۔ کشف خاموشی سے سن رہی تھی ان کے چپ ہو تے ہی بولی۔

”بہت اچھی بات ہے سرا ایسے آپ کس کو بھیجتا چاہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”موٹ فیلڈ گرل مٹل کشف عارضین عادل کا نام ہی میرے دماغ میں آیا تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“ آصف علی فتح نے کہا۔

”بہت اچھی بات ہے۔ میں تو خود سوچ رہی تھی کہ آپ سے وہاں جانے کا کہوں۔“ کشف نے حکا کے کہا۔

”اتقان بہت سخت ہے کشف! مشکلات سے ہماری راجیلہ خستہ ہیں۔“ انہوں نے گویا وارث کیا۔

”مجھے مشکلات سے کہنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ بہت لڑائی کی، مجرم ہرے لہجے میں بولی۔

”مگر! میں سب کی ایکجکٹ کر رہا تھا تو پھر تیار کر لیں۔“ اگلے تفتہ روا لگی ہے۔ آپ کے رہنے کے لئے وہاں ایک گھر تعمیر کروایا ہے۔ گاؤں اور دوسرے کاموں کے لئے ملازمین تعینات کر دیا ہے۔ مگر ایسی کوششیں بھی ہو گئیں۔ پانی آپ اپنی مرضی و پند سے نہسے اپنا کٹ کر چاہیں، کر سکتی ہیں۔ مگر ایک بات تو پوچھنا بھولی ہے۔ کیا آپ کے گھر والے اس بات پر استراض کریں

کے؟ آئی مبین اتنی دود گاؤں میں آگیا کہ رہیں گی۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”یہ میرا بیٹا ہے سرادھ لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔“ وہ مسکرائی۔

”ٹھیک ہے۔ تو پھر آپ تیار شروع کر دیں۔ ارے ہاں..... میں پھر بھول گیا۔ آپ کی ماں یہاں ناصر علی صاحب اپنا اثاثہ ہے ہیں۔ ملوایا تھا آپ کو وہن ایسوی انشورینس بینک میں۔“

”جی جی، میں مل چکی ہوں۔ اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ بہت قابل انسان ہیں اور اس کی سرگودھ پر دروگر ہے ہیں۔“ وہ مسراتے ہوئے بولی۔

”لوگے، فائن۔ اب میں چلتا ہوں۔ اور ہاں، وہ فیض کمال کا فون آیا تھا میرے سیل پر۔ آپ پرستی تھیں کبھی جس۔“ آصف علی جی نے جاتے جاتے جلت جاتے ہیں۔

”سرا آج آپ کچھ زیادہ ہی باتیں نہیں بھول رہے؟“ اس نے خوشی سے کہا۔

”ہاں..... میں آج کچھ زیادہ ہی بھول رہا ہوں۔ شاید آپ جاری ہیں اس لئے۔“ وہ ہلکا اور آہستہ سے سرگمراہ آواز میں بولے۔ کشف کو ان کا اعجاز کچھ عجیب سا لگا مگر اس نے اسے اذیت نہ سمجھا۔

”ہوں..... ام! آپ کو ایک بار پھر سمجھانا پڑے گا..... بابا! آپ کا وفد نے میرے لئے ایک ڈھال بنا کر بھیجا ہوا ہے۔ وہ کرسی کی پشت سے سرگمراہ سوچ رہی تھی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو، اس طرف متوجہ ہو گئی۔



ام کا رومل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے ایک بنگلہ مگر کرا کر دیا تھا۔ مگر اس بار بھی عارضین عادل نے اس کا دفاع کیا تھا۔

”دیکھیں جی، میں کیسے دیتی ہوں کہ آپ نے اس حد سے زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔ ارے اب ڈیڑھ دو سال اسے نوکری کرتے ہو چکے ہیں۔ اب بس کرے۔ کر لیا اس لئے اپنا شوق پورا

سناج سنا بہت ہو گئی مگر کبھی ہوں۔ اب یہ گاؤں جانے کا شوق نہ رہا ہے۔ وہاں ان سمنہوں میں میں اسے تنہا رہنے دوں گی؟“ وہ گولہ باری کر رہی تھیں۔

”فرنگیوں میں تنہا وقت گزارا کے آگئی ہے ہماری بیٹی۔ تم سمنہوں سے ڈر رہی ہو بھلی ماں!“ عارضین عادل نے مذاق میں بات ڈالنی چاہی۔

”آپ تو چپ ہی رہتے۔ ارے اپنے مگر کی ہو جاتی تو اب فخر سے بال بچوں والی ہوتی۔ ارے مراد کے بھی دو بیٹے ہو گئے ہیں۔“ وہ حیرت سے بولیں۔

”بچے، مان کی سوتی تو ابھی تک سرادھ میں انکی ہوئی ہے۔ وہ مگر یہ سانس لینے ہوئے سوچنے لگی۔

”اچھا ام! ایسا کریں کہ آپ بھی نہیں میرے ساتھ۔ وہاں مجھے گھر ملا ہوا ہے۔ نوکر چاکر مگر ہیں۔ کوئی تکلیف تو ہو گی نہیں۔“ اس نے ان کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر کہا۔

”تم لوگ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے؟ یہ وڈرے عاتپ کے لوگ بہت خطرناک

اور بڑا درو عیاش ہوتے ہیں۔“ وہ چلا گئیں۔

”عارفین صاحب! جہان نیکی کو کس طرح کسی انشوی وڈرے کے گاؤں میں بھیج دوں؟“ وہ بے بسی سے بولیں۔

”اب ایسا جنگل کا قانون بھی نہیں ہے ام!..... وہاں پولیس قاتل ہے۔ قانون ہے۔ مگر میری بیک پورٹ بھی بہت اسڑونگ ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ میں کام کرتی ہوں وہ معمولی لوگ نہیں

ہیں۔ وڈرےوں تک کشف ہے ان کی۔ آپ کی بیٹی ان کی قور نہیں ہے۔ مگر دوسرے کھیل اڈہ پر، مجھ پر۔“ وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینے ہوئے زری سے سمجھانے لگی۔

”تمہاری خد کے سامنے میری کب چلی ہے۔ جو جی میں آئے کرو۔ میں چلوں گی کچھ بڑوں کے لئے تمہارے ساتھ۔ بلکہ آپ بھی چلیے۔“ فیرے نے عارضین عادل سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم سب چلیں گے۔ چنانچہ کب ہے بھی؟“ عارضین عادل نے پوچھا۔

”بس اگلے ہفتے روانہ کی جائے۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے پھر۔ جب تک تو تمہارے دن ہیں۔ تم اپنی بیٹی بنگلہ کرلو۔“ انہوں نے کہا۔

جانے سے پہلے وہ پرفیور کرمانی اور نقوی صاحب سے بطور خاص فیصلی۔

”بھئی اوہوں کے لئے خاص تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے اور تم تو اس تقریب کی مہمان خاص ہو۔ پہلے یہ تقریب انڈیا کرلو، پھر چلی جائے۔ نقوی ادیب صاحب نے اس سے کہا۔

”کب ہے تقریب؟“

”ہفتے کی شام کو۔ بلکہ جسے تو خود تمہارے پاس آج آنے والا تھا تقریب کا انونی ٹیشن لے کر۔ مگر خیر کوئی بات نہیں۔ میں پھر جی آ جاؤں گا۔“

”ارے جانا؟ کیوں زمت کرتے ہیں؟ آپ کی دعوت ہم نے قبول کر لی ہے۔ مجھے تو پیسے بھی اگلے ہفتے چاہئے۔“ میں ضرور آؤں گی۔“ وہ احترام سے بولی۔

”معلوم ہے کشف! تم کیسے عزیز ہو اوتی۔ وہ اس لئے کراہتی شہرت و کامیابی نے جس میں ذرا بھی ضرور نہیں ملتا۔ تم اپنے بڑوں کا اتنا ہی احترام آج بھی کرتی ہو جتنا پہلے کرتی تھیں۔“ نقوی

ادیب صاحب نے محبت سے کہا۔

”اسی احترام اور عاجزی نے مجھے اس قابل بنایا ہے نقوی صاحب! ورنہ میری کیا بساط؟“ وہ اٹھاری سے بولی۔

”خدا تمہیں قدم قدم پر کامیابوں سے نوازے۔ ایسی ہی عاجزی و اٹھاری اگر ہماری آج کی جی نسل کے ہر جوان میں پیدا ہو جائے تو انہیں ”اصل“ کامیابی مل جائے۔ مگر آج کے جوان تو ذرا سا نام کا لینے پر سادھو آسمان پر جا بیٹھتے ہیں۔ بہر حال یہ بتاؤ کہ تمہاری کتاب مکمل ہو گئی؟“

”بس اختتام پر ہی لکھنے۔ مگر اس کتاب کا شائع ہونا کہیں آپ کو مزہ نہ پڑ جائے۔ کچھ حصہ تو پڑا

چکے ہیں آپ۔“ وہ ہنسی۔

”تمہاری تحریر جب نظروں کے سامنے سے گزرتی ہے تو اچھے اچھوں کے جھلکے جھوٹ جاتے ہیں بنی افکار مت کرو۔ یہ کام ہم نے محض ”کمانی“ کے لئے نہیں شروع کیا تھا۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ سونے ہوئے لوگوں کو بھینڈ کر جگایا جائے۔ بے حسوں میں احساس پیدا کیا جائے۔ جھٹکیا جانتے ان میں شعور ابھری کی مشورہ کی جائے۔ معاشرے کی برائیوں کو برہنہ کیا جائے۔ خوب صورت چہروں کے پیچھے جیسے بھیا تک چہروں کے نقاب اتارے جائیں۔ یہ تو ایک ہم ہے جس میں تم اور تمہارے جیسے ساری میرے ہمراہ ہیں۔“

”کوشش تو کر رہے ہیں نفوی صاحب اب اس دعا کیجئے کہ ثابت قدمی قائم رہے۔ جس عزم و حوصلے سے اس راہ پر نکلے ہیں، آگے ہی بڑھتے رہیں۔ کبھی کبھی تو حوصلے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ مگر آپ جیسے بزرگوں اور رہنماؤں کی حوصلہ افزائی سے ان حوصلوں کو تازہ کی جاتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں نے تو آپ ہی سے اتنا کچھ سیکھا ہے۔ اگر آپ جیسے استاد نہ ہوتے تو شاید میں بھی صحیح رہنمائی نہ پاسکتی۔“ اس نے جواب دیا۔

”خدا تمہیں کامیابی سے ہمکنار فرمائے۔ اچھا تو پروگرام میں ہم تمہارے مختصر ہوں گے۔“ نفوی صاحب نے کہا۔

”ہی، میں انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گی۔ خدا حافظ!“

”خدا حافظ۔“



اس ادنیٰ تقریب میں اسے بہت حراہ آیا تھا۔

کافی عرصے بعد اس نے ایسی کوئی تقریب اسٹیڈ کی تھی۔ بڑے بڑے ہال نوٹس، قلم کار، اخبار نویس موجود تھے اور وہ ان سب میں سب سے کم عمری۔ مگر کبھی لوگ اس کو بچپانتے تھے اور بہت وقت سے ملے تھے۔

”اس قدر کم عمری میں اتنی شہرت حاصل کر لیا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔“ مشہور انسان نگار راگول ناگرم رشا مکس دے رہے تھے۔

”کچھ لوگوں کو خدا پیدا کی خاصی مقصد کے لئے کرتا ہے اور کائنات بھی ایسے ہی لوگوں میں رہتی ہیں۔“ بھی ایسی شہرت اور کامیابی کہاں ہر کوئی پاتا ہے۔ ”ایک مشہور نقاد اپنی رائے دے رہے تھے۔

”مگر بہت سناک قلم ہے آپ کا۔ بالفاظ ایسا قتل عام کرتا پھرتا ہے کہ روہی جسوں کے اندر اچڑا کر رہ جاتی ہیں۔“ ایک اور نقاد کہہ رہے تھے۔ وہ ان تہجروں پر محض مسکراتی تھی۔ اس بات کی۔

”مکمل عام ہیں جناب! میں تو محض آئینہ دکھاتی ہوں۔ جسے اپنی صورت آئینے میں صاف صاف اصلی حالت میں نظر آ جاتی ہے، وہی خود وہ ہو کہ چاہتا ہے۔“ پھر خوشی سے بولی۔ ”کبھی آپ کو تو کوئی آئینہ نظر نہیں آ گیا چودھری صاحب؟“

”اُسے کیا بات کرتی ہیں بھڑسا..... اللہ اللہ اپنی صورت اچھی خاصی ہے۔“ وہ ہر جہت بولے اور کی سے سنبھلی پر حاضرین ہنس پڑے۔

”بیلو کشف!“ آصف علی فتح کی آواز پر وہ چمکی۔

”اُسے سرا! آگئی یہاں مدعو ہیں؟“ وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

”بھئی یہ تو ہمارے بہت اچھے دوستوں میں سے ہوتے ہیں۔ انہیں کیونکر بھول سکتے تھے۔“ نفوی صاحب بولے۔

”آپ ذرا انہیں بھیجی دیجئے، ہم ذرا محسن صاحب سے مل آئیں۔ تمنا کھڑے ہیں۔“ نفوی صاحب معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

”بہت اچھی لگ رہی ہیں آپ۔“ آصف علی فتح نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ وہ اب سر پر سیاہ

اسکارف نہیں لٹکی تھی مگر سر کو دوپٹے سے ڈھکی تھی۔ آج اُس نے سفید رنگ کا نازک ساموئیوں ' باریک کام والا کرتہ، یا جامہ زیب تن کیا تھا۔ چڑا سادہ پن اس کے سینے پر ترپنے سے پھیلا ہوا تھا بے حد دروازہ بالوں کی لمبی سی چوٹی ٹخنوں کو چھو رہی تھی۔ اس نے سفید رنگ کے آؤڑے پہن رکھے اور نیلے گامی رنگ کی چمک دار لپ اسٹک سے اپنے نازک لیوں کو حریف حسین بنا لیا تھا۔ اس سہما سے ہنسنے لگی۔ وہ احماد کو ساتھ مارو پٹخا ہوا تھا۔

”جھکس! وہ احماد کو ساتھ مسکرائی۔

”آپ کی ساری تیاری مکمل ہوئی ہے؟“ انہوں نے اگلا سوال کیا۔ مگر کشف کو کھوس ہوا کہ۔

”وہ کچھ اور پوچھتا یا کہنا چاہ رہے تھے۔ مگر اس کے بھانے سے سوال کر دیا۔

”جی..... بابا اور ام بھی چائیں گے میرے ساتھ۔ وہ اپنی لمبی کرتا کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے اتنا ”ابھی بات ہے۔ ایک دم سے اکیلے پن کا احساس نہیں ہوگا آپ کو۔ دراصل ہمارے ہمارا

مینگ میں آپ کا کام ہی ہر ایک کی زبان پر تھا۔ ورنہ میں آپ کو وہاں بھی نہ بھیجتا۔“

”اس میں کیا حرج ہے؟“ مجھے تو خوشی ہے کہ میرا نام تجوڑ گیا کیا۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”کشف! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

”جی کہئے۔“

”وہ..... دراصل.....“ وہ نہانے کیوں ہنگام رہے تھے۔

”کیا بات ہے سر؟“ اس نے ان کی ہنگامہ زدگی کو دیکھ کر چھا۔

”وہ..... دراصل..... میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ وہاں کیسے مگر جائیں گی؟“ وہ ۱۹

”آپ محبت کے لائق ہیں۔“ جی لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ کچھ تو ہے آپ میں جو ہر کوئی آپ کی طرف کھینچا آتا ہے۔“ آصف علی فتح کے گردن موڑ کے اسے دیکھا اور سمیر انداز میں کہا۔

”کشف ان کے لفظوں میں ڈھکی ہوئی بہت پیچھے چلی گئی۔

”تمہارے اندر عجیب کشش ہے..... لوگ خود بخود کھینچے پلے آتے ہیں۔ کیا جادو کرتی ہو؟“

”جور علی خان نے ایک روز دو ہی باتوں باتوں میں کہا تھا۔

اس کے دل کی ترتیب سے چلتی دھڑکنوں کی رفتار میں عجیب سی پکڑ دکھائی ہوئی تھی۔

”کشف! مجھے..... مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ مگر سوچنا ہوں کہوں کیسے؟..... بہت نہیں ہو رہی۔“ آصف علی فتح چند لمحوں بعد کہہ رہے تھے۔ وہ چونک کر۔

”ایسی کیا بات ہے سر؟“ اس نے انہیں دیکھا۔

”ڈرتا ہوں کہ آپ برا نہ منا جائیں۔“

”آپ سے ایسی کسی بات کی توقع تو نہیں ہو سکتی۔ مگر پھر بھی اگر بات کہنی ضروری ہو اور کہے بنا

پارہ بھی نہ ہو تو دل کی بات کو ہوتوں تک لے لی آ جائے۔ کم از کم دل کا جو بوجھ ہوا ہی جاتا ہے۔ آپ کہہ دیجئے جو کہنا ہے۔“ اس نے تنبیہ کی سے کہا۔

”کشف! زندگی کے 38 سال میں نے تنہائی میں گزارے ہیں۔ اپنے کام سے اتنی محبت تھی مجھے

کہ کبھی اپنے بارے میں سوچنے کا خیال تک نہیں آیا۔ آج جب میں نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لی ہے تو کچھ اپنی ذہنی زندگی کے بارے میں بھی سوچنا شروع کیا ہے۔ پھر گھر والے بھی

کافی پیچھے پڑے ہیں کہ اب مجھے بھی شادی کر کے اپنے خالی گھر اور سوتی زندگی کو آباد کر لینا چاہئے۔“

انہوں نے تنبیہ بازمی۔

”یہ تو ابھی بات ہے۔ پھر کیا سوچا آپ نے؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”گھر والوں نے تو اختیار مجھے دیا ہے کہ جس لڑکی کی طرف میں اشارہ کروں گا، وہ اسی کو

زنت بنا کے لے آئیں گے مگر.....“ وہ کہنے کے لئے ڈک۔

”مگر کیا؟..... کیا آپ کی اپنی کوئی پسند نہیں ہے؟“ وہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔ ایک لڑکی پسند آئی ہے زندگی میں پہلی مرتبہ۔ مگر اس سے کچھ

کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر.....“ وہ ہنس پڑی۔ ”کیوں سر؟ کیا وہ اتنی بیاہک ہے؟“ اس نے مذاق کیا۔

”اس کی صورت بہت باری ہے۔ بہت کھل ہے۔ وہ۔ مگر میں اس کی رائیسی سے ڈرتا ہوں۔ اگر

وفا ہوگی تو؟“

”آپ جیسے اچھے انسان کا ساتھ تو مقدر والوں کا نصیب بنتا ہے۔ وہ کبھی منع کر ہی نہیں سکے گی۔

آپ اسے ڈاکٹر یا کٹ پر پڑ کر دیں۔“ وہ ان کی ہمت بندھائی ہوئی بولی۔

”آپ کو یقین ہے کہ وہ وفا نہیں ہوگی؟“ وہ جیسے کنٹریشن چاہتے تھے۔

”آپ دیکھئے گا ڈاکٹر صاحب! یہی عورت ایک روز ان وہیروں کے گلے کا پھندا بن جائے گی۔“ وہ بڑا خوف بولی۔

”بہت خطر ہیں۔“ وہ تعریف کے بغیر کہیں رہ سکا۔

”تاہم قدم رہنے کی دعا کیجئے۔“ اچھا ڈاکٹر صاحب! آپ نے کوئی ضروری بات کرنی تھی مجھ سے۔“

”ہاں..... حیدر آباد کے کنسٹرکٹور مل خان کا نام تو سنا ہوگا آپ نے۔“

”کشف کا دل دھڑکا اس نے خود پہ قابو رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔“ جی ہاں۔“

”میری ان سے ملاقات بیچ کے دنوں میں ہوئی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”جی..... کیا وہ بیچ کرنے کے لئے تھے؟“ وہ حیرت زدہ ہی اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”جی ہاں۔“ ہے نا چھی جیران کن بات کا اتنا کم عمر آدمی اس قدر کامیاب انسان۔ اور پھر بھی بے

پ سے اس قدر دلکذا۔ مجھی وہ تو عمر میں مجھ سے بھی بہت چھوٹے ہیں۔ مگر ان سے مل کر مجھے بے

فروشی ہوئی۔ جانتی ہیں وہ حافظ قرآن بھی ہیں۔ ”چنگا نہ نازی“ سچہ گزار۔ میں نے تو انہیں جب بھی

شریف میں دیکھا، عبادت الہی میں مصروف ہی دیکھا۔ پھر جب ان سے گفتگو کی تو یہ پتہ چلا کہ وہ

بھی کسی قدر خوب صورت اور سلیبے ہوئے انسان ہیں۔“ کشف خاموشی سے ان کی باتیں سن

رہی۔ اس کے چہرے کے جذبات بالکل ساہت تھے۔

”میں نے انہیں یہاں گاؤں میں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور وہ کل آنے والے ہیں۔ میں

دار ہا تھا کہ آپ بھی ان سے مل لیں۔ بہت کام کے آدمی ہیں وہ۔“ نویہ اللہ اپنی ہی دامن میں کہتا

ہوا تھا۔

”انہیں نویہ صاحب! میں ان سے مل کر کیا کروں گی۔ مجھے اگر کوئی کام آن پڑا جب دیکھی جائے

یوں بھی ان پولیس والوں سے تو ذرا دور دوری رہنا چاہئے۔ وہ کہلات کئی ہے؟ آپ نے کہ

پس والوں کی نہ دوستی ملے گی نہ دشمنی۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں انکار کر دیا۔

”اگر سے نہیں، وہ بہت ہنسکتا ہیں۔ آپ مل لیں گی نا تو یقین بن جائیں گی۔“ نویہ اللہ نے تیسوری

پر سامان حال نہیں، جن کا کوئی بھروسہ نہیں، اس قدر مطمئن اور جہالت کا ڈیرہ تھا یہاں کہ کشف

مضبوط لڑکی بھی نکلتی میں پر مچی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اسے مناسب یہی لگا کہ شروعات علم کی

راستی پہلانا سے کرے۔ اس نے اللہ کا نام لے کر اہستہ اور مدتی تھی۔ نویہ اللہ نے اس کی بہت زیادہ

مدد کی تھی۔ لوگ نویہ اللہ کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کی بہت مانتے تھے۔ نویہ اللہ نے کشف

مختار فرما دیا اور اس کے لئے اگلا قدم آسان بنادیا۔

کشف نے یہاں عورتوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہوتے دیکھا تھا۔ وٹے بٹے کی

شادی کا رواج عام تھا۔ اس رواج پر انصاف کی طرح تقلید کرنے والے یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ

سالہ مصوم بچی کی شادی پچاس سالہ بڑے سے کر رہے ہیں یا بیس سال کے نوجوان کو پچاس سال

کی عورت کے ساتھ باندھنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ کاروباری بھی جہالت بھری رسم عام کی۔ لڑکیوں

کو قیدی بننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ آپس کی دشمنیوں میں خون بہا میں لڑکیوں کو لیا اور دے دیا جاتا تھا۔

وہ گوشت پوست کی بنی ذمہ انسان نہ ہوں بلکہ بے جان مٹی کے پھٹے ہوں۔ لوگوں کو ترسے کے

اگر معمولی معمولی رقم بھی چاہئے ہو تو وہ ڈیرے کے آگے ہاتھ پھیلائے لے کر اس لئے مجبور تھے

کوئی دوسرا انہیں اس کے سوا نظر نہ آتا تھا۔ بدلے میں وہ بڑا توان کی زمین کے کاغذات رکھ لیا

پھر کھڑے کاغذ پر گولیاں گولیاں۔ اس طرح غربت کی غربت کی چٹکی میں تو لپکتا ہی تھا مگر ساتھ ساتھ ہی

قرضے کے بوجھ تلے بھی دیتا چلا جا رہا تھا۔ ڈیرے کے منظم بھی سونے پر سہاگہ تھے۔ مفاد پرست

حاکم اپنی حاکمیت قائم رکھنے کے لئے ان غریبوں کا اپنے بیروں سے دبا کر رکھتا تھا۔ سکول کی عمارت

وہاں تعمیر کروانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان غریب مزدوروں کے بچے پڑھ لکھ جائیں

اور اپنے حقوق سے آشنا ہوں۔

کشف کے لئے یہ محاذ لڑنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے گاؤں کے

بچوں کے لئے مفت کتابوں کا بیڑا اور دوسری ضروری اشیاء کا انتظام کروایا اور انہیں اپنے گھر کے

میں پر مانتے لگے۔ نویہ اللہ نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ سب کب تک خود کرے گی تو اس نے جواب

دیا۔

”شہر سے ٹیچر آئے ہیں انہیں کچھ دن لگ جائیں گے۔ پھر اس مسئلے میں ان میں سے کیسے پڑھ لیا

گئے؟ وہاں بھی تو سکول کی تعمیر کا کام شروع کرانا ہے۔ درخواست دے رکھی ہے۔ دیکھیں کب

کام شروع ہوتا ہے۔ تب تک تو یہ بے چارے کچھ نہ کچھ پڑھ ہی لیں گے۔“

”ڈیرے سے ٹکڑوں میں آگ لگی ہے۔ بہت چلا رہا ہے۔“ نویہ اللہ ہنسا۔

”ابھی تو صرف ٹکڑوں میں آگ لگی ہے، آپ آگے آگے دیکھئے کہاں کہاں آگ کی جتنی

ہے۔“ وہ تیزی سے انداز میں مسکرائی۔

”آپ ذرا احتیاط کیا کیجئے۔ ان وہیروں کے لئے تو عورت صرف ایک کھیل تھا شادی

رکھتی ہے۔“ وہ عجیبہ تھا۔

"اچھی بات ہے۔ اچھا ڈاکٹر صاحب! وہ نوراس کے باپ کوکل میں نے بلوایا ہے اپنے آپ میں۔ میں اس کو سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ نوراس کی شادی اس اچھے گھرانے سے نہ کرے۔ گا گوہر سے کر دے۔ وہ دوسری باپ بھی ہے، شہر میں کماتا ہے، جوان ہے۔ اور پھر نوراس اور وہ! دوسرے کو پوچھ بھی کرتے ہیں۔ میں اسے رام کرنے کی کوشش کروں گی۔ نہ مانا تب آپ سے دعا کی۔ ٹھیک ہے؟" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہی لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے ہیں۔" فوہ اللہ نے سر ہلایا۔
 "خدا حافظ! وہ پلٹ آئی۔ مگر اسے مجھ سے ملنا تو یہ اللہ کی باتوں پر غور کرنی رہی تھی۔"
 "نیک، عبادت گزار، حاشی، درو مند۔" کیا یہ بڑی عجیب شخصیتوں کی خان کی ہو سکتی ہے؟ وہ اہم تک یقین دے چکی کی بھولی بھولی میں پھنسی ہوئی تھی۔
 "پتہ چل جائے گا مسٹر جیوریل! بس چکے بھٹ مزے باقی ہے۔" وہ سوچ رہی تھی۔

صبح کا اسے بہت شدت سے انتظار تھا۔ صبح تھوڑا سا تھا۔

کشف حسب معمول اپنے آفس میں بیٹھی معمولات نفاذ ہی تھی۔ گاؤں والوں کے مسئلوں پر ملتا رہتی تھی کہ اس کی سونی سی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس سالونی سلونی محرم سیدہ سندھن کو، بل کشف اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مغزاس! کیا بات ہے؟..... کوئی کام تھا؟"
 "بی بی سائیں! نوراس کا باپ وہاں مگر پہ آیا بیٹھا ہے۔ کہتا ہے آپ نے بلوایا تھا۔" منہ

نے بتایا۔
 "تو اسے یہاں بلایا تھا۔ مگر تمھاری بلایا تھا؟" وہ حذر ہو کر بولی۔
 "تو ہی، میں اسے یہاں بھیج دیتی ہوں۔" مغزاس بولی۔
 "نہیں رہنے دو۔ ویسے بھی بچہ ناگم ہو گیا ہے۔ مجھے مگر آغا ہی ہے۔ چلو تم میرے ساتھ ہی۔"
 "وہ اپنے ضروری کاغذات سمیٹنے لگی۔

"نوراس! تمھی ساتھ ہے؟" کشف نے پوچھا۔
 "نہیں جی۔ نوراس نہیں ہے۔ وہ آگیا ہی ہے۔" اس نے بتایا۔
 "اچھا چلو۔ پہلے ڈاکٹر صاحب کے یہاں چلتے ہیں۔ مجھے ان سے کچھ ضروری کام ہے۔"
 پس اٹھاتے ہوئے بولی۔

"وہ تو اس وقت ڈھنڑری میں ہوں گے۔" مغزاس نے سوچ کر جواب دیا۔
 "بچہ ناگم ہی تو کھڑا آتے ہی ہیں۔ نہیں ہوئے تو ڈھنڑری میں مل لوں گی۔" وہ کار کی اٹھاتے ہوئے بولی۔ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی باہر نکل گئیں۔
 کشف نے کار ڈاکٹر فوہ اللہ کے گھر کے باہر روکی۔ سڑک کے کھڑکی سوک کار پر اس کی نظر

ہی پڑ چکی تھی اور وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ تھوڑی سی شادی سواری ہوگی۔ وہ الٹ جاتی۔ اس نے اپنی کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے اچھتی کی نگاہ کار پر ڈالی اور مغزاس کو اشارہ کیا۔ مغزاس نے آگے بڑھ کر فوہ اللہ کے گھر کا دروازہ کھٹکایا۔ چنچنوں بعد فوہ اللہ کا ملازمہ دروازہ کھولے نظر آیا۔ کشف دانش طور پر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ مغزاس البتہ دروازے کے سامنے ہی کھڑی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب مگر یہ ہیں؟" اس نے الفہ دین سے پوچھا۔
 "سلام بی بی! صاحبہ تو مگر یہ نہیں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔
 "کس وقت آئیں گے؟" کشف نے پوچھا۔
 "جی بس آنے والے ہوں گے۔ آپ انتظار کر لیں۔" وہ بولا۔
 "نہیں..... مجھے جلدی ہے۔ ان سے کہنا شام کو ملنے آؤں گی۔ بہت ضروری کام ہے۔" کشف نے کہا۔ "یہ کار کس کی ہے؟" کشف نے سوک کی طرف اشارہ کیا۔
 "صاحب کے کوئی دوست شہر سے آئے ہیں۔ انجی کی ہے۔ الحمد آرام کر رہے ہیں۔" اس

نے بتایا۔
 "اچھا، اچھا..... چلو مغزاس! وہ پٹائی۔ مغزاس اس کے پیچھے تھی۔
 پھر شام کو فوہ اللہ اس کے گھر آیا تھا اور اس کی زبانی اسے تھوڑے کئیالات و ارادوں کے بارے میں آگیا ہوئی تھی۔ وہ بے حد سرور تھی۔
 "خدا تمھیں تمھارے نیک ارادوں میں سرخرو فرمائے۔ اس نے صدیقی دل سے دعا کی۔

تھوڑے چھوڑے کا تھا وہ اس کے ہر فعل سے واقف تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اسے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی حالت بدلتی ہوئی دیکھی تھی۔ جس کام کو وہ اور اس کی پوری ٹیم بھٹکل کر پاری تھی۔ تھوڑے لے وی کام بچوں کا مکمل تھا۔ وہ بہت تیزی سے ان لوگوں کے لئے دوسب کر رہا تھا جس کے لیے لوگ بحیثیت ایک شریف انسان اور شہری تھے۔ وہ سب جو حکومت کی ذمہ داری تھی مگر جو وہ پورا کرنے سے قاصر تھی۔

ان چار سالوں میں گاؤں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ ڈمیرے کا مطلقاً بھی ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ تھوڑے کے آگے اس کی کھیتی بندھ جاتی تھی۔
 اس نے خود کو ابھی تک باہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ فوہ اللہ کو کتنی سے منع کر رہا تھا کہ کبھی تھوڑے کے سامنے اس کا نام نہ لے۔ فوہ اللہ جہانگیر سے آدھی تھا۔ وہ انجیلے پٹن میں بھی بہت سے راز جان گیا تھا۔ اس نے اپنے وعدے کا پاس رکھا اور کبھی تھوڑے کے سامنے کشف کا نام نہ لیا۔

اس روز اسے خبر چاہا تھا۔ آصف ملی فتح نے میٹنگ دیکھی تھی اور اسے بھی اس میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ وہ تین ساڑھے تین گھنٹوں کی ڈرامے لے کر کرنا بیٹھی تھی۔ جس وقت وہ اپنے مگر پہنچی تھی،

کہ کہ آپ نے اس پر کوئی احسان کیا ہے۔ کہیں آپ کا یہ جتنا اس کے احسا کو قسم نہ کر دے۔" کشف نے کہا۔

"آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں کشف؟..... میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ میرے گھر آئے تو اسے وہاں کے در و دیوار سے محبت و محبت چھتی نظر آئے۔" انہوں نے کہا۔ "بہت اچھی سوچ ہے سراسر! مجھے یقیناً یہ حد خوشی ہوئی ہے۔" وہ بولی۔

"آپ ہماری شادی میں ضرور شریک ہوئے گا۔" انہوں نے شگفتگی دعوت دے دی۔ "نہی کہی کہتے ہیں میری شرکت لازمی تھی۔" وہ ہنس پڑی۔

"گھڑوں والے پر وہ بیٹک کا کیا حساب کتاب ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"بہت ہی زبردست۔" تیمور علی خان نے تو وہاں کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ آپ ایک مرتبہ آئے تو تھے مگر جب تک اپنی زیادہ تہلیلان نہیں آئی تھیں۔ اب آپ وہاں کا سروے کیجئے۔ بہت خوش ہوں گے۔" اس نے کہا۔

"میں ضرور آؤں گا۔ آپ کے ذریعے تو وہاں کی خبریں ملتی ہی رہتی ہیں خیر۔ تیمور صاحب نے ہمارا کام خاصا آسان کر دیا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"تمی ہاں۔ لوگ بہت مانتے ہیں ان کو۔ وہ میرے کا تو دم خشک ہوتا ہے ان سے۔ بہت آسانیاں پیدا کر دی ہیں تیمور نے ہم لوگوں کے لئے۔" وہ اپنی ذہن میں کتنی جاری تھی۔ آصف علی فتح نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ احسان کا یہ سلسلہ کب ختم کر دی ہیں؟..... کب ہمیں آپ کی اور تیمور علی خان کی شادی کا دعوت نامہ ملے گا؟" وہ خوشی سے بولے۔ "آے ان سے ایسی خوشی کی امید نہیں تھی۔ وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ انہوں نے اس کے بھیجنے ہوئے سرخ چہرے کو دیکھی سے دیکھا۔

"سرا فتح کے لئے سب لوگ جا رہے ہیں۔ چلیں۔" وہ کمزری ہو گئی اور آصف علی فتح معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

جس ٹیبل پر وہ دونوں بیٹھے تھے اس ٹیبل سے کچھ دور ہی وہ آنکھیں اسے اپنی نظروں کی زو میں لے ہوئے تھیں۔ وہ آنکھیں جب تک اس کا پیچھا کرتی رہیں جب تک کہ وہ ڈانگ ہال کے اندر جا کر نظروں سے ہوجائے نہ ہو گئی۔

"او یارا! کہاں کھو گئے؟..... چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" دوسری کرسی پر بیٹھ لڑکا اس لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"آں..... کچھ نہیں۔" وہ چونکا۔

"سب چاہتا ہوں میں۔ بڑی دیر سے تو اس حسینہ پر نظر ہی جمائے بیٹھا ہے۔ ویسے لڑکی ہے کمال کی۔" دوسرا لڑکا کینگی سے بولا۔

مج کے دل ہی بچ رہے تھے۔ اسے سارے دل سے بچے تک لازماً آصف علی کے آفس پینٹا تھا۔ وہ تازہ دم ہوئی اور صرف ایک کپ پانے کی طرف چلی گئی۔ وہاں پہنچے پہنچے اسے پونے کی مارہنہ منجھتے تھے۔ وہاں پر کسی مہمان موجود تھے۔ آصف علی فتح نے خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ میزنگ کے بعد کھانا پڑا ہے۔ وہ لوگ میزنگ سے جلدی خارج ہو گئے تھے۔ "کچ" میں ابھی آدھ گھنٹہ پڑا ہے۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اگر مائل نہ کریں تو وہاں چل کر بیٹھیں۔" انہوں نے کہا۔ کشف نے سر ہلا دیا۔

"آپ نے چند سال پہلے مجھے میرے پر پوزل کے جواب میں ایک مشورہ دیا تھا کہ کیا آپ کپا رہے؟" انہوں نے بلا تہدید کہا۔

"یاد ہے بہت اچھی طرح۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے آپ کی باتوں پر بہت غور کرنے کے بعد ایک فیصلہ کیا تھا۔" وہ کہتے کہتے رکے۔ کشف خاموش تھی۔ بس ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "میں نے فیض کمال کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔" وہ

جب بھی خاموش رہی مگر سوال جواب کے ذہن میں اٹھا تھا وہ لفظ "تھا" پر آکے انگ کیا تھا۔ "تھا" سے کیا مراد ہے آپ کی؟" وہ پوچھنے لگی۔

"میں اس کی وضاحت ابھی کرتا ہوں۔ میں نے سب سے پہلے فیض کمال سے بات کی تھی۔ اسے پوچھ دیکھا تھا۔ اس نے فوراً سے خوشتر انکار کر دیا تھا۔" وہ بتا رہے تھے۔

"پھر؟" اس نے پوچھا۔

"مگر میں نے بہت نہیں باری۔ میں اس کا برین واش کرتا رہا۔ اس کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو میرے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ مگر میں نے اس کے دل و دماغ سے آہستہ آہستہ یہ بات نکال دی۔ اس کے بعد کا سلسلہ بہت لمبا تھا۔ میرے مگر والوں کو مٹانا، ان کو رامی کرنا۔ یہ سب ایک ایک کپائی ہے۔ مگر اختصر یہ کہ میں نے کامیابی حاصل کر لی اور اس کامیابی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج فیض کمال میرے نکاح میں ہے اور اسے سینے ہماری شادی ہے۔"

تو یہ حد خوشی کی خبر ہے سراسر! آپ کی عزت میرے دل میں اور بڑھ گئی ہے۔" وہ واقعی بہت خوش تھی۔

"میں نے یہ قدم کسی تعزیری میڈل کو پانے کے لئے نہیں اٹھایا ہے۔ دراصل آپ کی باتوں کو جب میں نے گہرائی میں سوچا تو اندازہ ہوا کہ واقعی ہمارے معاشرے میں ایسی لڑکیوں کا وجود ایک ناسور کی طرح دکھایا جاتا ہے۔ مگر یہ غلط سوچ ہے۔ ایسی لڑکیاں بھی قابل احترام ہوتی ہیں۔ محبت کے جاننے کے قابل ہوتی ہیں۔ ان کو دھتکارنے کی بجائے ہم دھوری اور توجہ سے راقب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یقین کریں جب سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے تب سے ایک عجیب سا سرد اور سکون میرے دل میں آتا ہوا ہے۔ لہذا بیٹنگو میں نے کبھی بھی غصوں نہیں کی تھیں۔"

"یہ ممکن نہیں نکلی ہے، ایک قدم ہے۔ پہلا پتھر ہے سراسر!..... آپ بس کبھی اس پر یہ مت جتنا ہے

ہوا تھا رکھے ہوئے شفقت سے بولا تھا۔

ظفر نے اپنی بند سیاحشوں والی لینڈ کرورز میں بٹھا کر اسے گاؤں کی سیر کرائی تھی۔ جہاں کشف کی رہائش تھی اور جہاں اس کا آفس بنا ہوا تھا ان جیہوں کا بطور خاص اس نے اسے سروے کر لیا تھا۔ اربان دل و دل میں غائب کر رہا تھا۔ اس نے کشف کے متعلق ضروری معلومات بھی اکٹھی کر لی تھیں۔ اب بس اسے صرف اپنے ٹاپکار ابراہن کو پاپے تکمیل تک پہنچانا تھا۔

آج بہت دنوں بعد اس نے اپنا واکمن نکالا تھا۔ وہ دوپہر اپنے جسم کے گرد لینڈ آفس دان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ کار پیٹ پر دوڑا تو بیٹھی تھی۔ واکمن کی ڈھن میں مٹکائی ہوئی بند آنکھوں کے کانڈول سے وہ تھوہ کے سامنے کی اور تھوہ اس کے سامنے۔ کافی دیر سے وہ واکمن بھاری تھی۔ مگر عجیب بات تھی کہ اسے ذرا بھی کھٹاک کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ اس کی سوچوں میں تھوہ علی خان تھا اور اس کی ذہنوں میں اسی کا ذکر اس کی مہرڑوں کی تال تھوہ علی خان کی "تے" پر مقرر رہی تھی اور اس کی بند آنکھوں میں اسی کا چہرہ روشن تھا۔ ایک طویل انتظار تھا جس کے بعد اسے نوٹ کر اسی کے پاس چلے جانا تھا جس نے اسے عشق کا صحیح مفہیم سکھایا تھا۔

"نسو..... تھوہ علی خان! تمہیں زیر کرتے کرتے میں خود زیر ہو گئی..... محبت نام کی جس روشنی کا میں نے صرف تذکرہ ہی سنا تھا، اس روشنی کو اپنے دل کے آسمان پر پھیلتے ہوئے اپنی سن کی آنکھوں کو دیکھ لیا ہے۔ اس روشنی کے نور نے مجھ کو سر سے ہر ایک منور کر دیا ہے۔ تھوہ علی خان! تم میرا مقدر ہو اور میں تمہارے لئے ہی بنی ہوں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں ہر پردہ گرداں اور تمہارے منہ پر ہر آکے روشنی پھیلا دوں۔ مجھے بے چل گیا ہے کہ تم اپنی آنکھ سے عشق کرتے ہو..... عشق نہ کرتے تو میں پاگوں کی طرح مجھے ڈھونڈتے نہ پھرتے۔ تمہاری سچائی سے تمہارا ہاٹن نظر آیا ہے..... مجھے بھی تو اب مجھ آئی ہے کہ عشق اور اس کی روح دراصل ہے کیا۔ ہاؤ فور اگر اپنے عشق کو لئے دیوانی ہوئی تو اس میں کیا عجیب؟ میں جو اتنے سالوں سے اپنے لاشعور میں تمہارا انتظار بھانے بیٹھی تھی اور یہ دعا کرتی تھی کہ تمہاری صورت میں خدا میرے ہڈیوں کو سرخسری خط کرے تو اس میں حیرت کیا؟..... تم نے جو سر تا سر خود بولا، اپنا دل، اپنا آپ بولا تو میں میں نیا کیا؟.....

پو عشق کرنے والوں کی ریت ہے۔ یہ تو ان کا چلن ہے۔ وہ سب کچھ بدل ڈالتے ہیں۔ دانستہ نہیں، غیر دانستہ..... جان بوجھ کر نہیں، انجانے میں..... ابراہن نہیں، بلکہ ابراہن..... میرے رب نے اپنے پیارے بندے محمد ﷺ کے عشق میں کیا کیا کیا۔ یہ کائنات تخلیق کی..... جگہ جگہ سن سمجھا..... اپنے محبوب کا نام اپنے نام کے ساتھ اس طرح بیست کر دیا کہ الگ الگ کرنے کی مٹھائیں ہی نہیں تھیں..... جہاں "اللہ" آتا ہے وہیں "محمد" بھی آ جاتا ہے۔ بس فرق تو صرف وہ بات کا ہے۔ کوئی ہاؤور کی طرح ان وہ بات میں اپنی بلندی حاصل کر لینے کے کہ اسے دیکھنے کے لئے یوں سر اٹھا پڑتا ہے کہ سر کا پچھلا حصہ اور گردن کا پچھلا حصہ اکٹھے میں مل جاتے ہیں۔ اور کسی نے ابھی

"میں جانتا ہوں اسے" اس نے انکشاف کیا۔

"کیسا؟..... کیسا؟" دوسرا لڑکا چونکا اور بے تاب سے پوچھنے لگا۔

"میرے گاؤں میں کام کر رہی ہے کسی رفاہی ادارے میں۔ مجھے تو اس کی رہائش کا بھی پتہ ہے۔" اس لڑکے نے بے نیازی سے کہا۔ "مگر بڑی سخت ہے۔ پچھلے پوہا نہیں دھرتے دیتی۔ اڑیل، مٹھائی گھوڑی ہے۔"

"تیرے گاؤں کی ہے؟" بس مجھے تو اس سے اپنا حساب پتکار کرنا ہے۔" دوسرا لڑکا دانستہ پتہ ہونے بولا۔

"کیسا حساب؟" پہلا لڑکا حیران ہوا۔

"یہ دے ہی جس کی وجہ سے مجھے لندن سے غور اور ڈیل ہو کے لگنا پڑا تھا۔ پھر پاکستان واپس آ کے جو بدنامی اور ذلت میرے سامنے پر ٹھیل بن کر چسپاں ہوئی وہ الگ۔ اسی کی وجہ سے میرا لہجہ فرق ہوا۔ میرے گھر والوں نے مجھ کو سرے نکال دیا۔ چائینا دے سے بدل کر دیا۔ وہ تو تیرے جیسے دوست نے ساتھ دیا اور اسلئے کی اسگاہ نے مجھے بھوکوں نہیں مرنے دیا۔ ورنہ میں تو بھکاری ہی بن گیا تھا۔" اربان نہ ہر لے لیے جس کمرہ پر تھا۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے؟..... لے ڈالو بدلہ۔" اس کے دوست نے کہا۔

"اس ظفر! بدلہ تو اب لینا ہے۔ مگر ذرا مٹھنے کی تلاش ہے۔ جہاں اتنے سال ضائع کئے ہیں، وہاں کچھ وقت اور سہی۔" اربان کی آنکھوں میں خطرناک چمک ابھر آئی تھی۔

"میں کل گاؤں جا رہا ہوں۔" ظفر نے مٹی تیز لپچے میں اس کو کھپا مٹل کیا۔

"تم کیسے نہیں جا رہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ گاؤں میں بدلہ لینے کا جتنا اچھا موقع مل سکا ہے، یہاں شہر میں نہیں۔" اربان نے خیانت سے مسکرا کے اسے دیکھا۔

"ہوں..... میرا باپ گاؤں کا ڈیرہ ہے۔ وہاں جہیں ظہر نہیں ہوگا۔ مگر ہاں، بھولے سے ان کے سامنے اپنے کام کا تذکرہ مت کرنا۔ وہ اسگاہ کے نام سے بھی بدستے ہیں۔ میں ان سے کہوں گا کہ تم شہر میں ڈرائی فروش کا کاروبار کرتے ہو۔ اور تم بھی کشف سے متعلق کچھ بھی شوش نہ کرنا۔" پھر..... ظفر نے اسے سختی سے ہدایت دی۔

"بے فکر ہو۔ ان کے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگنے دوں گا۔" وہ بولا۔

اگلے روز وہ ظفر کے ساتھ اس کے گاؤں آ گیا۔ اس نے اپنے باپ سے اس کا تعارف کچھ اس انداز میں کر دیا تھا۔

"یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں، اربان۔ شہر میں بڑے پیارے بے ڈرائی فروش کا کاروبار کرتے ہیں۔ میری ان سے دو تہی چار سال پرانی ہے مگر آج انہیں زبردستی اپنے ساتھ اپنا گاؤں دکھانے لے آیا ہوں۔ یہ کچھ دن سیکھ رہی ہیں گے۔"

"ضرور، ضرور۔" پھر اپنا اپنا گاؤں ہے۔ خوب مزے کبنا ظفر کے ساتھ۔" ڈیرہ اس کے شانے

نیک بچھی تو جیسے بندوں سے جان ہی نکل گئی۔ گیت اندر سے لاک تھا۔ سوج سا تال گیت پر اس کا منہ پڑا رہا تھا۔

"یاما یاما....." اس نے بے بسی سے اس تالے کو دیکھا جو وہ ہر رات سونے سے پہلے اس گیت پر خود لکھا کرتی تھی۔ آج اسی تالے کو دیکھ کر اسے اپنا آپس قس میں پھنسا ہوا محسوس ہوا۔ گیت اتنا اونچا تھا کہ وہ اسے پھلانگ نہیں سکتی تھی دیر میں بھی اونچی گیا۔

اس نے ہانکوں کی طرح آنکھیں گیت کو اپنے ہاتھوں سے پینٹا شروع کر دیا۔

"کوئی ہے..... بچاؤ..... خدا کے لئے مجھے بچاؤ....." اس نے اس کی آواز پر طرف

کونج رہی تھی ارمان دوشیانہ ہفتے لگا ہوا اب آہستہ آہستہ پتلا ہوا اس کے پاس آ رہا تھا۔

"اس کے ہاتھوں سے بچے آئے ہوں؟..... ذلت کی زندگی سے بہتر ہے کس عزت کی موت کو گلے لگا لوں۔" اس نے سوچنے اور بھرپور فیصلہ کرنے میں صرف ایک لمحہ لگا دیا تھا۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اندر کی طرف پوری جان سے بھاگے گی اور یکن میں رہی گوشت کا کٹنے والی چھری سے اپنا حلقہ کرے گی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے پر عمل کرتی، گیت سے باہر کی گاڑی کے انجن کی آواز اور بھرپور ٹالسٹا کی تیز دوشیانہ اندر آنی نظر آئیں۔ وہ چچی اور ساتھ ہی ارمان بھی۔

"کوئی آیا ہے۔" اس نے سوچا اور پھر زور زور سے چلائے گی۔ گاڑی کے دروازے کھلے اور بند ہونے کی آواز میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"کشف..... کشف! میں تیرے ہونٹ..... دروازہ کھلو۔" تیرور کی آواز بہت صاف سنائی

دے رہی تھی۔ کشف کے ساتھ ساتھ ارمان بھی چونکا۔

"یہ یہاں کیسے آ گیا؟ اس نے سوچا۔

"تیرورا..... خدا کے لئے مجھے بچاؤ..... یہ درندہ یہاں بھی آ پہنچا ہے۔ تیرور....." اس نے

بند گیت سے لگ کر چلا کر کہا۔

"گیت اندر سے لاک ہے کشف..... کھلو۔" تیرور نے اس پر زور سے کہا۔

"چانی نہیں ہے۔" وہ بولی اور ساتھ ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ارمان اس کے ہانکوں کو اپنی مٹھی میں پکڑ کر اسے گھٹینا ہوا اندر لے جانے لگا۔ اس کے حلق سے چیخیں اُٹھ رہی تھیں۔ ہر باؤڑے تیرور نے ہونٹ کاٹنے ہوئے ایک لمبی کوسو پاؤں پھر اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور اس کا اشارہ دیکھتے ہی زمین پر دونوں کھنکھوں کے مل بیٹھا اور پھر اس نے زمین پر دونوں پھیلا دیں وہیں اور تیرور کو تھام لیا۔

"نمر....."

تیرور اس کی کمر پر چڑھ گیا اور اچھل کر گیت کے سرے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ گیت خامسا اونچا تھا۔ اور پھر اس کے سرے پر ٹوٹنے کا تھوڑا سا ہلکا سا جھکنا تھا کہ وہیں نظر وہاں کو لگتی تھی تھی۔ مکیا بار اُچھلنے پر وہ کام ہوا تھا۔ دوسری بار وہ زیادہ زور سے اچھلا تھا۔ اس بار اسے کامیابی

آئی تھی۔ تیرور نے گیت کے سر کو پکڑ لیا تھا۔ مگر ساتھ ہی اس کے منہ سے تیز سسکی نکلی۔ ٹوکیے اس نے اس کی دونوں پٹیلیوں کو بری طرح پھینکی کر پکچے تھے۔ مگر اس وقت اسے ان معمولی زخموں کی یاد نہ تھی۔

"تم تمہارے جاکے اور لوں کو لے آؤ۔" وہ اندر پھلانگنے سے قبل ڈرائیور کو کھڑے رہا تھا۔

"جی سر!" ڈرائیور نے پھر کی دھمکی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تیرور نے اندر کو دے کر گیت کے اندر

لی جانب دوڑ لگا دی تھی۔ باہر گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہی تھی۔ اس کے دونوں

انگوٹوں سے خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ کشف کی چیخ کی آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ وہ دیرانہ

اور جیس بھاگا۔

اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ ارمان، کشف کو ہانکوں سے پکڑ کر فرش پر

لیٹ رہا تھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ ارمان کے چہرے سے عجیب سی وحشت نکل رہی تھی۔

اور آگے بڑھا اور زوردار گھونر ارمان کے گز سے پریس کیا۔ ارمان اس کا چاکلے چلنے کے لئے تیار

تھا وہ تیرور کو گرا کر کشف کے لپٹے پاس ال کی گرفت سے آزاد ہو گئے تھے۔ وہ اتنی خوف زدہ اور

بھی ہوئی تھی کہ جان چھوٹ جانے کے باوجود کھڑی ہونے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ تیرور نے آگے بڑھ

رہے شانے سے پکڑا۔

"میں آ گیا ہوں..... اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" اس نے نرمی اور محبت سے اس کے سر پر

دھککا دیا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کسی فرشتے کی طرح تم ہر بار میری مدد کرنے آ جاتے ہو اور میں جیسے شیطان سمجھتی تھی.....

یہ صاف کر دو۔" وہ اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر رو پڑی۔

"تم اندر جاؤ..... ایک شیطان سے تو ایسا مجھے فرشتا ہے۔" تیرور نے خنخار نظروں سے ارمان

دیکھا۔ کشف نے نفرت سے ارمان کو دیکھا اور اس کے منہ پر قہقہہ دیا۔

"چھوڑنا مت..... چھوڑنا مت اسے۔ ایسے درندوں کو زمین پر آزاد نہیں پھرنانا چاہئے۔"

"فکر مت کرو..... اس کا تو پکا پکا بندوبست کرنا ہے۔" تیرور نے ارمان کو دیکھا جو اپنی ناک اور

اُڈ سے لٹکے والے لیو کو اپنی آنکھوں سے پونچھ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں سے ابھی بھی شعلے نکل

پہ تھے۔

"میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا..... میری جانے کے ذمہ دار تم دونوں ہو۔ اب تم دونوں کی

دلی کا ذمہ دار میں بنوں گا۔" وہ کبھ رہا تھا۔

"جیسا کہ تمہاری بدکاری اور نیت کا صلہ ملتا ہے تم نے مجھے خود کو سدھارنے کے الٹا شیطان کے

بے بن چنا شروع کر دیا۔ تو یہ تو جانتے تھا کہ تم اللہ سے بد کر کے مسافر اور حق کی راہ پر نکل

لے۔ مگر تم نے تو ارادہ ہی نہیں کیا تھا کہ جس راہ کا جس چیز کی طلب ہو، خدا بھی صرف وہی دیتا

جیسا کہ تمہاری خواہش تھی۔ جیسا کہ تمہاری ہمت سے برائی ہی ملی۔ اب کسی مجھے شرمندہ ہونے

کے تم وہمکیاں دے رہے ہو۔" تیمور نے تاسف اور غصے سے کہا۔
 "صرف وہمکیاں نہیں ہیں، بلکہ آج میں تم کو اس پر عمل کر کے بھی دکھاؤں گا۔" ارمان نے اُن کو کہہ کر اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور پھر اگلے ہی لمبے اس کی جیب میں سے ایک چھوٹا سا رومال نکال کر اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔

تیمور کی چھٹی مناسبت سے پہلے ہی خطرے کا سنٹکل دے چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ارمان رومال اور ٹرائیڈ دہاتا، تیمور اپنی جیب سے اپنا سرورس رومال نکال چکا تھا۔

"رومال اور پیچک دو ارمان!" اُس نے اسے وارن کیا۔ مگر ارمان لپٹا دیوڑیا چپکا تھا۔ کوئی اپنی ہڈی روتار سے ہائی سے نکل کر تیمور کے کندھے میں گھس چکی تھی۔ تیمور کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ ارمان نے کچھ بعد دیکر دوسرے دو گولیاں اس پر فائر کی تھیں۔ کشف کے منہ سے نکل گئی تھی۔ گولیاں تیمور کے بازو، کندھے اور پیچھے لگی تھیں۔ مگر ساتھ ہی ارمان کی پیٹھ میں سانس میں کوئی گھس۔ وہ تیمور کے کمرے بل کر مارتا تھا۔ تیمور کے رومال اور سے نکلنے والی گولیاں سیدھی اس کے سر میں لگی تھیں۔ اُپر و در و گرد اور تیمور کا پٹ پر گر گیا تھا۔

اسی وقت باہر پولیس کی گاڑیاں رکنے اور سائرن کے شور کی آواز سنائی دیں۔
 "تیمور....." وہ اس پر چلی۔ تیمور نے بند ہوئی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

تیمور کو کتنی گولیاں لگی تھیں اور وہ خاصا ڈنڈی تھا۔ اس نے تیمور کے زرد ہوتے چہرے کو نم آنکھوں سے دیکھا اور تیزی سے اُنڈر کرکٹ کی چابی لینے کمرے میں بھاگی۔ وہیں اس نے اپنی چادر لٹا کر کے ابھری طرح جسم کے گرد اوڑھ لی اور چابی میز پر سے اٹھا کے باہر بھاگی۔ وہ پولیس کی گاڑیوں کی آواز سن چکی تھی۔ جب تک وہ گیت تک پہنچتی تھی اسے لوگوں کی باتوں کی آواز سن بھی صاف سنا دے رہی تھیں۔ اس نے پھر تری سے ناکا کھولا اور گیت کھلتے ہی پولیس والے اندر آ گئے۔ نویہ اٹھ کر ان کے ساتھ تھا۔

"تیمور کو گولیاں لگی ہیں..... وہ اندر بے ہوش ہے۔" کشف نے لڑاں کی آواز میں اسے بتایا۔
 "اوہ....." وہ بے ہوشی سے اندر بھاگا۔ اس کے ساتھ باقی پولیس والے بھی اندر بھاگے۔ تیمور، بے ہوش بڑا ہڈا تھا۔ نویہ اللہ نے اس پر جھکتے ہوئے اس کی گلائی تمام لی اور ایک نظر ارمان پر ڈالی۔ بھی لودھو مارتا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہوئی تھیں۔

"انہیں فوراً ہسپتال لے چلو۔ خون بہت زیادہ نکل چکا ہے۔" دو فورس والوں نے مخاطب ہوا۔
 "جلت میں کشف سے کہا۔" آپ کوئی کپڑا دیں۔ اس کا خون دیا کر دو سنا ہو گا۔"
 کشف سر ہلاتی ہوئی اندر کمرے میں بھاگی اور ایک ہی لمبے میں وہ دو چادر میں لے آئی تھی۔
 "جلدی میں سب لپی ہیں۔" اس نے نویہ اللہ سے کہا۔
 "ٹھیک ہے..... آپ ایک طرف ہو جائیں۔" نویہ اللہ نے جلدی سے تیمور کے سینے اور بازو،

پاؤں رکھ کر دبا دیں اور ساتھ ہی پولیس والوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے پھر تری مکر احتیاط کے ساتھ تیمور کو اٹھایا اور باہر نکل گئے۔ کشف بھی ان کے پیچھے پیچھے نکلی تھی۔ تیمور کو نویہ اللہ کی کار میں ڈالا گیا تھا۔ ساتھ میں دو کانسٹیبل اور کشف بیٹھے تھے۔ نویہ نے تیزی سے کار بھاگی اور پھر سیدھا ہسپتال جا کر ہی کار کو روکا تھا۔

تیمور کو کار سے نکال کر اسٹریچر پر ڈالا گیا تھا۔ نویہ اللہ اور دو ڈاکٹر ڈاے آپریشن تھیمز لے گئے تھے۔ کشف آپریشن تھیمز کے باہر کار میں بیٹھ کر کمری اس کے لئے دعا گوئی۔ کچھ دیر پہلے نویہ اللہ نے کہا تھا کہ بہت زیادہ خون بہہ چکا ہے۔ اب تو دوسرے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔ اور جب کشف عارضین عادل نے رپ کے حضور سر جھکا کے اس کی زندگی کی دعا مانگی۔ اس نے منت مان لی تھی کہ تیمور کے ابھی طرح صحت یاب ہونے پر وہ عمرہ کرے گی۔ یہ لفظ خود بخود اس کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔ بلا ارادہ، بنا سوچے۔

آدھ گھنٹے بعد ایک نرس اندر سے نکلی تھی۔ وہ بے باتی سے اس کی طرف چلی۔
 "مسٹر ڈاکٹر کیسے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"خون کی ضرورت ہے انہیں۔ کم از کم دو پونیس خون کی ضرورت ہے۔" نرس نے بتایا۔
 "نیمرا لے لیجئے۔" میرا ارمان کا بلڈ گروپ ایک ہی ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"ٹھیک ہے۔" نرس اسے لے کر دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی اور کشف کو برسوں پہلے کا وہ خطرناک دیا گیا جب تیمور ڈنڈی طرح ڈنڈی حالت میں وہی ہسپتال لائی تھی اور اس کو جب بھی خون کی ضرورت تھی۔ تب بھی اس نے اس کو خون عطیہ کیا تھا اور آج بھی وہی صورت حال تھی۔ مگر جب دل اور جندبات میں یہ تڑپ، یہ دیوانگی کھلی تھی۔ تب تو شخص انسانی بھدوی کے توسط سے اُن نے ایسا کیا تھا۔ اور آج اپنے دل کے ہاتھوں بھجور ہو گئے۔ وہ ایسا کر رہی تھی۔ جب تیمور اس کے لئے محض ایک عام انسان تھا جس کی جان بچانی اس لئے ضروری تھی کہ محض ایک انسان تھا۔ اور آج اس کی کل کائنات بن چکا تھا۔ آج وہ اسے محض دل کے ہاتھوں بھجور ہو کر زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اُل بدل جائیں تو یونہی سب کچھ بدل جاتا ہے۔ جس طرح کشف نے محسوس کیا تھا۔

تین گھنٹوں کے آپریشن کے بعد بھی نویہ اللہ کچھ زیادہ ہڈا ہڈا نہ تھا۔
 "اسے دعا کی ضرورت ہے بس۔" وہ صاف صاف کہہ چکا تھا اور جب کشف نے خدا کے آسمے بے بسی سے سر جھکا دیا تھا۔

ایک کچھ کھائے، پینے پیتے اس نے دو دن اور دو راتیں بس مصلیٰ پر گزار دی تھیں۔ اور تیسرے روز وہ پھر میں نویہ اللہ نے اسے یہ نویہ سنا کی کہ وہ پوری طرح خطرے سے باہر ہے۔ اس خوشخبری پر کشف کا سر ایک بار پھر خدا کے حضور سجدے میں جھک گیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔
 "ابھی نہیں۔ پہلے کچھ کھائیں۔" ورنہ اس کی بجائے آپ کو ہسپتال پر ڈالنا پڑ جائے گا۔" وہ سکرایا۔

دشمنوں پر بہتے موتیوں کو اپنی لالچی انگلیوں پر چن لیا۔ کشف نے کوئی حرکت نہ کی۔ بس اسے بچتی رہی۔

”روستہ..... مجھے تمہارے آنسوؤں سے تکلیف ہوتی ہے۔“ وہ آہستگی سے صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ کشف نے سر ہلا دیا۔

”اے..... ہوش آگیا تھو کہ؟“ اس کی فواید اللہ کی آواز عقب سے سنائی دی۔ کشف جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آگئی۔ اپنی بے ساختگی اور بے خودی پر سمجھتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”جلد مایاں! بہت تڑپا لیا ہے چارلی لڑکی کو۔ اب سید سے شرافت کے ساتھ پہلے پھرے نظر آؤ۔ بے چاری نے ایک تو تجھیں دو بولیں خون دیا اور اس پر جب سے تم یہاں پڑے ہو نہ کچھ کھانا نہ پینا۔

میں تو سوچ رہا تھا کہ گھنٹا ان خبر نہ کہ بستر بھی تمہارے برابر میں نہیٹ کر پڑ جائے۔“ فواید اللہ اس کی بغض چپک کرتے ہوئے مسلسل کہہ رہا تھا۔ جیور نے بے حد گہری نظروں سے کشف کو دیکھا تھا۔

اس کی نظروں کی وارمی، حرارت اور گرمی نے کشف کو سوس کی طرح جھکا دیا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو آگاہ بننے ہوئے محسوس کیا۔ اس کی نظروں ازخود عارضوں پر جھک گئیں۔ جیور نے بے حد لڑکی سے اس کے سرخ آنکھوں پر سے اور جھپٹی ہوئی چپوں کو دیکھا۔ ایک بولڈ، زلد، خشک قسم کی لڑکی کا

اس طرح حیا آجیز ہو رہی وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ نظر اس کے لئے نیا تھا کہ بے حد یادگار۔

”میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔“ کشف اس کی وارفتہ نظروں سے گھبرا کر فواید اللہ سے بولی۔

”ہاں بالکل..... آپ جا بیٹے، کھا بیٹے پیٹے اور ریٹ کریں۔ اب آپ کے جیور علی خان لکھڑے سے باہر ہیں۔“ وہ اپنی دھن میں بولا۔

”آپ کے“ کے لفظ نے اس کا سارا اعتماد پانی بنا دیا۔ اس نے جیور کو دیکھنے بغیر وہاں سے تھک رہا ڈر لگا دی تھی۔



جیور کو پوری طرح سے سحر دست ہونے میں تین مہینے لگے تھے۔ ان تین مہینوں میں کشف اس کے ساتھ سامنے کی طرح تھی۔ کیونکہ جیور کے اصرار پر بہت سادگی سے ان دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ نہ کوئی ذمہ داری، نہ شہرے، نہ بارہا تاج کا کھنکھانا۔ بس سادگی سے دونوں کا نکاح ہوا تھا اور

رہ گئی۔ جس میں بہت ہی ترقی ہوئی لوگ مچو تھے۔

جیور کی اس جلد بازی اور بے قرارگیوں کا حیدر نے بہت مذاق اڑایا تھا۔ مگر وہ کسی کب کو خاطر نہ لانا تھا۔ رؤف علی خان نے کشف کو باغیچہ دل سے اپنایا تھا۔ یوں بھی اس وہ کوئی معمولی لڑکی نہ

تھی۔ اس کی معاشرے میں حیثیت تھی، نام تھا، مقام تھا، پہچان تھی، شناخت تھی۔ رؤف علی خان کو کشف اس لئے بھی پسند تھی کہ وہ بارہواں کے بیٹے کی جان بچانے کی ذمہ داری تھی۔ پھر وہ جیور کو

دیکھی۔ اس عرصے میں انہیں بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ جیور ان کو کس قدر عزیز ہے اور انہوں نے

”بس ایک نظر دیکھ لوں، پھر کھالوں۔“ پھر کھالوں کی۔“ وہ جیسے اچھا کر رہی تھی۔ تو یہ اللہ نے سر ہلا دیا۔

کشف کرے میں داخل ہوئی۔ وہ جیور میں جیڑا ہوا بستر پر اٹھا۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی زردی نمایاں تھی۔ آنکھوں کے گرد جھٹے پڑ گئے تھے۔ لب ٹھک رہے تھے۔ اس کے دونوں بازوؤں

میں ڈرچیں بھی تھیں۔ وہ بے سادہ آ رہا تھا۔ کشف نے لڑاں انگلیوں سے اس کے چہرے کو چھوا۔ اس کے چہرے پر زردی کی تہ جیسے بیٹھی تھی۔ کشف نے بے اختیار ”شکر ہے تیرا اگ!“ کے الفاظ زبان سے ادا کئے تھے۔ چنانچہ یہ اس کی تخریبی انگلیوں کی حرکت تھی یا کیا کہ جیور کی چپیں لرزے لگیں۔

”جیور!“ وہ چپک کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے لب بھی کاٹے تھے۔ وہ اس کے ہاتھ اور زردیک آگئی۔

”جیور! اس نے گویا سر کوئی کی۔“

جیور آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی جدوجہد کی تھی۔ اس کی انگلیوں میں حرکت ہوتی تھی۔ کشف نے بے چارہ انداز میں اس کی بند خوب صورت چپوں والی آنکھوں کو دیکھا۔

”جیور! آنکھیں کھولو۔“ اس نے بے حد نرمی سے کہا اور اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔

جیور کی آنکھیں نیم اوپر گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بے حد نرمی اور نرمی تھی۔

”اللہ! تیرا شکر ہے۔“ اس کے سینے سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ ”میری زندگی مبارک ہو۔“ وہ محبت سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں تیرنی نمی اور لیوں کی مسکان نے جیور کو سب حال دل کہہ سنایا تھا۔

”کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ وہ پوچھتی تھی۔

”لکھک۔“ وہ بے حد شائستگی سے بولا۔

”تنتا ڈرامائی انداز ہے تمہارے لمبن کا..... ہے نا؟“ وہ لہجے میں خوشی سینے ہوئے بولی۔ جیور کے لیوں پر بالکی مسکراہٹ تیر گئی۔

”اب بس اس بستر کو جلدی سے چھوڑ دو۔ تین روز سے پڑے سو رہے ہو۔ کتنے سست ہو۔“ وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔ جیور خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے اس سے کہہ نہ سکتا کہ جیور

تھی۔ اس قدر قریب کہ اس کی سانسوں کی خوشبو کو بھی وہ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر شاید اسے اس قربت کا احساس نہ تھا۔ وہ تو دل کے ہاتھوں بچھو رہی تھی۔ اپنی بے خودی سے بے خبر تھی۔

”جانتے ہو میں نے دو راتوں سے بالکل نیند نہیں لی۔ اب تم جا کو گھر اور میں سوؤں گی۔

”سچے؟“ وہ گہری تھی۔ جیور اب بھی خاموش تھا۔

”بہت ڈرایا ہے تم نے..... بس اب اور نہیں۔“ وہ ضبط کے باوجود بالآخر رو پڑی۔ آنسو کے

قطرے پیاز کی ندی کی طرح اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جیور نے اپنی انگلیوں کو حرکت دی۔

بیشکل ہی وہ اپنا ہاتھ بلند کر کے اس کے چہرے تک لایا تھا۔ اس نے نرمی اور آہستگی سے اس کے

”میں سوچتی ہوں کہ تم جیسا ذہین، قابل اور لائق آدمی مجھ سے کیسے محبت کر بیٹھا؟“ وہ خوشی سے بولی۔

”اور میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھ جیسے مفرد، اکفر، ضدی کی محبت کو تم جیسی لڑکی نے قبول کیسے کر لیا؟“ وہ ہر جہت بولا تھا۔

”ہاں..... یہ تو ہے سوچنے کی بات۔ مگر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ محبت واقعی اندھی ہوتی ہے۔“ وہ بھرپور خوش ہو گئی۔

”آں، ہاں..... محبت عبادت ہوتی ہے۔“ تیمور نے گردن موڑ کے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہم قدم وہ ہنسی بھی جس نے اس جیسے جھٹس اور ہزار خصوصیات والے مرد کو پر کیا تھا۔

”جود کی نظروں میں محبت کے ساتھ احترام بھی تھا۔“

”میں سوچتا ہوں کہ اس اسٹوڈنٹ ارمان کی وجہ سے مجھے وہ سارے ڈانپلاگز کہنے کا موقع ہی نہیں مل سکا جو میں نے تم سے کہنے کے لئے رٹ رکھے تھے۔“ تیمور نے خوشی سے کہا۔

”کسی ڈانپلاگ کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں تیمور! تمہارے دل پر گھسی خیر میں چار سال پہلے ہی پانچ بنگی تھی اور اس پر یقین بھی کر چکی تھی۔“ کشف نے جذبے لانی نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ مسکرا دیا۔ واقعی ان دونوں کو انکھار کے لئے زبان کی ضرورت ہی نہیں تھی!

(تحت بالگیر)

پائی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ واقعی ”انکھار“ کی نرم پھار جب تک ساتوں کی سوچی زمین کو گیلنا نہ کرے تب تک اس زمین پر یقین کے پھول نہیں کھلتے۔

وہ دونوں اسلام آباد بھی گئے تھے۔ حمایت بادشاہ سے ملے تھے۔ انہوں نے دونوں کے سر ہاتھ رکھ کر دعا میں دی تھیں۔

”جنہیں مقدر ملنا چاہے، ان کے ملن کو کون روک سکا ہے؟“ انہوں نے کہا تھا۔

وہ دونوں ہانڈو کے طعر پر بھی گئے تھے۔ ہانڈو کو دیکھ کر دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ دو تو کوئی اور ہی ہانڈو تھی۔ اس نے عشق کی اس معراج کو حاصل کر لیا تھا جو ہر ایک کا مقدر نہیں ہوتی۔

”عالمی اکب تک یوں تہا زندگی گزاریں گی؟“ تیمور نے اس سے پوچھا تھا۔

”تہا کی کبھی؟“ دیکھو تو میرا گھر آباد ہے۔ یہاں، وہاں ہر سمت میرے سرکار نظر آ رہے ہیں۔ میرا دل تو لب لباب میرا ہے..... ایسا نہیں احساس ہے کہ کیا کوئی جنت کو پا کے حاصل کرے گا۔ پہلے تو میں ان کا دیار کرنے ان کے آستانے پر بھی چل گیا کرتی تھی۔ مگر اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ دیکھو..... وہ وہاں بیٹھے خوش کر رہے ہیں۔ پھر وہ صلی کی طرف آئیں گے۔ میں نے صلی بچھا کر رکھا ہے۔ یہ وقت ان کی نماز ادا کرنے کا ہے۔ وہ تو ہمہ وقت میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ تہا چھوڑتے ہی نہیں۔“ وہ بے خودی کے عالم میں کہتی جا رہی تھی۔

تیمور نے کشف کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ دونوں داہیں چلے آئے۔



عمرے کے گٹ آ گئے تھے۔ دونوں اللہ کے حضور حاضر دی دینے گئے تھے۔

اس وقت وہ دونوں کعبہ شریف کے عین سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ دونوں کی آنکھیں نہ تھیں اور دونوں کے ہاتھ دعا کی اعجاز میں فضا میں بلند تھے۔ دونوں ہی کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور دونوں کے لب کھپکار رہے تھے۔

کافی دیر تک رب العزت کے حضور کھڑے رہنے کے بعد کشف نے آنکھیں کھول دیں۔ اڑ نے اپنی چادر سے اپنا چہرہ پوچھا اور تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اسی اشتہار سے دعا مانگا، تھا۔ کشف اسے دیکھنے لگی اور پھر ایک تک دوستی ہی چلی گئی..... وہ لہا چڑا دیو مانی دیوتاؤں سے زہا خواہر دستیں تو جوان اس کے سامنے تھا اور بچوں کی طرح زور ہاتھ تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے کیا مانگا ہے۔ وہ رو کے۔ مگر اس وقت تیمور پر چھائی رقت دیکھ کر ۱۱

نے ہانکل بھی اسے نہ سمجھا تھا۔ بس خاموشی سے وہیں کھڑی رہی، کعبہ شریف کو دیکھتی رہی۔ ۱۱

دونوں کو یہاں آئے آج چودھواں روز تھا۔ دونوں عمرہ کرنے آئے تھے۔

”تم نے واقعی یہی دعا مانگی کیا مانگا ہے.....؟“ وہ بونگ کے راستے پر بیدل چلتے چلتے پوچھ رہی تھی۔

”دعا میں بتائی نہیں جاتیں۔“ وہ معنی خیر لہجے میں بولا۔

خواتین مصنفین کے مقبول ناول شائع ہو گئے ہیں

مکتبہ القلیش

- 90/- شکوہ
100/- شکر
150/- بیسی پلکیں

ایک مصنفین کے مقبول ناول

- 250/- یوں رنگ زندگی بدلا اسماء سلیم
200/- خواب رنگ اور راستے گہمت سیما
250/- آئی رت بہار کی زاہدہ پروین
200/- سبز زیتوں کی جھلجھل میں عفت سرپاشا
300/- مگر زیا راحت و قہار
700/- اے شمع کوئے جاں عاشا کوثر سردار (2 جلدیں)

- 200/- کوئی جگنو ہو انجم انصار
300/- دھند بقیس کنول
300/- ڈکھاں دی مگری دوج فضیلت احوال
شکھاں دی برکھا
200/- مٹی کا دیا سیما کاہل
200/- بہاروں کا انتظار کرو بقیس ظفر
250/- شب انتظار ڈھلتی ہے طاہرہ تول
125/- دل اسیر خیال ہے تیرا عائشہ زمل
100/- زہریلی محبت محمد مودی

مکتبہ القلیش

- 450/- کوئی لمحہ گلاب ہو

ایک مصنفین کے مقبول ناول

- 300/- تیری آفت میں صنم
300/- چاند مگن اور چاندنی
400/- بہاروں کے رنگ رنگ
100/- تم میری زیست کا حاصل ہو

ایک مصنفین کے مقبول ناول

- 400/- ساحلوں کے گیت
225/- دھبہ دل
200/- سکوت شب کے رنجے

ایک مصنفین کے مقبول ناول

- 500/- دل اک شہر جنوں
400/- کچھ مینوں مرن دا شوق وی سی

ایک مصنفین کے مقبول ناول

- 180/- پھولوں کو مر جمائے نہ دینا
225/- جمونکا بہار کا
200/- کے دھماکے

ایک مصنفین کے مقبول ناول

- 300/- سیکس
200/- صبا

مکتبہ القلیش سسر روڈ اردو بازار، لاہور

فون: 4183097-0300-7352835-7868956 (042)